رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ | جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

معارف

مجلس المصنّفین دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

سیّد سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

اردو مین اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب نہین تھی جس مین تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر حکومتون کی سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ہو اس لئے دار المصنفین تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ خاص اہتمام سے مرتب کرا رہا ہے جس کے بعض حصے یہ ہین اور بعض زیر طبع ہین، او ملکثر زیر تالیف و تکمیل ہین، جو بتدریج جیسے جیسے حالات مساعد ہون گے شائع ہوتے رہین گے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل (عہد رسالت وخلافت راشدہ)
اس مین آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مفصل مذہبی، سیاسی وتمدنی اور علمی تاریخ ہو (زیر طبع)
ضخامت: ۴۸۰ صفحے، قیمت: سے ۳ر

تاریخ اسلام حصۂ دوّم، (بنو امیہ) اس مین اموی حکومت کی صد سالہ سیاسی وعلمی و تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے،
ضخامت ۴۷۴ صفحے، قیمت: سے ۳ر

تاریخ اسلام حصۂ سوم، (تاریخ بنی عباس جلد اوّل)
اس مین خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے خلیفہ ابو اسحٰق متقی للہ ۳۳۳ھ تک دو صدیون کی بہت مفصل سیاسی تاریخ ہے، ضخامت ۵۰۴ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصۂ چہارم (تاریخ بنی عباس جلد دوم)
اس مین خلیفہ المستکفی باللہ کے عہد ۳۳۳ھ سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۶۵۶ھ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ ہے،
ضخامت ۲ ۳ ۴ صفحے، قیمت: صہ ر
(مرتبہ [illegible] الدین احمد ندوی)

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ اوّل، اس مین عثمان اوّل سے مصطفٰے رابع تک سلطنت عثمانیہ کے چھ سو برس کے کارنامون کی تفصیل ہے، ضخامت: ۵۰۰ صفحے
قیمت: سے ر

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارنامون کی تفصیل از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء تا جنگ عظیم ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۶ء
ضخامت: ۴۶۸ صفحے، قیمت: صہ ر
مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے علیگ سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈہ،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، حکومت کا قیام، اور عہد بعہد کی ترقیون اور عروج کی پوری اور مفصل داستان ہے،
۵۴۶ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ صقلیہ حصۂ دوم، یہ سسلی کے تمدنی وعلمی ترقیون کا مرقع ہے جس مین عہد بعہد کے مفسرین، محدثین، فقہاء ادباء و شعراء کے مفصل حالات اور ان کی تصنیفات کا ذکر ہے،
۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ
مرتبہ: مولانا سید ریاست علی ندوی،

مسعود علی ندوی **منیجر** **دار المصنفین اعظم گڈہ**

جلد ۶۰ ماہ شعبان المعظم ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ جولائی ۴۷ء عدد ۱

مضامین

شعر العجم حصۂ دوم

شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ ابن یمین تک) مع تنقید کلام،

حجم :- صفحے، قیمت :-

"منیجر"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

پہلی بڑی لڑائی کے بعد روس سے اشتراکی تحریک کے ساتھ الحاد کا طوفان اٹھا تھا، خدا اور اوس کے وجود کا علانیہ انکار کیا گیا، نعوذ باللہ اس کے فرضی تابوت کو نذر آتش کیا گیا اور مذہبی کتابون کی مقدس آیتون کو بگاڑ کر ماسکو کی سڑکون پر لگایا گیا تھا، اور بقول مسٹر رام . ار سانی، باکو کی ایک مسجد مین ایک ضعیف مسلمان ملا نے بڑی حسرت سے اُن سے کہا کہ "اب چند برسون مین اس مسجد مین آنے والا کوئی باقی نہ رہیگا اور یہ عبادتگاہ ہمیشہ کے لئے مقفل کر دی جائے گی"

لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ دوسری بڑی لڑائی کے بعد روس مین ہوا کا رُخ بدل جائے گا، اس ملک مین نہ صرف مذہب کے خلاف گستاخانہ و ملحدانہ سرگرمیان ختم ہو جائین گی، بلکہ وہ "مسلمان اشتراکیون" کو اپنی مذہبی تنظیم کرنے مذہبی ادارون کو چلانے اور مذہبی مجالس کے منعقد کرنے کی اجازت دین گے اور یہان کے مسلمان اپنے تعلیمی و معاشرتی مسائل پر مذہبی نقطۂ نظر سے غور و فکر کر سکین گے، ہم نے سوویٹ یونین نیوز ایجنسی کی نشر کی ہوئی ان اطلاعون کو بڑی دلچسپی اور سنجیدگی سے پڑھا، جن مین مرکزی ایشیا کے مسلمانون کی مذہبی سرگرمیون کا تفصیل سے ذکر آیا ہے، چنانچہ وہی تاشقند جس کے مشہور شہر سمرقند کی جامع مسجد کا منارہ منہدم کر کے لینن کا مجسمہ نصب کیا گیا تھا، اور اس کے نیچے مرقوم تھا کہ "اب یہان سے خدا کی اذان کبھی نہ پکاری جائے گی"، اسی تاشقند مین مرکزی ایشیا کے "مسلم بورڈ" کا نمایندہ اجلاس منعقد ہوا، جس مین مختلف مذہبی و معاشرتی مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا گیا، اور ایسے فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش کی گئی کہ وہ احکام "شریعت" کے مطابق ہون، کیا موجودہ روس کے مسلمانون کی زندگی کے لئے یہ حیرت انگیز انقلاب نہین ہے،

تاشقند کے اس اسلامی اجتماع میں مسلم بورڈ کی کارگذاریوں کی روداد بھی پیش کی گئی، اس میں ایشیائی روس کے مختلف مذہبی مرکزوں کا جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں خانقاہ حضرت بہاء الدین نقشبندی بخارا خانقاہ حضرت شاہ زندہ سمرقند، اور خانقاہ حکیم ترمذی، ترمذ کے توسط سے مذہبی تعلیم و تربیت کے جو خدمات جاری ہیں، ان کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے، یہ مسلم بورڈ ایشیائی روس کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا نگراں ہے مساجد کے ائمہ و مؤذن کا تقرر، اُن کے کاموں کی نگرانی وقتاً فوقتاً مختلف مسائل و مباحث میں دینی نقطۂ نظر سے روس کے مسلمانوں کی رہبری کرنا، اور اسلامی احکام و واجبات کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دینا اس کے فرائض میں داخل ہے، نیز ایشیائی روس میں مذہبی درسگاہوں کی تنظیم اور ان کا نصاب تعلیم مقرر کرنے کا کام بھی جاری ہے، اس علاقہ کا تعلیمی مرکز امام بخاری علیہ الرحمہ کا موطن بخارا قرار پایا ہے یہاں "مدرسہ میر عرب" کے نام سے ایک درسگاہ قائم ہے، اس مدرسہ کا نصاب پانچ سال کا مقرر کیا گیا ہے مضامین درس میں قرأت، تفسیر، حدیث، عربی صرف و نحو، فارسی قواعد، سوویٹ یونین کی قوموں کی تاریخ، سوویٹ یونین، کا دستورِ حکومت اور دوسرے مضامین داخل ہیں،

اگر یہ اطلاعیں مبالغہ سے خالی ہیں، تو ہم روس میں ان تبدیلیوں کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں، وسط ایشیا کے ان مقامات میں اسلامی تہذیب و ثقافت و روایات کے کبھی نہ مٹنے والے آثار قائم ہیں، اگر وہاں کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں حکومت وقت کی طرف سے واقعی کوئی معاندانہ رخنہ اندازی نہیں ہوئی، تو وہاں حکومت کے ہمدردانہ رویہ کے بغیر بھی اسلامی زندگی کی روح نئے سرے سے پیدا ہو سکتی ہے، اور وہ ملک جہاں سے دین و مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی تحریک اٹھی تھی، آج بھی اسلامی ثقافت و روایات کا اہم مرکز بن سکتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں کے مسلمانوں کی فلاح و ترقی اور ان میں حقیقی مذہبی زندگی پیدا ہونے کے لئے حالات کو سازگار بنائے، اور اُن کی مشکلات پر انھیں قابو عطا فرمائے،

پچھلے مہینہ میں والا حضرت سردار محمد ہاشم خان سابق صدر اعظم افغانستان کی طرف سے قرآن مجید کے ایک پاکیزہ نسخہ کا تحفہ ہمیں موصول ہوا ہے، یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب علیہ الرحمۃ کے اردو ترجمہ و حواشی کا فارسی ترجمہ ہے، جس کی پہلی جلد خوشخط ٹائپ اور بہتر کاغذ پر اہتمام سے چھاپی گئی ہے، والا حضرت موصوف نے اس کو فارسی اور پشتو دونوں زبانوں میں ترجمہ کرایا ہے اور عام نفع کے لئے شائع فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ والا حضرت کو ان کے حسن عمل کا اجر عطا فرمائے، اور اس مقدس نسخہ کے ذریعہ افغانستان کے مسلمانوں کو خیر و برکات سے مستفید فرمائے۔

ملک میں سیاسی انقلاب کی جو عام لہر دوڑی ہوئی ہے، اوس سے یہاں کے تعلیمی ادارے بھی متاثر ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ بمبئی یونیورسٹی نے ہماری درسگاہ ندوۃ العلماء کے ایک فارغ التحصیل مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی کو کسی مغربی درسگاہ کی سند کے بغیر کلیہ پوسٹ گریجویٹ میں ام اے پڑھانے کے لئے پروفیسر کی حیثیت سے باقاعدہ اجازت نامہ دیدیا ہے، اور موصوف کے خدمات گجرات یونیورسٹی کے قیام کے بعد (جس کی تاسیسی کارروائیاں ان دنوں جاری ہیں،) اس یونیورسٹی میں منتقل ہوجائیں گے، مغربی تعلیمی ادارہ میں مشرقی درسگاہوں کے افاضل کی خدمات کی قدردانی کی یہ پہلی مثال ہے، امید ہو کہ اس طرح مغربی و مشرقی تعلیمی اداروں میں جو دوری ہے وہ رفتہ رفتہ دور ہوگی، اور ارباب فضل کے خدمات سے خواہ وہ مغربی درسگاہ کے فارغ التحصیل ہوں یا کسی مشرقی درسگاہ کے محض ان کی علمی صلاحیتوں کے اعتبار سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

حضرت مولانا شاہ محی الدین پھلواروی امیر شریعت بہار کے سانحۂ وفات کا ذکر پچھلے مہینہ میں آچکا ہے، اس صوبہ میں امارت شرعیہ کا نظام خواہ جس حال میں ہو قائم ہے، خوشی ہوئی کہ مولانا مرحوم کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس کے لئے مولانا شاہ قمر الدین صاحب پھلواروی کا انتخاب عمل میں آیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس صوبہ کے مسلمانوں کو مولانا موصوف کے فیوض و برکات سے مستفید فرمائے،

مقالات

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۴)

(۹) **عقل و عشق** اثباتِ خودی کا یہ نوان مقدمہ ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عقل و عشق دونون خودی کا جزو ترکیبی ہین،

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل　　اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

جہانِ نو جو ڈاکٹر صاحب کی خودی کی سب سے آخری منزل ہے، وہ بھی عقل و عشق ہی کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے،

غربیان را زیرکی سازِ حیات　　شرقیان را عشق رازِ کائنات

زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چون با زیرکی ہمبر بود　　نقشبند عالمِ دیگر شود

خیز و نقش عالمِ دیگر بنہ　　عشق را با زیرکی آمیز دہ

پیام مشرق مین انھون نے "محاورۂ علم و عشق" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس مین علم و عشق

کا مناظرہ کروایا ہے، اور ہر ایک نے اپنے اپنے فضائل بیان کئے ہین، علم کہتا ہے،

نگاہم راز دارِ ہفت و چار است   گرفتار کمندم روزگار است
جہان بینم باین سو باز کردند   مرا باآن سوے گردون چہ کار است
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم   ببازار افگنم رازے کہ دارم

اب عشق اس پر ردو قدح کرتا ہے،

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است   ہوا آتش گداز و زہر دار است
چو با من یار بودی نور بودی   بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی   ولیکن در نخِ شیطان فتادی

اس ردو قدح کے بعد اوس کو پیغامِ صلح اور دعوتِ اتحاد دیتا ہے،

بیا این خاکدان را گلستان ساز   جہانِ پیر را دیگر جوان ساز
بیا یک ذرہ از درد دلم گیر   تہ گردون بہشتِ جاودان ساز
ز روز آفرینش ہمدم استیم   ہمان یک نغمہ را زیر و بم استیم

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے، کہ وہ عقل کے کلیۃً مخالف نہین ہین، البتہ جب عقل، عشق سے بالکل علٰحدگی اختیار کر لیتی ہے، تو وہ اس کے مخالف ہو جاتے ہین، اور عشق کو ہر جگہ ترجیح دیتے ہین، لیکن اس ترجیح کے وجوہ سے پہلے عشق کی حقیقت اور ماہیت پر غور کر لینا چاہئے،

عشق اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن، حدیث اور شعرائے جاہلیت کے کلام مین یہ لفظ نہین آیا ہے، متاخرین شعرائے عرب نے بھی اس لفظ کا بہت کم استعمال کیا ہے، اور عشق کی وہ اہم خصوصیات جو فارسی شاعری مین نظر آتی ہین، اُن کا تو عربی شعرا کے کلام مین وجود ہی نہین ہے، اس لئے ہم کو تاریخی حیثیت سے یہ پتہ لگانا چاہئے، کہ فارسی شاعری نے عشق کو اس قدر اہمیت کیون دی ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ سب سے پہلے عشق اور عشق کی تمام خصوصیات کو فلسفۂ اشراق نے نمایان کیا اور ان کو نہایت اہمیت دی، اشراقیون کے نزدیک نظام عالم قہر و مہر کی بنیاد پر قائم ہے، شیخ الاشراق حکمۃ الاشراق مین لکھتے ہین کہ ہر بلند نور کو نیچے کے نور پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے، اور نیچے کا نور بلند نور سے محبت رکھتا ہے، اور اسی قہر و مہر سے نظام عالم کا وجود وابستہ ہے، اور جب بہت سے انوار جمع ہو جاتے ہین، تو بلند نور نیچے کے نور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے، اور نیچے کے نور کو بلند نور کا شوق اور عشق ہو جاتا ہے، اس لئے نور الانوار (یعنی خدا) کو اپنے ماسوا تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہے، اور وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا عشق نہین کرتا، کیونکہ کوئی چیز دوسرے پر اس لئے عاشق ہوتی ہے کہ وہ اس سے زیادہ مکمل ہوتی ہے، بلکہ اس کی نسبت سے اس مین کوئی کمال ہی نہین ہوتا، البتہ وہ اپنے اوپر عاشق ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور مکمل ہے، اور اس کو خود اپنا کمال نظر آتا ہے، اس لئے وہ عاشق بھی ہے، اور معشوق بھی ہے، اور چونکہ خدا سے زیادہ کوئی چیز حسین و مکمل نہین، اس لئے اور کسی چیز کو بھی دوسری چیز کے عشق مین وہ لطف نہین حاصل ہوتا، جو عشق الٰہی مین ہوتا ہے، اس لئے نظام عالم کا وجود قہر و مہر سے قائم ہے، اور انوار مجردہ کی جس قدر کثرت ہوتی ہے، اور جس قدر ان مین علت و معلول کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر نظام عالم مکمل ہوتا ہے، اور کل عالم مل کر ایک عالم بن جاتے ہین[۱]

مختلف حکما نے عشق و محبت پر جو بحثین کی ہین، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ایک فلسفیانہ چیز ہے سب سے زیادہ مفصل اور عام فہم مضمون اس پر رسائل اخوان الصفا نے لکھا ہے، جو زیادہ تر فلسفۂ اشراق کی طرف مائل ہین، انھون نے عشق کی ماہیت پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اور اس مین عشق و محبت کے متعلق تمام نظریات جمع کر دیئے ہین، جن مین ایک نظریہ یہ ہے، کہ

ا۔ عشق نام ہے معشوق کے ساتھ متحد ہونے کے سخت شوق کا، اس لئے عاشق کو ایک حالت پر قناعت نہین ہوتی، بلکہ وہ اس سے ترقی کرنا چاہتا ہے، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ مین معشوق کو

---

۱ ملخص از شرح حکمۃ الاشراق ص ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۴۱،

گلے لگاتا ہون، تب بھی دل اس کا مشتاق رہتا ہے، کیا گلے لگانے سے بھی زیادہ معشوق کی قربت کا کوئی درجہ ہے، مین اس کے منہ کا بوسہ لیتا ہون تاکہ میرا عشق زائل ہو جائے، لیکن اس سے تو میرا شوق اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، غالباً میرے دل کی پیاس بجز اس کے نہین بجھ سکتی، کہ عاشق و معشوق کی دونون روحین باہم مل جائین،

اس نظریہ کو نقل کرکے ارباب رسائل اخوان الصفا، لکھتے ہین، کہ

"عشق کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، ان مین سب سے زیادہ راجح اور سب سے زیادہ لطیف یہی نظریہ ہے"

اس کے بعد انھون نے اس کی تفصیلی شرح کی ہے، اور لکھا ہے کہ جو حکما، اس نظریہ کے قائل ہین ان کا مطلب یہ ہے کہ اتحاد صرف روحانی امور کا خاصہ ہے، کیونکہ جسمانی چیزون مین اتحاد نہین ہو سکتا، بلکہ وہ صرف ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہین، باہم مل جاتی ہین، اور ایک جسم دوسرے جسم کو چھو جاتا ہے، اتحاد صرف روحانی چیزون مین ہوتا ہے،

اشراقی فلسفیون کا یہی عشق ہے، جس کو ہمارے صوفیون نے لیا ہے، اور وہ تصوف کی راہ سے صوفیانہ شاعری مین آیا ہے، فارسی شاعری اگرچہ مختلف حیثیتون سے عربی شاعری سے متاثر ہے، لیکن وہ عشق و محبت کے مضمون مین عربی شاعری سے بالکل متاثر نہین، کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین، شعرائے جاہلیت کے کلام مین عشق کا لفظ کہین نہین آیا ہے، اور اگر کہین آیا بھی ہو تو عشق کے وہ اسرار و رموز جس کی نسبت ارباب رسائل اخوان الصفا لکھتے ہین، کہ "وہ بیکار اوباشون کا مشغلہ نہین ہے، جیسا کہ وہ لوگ خیال کرتے ہین جن کو امور خفیہ اور اسرار لطیفہ سے واقفیت نہین ہے بلکہ صرف ان امور سے واقف ہین جو حواس ظاہرہ کے سامنے علانیہ نمایان ہوتے ہین" عربی شاعری مین مطلق نہین پائے جاتے، بلکہ وہ صرف فارسی شاعری کے ساتھ مخصوص ہین، قرآن و حدیث مین بھی عشق کا لفظ نہین آیا ہے، اس لئے یہ لفظ فلسفۂ اشراق کے ذریعہ سے تصوف مین آیا، اور اس عشق کے ذریعہ سے جو صوفیانہ نظریات قائم ہوئے، فارسی شاعری نے نہایت لطیف انداز مین اُن کی تشریح کی،

۱- ان مین پہلا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی بنیاد عشق و محبت پر قائم ہے، کیونکہ دنیا مین علت و معلول

کا سلسلہ قائم ہے، اور ہر معلول اپنی علت سے عشق و محبت رکھتا ہے، اور علت کو اس پر غلبہ واقتدار حاصل ہوتا ہے، لیکن چونکہ ایک ہی چیز دو حیثیتوں سے علت و معلول دونوں ہوتی ہے، اس لئے ہر چیز میں قہر و مہر دونوں پائے جاتے ہیں، البتہ بعض میں قہر اور بعض میں مہر زیادہ ہوتا ہے،

عشق و محبت کے اسی عالمگیر نظریہ کو مولانا روم نے اس طرح بیان کیا ہے،

جملہ اجزاے جہان زان حکم پیش — جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ — راست ہمچو کہربا و برگ کاہ
آسمان گوید زمین را مرحبا — با توام چو آہن و آہن ربا
میل ہر جزوے بہ جزوے می نہد — زاتحاد ہر دو تولیدے جہد
ہر یکے خواہان دگر را ہمچو خویش — از پئے تکمیل فعل کار خویش
دور گردونہا ز موج عشق دان — گر نبودے عشق بفسردے جہان
کے جمادی محو گشتے در نبات — کے فداے روح گشتے نامیات
ہر یکے بر جا فسردے ہمچو یخ — کے بدے پران و جویان چون ملخ

وحشی یزدی اسی عشق کی تعبیر میل سے کرتا ہے :۔

یکے میل است با ہر ذرہ رقاص — کشان ہر ذرہ را تا مقصد خاص
اگر پوئی ز اسفل تا بہ عالی — نہ بینی ذرۂ زین میل خالی
ز آتش تا بہ باد و آب تا خاک — نہ زیر ماہ تا بالاے افلاک
ہمین میل است اگر دانی ہمی میل — جنیبت در جنیبت خیل در خیل
سر این رشتہاے پیچ در پیچ — ہمین میل است باقی ہیچ در ہیچ
ہمین میل است کآہن را درآخت — کہ خود را بر در و بر آہن ربا دوخت

ہمیں میل آمد و ناگاہ پیوست کہ محکم کاہ را بر کہربا بست
بہ ہر طبعے نہادہ آرزوئے یگ و پو دادہ ہر یک را بسوئے
غرض کین میل چو گردد قوی پے شود عشق و در آید در رگ وپے

شعرائے ایران نے عشق کے اسی عالمگیر نقطۂ نظر سے کائنات کو دیکھا تو جن چیزون مین عشق و محبت کی کشش زیادہ نظر آئی، ان کو باہم عاشق و معشوق بنا دیا، ذرہ وآفتاب، کاہ و کہربا، کبک وآتش، سرو قمری، گل وبلبل، پروانہ وشمع، نیلوفر وآفتاب، ماہ کتان سب کے سب باہم عاشق و معشوق ہین، دوسرے ممالک کی شاعری مین ایک آدھ چیز کو عاشق مانتے ہین لیکن فارسی شاعری نے تمام کائنات کو عاشق ومعشوق بنا دیا، مولانا شبلی نے شعر العجم مین لکھا ہے، کہ یہ اوس عالمگیر حسن کا اثر تھا، جو ایران مین جمع ہو گیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک یہ فلسفۂ اشراق کا اثر ہے، جس نے عشق کا عالمگیر کائناتی نظریہ قائم کیا،

۲- علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے، اور علت مین قہر اور معلول مین مہر کا جذبہ پایا جاتا ہے، زمین اور زمین کی پیداوار پر سب سے زیادہ اثر آسمان کا پڑتا ہے، اس لئے آسمان اس کی علت اور زمین معلول ہے، اور اسی نسبت سے آسمان مین قہر اور زمین مین مہر کا جذبہ زیادہ موجود ہے، ایرانی شعراء آسمان کی جفا کاری اور بے مہری کی جو شکایت کرتے ہین، وہ اسی اشراقی فلسفہ کا اثر ہے، جو علت کو علت قاہرہ قرار دیتا ہے،

۳- علت مین قدرت، غلبہ، اقتدار اور عز و شرف پایا جاتا ہے، اور اسی نسبت سے معلول مین عجز، اطاعت اور ذلت و مسکنت پائی جاتی ہے، اور چونکہ علت معشوق اور معلول عاشق ہوتا ہے، اس لئے معشوق زیادہ معزز، صاحب اقتدار، اور بلند رتبہ ہوتا ہے، اس کے برعکس عاشق مین عجز، فروتنی اور پستی پائی جاتی ہے، اس لئے ایرانی شاعری سے زیادہ کسی شاعری نے عاشق کو ذلیل نہین کیا، خواجہ حافظ فرماتے ہین :-

شنیدہ ام کہ سگان را قلادہ می بندی
چرا بہ گردنِ حافظ نمی نہی رسنے

اور یہ اسی فلسفۂ اشراق کے نظریۂ عشق کا اثر ہے، ورنہ عرب مین عاشق اس قدر ذلیل وخوار نہین ہوتا،

(۴) عشق اتحاد چاہتا ہے، عاشق جب تک معشوق سے متحد نہ ہو جائے، اوس کو اور کسی چیز سے تسکین نہین ہوتی، عشق کے اس نظریہ نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ پیدا کیا، اور صوفیون نے خدا کی ذات کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا چاہا، لیکن جسم کا اتحاد جسم سے نہین ہوتا، بلکہ روح کا اتحاد روح سے ہوتا ہے، اور خدا چونکہ ہمہ تن روح ہے، اس لئے اس سے اتحاد پیدا کرنے کے لئے جسم کو فنا کرنا چاہئے، صوفیون کے ریاضت ومجاہدہ اور فارسی شاعری مین جسمانی ضعف کے مضامین کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے،

(۵) خدا خود اپنی ذات پر عاشق ہے، اس لئے وہ عاشق بھی ہے، اور معشوق بھی، اوس سے زیادہ کوئی چیز حسین وجمیل نہین، اس لئے وہ کسی دوسری چیز پر عاشق نہین ہو سکتا، البتہ اس مین اپنے حسن کی جلوہ گری کا تماشا دیکھ سکتا ہے، اور اسی غرض سے اس نے دنیا کو پیدا کیا ہے، مرزا غالب اسی تخیل کو اس طرح بیان کرتے ہین،

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہین
ہم کہان ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین

(۶) حسن وجمال اور تمام محاسن وفضائل کا منبع خدا کی ذات ہے، اسی کے فیض کا پرتو درجہ بدرجہ تمام کائنات پر پڑتا ہے، اور دنیا اوس سے روشن ہو جاتی ہے، اس لئے تمام اشیاء مین جو حسن نظر آتا ہے، وہ عارضی اور مستعار ہے، اگر آفتاب کے پرتو سے دیوار روشن ہو جائے، تو دیوار دراصل روشن نہین، بلکہ اصل مین آفتاب روشن ہے، دیوار پر صرف اس کا پرتو پڑ گیا ہے،

گر شود پر نور روزن یا سرا   تو مدان روشن مگر خورشید را
ور در و دیوار گوید روشنم   پرتو غیرے ندارم این منم
پس بگوید آفتاب اے نارشید   چونکہ من غائب شوم آید پدید

اسی بنا پر اشراقی حکما، خدا کو معشوق اول مانتے تھے، اور صوفیہ نے اسی نظریہ کی بنا پر خدا کو معشوق حقیقی قرار دیا،

چھٹی صدی ہجری تک عشق و محبت کا یہی اشراقی نظریہ صوفیانہ شاعری کا راس المال رہا لیکن اب تک عقل سے اس کا حریفانہ مقابلہ نہیں ہوا تھا، لیکن چھٹی صدی ہجری مین تصوف اور فلسفہ دونون نے غیر معمولی ترقی حاصل کی، تاتاریون کا ہنگامہ اسی زمانے مین شروع ہوا جس نے تمام دنیاے اسلام کو زیر و زبر کر دیا، اور دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی جو تصوف کا سنگِ بنیاد ہے، سب کو علانیہ نظر آ گئی، اس حالت مین لوگون کو خدا سے زیادہ لو لگی، اور نہایت کثرت سے صوفی شعرا پیدا ہو گئے، جن مین مولانا روم، سعدی، اوحدی اور عراقی زیادہ مشہور ہین، لیکن یہی زمانہ عقلی ترقی کا بھی ہے، عقلی علوم و فنون کی ابتدا اگرچہ عباسیون کے دور حکومت سے ہوئی لیکن مسلمانون مین اُن کی عام اشاعت اور مقبولیت امام غزالی اور امام رازی کے زمانہ سے ہوئی، اور ان دونون بزرگون نے فلسفہ اور علم کلام کا صور اس بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا، کہ بچہ بچہ کے کان مین یہ آواز پہونچ گئی، فارابی اور بو علی سینا نے جو فلسفیانہ کتابین لکھی تھین، وہ نہایت مبہم، پیچیدہ اور مغلق تھین لیکن امام غزالی، بالخصوص امام رازی نے فلسفہ کو اس قدر آسان کر دیا کہ وہ بازیچۂ اطفال بن گیا، اس لئے اس زمانہ مین قدرتی طور پر عشق و عقل کا حریفانہ مقابلہ ہوا، اور دونون کے راستے الگ الگ ہو گئے، فلسفہ اور علم کلام عقلی استدلال کے ذریعہ سے خدا رسی کی راہ دکھاتے تھے، اور تصوف عشق و محبت کے راستے سے اس منزل کو طے کرنا چاہتا تھا، مولانا روم فلسفہ اور تصوف دونون کے اسرار و رموز سے واقف تھے، اس لئے ان کو معلوم ہو گیا کہ فلسفیانہ اور متکلمانہ عقل خدا تک نہین پہنچا سکتی، اس کا ذریعہ صرف عشق و محبت ہی ہے، جو تصوف کا مایۂ خمیر ہے، اس لئے سب سے پہلے انھون نے عقل کے خلاف آواز بلند کی، اور چونکہ امام رازی نے اسی زمانہ مین عقل و حکمت کا صور پھونکا تھا، اس لئے تخصیص کے ساتھ ان کا نام لے کر فرمایا،

پاے استدلالیان چوبین بود پاے چوبین سخت بے تمکین بود

گر باستدلال کار دین بدے فخر رازی رازدار دین بدے

اس حریفانہ مقابلہ سے عشق جو پہلے ہمہ تن عجز و نیاز اور سوز و گداز تھا، وہ ایک جوش و ولولہ بن گیا،

اطبا اس کو ایک نفسانی مرض سمجھتے تھے لیکن مولانا روم نے اوس کو طبیب کا خطاب دیا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہاے ما

اے علاج نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور اب عقل و عشق باہم دو حریف مقابل قرار پائے،

در مذہب عاشقان قرار دگر است وین بادۂ ناب را خماری دگر است

ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم کار دگر است و عشق کاری دگر است

یہ زمانہ مولانا روم کے زمانہ سے بھی زیادہ سخت ہے، اوس زمانے مین عقل و عشق دونون زندہ تھے،

اس لئے عشق عقل کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن اس دور مین صرف عقل زندہ ہو اور عشق بالکل مردہ ہو چکا ہے،

ٹرانہ مان ندا آزما کے دیکھ اُسے فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

جوانان را بد آموزست این عصر شب ابلیس را روز است این عصر

بدامانش مثال شعلہ پیچم کہ بے نور است و بے سوز است این عصر

اس لئے عشق کو عقل کے مقابلہ مین حریفانہ حیثیت سے کھڑا کر کے جو کام اس دور فتن مین مولینا

روم نے کیا تھا، اوس سے زیادہ اہم کام اس دور فتن مین ڈاکٹر صاحب نے کیا،

چو رومی در حرم دادم اذان من ازو آموختم اسرار جان من

بہ دور فتنۂ عصر کہن او بہ دور فتنۂ عصر روان من

اور عشق کے مقابلہ مین مختلف حیثیتون سے عقل کو شکست دی،

(باقی)

وادی ایمن

یعنی کلام حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرت مجذوب سے پہلا تعارف | تقریباً دس بارہ سال ہوئے راقم الحروف کسی ضرورت سے لکھنؤ گیا تھا، ایک دن مخدومی قطب میاں صاحب سے ملنے کے لئے فرنگی محل جانا ہوا، اس وقت ان کے پاس ایک فرشتہ صورت اور مجذوب صفت بزرگ بڑے والہانہ انداز سے، زمزمہ سنجی میں معروف تھے، ان کی وارستہ مزاجی اور ظاہری وضع و قطع سے نہ جاننے والا ان کی حیثیت اور مرتبہ کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا، میں بھی سمجھا کہ فرنگی محل کے عقیدتمند خواجگان میں سے کوئی صاحب ہوں گے، لیکن دو ہی چار شعر سنے تھے، کہ کلام کی خوبی نے اپنی جانب متوجہ کر لیا، اور یہ تاثر برابر بڑھتا گیا، تا آنکہ ختم مجلس کے وقت دل کلام کی تاثیر سے مسحور اور زبان اس کے اعتراف پر مجبور تھی، یہ شاعر حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب انسپکٹر مدارس خلیفۂ مجاز حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تھے، جس کا تعارف سے پہلے قیاس بھی نہ ہو سکتا تھا،

لیکن اس مختصر صحبت سے ذوق کو تسکین نہ ہوئی، بلکہ آتش شوق اور بھڑک اٹھی، اتفاق سے اسی دن شب کو کسی تقریب کے سلسلہ میں قطب میاں کی جانب سے دعوت تھی، موصوف نے مجھے بھی مدعو کیا، اس دعوت میں خواجہ صاحب اور دوسرے عمائد شہر بھی شریک تھے، کھانے سے فراغت کے بعد مجلس میں خواجہ صاحب کا جام گردش میں آیا، اور نو دس بجے شب سے صبح صادق تک برابر موصوف کی شعر خوانی

کا سلسلہ جاری رہا گویا

ملا ساقی جو دریا دل بلا نوشوں کی بن آئی
اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگام سحر رکھا

خود خواجہ صاحب کی زبان مین کلام کی تاثیر کا یہ حال تھا،

جان رگ رگ سے کھچی آتی ہو کانون کی طرف
کس قیامت کی کشش اُف تری آواز مین ہے

سامعین کی پوری رات آنکھوں مین کٹ گئی تھی، لیکن ہر شخص ہمہ تن گوش تھا، اور سب کی زبانِ حال گویا تھی،

جی اُٹھے مردے تری آواز سے
پھر ذرا مطرب اسی انداز سے

خواجہ صاحب کے جذب و وارفتگی کا یہ حال تھا کہ پڑھتے پڑھتے بیخودی مین اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور نیم رقص کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، اور اُن کی زبان بول رہی تھی،

یہ نغمۂ دلکش مرا بے ساز نہین ہو
وہ بول رہے ہین مری آواز نہین ہو

اس واقعہ کو برسون گذر گئے مگر وہ سمان اب تک نگاہون مین ہے، جب تہجد کے سہانے وقت خواجہ صاحب بڑے جوش اور مستی مین یہ مصرع

اندھیرے مین لوٹین گے جوبن کسی کا

پڑھتے جاتے تھے، اور بڑی ترتیل اور خوش الحانی کے ساتھ "فتھجد بہ نافلۃ لک" کی آیۂ پاک کا منظر اس طرح لگاتے تھے، کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مصرع اسی وقت کے لئے کہا گیا تھا، اور اس آیت پاک کی تفسیر یہی ہے، اس تفسیر نے اس عامیانہ مصرع کو کہان سے کہان پہنچا دیا،

اس وقت سے راقم کو خواجہ صاحب کے کلام کے ساتھ ایک خاص شغف اور ذوق پیدا ہو گیا، اس واقعہ کے چند برسون کے بعد شیوخ دار المصنفین حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے، اس تعلق سے خواجہ صاحب کئی مرتبہ دار المصنفین تشریف لائے، اور یہ دولت گھر بیٹھے مل گئی لیکن ع:-

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

افسوس کہ یہ دولت بہت جلد چھن گئی، اور دارالمصنفین کی آخری آمد کے چند ہی مہینوں کے بعد اگست ۱۹۴۴ء میں یہ مجذوب حق، واصل بحق ہو گیا،

خواجہ صاحب کے کلام کی خصوصیات

آج کل سب سے زیادہ ارزان جنس شاعری ہے، گلی گلی کوچہ کوچہ میں شاعری کا بازار گرم ہے لیکن حقیقی شاعری اب بھی نادر و نایاب ہے، عام شعراء کا ذکر نہیں، ان شعراء میں بھی جن کا شمار مشاہیر میں ہے، کتنے واقعی شاعر کہلانے کے مستحق ہیں، پھر ان تلامیذ الرحمٰن کا کیا ذکر ہے، جن کی شاعری ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا کی مصداق ہو،

کسی زمانہ میں بھی شعراء کی کمی نہیں رہی، ہر دور میں بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہوتے رہے، لیکن جن کے کلام میں طور کی تجلی اور وادی ایمن کے شرارے ہوں وہ ہمیشہ نادر و نایاب کے حکم میں رہے،

فارسی شاعری کے دفتر بے پایاں میں جس سے عارفانہ شاعری پیدا ہوئی، صرف عطار، سنائی، شمس تبریز، مولانا روم، ابو سعید ابو الخیر، اوحدی کرمانی، عراقی، خسرو، یا اور اس قبیل کے دو چار شعراء اس حریم قدس کے محرم تھے، جن کے کلام میں آتش عشق کے شرارے اور شراب محبت کی مستی ہے، اردو میں اصحاب دل شعراء کی تعداد اور بھی کم اور انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے،

درحقیقت یہ صوت سرمدی موہبت الٰہی اور انہی سوختہ سامانوں کا حصہ ہے، جن کے سینے عشق حقیقی کی آگ سے سوزاں اور جن کے دل بادۂ معرفت سے لبریز ہیں، یہ دولت عموماً صوفیائے کرام کا حصہ رہی ہے، خصوصاً خواجگان چشت میں اس شراب کی مستی زیادہ رہی ہے، حضرت مجذوب بھی اسی میکدہ کے بادہ خوار تھے، اور ان کی طبیعت کو ذوق و مستی سے زیادہ مناسبت تھی، اس لئے ان پر اس کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا، مگر اس سلسلۃ الذہب کے بزرگوں کی طرح اس مستی میں بھی ان کا قدم شریعت و تقوی کے جادۂ مستقیم سے کبھی نہیں ہٹا،

درکفے جام شریعت درکفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

خواجہ صاحب فطری شاعر تھے، اُن کے سینہ سے شاعری کا چشمہ اُبلتا تھا، کہنے پر آتے تھے، تو بے تکان کہتے چلے جاتے تھے، قافیے پناہ مانگ جاتے تھے، لیکن اُن کی طبیعت کی روانی نہ رکتی تھی، جس پر ان کی طویل غزلین شاہد ہین، اس فطرتِ شعری مین ذوق و مستی کی آمیزش نے اس شراب کو اور دو آتشہ تیز کر دیا تھا، فنی حیثیت سے بھی وہ کامل الفن شاعر تھے، معنوی محاسن سے قطع نظر ان کا کلام ظاہری خوبیون سے بھی آراستہ اور فنی حیثیت سے استادانہ ہے، جس کی تفصیل آیندہ آئے گی، اُن کے کلام مین بڑی نیرنگی اور جامعیت ہے، ایک طرف اس مین سنائی اور عطار کی حکمت، شمس تبریز کی گرمی، مولانا روم کا جوش و خروش، اور خسرو کی مستی ہے، دوسری طرف میر کے نشتر اور غالب کے فلسفہ سے لیکر داغ و امیر کی معاملہ بندی، بلکہ ناسخ اور امانت کے ضلع جگت تک کے نمونے موجود ہین جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے،

لیکن یہ ان کا اصل رنگ نہین، عمومیتِ فیض ہمیشہ سے صوفیائے کرام کا حصہ رہا ہے، اس لئے خواجہ صاحب نے بھی عوام کو محروم رکھنا مناسب نہ سمجھا، اور اُن کی دلچسپی اور تفریحِ طبع کے لئے اپنے کلام مین کچھ رنگین چھینٹے بھی دیدیئے ہین، کہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان کے کلام سے لطف اندوز ہو سکین، خود فرماتے ہین،

ادھر ہین رند مستی مین اُدھر ہین وجد مین صوفی
مزے ہر رنگ والے کو مرے اشعار مین آئے

اُن کا اصل رنگ جس مین وہ اپنے دور مین بالکل منفرد اور تنہا تھے، عشق حقیقی کی واردات اور راہ سلوک کے احوال و کوائف کی ترجمانی ہے، اُن کے کلام کا یہی حصہ ان کی شاعری کی اصل روح اور خود شاعر کی زبان مین حقائق و معارف کا الہام ہے،

یہ حقائق یہ معانی یہ روانی یہ اثر شاعری تیری ہوائے مجذوب یا الہام ہے

ان حقائق و معانی و الہام کی کیفیتین اتنی گوناگون نازک اور لطیف ہین، کہ شرح و بیان کی متحمل

نہیں ہو سکتیں، اور خواجہ صاحب نے اُن کو جن جن پیرایوں میں بیان کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں مل سکتی، خواجہ حافظ کی طرح اُن کے خیالات کا دائرہ بھی محدود ہے لیکن بیان کے تنوع اور نیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے،

یہی ہے رنگ اگر مجذوب کی مستانہ غزلوں کا عجب کیا ہند کا وہ حافظ شیراز ہو جائے

میری عرصہ سے تمنا تھی کہ جس پایہ کا یہ کلام ہے، اسی درجہ کے کوئی بزرگ اس پر قلم اٹھاتے لیکن جب کہیں سے کوئی صدا نہ اٹھی، تو اپنی نااہلی کے باوجود خود راقم کو اس سعادت کے حصول کا حوصلہ پیدا ہوا، مگر اس کے لئے خواجہ صاحب کے پورے کلام یا کم از کم اس کے معتد بہ حصہ کے مطالعہ کی ضرورت تھی جس کی بظاہر کوئی اُمید نہ تھی، ایک دو مرتبہ اس کی کوشش بھی کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اور یہ حسرت دل ہی میں رہ جانے کو تھی، کہ طلب صادق کی کارفرمائی نے خود اس کا سامان پیدا کر دیا،

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خواجہ تاش بزرگوں کو ان کے کلام کی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، انھوں نے یہ کام مولانا مسعود علی صاحب مدظلہ کے متعلق کیا، انھوں نے یہ بار امانت میرے حوالہ کیا، اس طرح ہے ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اور راقم کو ایک دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع ملا،

خواجہ صاحب کی صورت سرمدی پر مجھ جیسے نااہل اور ناآشنا سے ذوق کا قلم اٹھانا بڑی جسارت ہے لیکن اس حسن نیت کی بنا پر قابل معافی ہے کہ اگر باطنی دولت سے محرومی ہے، تو کم از کم اس کے مداحوں ہی کے زمرہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے، ع

بلبل، ہمین کہ قافیۂ گل شود بس است

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، خواجہ صاحب کے کلام کے دو حصے یا دو رُخ ہیں، ایک خالص مادی شاعری، دوسرا قلبی کیفیات و باطنی واردات، پہلے حصہ پر نقد و تبصرہ آسان ہے، لیکن دوسرے کا تجزیہ بہت مشکل ہے کہ

پھول کی بو اور شراب کے نشہ کو الفاظ مین نہین دکھایا جاسکتا، اور آفتاب کی کرنون اور نور کی تجلیون کو مٹھی مین بند نہین کیا جاسکتا، اس کا ادراک صرف حواس ہی کر سکتے ہین، تجزیہ سے اس کی ساری خوبی اور لطافت غارت ہو جاتی ہے، اس کا شارح صرف ذوقِ سلیم ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، راقم ان اسرار کا محرم نہین، اس لئے اگر کسی شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اس کی تشریح مین لغزش ہو جائے تو اس کو راقم کی نارسائی پر محمول کیا جائے، اس اعتراف کے بعد کلام مجذوب کے متعلق کچھ قلبی تاثرات پیش کئے جاتے ہین،

بادۂ معرفت دوسرے اکابر اہلِ دل شعراء کی طرح خواجہ صاحب نے بھی باطنی کوائف اور راہِ سلوک و معرفت کے حالات و مقامات کی تعبیر کے لئے بیشتر شراب اور اس کے لوازم کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، گو ان کی تعبیرین اسی پیمانہ تک محدود نہین ہین، بلکہ ان کے خیالات کی طرح اُن کے طریقۂ تعبیر مین بھی نیرنگی ہے، لیکن اس سرمست بادۂ وحدت کی واردات کی ابتدا اسی بادہ سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے خواجہ صاحب کے کلام کی اصلی روح کا بھی اندازہ ہو جائے گا،

عموماً اس طریقۂ تعبیر مین مجاز کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے، کہ حقیقت و مجاز مین امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن خواجہ صاحب کے یہان یہ پردہ اتنا ہلکا اور لطیف ہے، کہ حُسن حقیقت کا چہرہ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، اور اکثر مقامات پر خود کلام بول اٹھتا ہے، کہ وہ دوسرے عالم کی آواز ہے،

حضرت مجذوبؒ کو اپنے مرشد برحق سے والہانہ شیفتگی تھی، اور انھین فنا فی الشیخ کا مرتبہ حاصل تھا، شیخ کی بارگاہ مین بھی اُن کو بڑی مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی، جس کے اشارے کہین کہین ان کے کلام مین بھی پائے جاتے ہین، مثلاً

مجذوب کو تو لائے وہ ہمراہ بزم مین
اور سالکون کو دور سے رستے بتا دیئے

نہیں ہو سکتیں اور خواجہ صاحب نے اُن کو جن جن پیرایوں میں بیان کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں مل سکتی، خواجہ حافظ کی طرح اُن کے خیالات کا دائرہ بھی محدود ہے، لیکن بیان کے تنوع اور نیرنگی سے ایک عالم نظر آتا ہے۔

یہی ہے رنگ اگر مجذوب کی مستانہ غزلوں کا عجب کیا ہند کا وہ حافظ شیراز ہو جائے

میری عرصہ سے تمنا تھی کہ جس پایہ کا یہ کلام ہے، اسی درجہ کے کوئی بزرگ اس پر قلم اٹھاتے لیکن جب کہیں سے کوئی صدا نہ اٹھی، تو اپنی نا اہلی کے باوجود خود راقم کو اس سعادت کے حصول کا حوصلہ پیدا ہوا، مگر اس کے لئے خواجہ صاحب کے پورے کلام یا کم ازکم اس کے معتدبہ حصہ کے مطالعہ کی ضرورت تھی جس کی بظاہر کوئی اُمید نہ تھی، ایک دو مرتبہ اس کی کوشش بھی کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اور یہ حسرت دل ہی میں رہ جانے کو تھی، کہ طلب صادق کی کارفرمائی نے خود اس کا سامان پیدا کر دیا،

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خواجہ تاش بزرگوں کو ان کے کلام کی ترتیب و اشاعت کا خیال پیدا ہوا، انھوں نے یہ کام مولانا مسعود علی صاحب مدظلہ کے متعلق کیا، انھوں نے یہ بار امانت میرے حوالہ کیا، اس طرح :- ع

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اور راقم کو ایک دیرینہ تمنا پوری کرنے کا موقع ملا،

خواجہ صاحب کی صوت سرمدی پر مجھ جیسے نااہل اور ناآشنائے ذوق کا قلم اٹھانا بڑی جسارت ہے لیکن اس حُسن نیت کی بنا پر قابلِ معافی ہو کہ اگر باطنی دولت سے محرومی ہے، تو کم ازکم اس کے مداحوں ہی کے زمرہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے، ع

بلبل ہمین کہ قافیۂ گل شود بس است

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، خواجہ صاحب کے کلام کے دو حصے یا دو رُخ ہیں، ایک خالص مادی شاعری، دوسرا قلبی کیفیات و باطنی واردات، پہلے حصہ پر نقد و تبصرہ آسان ہے لیکن دوسرے کا تجزیہ بہت مشکل ہو کہ

پھول کی بو اور شراب کے نشہ کو الفاظ مین نہین دکھایا جاسکتا، اور آفتاب کی کرنون اور نور کی تجلیون کو مٹھی مین بند نہین کیا جاسکتا، اس کا ادراک صرف حواس ہی کر سکتے ہین، تجزیہ سے اس کی ساری خوبی اور لطافت غارت ہو جاتی ہے، اس کا شارح صرف ذوق سلیم ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، راقم ان اسرار کا محرم نہین، اس لئے اگر کسی شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے اور اس کی تشریح مین لغزش ہو جائے تو اس کو راقم کی نارسائی پر محمول کیا جائے، اس اعتراف کے بعد کلام مجذوب کے متعلق کچھ قلبی تاثرات پیش کئے جاتے ہین،

بادۂ معرفت دوسرے اکابر اہل دل شعرا کی طرح خواجہ صاحب نے بھی باطنی کوائف اور راہِ سلوک و معرفت کے حالات و مقامات کی تعبیر کے لئے بیشتر شراب اور اس کے لوازم کا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے، گو ان کی تعبیرین اسی پیمانہ تک محدود نہین ہین، بلکہ ان کے خیالات کی طرح اُن کے طریقۂ تعبیر مین بھی نیرنگی ہے، لیکن اس سرمست بادۂ وحدت کی واردات کی ابتدا اسی بادہ سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے خواجہ صاحب کے کلام کی اصلی روح کا بھی اندازہ ہو جائے گا،

عموماً اس طریقۂ تعبیر مین مجاز کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے، کہ حقیقت و مجاز مین امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن خواجہ صاحب کے بیان یہ پردہ اتنا ہلکا اور لطیف ہے، کہ حُسن حقیقت کا چہرہ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، اور اکثر مقامات پر خود کلام بول اٹھتا ہے، کہ وہ دوسرے عالم کی آواز ہے،

حضرت مجذوبؒ کو اپنے مرشد برحق سے والہانہ شیفتگی تھی، اور انھین فنا فی الشیخ کا مرتبہ حاصل تھا، شیخ کی بارگاہ مین بھی اُن کو بڑی مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی، جس کے اشارے کہین کہین ان کے کلام مین بھی پائے جاتے ہین، مثلاً

مجذوب کو تو لائے وہ ہمراہ بزم مین
اور سالکون کو دور سے رستے بتا دیئے

حضرت نظام الدین اولیا، قدس سرہ اور حضرت امیر خسرو کے ربط و تعلق کے جو واقعات سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں، اس کی زندہ مثال حضرت مجذوب اور ان کے مرشد کے تعلق میں نظر آتی تھی، حضرت مجذوب شیخ کی شراب عشق میں سراپا مخمور تھے، اور ان کا ہر موے بدن شیخ کی ثنا و صفت کا ایک شعر تھا جس پر ان کا کلام شاہد ہے،

ترے محبوب کی یا رب شباہت لیکے آیا ہوں حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لیکے آیا ہوں
جو اشرف تھا زمانہ میں جو اشرف ہو زمانہ میں میں ایسے تیرے اشرف کی عقیدت لیکے آیا ہوں

اسی لئے ان کے قریب قریب کل اشعار میں ساقی و پیر میخانہ سے مراد شیخ طریقت ہیں بعض بعض اشعار میں یہ کنایہ تصریح کی حد تک پہنچ جاتا ہے،

چڑھی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو جوان آج پیر مغان ہو رہا ہے
دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں بڑھاپے میں بھی جان جان ہو رہا ہے

حوض کوثر موجزن پیر مغان کے دل میں ہے کس میں ہے وہ بات جو اس مرشد کامل میں ہے

ہزار راحت ہزار رحمت مگر نہیں دم زدن کی جرأت یہ سادگی میں بھی رعب ہیبت اسی جلالت مآب میں ہے

یہیں سے پاؤں لگا ہر نعمت دنیا و دیں ساقی کہیں کیوں ن جاؤں میں مرے میکدہ میں کیا نہیں ساقی

ملوں گا میں نہ ہرگز لاکھ ہو تو خشمگیں ساقی کہ جو سب سے بہتر ہو وہ ملتی ہو یہیں ساقی

شرابیں سیکڑوں ساقی ہزاروں بادہ کش لاکھوں میں ان کا مست ہوں آنکھوں سے جو مخمور کرتے ہیں

مجذوب ہی کا خانہ دل کیا کہ آپ نے گھر ایسے ایسے کتنے نہ جانے سجا دیئے

اس قسم کے بہ کثرت اشعار ہیں جن سے حضرت مجذوب کے ساقی و مے و میخانہ کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

مرے جام و مینا نہیں جام و مینا یہ ہے قلب روشن وہ ہے چشم بینا

ان کے میخانہ کے شیوخ کا سلسلہ اس رحمۃ للعالمینؐ پر منتہی ہوتا ہے جس کے فیض سے سارا عالم سیراب ہے،

نہ چھیڑ اے محتسب میں ہوں تو وحدت کا متوالا میں وہ میخوار ہوں جس کے ہیں ختم المرسلیںؐ ساقی

کہوں کیونکر نہ تجھکو رحمۃ للعالمین ساقی کہ تیرے فیض سے سیراب ہے روئے زمیں ساقی

اس شراب کی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد اب اس کے اثرات اور مختلف کوائف ملاحظہ ہوں،

اس کے بادہ خواروں کے دل خوف و خشیت سے لبریز ہوتے ہیں،

بہت پاتا ہوں میں رندوں میں خوفِ یوم دیں ساقی بنی اُم الخبائث بھی شراب الصالحین ساقی

ان پر سارے اسرار دین فاش ہوتے ہیں، اور انھیں ایمان کامل کا درجہ حاصل ہوتا ہے،

ترے رندوں پہ ساری کھل گئی اسرار دیں ساقی ہوا علم الیقیں، عین الیقیں حق الیقیں ساقی

اس وقت یہ کہنا بالکل صحیح ہے،

کہاں سے مجھ کو پہنچایا کہاں پیرمغاں تونے مرا میخانہ اب لاہوت ہے روح الامیں ساقی

یہ میخانہ انوار الٰہی کا منبع اور عرش بریں کا ہم پایہ ہے،

تری محفل میں کیا انوار ہیں اے مہ جبیں ساقی اتر آیا زمیں پر آج کیا عرش بریں ساقی

اس میخانہ کی دریوزہ گری کے بغیر کمال حاصل نہیں ہو سکتا،

عبادت، ریاضت کرے لاکھ زاہد مقدس جو ہوگا تو مے خوار ہو کر

کچھ اور ہی ہے ذرا چکھ تو مرے ساغر کی جو پھر کبھی تجھے زاہد طلب ہو کوثر کی

اس راہ کی ابتدائی جھجک کی کتنی لطیف اور صحیح توجیہ ہے،

جام لیتے ہاتھ کپتا ہے تو اے ساقی نہ ہنس پہلا موقع ہے نہیں پڑتی ہے ہمت کیا کریں

اس شعر پر راقم کو ایک ذاتی مشاہدہ یاد آگیا، میرے ایک محترم بزرگ نے جب ابتداء میں بس ما

مین قدم رکھا تو عادت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو جام یعنی تسبیح ہاتھ مین لینے مین جھجک محسوس ہوتی تھی، فرماتے تھے کہ اس پر ریا کا دھوکا ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب اس کا چسکا لگ گیا تو اب یہ جام و ساغر کسی وقت اُن کے ہاتھ سے جدا نہین ہوتا، بقول مجذوب

وہ ریا جس پر تھے زاہد خندہ زن   پہلے عادت پھر عبادت ہوگئی

اور اب ان کا یہ حال ہے،

دم رکا سمجھو اگر دم بھر بھی یہ ساغر رُکا   میرا دورِ زندگی ہے یہ جو دورِ جام ہے

جام و ساغر و مینا کی یہ تشریح خود حضرت مجذوب کی زبان فیض ترجمان سے راقم نے سُنی ہے، فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ الٰہ آباد کی انسپکٹری کے زمانہ مین کامون کی اتنی کثرت ہوگئی تھی کہ اوراد و وظائف کے معمولات پورا کرنے کا بھی موقع نہ ملتا تھا، اس کی ترجمانی اس شعر مین فرمائی تھی،

نہ مطرب نہ ساقی نہ ساغر نہ مینا   ارے یہ بھی ہے کوئی جینے مین جینا

اسی طریقہ سے اس شعر

روانہ سوے کعبہ یون ترا مستانہ ہوتا ہو   کہ بوتل تو بغل مین ہاتھ مین پیمانہ ہوتا ہو

کی تشریح مین فرمایا کہ ہاتھ مین تسبیح اور بغل مین کلام مجید،

یہ واقعات درمیان مین ضمناً آگئے، اصل مقصود بادۂ معرفت کے احوال و کوائف پیش کرنا تھے

ابتدائی جھجک کا منظر اوپر گذر چکا ہے، آخر مین غلبۂ شوق کا یہ حال ہوجاتا ہے،

پینے سے کیا بجھے گی بلا کی ہے تشنگی   ساقی تو آج مجھکو ڈبو دے شراب مین

لیکن یہ شراب بڑی تیز و تند ہے، اس کا تحمل آسان نہین،

یہ کس بھٹی کی دی تو نے شرابِ آتشین ساقی   کہ آنکھون سے لہو کی ندیان بہنے لگین ساقی

پلا دی ہے کس تیز بھٹی کی ساقی   کہ مجذوب آتش بجان ہو رہا ہے

دے تا ؤ نہ اب اتنا کر آنچ ذرا ہلکی — تیزی پہ ہے جب سے ساقی اڑجائے نہ میخانہ

اس میخانہ کے بادہ خوار ہی ان کوائف کا اندازہ کر سکتے ہیں، ایسی تیز و تند شراب کے لئے بہاے ندازہ دان ساقی کی ضرورت ہو،

نظرین جانچ لیتا ہے کہ کس کا ظرف کتنا ہے — دکھائے کوئی ایسا نکتہ رس اور دور بین ساقی

رہے ہشیار پی کر خم کے خم بھی تیرے متوالے — ترے اندازے بخشی پہ ہے صد آفرین ساقی

اس شراب کے انقلاب انگیز اثرات :-

ساقی نے بدل ڈالی دنیا مری ہستی کی، — آنکھیں ہیں کہ میخانہ دل ہو کہ پری خانہ

اس شعر کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس حالت کو پیش رکھنا ضروری ہے، کہ صاحب دل بزرگون کی آنکھون مین ایک خاص کیفیت و کشش پیدا ہو جاتی ہے، اور ان کا دل یاد الٰہی سے معمور رہتا ہے، دنیا سے بے تعلقی وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً ہ

بڑھ گیا ربط کچھ ایسا مرا پیمانون سے — کچھ تعلق ہے نہ اپنون سے نہ بیگانون سے

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا — اب مین تمھارے کام کا ہم نفسو نہین رہا

ہوا مین بے خبر دونون جہان سے ایک ساغر مین — ہوئے سب طے مراحل اولین و آخرین ساقی

اس شراب کے ذوق آشنا کے لئے پھر ساغر و مینا کے اہتمام کی ضرورت نہین رہ جاتی،

ہمیشہ ہون مست اور ساغر نہ مینا — اسے کہتے ہین دیکھ اے رند پینا

وہ پیر مغان کا نظر کردہ مین ہون — کہ پانی مین کیف شراب آرہا ہے

جس کو فکر جام و ساقی ہو وہ رند خام ہو — ہم کو تو اب آب سادہ ہی مے گلفام ہو

اب ہون ہی کب مین دائرۂ احتساب مین — اب مجھکو امتیاز ہی نہین آب و شراب مین ۲-

وہ لطیف الطبع ہون جو بے پئے مخمور ہو — محتسب بھی ایسے طرف رند سے مجبور ہے

یعنی اس وقت ذکر و فکر کے لئے اہتمام کی بھی ضرورت نہین رہتی، ہر موے بدن تسبیح بن جاتا ہے، اور قلب سے خود بخود ذکر الٰہی کی موجین روان ہو جاتی ہین،

ایسی رندی سراسر رحمت اور نکوکاری ہے،

کرم کے بھروسہ پہ میخواریان ہین یہ میخواریان کیا نکوکاریان ہین
کریم ہی کے بھروسہ پہ پی رہا ہون مین مین رند تو ہون مگر رند پارسا ہون مین
ظہور رحمت مولیٰ بھی تو ضروری ہے گنا ہگار نہ ہون تو گنا ہگار ہون مین

نگاہ ساقی کا فیض

نظر کردہ ترا اک طالب پیمانہ ہوتا ہے تری اک اک نظر مین کیف صد میخانہ ہوتا ہے

ساقی کی توجہ خاص کا اثر،

حقیقت مین تو میخانہ بھی میخانہ ہوتا ہے ترے دست کرم مین جب کبھی پیمانہ ہوتا ہے

رندی اور مے کشی کا لطیف فرق :۔

میکش وہ تو میکشی رندی ہے میکشی نہین آنکھون کی تم نے پی نہین آنکھون سے تم نے پی نہین

غلبۂ حال کے زمانہ مین یاد محبوب ذکر محبوب اور گریہ وزاری سے بہتر کوئی شغل نہین ہوتا،

مستی کا زمانہ بھی کیا خوب زمانہ ہے پینا ہے پلانا ہے، رونا ہے، رلانا ہے

ساقی کی مستانہ ادائی کے کرشمے،

تیری مستانہ ادائی کے کرشمے ہین یہ سب میری رندانہ روش تو مفت مین بدنام ہے

اس شعر کو نوشتہ تقدیر کے مقابلہ مین انسان کے عجز و بے بسی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے،

شراب کی تطہیر یا اجتماع طریقت و شریعت :۔

مے بھی یون ظاہر بنا لیجائے گی آب زمزم مین ملا لیجائے گی،

خرقہ کا مصرف

اور تو کچھ بن ہی گے خرقہ سے کام اس مین بوتل بھی چھپا لیجاے گی

شیخ وزاہد محتسب وغیرہ ۔ مے پرستون یعنی بادۂ معرفت کے متوالون، اور شیخ وزاہد محتسب یعنی متقشف علماے ظاہر مین پرانی رقابت ہو، اور ان پر طعن وطنز شاعری کا جزو بن گیا ہے، خواجہ حافظ اس فن کے امام ہین، انھون نے ریا کار زاہدون کی خوب پردہ دری کی ہے لیکن ان بزرگون کے کلام مین جہان شیخ وزاہد وغیرہ کا ذکر آیا ہے، ان سے مراد وہ ریاکار ارباب ظاہر ہین جن کے دل شراب معرفت یعنی دین کی روح سے خالی ہین، اور ان کا کام صرف دوسرون کی عیب چینی ہے، ورنہ وہ علماے برحق جو شریعت وطریقت کے مجمع البحرین اور دین کی پاسبانی کے ساتھ اس حریم قدس کے بھی محرم ہین، ہر طبقہ کے لئے واجب الاحترام ہین، رندانہ شاعری مین اُن سے نہین بلکہ پہلے طبقہ کے علماء سے خطاب ہے، خواجہ صاحب مین طبعی شوخی اور زندہ دلی تھی، اس لئے انھون نے بھی اُن پر بڑی لطیف چوٹین کی ہین لیکن وہ محض تمسخر اور استہزا نہین ہین، بلکہ اس مین بڑے نکتے اور لطائف پیدا کئے ہین،

محض ارباب ظاہر سے فیض باطنی کا حصول ممکن نہین،

ترا وجود ہے بے فیض مردہ دل زاہد کہ نخل خشک سے امید برگ وبار نہین

اس بے جان جسم مین محبت کی گرمی سے روح پیدا ہوسکتی ہے،

زاہدون پر مے اچھالی جاے گی روح ان مردون مین ڈالی جاے گی

راہ سلوک ومعرفت کے شرائط محض احکام شرعی کی پابندی سے زیادہ سخت ہین،

زاہد در میخانہ بھی کیا ہے در توبہ یہ ہر کس وناکس کے لئے باز نہین ہے

اس لئے عالم ہونا آسان ہے اور عارف ہونا بہت مشکل ہے،

ترک دنیا اور گوشہ گیری مین دینداری کمال نہین، بلکہ دنیا مین رہ کر دین پر قائم رہنا اصل کمال ہے

دیکھا اتفاق سے رندون مین زاہد یہ حجرہ مین کیا پارسا ہو رہا تھا

ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف اہل دل کا معیار تقوی سند ہے،

یہ واقعات نادر نہین کہ اہل دل کی ایک نگاہ نے بڑے بڑے علما کی کایا پلٹ دی

ذرا ہشیار رہنا شیخ جی مین ہون وہ مستانہ نظر مین زاہد صد سالہ کو پیر مغان کر دون

اگر شراب محبت کی مستی وقار علم کے خلاف ہو تو کم از کم اس سے ربط باطن ہی رکھنا چاہئے،

ہی خلاف وضع زاہد پہ ملا رندی اگر دختر رز سے چھپے چوری ہی یارانہ رہے

زاہد کے ذوق مے پرستی پر لطیف تعریض،

مین تو ہون ہی رند زاہد پارسا تو بھی نہین مین اگر ہون جام بر کف تو نظر بر جام ہی

محتسب کے ذوق رندی کا دلچسپ ثبوت

مگر اے محتسب تجھکو بھی ہی کچھ ذوق رندی کا جبھی آتا ہے تو جب رنگ پر میخانہ ہوتا ہی

شیخ کی ہٹ دھرمی

حق بات جانتے ہین مگر مانتے نہین ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب مین

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گو عالم سلوک و معرفت کی حقائیت دل پر روشن ہے لیکن زبان سے اعتراف اور اس پر عمل نہین،

بعض شوخ مذاق

شیخ کی پگڑی اچھالی جائیگی سرکشی سر سے نکالی جائیگی

رخصت تقوی کے دن ہمراہ شیخ دختر رز بن کے سالی جائیگی

راہ عشق و محبت کے کوائف اور سلوک کے احوال و مقامات

جذبات کی دنیا مین عشق و محبت کی کیفیتون سے زیادہ لطیف پر کیف وسیع اور گوناگون کوئی جذبہ نہین جو اپنے اندر کیفیات کا ایک عالم رکھتا ہو

بحر محبت کی موجیں بڑی پر جوش اور ان گنت ہیں، شعرا کے تخیل نے بڑی بلند پروازیاں کیں، بڑی گہرائیوں میں ڈوبے، مگر کوئی شاعر اس کا احاطہ نہ کر سکا،

یہ تو وادی عشق و محبت کے جذبات کی نیرنگی کا حال ہے، جو نسبتہً محدود ہے، پھر عشقِ حقیقی کے بحر ناپیدا کنار کی وسعت و گہرائی اور جوش و خروش کا کون اندازہ کر سکتا ہے، جس کی بقول مجذوب کوئی ابتدا و انتہا نہیں،

کشتیِ دل یہ ناگہاں آگئی نا خدا کہاں بیٹھیے تو ابتدا نہیں بڑھیے تو انتہا نہیں

اور بڑے بڑے اصحابِ دل شعراء کو اپنے عجز و نارسائی کا اعتراف کرنا پڑا،

دفتر تمام گشت و بہ پایان رسید عمر ماہمچنان در اول وصف تو ماندہ ایم

یہ عالم لاہوت بے کیف و کم ہونے کے باوجود، گوناگوں کوائف سے معمور ہے، حضرت مجذوب نے ان کی بڑی لطیف ترجمانی کی ہے، یہ ان کی شاعری کا بڑا نازک اور دقیق حصہ ہے، جس سے صرف ذوقِ سلیم ہی لذت گیر ہو سکتا ہے،

یہ راہ سراسر عشق و محبت کی ہے، اور محبت کے حالات و کوائف گوناگوں ہیں، اس کا مقام عرش سے بھی اونچا ہے،

چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم رسائی سے بالا ہو بام محبت
ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے نہ صبح محبت نہ شام محبت
نہ ہوگا ابد تک بھی پورا نہ ہوگا میرا قصہ، نا تمام محبت
سنبھل کر ذرا تیز گام محبت مقام ادب ہے مقام محبت
مقام فنا ہے مقام محبت کہ یکساں ہو سب خاص و عام محبت
ٹھہر یاد جاناں ٹھہر میرے دل میں یہی ہے یہی ہے مقام محبت

مٹے فرقِ وصل و فراق من و تو | جو ہو جائے راسخ مقامِ محبت
وہ آئے ہیں اور میں ہوں محوِ تصور | عجب کیف ہے کیف جامِ محبت
حقیقت ہی اب چارہ سو جلوہ گر ہو | جدھر پھیر دوں میں زمامِ محبت

لیکن یہ راہ بڑی کٹھن اور دشوار گذار ہے، اس میں کامیابی کی پہلی شرط ہمت و استقلال اور مشکلات و مصائب کا مقابلہ ہے،

دیکھ یہ راہِ عشق ہے ہوتی ہے بس یوں ہی طے | سینہ پہ تیر کھائے جا آگے قدم بڑھائے جا
قدم جس طرح ہو بڑھاتا چلا جا | کہیں پر نہ رک لڑکھڑاتا چلا جا،
بس چلا چل قطعِ راہِ عشق اگر منظور ہے | یہ نہ دیکھ اے ہم سفر نزدیک ہے یا دور ہے
ہمیں تو رات دن اے ہم سفر گرمِ سفر رہنا | سفر محدود ہو جسکا اسے ہو فکر منزل کی

اس راہ کی لغزش بھی وصول کا ذریعہ ہے،

میں لاکھ چلا پھر بھی پہنچا نہ سرِ منزل | کچھ تو ہی سہارا دے اے لغزشِ مستانہ

اور اس کی گم کردہ راہی کا بھی یہ درجہ ہے،

طریقِ عشق میں جو جس قدر گم کردہ منزل تھا | وہ بس اتنا ہی اے دل خضرِ رہ بننے کے قابل تھا

یہ دولت کیا کم ہے کہ،

اک مسلسل کیف و ذوق و شوق ہے تیرے دل میں ہے | خیر یہ مقصد تو حاصل سعیِ لاحاصل میں ہے

اس راہ میں جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہ کرنا چاہئے،

بے جھجک شوق سے ہاں مٹنے پہ ہو جا تیار | بے نشاں ہو کے وہ کچھ اپنا پتہ بھی دیگا
خرد ہوش سب کچھ گنواتا چلا جا | نشاناتِ ہستی مٹاتا چلا جا
دیتا ہے زہر کا پیالہ میرا ساقی پہلے | پی لیا جس نے اسے آبِ بقا بھی دیگا

جو سب کچھ ہو برباد مطلق نہ غم کر بس اک خیر دل کی ہنا تا چلا جا

اس راہ کی دوسری شرط جنون و سودا ہے، بغیر مجنونانہ طلب کے مقصود حاصل نہیں ہو سکتا، اور بغیر خود کو کھوئے ہوئے مطلوب نہیں مل سکتا،

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبین سائی ہے سر زاہد نہیں یہ سر سر سودائی ہے

اب بھی مجذوب جو محروم پذیرائی ہے کیا جنون میں ابھی آمیزش دانائی ہے

بقدر جنون مجذوب واصل ہوتا جاتا ہے کہ ہوش اپنا تو زائل انکا حاصل ہوتا جاتا ہے

ادھر ہر گام پر گم کردہ منزل ہوتا جاتا ہے بفیض جذب ادھر مجذوب اصل ہوتا جاتا ہے

حدیث کی کتابوں میں صحابہ کرامؓ کے حالات میں آتا ہے، کہ اگر تم ان کی شدت ایمان اور جوشِ عمل کو دیکھتے تو اُن کو مجنون سمجھتے، اوکما قال،

کوئی طالب محروم نہیں، قرب و دوری وغیرہ اس راہ کے مختلف کوائف ہیں،

حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم کبھی پاس آکر کبھی دور ہو کر

سر دار ہو کر سر طور رہ کر ترے پاس پہونچے بہت دور ہو کر

زیادہ قرب خطرناک ہے، اس میں طالب کو اپنی ذات پر مطلوب کا دھوکا ہو جاتا ہے،

نہ پاس آؤ اتنے ملے دور ہو کر میں کچھ اور کہہ دوں نہ منصور ہو کر

مطلوب کی ظاہری بے توجہی بھی درپردہ توجہ ہے، اور کسی نہ کسی عنوان طالب کی تشفی کا سلسلہ قائم رہتا ہے،

مجھے یاس کیوں ہو کہ وہ دل میں بیٹھے برابر تسلی دیئے جا رہے ہیں

ان سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے

اس کا غضب بھی در اصل کرم ہے، صرف پردہ عتاب کا ہے، کہ یہ بھی اصلاح و تطہیر کا طریقہ ہے،

سمجھتے تھے جس کو غضب ہو رہا ہی — وہی اب کرم کا سبب ہو رہا ہی
کرم ہی کرم روز و شب ہو رہا ہی — مگر ہاں بہ شکلِ غضب ہو رہا ہی

بعض روایات مین بھی آیا ہی کہ گنہگار مسلمانون کے عذاب کا مقصد معاصی کی آلایش سے ان کی تطہیر کرنا

یادِ محبوب کی مختلف کیفیتین

بس اب تو ہمدم کوئی جگہ ایسی کہین ہوتی — اکیلے بیٹھے رہتے یادِ اُن کی دلنشین ہوتی
رات دن مین ہون تری یاد ہے تنہائی ہی — کام ہی کچھ ہی نہ فرصت ہی کبھی پائی ہی
خانۂ دل مین عجب انجمن آرائی ہے — رونقِ بزمِ دو عالم مری تنہائی ہی

جلوۂ محبوب کے لئے قلب کا ماسوا سے فارغ ہونا ضروری ہے، کہ ایک مکان مین دو مکین نہین رہ سکتے،

آ میرے دل کی بزمِ تمنا مین اب تو آ — دیتے تھے جو دھوان وہ دئے سب بجھا دیئے
وارفتگیِ شوق کا امکان نہین رہا — آجا کہ دل مین اب کوئی ارمان نہین رہا
ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی — اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی
کوئی حسرت ہے نہ اب کوئی تمنا دل مین ہے — شکر ہے اب عشق اپنا آخری منزل مین ہی
باقی نہین اب کوئی تمنا میرے دل مین — موجود ہے عکسِ رُخِ زیبا میرے دل مین
کس جگہ بیخودیِ شوق یہ لے آئی ہی — کہ جہان کوئی تمنا نہ تمنائی ہے

تصوّرِ محبوب کی عظمت اور اس کے نتائج،

اس رُخ کے تصوّر کو آنکھون مین جماتا ہی — ہر ذرۂ عالم کو اک طور بناتا ہے
یہ آج تصوّر مین مرے کون حسین ہی — ہر موئے تجر طور ہی دل عرش برین ہے
کیا گھر تصوّر مین کس مہ لقا نے — جو دل پر مسلسل ضیا بار ہان مین

تصور عرش پر ہو وقفِ سجدہ ہو جبین میری — میر اب پوچھنا کیا آسمان میرا زمین میری

غلبۂ تصور کے نتائج

یون تصور ترا پیوست دل وجان ہوجائے — فرقت وصل مجھے عشق مین آسان ہوجائے

تری تصویر سی ہر سو کبھی معلوم ہوتی ہو — تصور کی یہ سب صورتگری معلوم ہوتی ہو

جو مین دن رات یون گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہون — تری تصویر سی دل مین کبھی معلوم ہوتی ہو

جہان مین جاؤن میرے ساتھ ہو تصورِ دوست — تمام روے زمین اب ہو کوے یار مجھے

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ،

تصور کی دیکھو تو معجز نمائی — کہ مجھ پر تمہارا گمان ہو رہا ہے

جمالِ وحدت کی نیرنگی

جلوہ گر عالم وحدت مین ہو کثرت ہر سو — آئینہ خانہ مین تو محو خود آرائی ہے

آئین بھی تو کیونکر میری پہچان مین آئین — بیرنگ ہین سو رنگ کی لیکن ہین تو آئین

جہان مین ہر سو ہے اُن کا جلوہ کہان نہین ہے کدھر نہین ہے،

وہ ذرّے ذرّے مین جلوہ گر ہے، مگر کوئی دیدہ ور نہین ہو

حجاب کے پردے،

یہ اپنی حدِ نظر ہے کسی کی دید کہان — یہ عکس حُسنِ نظر ہے جمالِ یار نہین

وہ جلوہ تو ہر سو عیان ہو رہا ہے — حجابِ خودی درمیان ہو رہا ہے

دکھاؤ تو روے آفتابی حجاب تیری ہی دو حجابی — مری نظر کی ہو یہ خرابی کہ تابِ جلوہ حجاب مین ہے

ناکام ہی تا عمر رہا طالب دیدار — ہر جلوہ ترا بعد کو پردہ نظر آیا

سب مین کیا کیا نہ زور مارے کبھی نہ جیتے ہمیشہ ہارے — حجاب گو اُٹھ گئے ہین سارے ہنوز چہرہ نقاب مین ہو

سمجھتے تھے جس کو غضب ہو رہا ہے — وہی اب کرم کا سبب ہو رہا ہے
کرم ہی کرم روز و شب ہو رہا ہے — مگر ہان بہ شکلِ غضب ہو رہا ہے

بعض روایات مین بھی آیا ہے کہ گنہگار مسلمانون کے عذاب کا مقصد معاصی کی آلایش سے ان کی تطہیر ہے،

یادِ محبوب کی مختلف کیفیتین

بس اب تو یہ ہو کوئی جگہ ایسی کہین ہوتی — اکیلے بیٹھے رہتے یاد اُن کی دلنشین ہوتی
رات دن مین ہون تری یاد ہے تنہائی ہے — کام ہی کچھ ہے نہ فرصت ہی کبھی پائی ہے
خانۂ دل مین عجب انجمن آرائی ہے — رو کشِ بزمِ دو عالم مری تنہائی ہے

جلوۂ محبوب کے لئے قلب کا ماسوا سے فارغ ہونا ضروری ہے، کہ ایک مکان مین دو مکین نہین رہ سکتے،

آ میرے دل کی بزمِ تمنا مین اب تو آ — دیتے تھے جو دھوان وہ دیئے سب بجھا دیئے
وارفتگیٔ شوق کا امکان نہین رہا — آ جا کہ دل مین اب کوئی ارمان نہین رہا
ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی — اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی
کوئی حسرت ہے نہ اب کوئی تمنا دل مین ہے — شکر ہے اب عشق اپنا آخری منزل مین ہے
باقی نہین اب کوئی تمنا مرے دل مین — موجود ہے عکسِ رخِ زیبا مرے دل مین
کس جگہ بیخودیٔ شوق یہ لے آئی ہے — کہ جہان کوئی تمنا نہ تمنائی ہے

تصورِ محبوب کی عظمت اور اس کے نتائج،

اس رخ کے تصور کو آنکھون مین جماتا ہے — ہر ذرۂ عالم کو اک طور بناتا ہے
یہ آج تصور مین مرے کون حسین ہے — ہر موئے تن طور ہے دل عرش بریں ہے
کیا گھر تصور مین کس مہ لقا نے — جو دل پر مسلسل ضیا باریان ہین

تصور عرش پر ہے وقف سجدہ ہے جبین میری میرا اب پوچھنا کیا آسمان میرا زمین میری

غلبۂ تصور کے نتائج

یون تصور ترا پیوست دل وجان ہو جائے فرقت وصل مجھے عشق مین آسان ہو جائے

تری تصویر سی ہر سو کبھی معلوم ہوتی ہے تصور کی یہ سب صورتگری معلوم ہوتی ہے

جو مین دن رات یون گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہون تری تصویر سی دل مین کبھی معلوم ہوتی ہے

جہان مین جاؤن میرے ساتھ ہے تصور دوست تمام روے زمین اب ہے کوے یار مجھے

فاینما تولّوا فثم وجہ اللہ،

تصور کی دیکھو تو معجز نمائی کہ مجھ پر تمھارا گمان ہو رہا ہے

جمال وحدت کی نیرنگی

جلوہ گر عالم وحدت مین ہے کثرت ہر سو آئینہ خانہ مین تو محو خود آرائی ہے

آئین بھی تو کیونکر میری پہچان مین آئین بیرنگ ہین سو رنگ کی لیکن مین قبا مین

جہان مین ہر سو ہے اُن کا جلوہ کہان نہین ہے کدھر نہین ہے،

وہ ذرّے ذرّے مین جلوہ گر ہے، مگر کوئی دیدہ ور نہین ہے

حجاب کے پردے،

یہ اپنی حدِ نظر ہے کسی کی دید کہان یہ عکس حسن نظر ہے جمال یار نہین

وہ جلوہ تو ہر سو عیان ہو رہا ہے حجاب خودی درمیان ہو رہا ہے

دکھانہ تو روے آفتابی حجاب تیری ہی دو حجابی مری نظر کی ہے یہ خرابی کہ تاب جلوہ حجاب مین ہے

ناکام ہی تا عمر رہا طالب دیدار ہر جلوہ ترا بعد کو پردہ نظر آیا

طلب مین کیا کیا نہ زور مارے کبھی نہ جیتے ہمیشہ ہارے حجاب گو اُٹھ گئے ہین سارے ہنوز چہرہ نقاب مین ہے

پردہ امتحان طلب ہے، اس سے مایوس نہ ہونا چاہئے،

عیان ہو کے جلوہ نہان ہو رہا ہے — طلب کا مری امتحان ہو رہا ہے

اس پردہ کو ہٹانے کے لئے ہمت چاہئے،

اٹھ جائے ابھی کام لین ہمت سے اگر ہم — ایک یونہی سا پردہ ہے ادھر وہ ہین ادھر ہم
تو اپنے رُخ کے سامنے پردے ہزار ڈال — سب دور ہین بس اک نگہ کامیاب مین
سب ترا پردہ دھرا رہ جائے گا — جب ذرا گردن جھکا لی جائے گی

پردہ اُٹھتا ہے،

چھپاتا بھی ہے اور دکھاتا بھی رخ کو — وہ رک رک کے زیر نقاب آ رہا ہے
یہ برق صفت کون اٹھا دیتا ہے پردہ — ہو جاتا ہے اک دم جو اُجالا مرے دل مین
دل کی دنیا جو جگمگا اٹھی — کس نے پردہ اٹھا کے دیکھ لیا

جلوۂ جمال اور اس کی تجلی کے ظاہری اثرات، حیرت

نقاب الٹ بھی دو اب کوئی ہوشیار نہین — کہ منتظر کو بھی احساس انتظار نہین
کبھی تکلیف فرما کر وہ آئے بھی تو کیا آئے — انھین خلوت ہی مین رکھتی حیرت اہل محفل کی
وہ اٹھ بھی گئے بزم سے کب کے مگر اب تک — اللہ ری حیرت جو جہان تھا وہ وہین ہے
جس کو بھی یہان دیکھا حیرت زدہ ہی دیکھا — یہ آپ کی محفل ہے یا آئینہ خانہ ہے

جلوہ جمال کی باطنی تجلیان،

نکلتی ہین ہر موئے تن سے شعاعین — یہ کس مہ کا جلوہ عیان ہو رہا ہے
اے جذب لا بٹھایا دل و دیدہ مین انھین — تو نے تو مرے دونون جہان جگمگا دیئے
یہ کون آ کے بیٹھا سویدائے دل مین — سیاہی چمکنے لگی نور ہو کر

سینہ مین تجلی کا جو ہر دم ہے یہ عالم — کیا عرش معلی اتر آیا میرے دل مین
کسے دیکھ کر آج ہم آرہے ہین — کہ آنکھون سے انوار برسا رہے ہین

جذب و بیخودی

جدھر جذب ہم کو لئے جا رہا ہے — کئے بند آنکھین چلے جا رہے ہین
گم گشتہ حیرت کوئی مجھ سا بھی نہین ہو — مین خود ہون کہین دل ہے کہین ہوش کہین ہے

اس کے نتائج

مرا دل ہے ہر وقت محو تماشا — ندا میری غفلت پہ ہشیاریان ہین
کسی اور عالم مین پہنچے ہوئے ہین — جہان خودی سے گذر جانے والے

قتیلِ راہِ محبت یا واصلین بحق کے لئے حیاتِ ابدی کی نوید

تیرے کشتون نے حیاتِ ابدی پائی ہو — اس کو کہتے ہین مسیحا یہ مسیحائی ہے

لاتقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتاً

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زمان از غیب جانے دیگر است

سالکین کی منزل بہت بلند اور قید مکان و لامکان سے آزاد ہے،

بنا نہ دنیا مین تو نشیمن نہین ہو یہ باغ تیرا گلشن — کہ بلبل قدس تو ہو تیرا تو شاخ طوبی پر آشیان ہو
پر شکستہ نہ سمجھ بلبلِ قدسی ہون مین — پر جبرل مرے بازوے پرواز مین ہو
محدود فضائین ہین یہ مرغانِ ہوا کی — اڑتے ہین جہان ہوش وہ مین اور فضائین

یہ قید کون و مکان تو شایانِ شان آزادگان نہین ہے

میرا جہاں ہے وہ عالم جہان زمین آسمان نہین ہو
مین مجذوب نارسیدہ کی عرش و کرسی و لامکان ہے — پہنچ کسی کو شکستہ پا کی یہی اللہ اللہ کہان کہان ہو

مجذوب اور سالک کا فرق،

اگرچہ مجذوب اور سالک ہین دونوں ایک ہی اشیٔ بڑا تفاوت ہی منزلون مین یقین یقین ہی گمان گمان ہے

ایک دوسرے شعر مین اس سے بلند تر تخیل کو اس سے زیادہ بلیغ پیرایہ مین بیان کیا ہے،

بخودِ شوق یہان جلوہ گہ ناز مین ہو طور پر بحث ابھی صورت و آواز مین ہو

اقبال نے بھی تقریباً اسی مفہوم کو اس شعر مین ادا کیا ہے،

بو علی اندر غبار ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

حقیقت یہ ہے کہ عشق کی وارفتگی کا درجہ علم و عقل کے تدبر اور احتیاط سے بمراحل بلند ہے، بلکہ بقولِ اقبال ع :-

عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب اور علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات

اس تشریح کے بعد اب اس شعر کو پھر پڑھئے،

بخودِ شوق یہان جلوہ گہ ناز مین ہے طور پر بحث ابھی صورت آواز مین ہے

اس سے معراج نبوی بھی مراد لیجا سکتی ہے، مقامِ توحید،

جب ہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے تو مجھ کو بھری بزم مین تنہا نظر آیا

طلب توجہ :-

ترے ہوتے یہ کیا اے جلوۂ جانانہ ہوتا ہے خبر ہے کعبۂ دل پھر مراتب خانہ ہوتا ہو

بقا و فنا :-

یون ہی تم پہ مرتا رہون زندگی بھر
بقا بھی بہ رنگِ فنا چاہتا ہون

ادائے خاص

یون تو ہین سبھی آپ کے اس حسن کے شیدا　　مرتا ہون مین جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

تقدیر کے معنی

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا ہے بھلا　　بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی،

سوز محبت اور گداز عشق کی کیفیتین | دل کا سوز و جراحت عشق و محبت کی روح ہے، اس کے بغیر عشق مین جان نہین پیدا ہوتی ع:-

برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اس سے مراد فریاد و فغان اور نالہ و شیون نہین ہے، بلکہ سوز و ساز، اور درد و لذت و الم کی وہ لطیف کیفیت مقصود ہے جس سے روح لذت گیر ہوتی ہے عشق حقیقی مین کیفیتین اور زیادہ تیز اور شدید ہوتی ہین، روایتون مین ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کا دل سوز عشق سے اتنا بریان تھا، کہ حضرت نظام الدینؒ اس پر فخر کرتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ جب خدا قیامت مین مجھ سے پوچھے گا، کہ میرے لئے کیا تحفہ لایا ہے، تو عرض کرون گا اس ترک بچہ کا سوز سینہ لایا ہون،

اس عالم مین دل پر سوز و ساز، درد و الم، کیف و سرور، حسرت و یاس، امیدی اور نا امیدی کی مختلف کیفیتین طاری ہوتی ہین، مجذوب کے کلام مین جا بجا یہ کوائف نظر آتے ہین،

درد و الم کی مختلف کیفیتین،

عالم عشق و محبت مین بہار آئی ہے　　آنسوؤن کی ہے جھڑی غم کی گھٹا چھائی ہے

اس دل زار سے مفر عشق مین جیتے جی نہین　　رونا ہے مجھ کو عمر بھر غم مرا عارضی نہین

غمزدگان عشق مین مجھ سا کوئی حزین نہین　　رونا تو رات دن ہون مین تر مری آستین نہین

ٹھہرے گا دل تھمین گے اشک آہ مگر ابھی نہین　　غم ہے یہ دل لگی نہین رونا ہے یہ ہنسی نہین

ہنسی بھی ہے میرے لب پہ ہر دم اور آنکھ میں بھی نمی نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم کسی کو اس کی خبر نہیں ہے

کسی حال میں چین پاتا نہیں دل
نہ مغموم ہو کر نہ مسرور ہو کر

لذتِ الم اور ایذا طلبی

جہاں سانس لینے میں ہو آہ پیدا
اب ایسی کوئی میں فضا چاہتا ہوں

مری چشم پر نم میرا قلب پُر غم
یہ مینائے الفت وہ جامِ محبت

پھونک دی اک روح تو مجھ میں مری ہر آہ نے
دردِ دل نے مری رگ رگ کو رگِ جان کر دیا

روح مثلِ شعلۂ جوالہ رقصاں ہے مری
کس مزے کی ہائے سوزش داغہائے دل میں ہے

یہ تلخ ہے گو غم نہانی مگر ہے لبریز شادمانی
سرور کی جیسے ہے نشانی وہ اک جو تلخی شراب میں ہے

حسرت و یاس،

یاس ہی اب دل کی فطرت ہو گئی
آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی

میں ہی محروم ہوں اک خلق تماشائی ہے
کیا غضب ہائے یہ اے ذوقِ جبیں سائی ہے

جی رہا ہوں موت کی اُمید میں
مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی

بے کسی اور بے بسی کی کیسی حسرتناک تصویر ہے،

زبان بے دل ہے اور دل بے زبان ہے ہائے مجبوریاں
بیان میں کس طرح آئے کہ جو دل پر گذرتی ہے

ہائے مجھ سا بھی جہاں میں کوئی مجبور نہیں
خود کو مجبور سمجھنے کا بھی مقدور نہیں

سکونِ قلب یا غم کی انتہا،

دفورِ غم سے اب احساس باطل ہوتا جاتا ہے
سکونِ دل کا باعث خود غمِ دل ہوتا جاتا ہے

سکون دشمنِ تلاطم آشنا دل ہوتا جاتا ہے
دفورِ موج سے گرداب ساحل ہوتا جاتا ہے

چارہ گر کا اعجاز مسیحائی،

میرے چارہ گر کا کیجے تو کوئی حسنِ علاج — محو دل سے امتیاز درد و درمان کر دیا

تیرے کشتوں نے حیاتِ ابدی پائی ہے — اس کو کہتے ہیں مسیحا یہ مسیحائی ہے

دنیا سے عشق و محبت کے آئین و قوانین جدا ہیں، کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے

ع عاشقان را مذہب و ملت جداست

اس لئے عشاق کی عبادت بھی عوام سے مختلف ہے، اس میں ظاہری شرائط کی پابندی کے ساتھ عبادت کی اصل روح ضروری ہے، اس کے بغیر عبادت نہیں ہوتی، حدیثوں سے بھی ثابت ہے کہ اخلاص وحضور قلب کے بغیر عبادت ناقص ہوتی ہے،

پھر زاہدوں کی عبادت صرف نماز تک محدود ہے لیکن اہلِ دل کی عبادت یعنی ذکر و فکر ہر وقت جاری رہتی ہے جس کے لئے کسی سمت و آستانہ کی بھی ضرورت نہیں، بلکہ صرف معبود و مسجود کا تصور کافی ہے، اسی کو حضرت مجذوب نے سجدۂ بے جبین سے تعبیر کیا ہے،

تم کو نصیب زاہد و سجدۂ بے جبین نہیں — پیشِ نظر ہے آستان تہ نظر جبین نہیں

اس کی بنیاد اسی آیت پر ہے، یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض، الخ

سجدہ درحقیقت وہی ہے کہ ایک مرتبہ سر جھک جانے کے بعد پھر نہ اٹھے

جھک کے اٹھے نہ پھر کبھی لائق سجدہ ہو جبھی — میرا سرِ سجود ابھی درخورِ آستان نہیں

اور حشر تک جبیں سائی قائم رہے،

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہے — سرِ زاہد نہیں یہ سر سرِ سودائی ہے

اہلِ صفا کا وضو،

بجائے سجدہ بہایا کئے کھڑے آنسو		نماز سب نے پڑھی ہم رہے وضو کرتے

اذان اور نماز

تری گلی ہے مری فغان ہو مری جبین تیرا آستان ہے		یہی ہے بس اب نماز میری یہی بس اب مری اذان ہے

در پہ گدا نواز کے رکھے سر نیاز ہون		عشق مین زاہد و مین بس جانتا یہ نماز ہون

تسبیح | عاشق تو ہے اے زاہد ہر وقت عبادت مین		اشکون کا مسلسل ہے اک سبحۂ صد دانہ

اس عبادت کا درجہ

عرش برین ہے زاہد و سجدہ گہ نماز عشق		تم کو مین کیا دکھا سکون مرتبۂ نیاز عشق

سجدہ :-

یہ داغ سجدہ داغ غلامی ہے آپ کا		پہچانے اب تو جاتے ہین بس اس نشان سے ہم

سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود،

نغمہ و ساز | بزرگان چشت کو سماع سے خاص مناسبت تھی، بلکہ بعضون پر اس کا غلبہ رہا ہے کہ ان کو نے سے بھی نے نوازی کی آواز سنائی دیتی تھی،

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست		از کجا می آید این آواز دوست

حضرت خواجہ صاحب گو اس مشرب سے محترز رہے لیکن وہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے اس باطنی اثر کو نہ مٹا سکے، بلکہ یہان تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود سراپا ساز و نغمہ تھے، جنھین ان کی زمزمہ سنجی سے سامعہ نوازی کا موقع ملا ہو وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہین کہ خواجہ صاحب ہمہ تن جوش و مستی تھے، اللہ تعالی نے ان کی آواز مین بھی لحن داؤدی کا اثر عطا فرمایا تھا جب وہ جوش و مستی مین مترنم ہوتے تھے، تو ان کا ہر موے بدن ساز بنجاتا تھا،

خود فرماتے ہین :-

یون تو اس پیکر ہستی مین مری کچھ بھی نہین — کوئی مطرب ہو تو ہر نغمہ مرے ساز مین ہو

مرا سازِ ہستی ہے لبریزِ نغمہ — کوئی مطربِ خوشنوا چاہتا ہون

ان کا یہ نغمہ کسی اور ہی ساز کی آواز تھی،

یہ نغمۂ دلکش مرا اپنے ساز نہین ہے — وہ بول رہے ہین مری آواز نہین ہو

ان کے نغمون کی تاثیر کا یہ حال تھا،

جان رگ رگ سے کھچی آتی ہو کانون کی طرف — کس قیامت کی کشش اُف تری آواز مین ہے

جی اُٹھے مردے تری آواز سے — پھر ذرا مطرب اسی انداز سے

نغمہ پیدا ہے کہ نوحہ ساز سے — ہوک سی اٹھتی ہے اس آواز سے

تن تن تنی کہ سینہ مین پیدا ہوئی جلن — یہ راگ ہو کہ آگ ہے چنگ و رباب مین

اس پر بھی ان کا اصل نغمہ ناشنیدہ ہی رہا،

کوئی محرم نہین سب حال مرا راز مین ہو — ناشنیدہ ہے وہ نغمہ جو ابھی ساز مین ہو

یہ نغمہ وہی تھا جس کا اس شعر مین اشارہ ہے،

سرِ نہان است اندر زیر و بم — فاش اگر گویم جہان برہم زنم

تغزل | یہان تک خواجہ صاحب کے کلام کی معنوی اور باطنی حیثیت پر گفتگو تھی، جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہو فن کی حیثیت سے بھی ان کا کلام استادانہ ہے، اس مین بڑی جامعیت اور ہر رنگ کے نمونے موجود ہین ان کو دکھائے بغیر یہ تبصرہ ناقص رہ جائے گا، اس لئے ان کے کلام کے بعض ظاہری نمایان رخ پیش کئے جاتے ہین، خواجہ صاحب فطرۃً شاعر، لطیف الاحساس، خوش خیال، خوش نگاہ، جمال پسند اور رنگین مزاج تھے، اس کا پرتو ان کی شاعری مین بھی نمایان ہے، اور اس مین دنیاوی عشق و محبت کے نہایت رنگین اور دلفریب مرقعے ہین، خود فرماتے ہین:-

حُسن کا خوشنما چمن عشق کا دلکشا چمن

سر سے ہے تا بہ پا چمن یہ مری شاعری نہیں

اس میں لطیف، ہلکے اور شوخ اور گہرے ہر رنگ کے خوشنما پھول ہیں،

کہیں کہیں بیان کی شوخی اور رنگینی اتنی تیز ہوگئی ہے، کہ اس کے سامنے داغ اور آمیر کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ساز سے ایسے متضاد نغمے بھی نکل سکتے ہیں مگر اس موجِ کوثر کی طہارت اور پاکیزگی کو مادی کثافت سے مکدّر کرنا ذوقِ سلیم گوارا نہیں کرتا، اس لئے صرف لطیف اور پاکیزہ تغزل کے نمونے پیش کئے جائیں گے، ان میں سے اکثر اشعار میں نہایت نمایاں اور کھلا ہوا تغزل ہے، اور بعض میں حقیقت اور مجاز کی سرحدیں آتنی ملی ہوئی ہیں، کہ دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے، اس کے لئے میں نے اپنے ذوق کو رہنما بنایا ہے،

محبت کا ایک رُخ اوپر پیش کیا جا چکا ہے، اب اس عالم آب و گل کی محبت کی کچھ کیفیتیں ملاحظہ ہوں،

مرے سامنے لو نہ نامِ محبت
چھلک جائے گا ہائے جامِ محبت

تری چشمِ مے گوں ہے جامِ محبت
تری زلفِ مُشکیں ہے دامِ محبت

پلا دے پلا دے پلا دے پلا دے
پلا دے ان آنکھوں سے جامِ محبت

محبت محبت محبت محبت
بڑا لطف دیتا ہے نامِ محبت

محبت کے بدلے محبت ستم ہے
نہ لے اُف نہ لے انتقامِ محبت

نہ رُک ہائے قاصد نہ رک ہائے قاصد
کہے جا کہے جا پیامِ محبت

محبت کا کھیل،

یہ کھیل دل کے لینے کے جو کھیلتے ہیں آپ
مجھ سے نہ کھیلئے کسی نادان سے کھیلئے

جو چاہیے کھیل کھیلئے دنیا ہے آپ کی
ہولی مگر نہ خونِ دل و جان سے کھیلئے

اے جلوہ ہائے دوست بس اب کیجئے کرم | آشانہ میرے دیدۂ حیران سے کیجئے

کمال حسن وبہار حسن ،

حسن خود حسن ہوا تیرے حسین ہونے کر | روئے [illegible] و زینت زیبائی ہر

تجھے زیب وزینت کی حاجت ہی کیا ہے | نظر مین سما کر سنور جانے والے

تن یاسمین پر لباس مصفی | وہ آئے ہین نورٌ علیٰ نور ہوکر

وہ نظرون مین میری کھبے جارہے ہین | سراپا ادا چشم بد دور ہوکر

یہ ناز یہ انداز یہ شوخی یہ ادا ئین | اے زلف بدوش آتری لیلون مین بلائین

قبا رنگین بدن رنگین دہن رنگین نظر رنگین | تمہین دیکھا کہ اس جا مجتمع رنگینیان دیکھین

نہاکر تو نہ جانے حسن کا عالم ہی کیا ہوگا | پسینہ پوچھنے سے جب تری رنگت نکھرتی ہر

مستانہ ادائی

صراحی دربغل ساغر بکف مستانہ وار آجا | رگ رگ سے آمرا بیٹھا ہے اک مستانہ برسون سے

آرہا ہے جھومتا وہ مست ناز | اب طبیعت کیا سنبھالی جائیگی

ان اشعار پر کسی فارسی استاد کے دو شعر یاد آگئے ،

پریشان کاکل آغوش وامستانہ می آئی | سرت گردم باین شانیکہ از میخانہ می آئی

باصد کرشمہ آن بت بدست میرود | خود می کند خرام وخود از دست میرود

ایک بہترین شعر

نہین درکار ہے ہم کو پئے جا تو ہی اے ساقی | ہمین تو مست کرتا ہے ترا سرشار ہوجانا

اس کیفیت کی تشریح نہین ہوسکتی ،

مستی شباب :-

بوضعِ رندانہ گھومتے ہیں قدم حسین بہکے چور ہیں　　بشانِ مستانہ جھومتے ہیں وہ کیفِ مستی شباب میں ہے

جلوۂ حسن کے اثرات،

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمعِ محفل کی　　پتنگوں کی جگہ اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

اہلِ محفل فرشِ محفل ہو گئے　　بزم میں آئے وہ اس انداز سے

اللہ اللہ ترے آتے ہی ہجوم اشکوں کا　　حسرتِ دید بھی مشکل سے نکل پائی ہے

احترامِ حسن

خود کو بھی ترے عشق میں ہم غیر ہی سمجھے　　جی بھر کے نہ دیکھا کہ لگا دیں گے نظر ہم

کس آنکھ سے دیکھیں انھیں ہمت نہیں پڑتی　　وہ مصحفِ رخ پاک ہے آلودہ نظر ہم

مجبوریِ نگاہ

کر دن ناصح میں کہاں تک [illegible] نہ دیکھونگا　　نظر پڑ جائے گی خود ہی جو دانستہ نہ دیکھونگا

نظرِ شوخ کی نیرنگی،

ان کی نظرِ شوخ ہے اک طرفہ تماشا　　ہر شخص سمجھتا ہے ادھر دیکھ رہے ہیں

یوں نظر تو مجھ پہ ڈالی جائے گی　　جب میں دیکھوں گا ہٹا لیجائیگی

ادا یہ دیکھ کے عاشق کہیں چھپ جائیگی　　حضور رکھتی ہے رسوائیاں زمانے کی

دل کی چمن آرائی،

دل میں گل عشق نے داغوں کے کھلائے تو بہت　　ان کی گلگشت کے قابل یہ گلستاں نہ ہوا

متفرق :-

غزل ہے مری اور وہ گا رہے ہیں　　غضب کر رہے ہیں ستم ڈھا رہے ہیں

گنگنا تو گئے جو اس انداز سے　　خود تڑپ نکلیں گے نغمے ساز سے

اب صبح ہوئی اب وہ اٹھا ئے وسد ھارے　　آثار سحر دیکھتے ہین قبل سحر ہم

نہ صبح آرہی ہے نہ وہ آرہے ہین　　نہ موت آرہی ہے نہ خواب آرہا ہے

وہ میخانہ بر دوش چرخ برین پہ　　بصد کیف مستی سحاب آرہا ہے

وہ بیٹھے رہتے ہین دیکھون تو بت نو کتبک　　جو بے قرار نہ کر دون تو بے قرار نہین

سلاست وصفائی | حضرت مجذوب زبان وادب کا بھی نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے، ان کا پورا کلام زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست کا نمونہ ہے، اُن کے بہت کم اشعار اس وصف سے خالی نکلین گے خصوصًا چھوٹی بحرون کی غزلین جن کے بہت سے اشعار اوپر نقل ہو چکے ہین، سادگی اور سلاست کے لحاظ سے سہل ممتنع کے حکم مین ہین، طویل بحرون مین بھی بہت سے متفرق اشعار ایسے ڈھلے ہوئے اور برجستہ نکل گئے ہین، کہ ضرب المثل بننے کے لائق ہین،

چند مثالین ملاحظہ ہون،

وفا کر کے اس کا صلہ چاہتا ہون　　بڑا نا سزا ہون سزا چاہتا ہون

محبت کا اپنی صلہ چاہتا ہون　　سزا چاہتا ہون سزا چاہتا ہون

بھری بزم مین راز کی بات کہدی　　بڑا بے ادب ہون سزا چاہتا ہون

سنائے بھی کوئی تو پائین دعائین　　گدا ہون مین سب کا بھلا چاہتا ہون

مین اس بے وفا سے وفا چاہتا ہون　　مجھے دیکھئے کس سے کیا چاہتا ہون

چلا تو ہون کس شوق سے عرض کرنے　　خبر یہ نہین ان سے کیا چاہتا ہون

ارے رکھ ہنسی کو ہنسی ہی کی حد مین　　ہلاک تبسم ہوا چاہتا ہون

مین کب تک پھرون در بدر مارا مارا
ترے در پہ اب بیٹھنا چاہتا ہون

ارے اس طرف اک نظر بھی خدارا بہ پاس مروت بہ نام محبت

کہاں ان کی بزم طرب کے ہوں قابل یہ شوریدہ سر تلخ کام محبت

زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں لیکن نگہ دے رہی ہے پیام محبت

ہٹا سامنے اپنی مستانہ نظریں چھلکنے کو ہے میرا جام محبت

نہ رک ہائے قاصد نہ رک ہائے قاصد کہے جا کہے جا پیام محبت

چھپ سکیں گے حضور پھر کیونکر جو تصور میں لا کے دیکھ لیا

آج میں نے وہ چاند سا مکھڑا بکھری زلفیں ہٹا کے دیکھ لیا

اب تو چین آ گیا تجھے قاتل خاک و خوں میں لٹا کے دیکھ لیا

مجذوب اپنی حد سے بڑھا جا نہ جذب آ حضرت بہت نہ جلوۂ جاناں سے کھیلئے

لینے ہی دیتا اب نہیں کم بخت دم مجھے کب تک اب آہ اس دل ناداں سے کھیلئے

میرے دل تپاں سے یہ اچھی نہیں ہے چھیڑ ایسے نہ آپ شعلہ بداماں سے کھیلئے

مجذوب کی تیغ زبان کی چمک سب سے زیادہ شیخ و ناصح اور زاہد کے مقابلہ میں نظر آتی ہے،

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

میں مجذوب ہوں کچھ سمجھئے تو ناصح بھلا آپ کس کو یہ سمجھا رہے ہیں

کچھ تو ہو ای شیخ جی تلقین تو بہ کا عوض اور کیا خدمت کریں حضرت یہ حاضر جام ہے

اب میں تلقین تو بہ شیخ جی وقعت فرمان عالی جائے گی

رہئے تو کبھی رندوں میں ای شیخ زمانہ قائل ابھی حضرت کا یہ احقر تو نہیں ہے

اتنے خفا جو آپ ہیں سچ کہئے شیخ جی ایسے ہی کیا تھے آپ مقدس شباب میں

تشبیہات | حضرت مجذوب میں ادبی اختراع کا بھی مادہ تھا، اس لئے انھوں نے بعض پرانی تشبیہ

حسن استعمال سے چمکایا ہے، اور بہت سی نئی تشبیہیں پیدا کی ہیں، اور ان کی شاعری کی طرح ان کی تشبیہات میں بھی بڑی بلندی ہے بعض مثالیں ملاحظہ ہوں،

موے بدن کی تشبیہ شجرِ طور سے اور دل کی عرشِ بریں سے

یہ کون تصور میں مرے آج حسین ہے   ہر مو شجرِ طور ہے، دل عرش بریں ہے

دلِ سوزاں کی تشبیہ شمع سے اور ارمانوں کی پروانوں سے،

بھاگتا ہے دلِ سوزاں سے عبث ارمانوں   جس جگہ شمع گئی گھر گئی پروانوں سے

سودائے سر کی تشبیہ تاج سے اور داغ دل کی نگین سے

سر میں مرے سودا ہے کہ ہے تاج میں گوہر   دل میں ہے مرے داغ کہ خاتم میں نگین ہے

دل کے داغوں کی چراغاں سے،

اے سوزِ عشق تونے مجھے داغ کیا دیے   جیسے چراغ دل میں ہزاروں جلا دیے

چمن آرائی سے

دل میں گل عشق نے داغوں کے کھلائے تو بہت   اُن کی گلگشت کے قابل یہ گلستاں نہ ہوا

دل کی سمندر سے اور دیدۂ تر کی سحاب سے،

یہ دیکھ کر میرا دیدہ تر سمجھ لو خود حالِ قلب مضطر

کہ ہوگا کس جوش میں سمندر جو یہ تلاطم سحاب میں ہے

چین جبیں کی موجِ مے سے اور چشم خشمگیں کی شراب آتشیں کے جام سے،

مجھے اک موجِ مے ہے یہ تری چینِ جبیں ساقی   شراب آتشیں کا جام چشم خشمگیں ساقی

ایک نادر مرکب تشبیہ:-

ترساں سوار کشتیِ طوفاں رسیدہ ہیں   ارمان لرز رہے ہیں دل بے قرار میں

ڈھلکے ہوئے آنسو کی قطرۂ خارج از مے سے،

وہ کیا آنسو ڈھلک جائے جو اے دل دیدۂ تر سے   وہ قطرہ خارج از مے ہے چھلک جائے جو ساغر سے

ابر سیاہ کی زلف سے اور برق تاباں کی ساغر سے

یہ فصل گل یہ ابر سیاہ و برق تاباں ہو   کہ در کف ساغر و بر دوش زلف عنبرین ساقی

خلعت نو،

جنت کو جب چلے ہین اترا لباس تن   شاخون کو ملتے ہین نئے خلعت بہار مین

چشمۂ فیض:-

اشک باری سی اشک باری ہے   چشمۂ فیض ان کا جاری ہے

محاکات | محاکات یعنی کسی ظاہری و باطنی کیفیت یا منظر کی ایسی مصوری جس سے اس کی پوری تصویر نگا کے سامنے آجائے، بڑی مشکل چیز ہے، خواجہ صاحب کا کلام اس سے بھی خالی نہین ہے، اور جا بجا اس نہایت مکمل نمونے موجود ہین،

اُن کے یہ دو شعر

چڑھی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو   جوان آج پیر مغان ہو رہا ہے

دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہین آنکھین   بڑھاپے مین بھی جان جان ہو رہا ہے

جو انھون نے اپنے مرشد کی شان مین کہے تھے، اوپر نقل کئے جا چکے ہین، ان شعرون مین کیف باطنی مرشد کی سرشاری اور اس کے فروغ جمال کی کتنی مکمل تصویر ہے،

مشاہدۂ جمال سے خود رفتگی کی کیفیت،

یہ کون آ رہا ہے یہ کون آ رہا ہے   سنبھالو ارے مین گرا جا رہا ہون

سنبھالو، سنبھالو، سنبھالو سنبھالو   گرا جا رہا ہون گرا جا رہا ہون

حیرت کا مرقع

مین ہر سمت پھرتا ہون کھویا ہوا سا نہ جانے کسے ڈھونڈنا چاہتا ہون

کھڑا ہون مین چپ اس طرح آکے آگے کہ جیسے ابھی کچھ کہا چاہتا ہون

طریق عشق مین احتیاط

طریق عشق مین ہم یون سنبھل کے چلتے ہین کہ جیسے ہاتھ مین لبریز جام ہوتا ہو

اس تشبیہ سے رفتار کی احتیاط کی کتنی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے،

غلبۂ تصور کی کیفیت

کھولے ہوئے آغوش بڑھا اس سے مین ملنے اتنا تھا تصور کہ مین سمجھا نظر آیا

خواجہ صاحب کا کلام رنگارنگ پھولون کا ایسا صد بہار اور دلکش چمن ہے کہ اسکی پوری بہار ایک گلدستہ مین نہین دکھائی جا سکتی

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اس کی تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے اس لئے ان کی ایک طویل غزل کے منتخب اشعار پر جو ان کے اصلی رنگ کا مکمل نمونہ ہین، یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے،

انشاء اللہ آیندہ کسی فرصت مین دوسرے پہلوؤن کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کیجائیگی،

چند منتخب اشعار یہ غزل حضرت مجذوب نے غالباً اپنے مرشد کے وصال کے بعد کہی تھی، گو راقم کو اس کا علم نہین لیکن اشعار کا سوز و تپش شاہد ہے کہ یہ تاثرات کسی گہری چوٹ کا نتیجہ ہین،

حال مین اپنے مست ہون غیر کا ہوش ہی نہین رہتا ہون مین جہان مین یون جیسے یہان کوئی نہین

کوئی مزا مزا نہین کوئی ہنسی ہنسی نہین تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہین

اس دل زار سے مفر عشق مین جیتے جی نہین رونا ہے مجھ کو عمر بھر غم مرا عارضی نہین

ٹھہرے گا دل تھمین گے اشک آہ مگر ابھی نہین غم ہے یہ دل لگی نہین رونا ہے یہ ہنسی نہین

پیر مغان کا دم کہاں اس کی وہ بزم جم کہاں / بادہ نہیں تو ہم کہاں زیست یہ زیست ہی نہیں

جائیں بچشم نم کہاں روئیں اب اپنا غم کہاں / پہلے سے اب کرم کہاں ایسا تو اب کوئی نہیں

تو جو رہا نہ ساقیا پینے کا کیا مزہ رہا / پینا نہ غم زُبا رہا پی بھی تو میں نے پی نہیں

دل میں اگر حضور ہو سر تا خم ضرور ہو / جس کا نہ کچھ ظہور ہو عشق وہ عشق ہی نہیں

عشق کا حق ادا کیا حسن کے حق بھی کر ادا / عشق کا کچھ ہو مرتبہ حسن یہ برتری نہیں

پینے میں آگیا کہاں لپٹی ہیں اُڑ کے مستیاں / اتنی ہی تند مے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

پہلے تھا گریۂ و بکا اب ہے تحیر و خفا / رنگ وہی ہے بزم کا ہاں وہ ہما ہمی نہیں

ہجر کی شب عجب ہے شب حال یہ کیا ہے اے عجب / تارے ہیں روشنی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں

شیشہ ہے جام ہے نہ خم اصل تو رونقیں ہیں گم / لاکھ سجا رہے ہو تم بزم ابھی سجی نہیں

دیکھے جو خود کو عرش پر اس سے بھی قطع نظر کر / دل میں نہ ہو جو ان کا گھر یہ کوئی چیز ہی نہیں

کتنا ہی تو بڑا سہی یہ بھی ہے زاہدا آگہی / سمجھے جو خود کو منتہی وہ ابھی مبتدی نہیں

حسن کی بارگاہ ہے سہل کوئی نباہ ہے / آہ بھی اک گناہ ہے عشق ہے دل لگی نہیں

جب تری رونمائی تھی دولت درد پائی تھی / دل نے ازل میں کھائی ہے چوٹ یہ آج کی نہیں

بیٹھا ہوں میں جھکائے سر نیچی کئے ہوئے نظر / بزم میں سب ہی مگر وہ جو نہیں کوئی نہیں

مال و زر و دل و جگر کر دی سبھی کو وقفِ در / بندگی اور بقید سر ننگ ہے بندگی نہیں

اُن کی محبت آہ میں شوق بھری نگاہ میں / یعنی ابھی ہے راہ میں دل میں ابھی بسی نہیں

پاتا ہوں ان کو شک نہ کر جان سے بھی قریب تر / فرق ضرور ہے مگر حد کوئی قرب کی نہیں

اے مرے باغِ آرزو کیسا ہے باغ ہائے تو / کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگا کے اُن کی لو کر دی جہاں میں نشرِ ضو / شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

اسلامی نظریہ اجتماع

از

جناب مولوی حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی، پٹھان کوٹ

تصور اجتماع اور حیاتِ ملی | حیاتِ انسانی کے شعبۂ عمل کا ہر زاویہ انسان کی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کا مظہر ہے، بلکہ جولانِ طبع اور رفتارِ فکر کے ساتھ ساتھ زندگی کے عملی زاویے بھی متغیر ہوتے چلے جاتے ہیں، اور نقشۂ حیات کے خالی اور بے رنگ خانے بھی وارداتِ قلب کی رنگینیوں سے چمک اٹھتے ہیں، اور اس طرح فرد، اور جماعت کے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے،

یہ مسئلہ علم النفس (سائکالوجی) کے مسلمات سے ہے، کہ انسان کے قلب و جسد میں ایک نہایت گہرا اور پائدار تعلق ہے، اور بیشتر جسمانی اعمال و وظائف نفسیات ذہنی کے مظاہر ہیں، اور انسان کا ہر شعوری اور ارادی فعل اس کے نقوشِ قلب کے اجمال کا شارح ہے، بلکہ یہی وہ چھوٹا سا ٹکڑا ہے، جو حرکاتِ جسم کے لئے نقطۂ مرکزی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسی سے پورے جسم کا صلاح و فساد وابستہ ہے،

الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت	ہاں! جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا
صلح الجسد کله و اذا فسدت	ہے، کہ اس کے صلاح سے سارا جسم صالح
فسد الجسد کله الا وهی القلب	اور اس کے فساد سے سارا جسم فاسد ہو جاتا
(بخاری)	ہے، وہ کیا ہے؟ دل!

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے   کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

وہ چاہت اور محبت جس سے کون و مکان کی ہر چیز زندگی کی پر کیف مسرتوں سے سرشا
آتی ہے، اسی نہاں خانۂ دل میں قرار پکڑتی ہے، اور یہی وہ مرکز انوار ہے جس کی ضیا ریزیوں سے کا
کا ذرہ تابانی حاصل کر رہا ہے، اور حیاتِ انسانی کی بلند پروازیاں اسی طائر لاہوتی کے بال و پر کی

تپش می کند زندہ تر زندگی را

تپش می دہد بال و پر زندگی را (اقبال)

یہ کون نہیں جانتا کہ انسان کے ظاہر اور باطن میں ایک قسم کا برقی تعلق ہے، اور قلب
رَ و جسم کے ہر حصہ پر حاوی ہے، یہی وجہ ہے کہ خوشی کے وقت انسان کا چہرہ بشاشت و مسرت
اٹھتا ہے، اور اندوہ و غم سے ظاہر جسم پر غیر معمولی تکان اور بے چینی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں
خوشی اور غم قلبی کیفیات ہیں،

ہم جانتے ہیں کہ بھوک کا علاج غذا سے اور پیاس کا پانی سے ہوتا ہے، یہاں تک تو علم
درجہ ہے، اب بھوک لگنے پر غذا اور پیاس کے وقت پانی کا استعمال فعلیت کا درجہ ہے، گو
فعلیت علم و یقین کی شعاعوں کا عکس اولین ہے،

علم و یقین اور عمل میں وہی تعلق ہے، جو اشعۂ شمس اور نور وضیا میں ہے، جہاں سور
کی شعاعوں کی رسائی ممکن ہے، وہاں حسب استعداد و صلاحیت روشنی کا پایا جانا لازمی ہوا
کی قوت اور عکس پذیر اشیاء کی صلاحیت کے تناسب پر روشنی کی قوت وضعف کا انحصار ہے،
شعاعیں کسی لطیف، شفاف، اور چمکدار چیز پر پڑتی ہیں، تو وہاں حیرت انگیز چمک اور آنکھوں
کر دینے والی روشنی پیدا ہوتی ہے، اور اگر عکس پذیر اشیاء کے سامنے پردہ حائل ہو یا وہ خود
اور سیاہ رنگ ہوں، تو وہاں بھی یہ شعاعیں اپنا اثر تو دکھاتی ہیں، مگر وہ روشنی (لائٹ) نہ
ہوتی، بالکل اسی طرح قلب کی برقی لہر کی قوت اور جسم کی صلاحیت و استعداد کے توافق اور تو

حیاتِ شخصی اور حیاتِ اجتماعی کے آثار و نتائج وابستہ ہیں،

کأن الشقنشأ لینة هوعرقها

وحسن نبات الارض من کرم البذر

اس فعل و انفعال کا محل اوّل اگرچہ فرد ہے، مگر چونکہ حیاتِ ملی فرد کی حیات مشخصہ سے الگ نہیں، بلکہ قوم اور جماعت کی اجتماعی زندگی کا اصل ماخذِ حیات فرد ہی ہے، اس لئے جماعت کا وجود شخص کے وجود ہی کی ایک دوسری شکل ہے، اور جماعت کی ذہنی اور عملی استعداد درحقیقت افراد ہی کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے،

یا یوں کہنا چاہئے کہ شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اگرچہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، مگر جب تک اس کے کمالاتِ شخصی جماعت سے انضمام پذیر نہ ہوں وہ خود بھی اپنے کمالات سے متمتع نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کے ذاتی جوہر کی کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے، اس لئے فرد بہرحال اپنے کمالاتِ شخصی کی افادیت و اظہار میں جماعت کا محتاج ہے، اور جماعت جس طرح اپنے وجود میں وجود فرد کی محتاج ہے، اسی طرح اس کے مقدر کی تابانی فرد کی شعاع ریزیوں کی رہین منت ہے،

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

مگر دیکھنا یہ ہے کہ قلب کی یہ پر اسرار قوت کس طرح درجۂ کمال کو پہنچتی ہے، اور کس طرح فرد کی تکمیل ذات کا ذریعہ بنتی ہے؟ درحقیقت اس روحانی قوت کی اصلاح و تربیت صرف ایک چیز سے ہوتی ہے، جسے قرآن حکیم اپنے حکیمانہ انداز میں تقویٰ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسی تقویٰ کو سعادت ابدی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے، اور یہی حیاتِ ملی کی واحد اساس ہے،

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و جو شخص تقویٰ سے متصف ہوگا خدا وند تعالےٰ

وہ چاہت اور محبت جس سے کون و مکان کی ہر چیز زندگی کی پرکیف مسرتوں سے سرشار نظر آتی ہے، اسی نہاں خانۂ دل میں قرار پکڑتی ہے، اور یہی وہ مرکز انوار ہے جس کی ضیا ریزیوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ تابانی حاصل کر رہا ہے، اور حیات انسانی کی بلند پروازیاں اسی طائر لاہوتی کے بال و پر کی رہین منت ہیں،

تپش می کند زندہ تر زندگی را

تپش می دہد بال و پر زندگی را (اقبال)

یہ کون نہیں جانتا کہ انسان کے ظاہر اور باطن میں ایک قسم کا برقی تعلق ہے، اور قلب کی برقی رَو جسم کے ہر حصہ پر حاوی ہے، یہی وجہ ہے کہ خوشی کے وقت انسان کا چہرہ بشاشت و مسرت سے چمک اٹھتا ہے، اور اندوہ و غم سے ظاہر جسم پر غیر معمولی تکان اور بے چینی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں، حالانکہ خوشی اور غم قلبی کیفیات ہیں،

ہم جانتے ہیں کہ بھوک کا علاج غذا سے اور پیاس کا پانی سے ہوتا ہے، یہاں تک تو علم و یقین کا درجہ ہے، اب بھوک لگنے پر غذا اور پیاس کے وقت پانی کا استعمال فعلیت کا درجہ ہے، گویا مرتبۂ فعلیت علم و یقین کی شعاعوں کا عکسِ اولین ہے،

علم و یقین اور عمل میں وہی تعلق ہے، جو اشعۂ شمس اور نور و ضیا میں ہے، جہاں سورج کی شعاعوں کی رسائی ممکن ہے، وہاں حسب استعداد و صلاحیت روشنی کا پایا جانا لازمی ہو، اشعۂ منعکسہ کی قوت اور عکس پذیر اشیا کی صلاحیت کے تناسب پر روشنی کی قوت و ضعف کا انحصار ہے، جب یہ شعاعیں کسی لطیف، شفاف، اور چمکدار چیز پر پڑتی ہیں، تو وہاں حیرت انگیز چمک اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی پیدا ہوتی ہے، اور اگر عکس پذیر اشیا کے سامنے پردہ حائل ہو یا وہ خود کثیف اور سیاہ رنگ ہوں، تو وہاں بھی یہ شعاعیں اپنا اثر تو دکھاتی ہیں، مگر وہ روشنی (لائٹ) نہیں پیدا ہوتی، بالکل اسی طرح قلب کی برقی لہر کی قوت اور جسم کی صلاحیت و استعداد کے توافق اور توازن ہی سے

ور حیاتِ اجتماعی کے آثار و نتائج وابستہ ہیں،

کن الشئ نشأ لینۃ ھو عرقھا

وحسن نبات الارض من کرم البذر

ں فعل و انفعال کا محل اوّل اگرچہ فرد ہے، مگر چونکہ حیاتِ ملی فرد کی حیات مشخصہ سے الگ
قوم اور جماعت کی اجتماعی زندگی کا اصل ماخذ حیات فرد ہی ہے، اس لئے جماعت کا وجود
وجود ہی کی ایک دوسری شکل ہے، اور جماعت کی ذہنی اور عملی استعداد درحقیقت افراد ہی
ہنوں کی آئینہ دار ہے،

یا یوں کہنا چاہئے کہ شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اگرچہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، مگر جب تک
کمالات شخصی جماعت سے انضمام پذیر نہ ہوں وہ خود بھی اپنے کمالات سے متمتع نہیں ہو سکتا،
اس کے ذاتی جوہر کی کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے، اس لئے فرد بہرحال اپنے کمالاتِ شخصی کی
، و اظہار میں جماعت کا محتاج ہے، اور جماعت جس طرح اپنے وجود میں وجود فرد کی محتاج ہے،
رح اس کے مقدر کی تابانی فرد کی شعاع ریزیوں کی رہین منت ہے،

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

مگر دیکھنا یہ ہے کہ قلب کی یہ پراسرار قوت کس طرح درجۂ کمال کو پہنچتی ہے، اور کس طرح
تکمیل ذات کا ذریعہ بنتی ہے؟ درحقیقت اس روحانی قوت کی اصلاح و تربیت صرف ایک
ے ہوتی ہے، جسے قرآن حکیم اپنے حکیمانہ انداز میں تقویٰ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے،
وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسی تقویٰ کو سعادت ابدی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے، اور یہی حیاتِ ملی
واحد اساس ہے،

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و جو شخص تقویٰ سے متصف ہوگا خدا اس کیلئے

ویرزقہ من حیث لا یحتسب (آیہ) اس کے لئے زندگی کی شاہراہیں کھولدیگا اور نا معلوم ذرائع سے اس کی ضرورتوں

تقوی دراصل ایک قرآنی اصطلاح ہے، اور اس کا اطلاق قلب کی اس کیفیت پر ہوتا ہے، جو انسان کو نوامیس فطرت کے احترام، اقدار شریعت کے اتباع اور حدود واحکام کی خلاف ورزی سے اجتناب پر آمادہ کرتی ہے، اس کی موجودگی میں انسان کا کوئی قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھ سکتا بلکہ قدم اٹھانے سے پہلے اسے اپنے ضمیر، الٰہی دستور اخلاق اور نوامیس شریعت سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے، یہی وجہ ہو کہ قرآن حکیم اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن پر تقوی کا رنگ نمایاں ہونا چاہئے، یہاں تک کہ انسان کے لئے حقیقی لباس اسی تقوی کو قرار دیا ہے:

یا بنی آدم قد انزلنا علیکم	اے آدم کے بیٹو! ہم نے تمھارے لئے
لباسا یواری سواٰتکم وریشا	لباس اتارا، جو تمھاری شرمگاہوں کو
ولباس التقوی، ذالک خیر	چھپاتا ہے، اور تمھارے لئے زینت بھی ہے،
(انعام)	لیکن یاد رکھو تقوی کا لباس بہترین لباس ہے،

اور عشق و محبت کی دور دراز منزلوں کو طے کرنے کے لئے زاد سفر بھی یہی تقوی ہے،

تزودوا فان خیر الزاد التقوی	زادِ راہ تیار کرو، اور بہترین زادِ راہ
(بقرہ)	تقوی ہے،

نیز مقام رفعت تک اگر انسان کی رسائی ہو سکتی ہے، تو صرف تقوی سے دوسری کوئی چیز نہیں جو اسے کامیابی کی منزل تک پہنچا سکے،

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم (حج) قربانی کے گوشت اور خون کو بارگاہ خداوندی میں رسائی نہیں ہو سکتی، وہاں تک تو صرف تقوی

وادیِ عشق اگر دور و دراز است ولے طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

اور یہی وہ قوتِ قاہرہ ہے جو فولادی قلعون کو پاش پاش کر دیتی ہے، اور تنہا غلبہ و تسلط کی ضامن ہے

مراحلِ عشق کو طے کرنے اور زمین و آسمان کی وسعتون پر چھا جانے کے لئے یہی پر اسرار قوت کام آتی ہے؛

یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا و یکفر عنکم سیئاتکم ۰ (انفال)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو خدائے قدوس تمھارے اندر بے پناہ معجزانہ قوت (قوت فارقہ بین الحق والباطل) پیدا کرے گا، اور تمھاری لغزشون کو معاف کریگا؛

تیغے کہ آسمانش از فیضِ خود دہد آب تنہا جہان بگیرد بے منتِ سپاہی

اسی تقوی سے سیرت مین پختگی اور اعمال مین نظم پیدا ہوتا ہے،

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولاً سدیدا یصلح لکم اعمالکم (احزاب)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچی بات کہو، خدا تمھارے اعمال مین درستگی پیدا کردے گا،

غرض تقوی اپنے وسیع معنی کے اعتبار سے تمام انسانی افکار و اعمال پر حاوی ہے، اور زندگی کا کوئی زاویہ اس کے اثر و نفوذ سے خالی نہین، یہان تک کہ اطاعت و ایثار جو حیاتِ اجتماعی کے لوازم ہین، اسی تقوی سے حاصل ہوتے ہین،

واتقوا اللہ واصلحوا ذات بینکم واطیعوا اللہ ورسولہ ان کنتم مؤمنین (انفال)

اللہ سے ڈرو، اپنے معاملات کی اصلاح کرو، اور خدا و رسول کی اطاعت کرو،

اس مین کوئی شک نہین کہ جب تک ظاہر و باطن کی اصلاح نہ ہو جائے، جو تقوی کا اصل منشا ہے، حقیقی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو ہی نہین سکتا، یہی وجہ ہے کہ آیت مین تقوی کے بعد اصلاح اور اصلاح

کے بعد اطاعت کا ذکر ہوا ہے،

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ انسانی تصورات قوم وملت کے تعمیری ارکان مین خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہین، بالخصوص وہ اجتماعی نظریے جو فرد کے دائرۂ وجود سے آگے نکل کر جماعات پر اثر انداز ہوتے ہین، اپنی عمومی حیثیت سے صرف جماعتی فکر اور جماعتی کردار مین تبدیلی پیدا کرتے ہین، اور تصورِ اجتماع بھی انہی عمومی تصورات سے ہے، جو جماعتی سیرت اور جماعتی نظم کی تعمیر مین سب سے زیادہ موثر ہین، یعنی قوم وملت کے صلاح وفساد مین سب سے زیادہ اسی کو دخل ہے، اور اسی سے مدنیت صالحہ مدنیت فاسدہ کی تخلیق ہوتی ہے، اگر داعیۂ اجتماع کو فطرت سے کامل مناسبت ہوگی، تو اس سے ایک صالح مدنیت اور صالح طرزِ اجتماع عالمِ وجود مین آئے گا، اور پھر اس حضارت اور مدنیت (سولیزیشن اینڈ کلچر) سے ایک صالح اور مہذب سوسائٹی کی تکوین ہوگی جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مثالی (آئیڈیل) حیثیت کی مالک ہوگی، اور اس کا وجود ساری دنیا کے نظم پر اثر انداز ہوگا، بلکہ کائنات عالم کے حقیر سے حقیر ذرے بھی اس کی ضیاباریون سے چمک اٹھین گے.

اور متضادِ فطرت نظریۂ اجتماع سے جس ہئیت اجتماعی کی تشکیل ہوگی، وہ نوعِ انسانی کو تباہی کی طرف لے جائے گی، یہانتک کہ ساری دنیا اس کے ناپاک وجود سے ہلاکت وبربادی کے جہنم مین جا پڑے گی، کسی نظریۂ اجتماع کے صلاح وفساد کا یہی ایک معیار ہے جس سے اس کے حسن وقبح کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مگر اقوامِ حاضرہ ان حقائق سے دانستہ یا نادانستہ بے اعتنائی کر رہی ہین جس کے تلخ نتائج سے آج ان کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے،

انسان کو جس قدر اپنی عقل ودانش اور فہم وادراک پر فخر ہے، اس کے بجائے اگر اس کی ذرا بھی کم مائگی اور عجز وبےبسی پر ہوتی، تو عالمِ انسانی اس عالمگیر اضطراب اور جبر وتشدد کی دستبرد سے محفوظ ہوتا، عدل وانصاف اور امن ومساوات کی اس طرح ہرگز رسوائی نہ ہوتی، جیسے کہ آج ہو رہی

مگر خود بینی و خود فریبی انہیں فطرت سے بے اعتنائی اور ظالمانہ طرز اجتماع نے آج اسے یاس و حرمان اور حسرت و ناکامی کے ایسے بحر نا پیدا کنار میں ڈھکیل دیا ہے، جہاں سے اس کی نجات امر موہوم ہو کر رہ گئی ہے،

مگر تعجب ہے کہ حضرتِ انسان کچھ اس طرح زمان و مکان کے طلسم میں کھو گیا ہے، کہ ان دہشتناک خونین منظر کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے طرزِ عمل پر غور نہیں کرتا، اور فضائے عالم میں پھیلی ہوئی تاریکیوں "ظلمات بعضها فوق بعض" میں بھی حق و صداقت کی شعاعِ تابان "نورمبین" کی طرف نہیں آنا چاہتا، کیا اس سے بڑھکر بھی انسان کی سیاہ بختی اور شومی قسمت کا تصور کیا جا سکتا ہے ؟ کہ ہلاکت و بربادی کے تیرہ و تار بادل سر پر منڈلا رہے ہیں مگر اس کی غلط روی میں سرمو فرق نہیں آتا، عذابِ الٰہی کی بجلیاں لگاتار کوندرہی ہیں، مگر یہ خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوتا،

سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق، (حم سجدہ ع ۷) — ترجمہ: ہم ان منکران حق کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاقِ عالم اور عالمِ انفس میں یہانتک کہ ان کو کتاب اللہ کی صداقت

دوسری جنگِ عظیم کے نتائج نے آج کائناتِ انسانی کو جن مصائب سے دوچار کر دیا ہے وہ کم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور ابھی ایک تیسری جنگ کے لئے مادہ پک رہا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ آیندہ جنگ کے نتائج کیا ہوں گے؟ اور دنیا کی بڑی سلطنتوں (گریٹ امپائرز) کا آیندہ نقشہ کیا ہوگا ؟

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک بینم و ہیچ ندانم کہ چسان می بینم (اقبال)

موجودہ تصادم اقوام کس نتیجے پر منتج ہوگا، اور دنیا کی آیندہ حالت کیا ہوگی؟ اس کے متعلق ابھی سے کچھ کہنا مشکل ہے، ہاں! کتاب و سنت کی روشنی میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے، کہ موجودہ عالمگیر اضطراب و بےچینی اسی ذہنیت فاسدہ اور ظالمانہ طرز اجتماع کا قدرتی معاکسہ عمل (ری ایکشن) ہے،

ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت — بحر و بر کا ہمہ گیر فساد انسانون کی لگاتار

ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی — بدعنوانیون اور بداعمالیون کا نتیجہ ہے تاکہ

عملوا لعلھم یرجعون، — خدا ان کو ان کی بدکرداریون کا مزہ چکھائے

(آیہ) — شاید وہ اس طرح حق کی طرف رجوع کرین،

آج اس عذاب الٰہی کے مناظر ہمارے سامنے ہین جس کے امثال و نظائر کتب سماویہ مین اقوام سابقہ کے تذکرون مین ملتے ہین، آپ کو دور جانے کی ضرورت نہین، قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے اس حقیقت باہرہ کا پتہ چلتا ہے، کہ خدائے قدوس کی مخفی اور پراسرار قوتین ہر وقت اپنے مین مصروف اور مناسب وقت کی منتظر رہتی ہین،

ولا تحسبن اللہ غافلا عما یعمل — تم اللہ کو ان ظالمون کی بدکرداریون سے

الظالمون، (آیہ) — غافل تصور نہ کرو،

قرآن کریم دنیا کے انسانون کو متنبہ کر رہا ہے، کہ سنن الٰہیہ اور مکافات عمل کے قدرتی نتائج غور کرو اور اقوام سابقہ کی تاریخ (ہسٹری آف نیشنز) کو امعان نظر سے دیکھو، اور سوچو کہ ہم نے ان ظالم اقوام سے کیا سلوک کیا ؟

وسکنتم فی مساکن الذین ظلموا — تم بھی ان ظالم انسانون کی بستیون

انفسھم وتبین لکم کیف فعلنا — مین رہ رہے ہو، اور تمھین معلوم ہو چکا ہے

بھم وضربنا لکم الامثال، — کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا، اور عبرت

(ابراھیم) — و موعظت کی مثالین تمھارے لئے بیان کر دی ہین

قدرت کا قانون کیا ہے ؟ جب انسانی آبادی ظلم و عدوان، جبر و قہر، زر پرستی، خود غرضی، اور غصب حقوق انسانی سے مضطرب ہو جاتی ہے، تو خدا کی انتقامی قوتین حرکت مین آجاتی ہین، پھر کہ

ہوتا ہے، آبادیون پر قہر الٰہی نازل ہوتا ہے، اور تمام بستیان ویرانون اور کھنڈرون کی شکل مین تبدیل ہو جاتی ہین، یہ عذاب الٰہی کبھی آسمان کی بلندی سے اُترتا ہے، کبھی زمین کے نیچے سے اُبل پڑتا ہے، اور کبھی اقوام عالم مین حسد و رقابت کی چنگاریان سلگنے لگتی ہین، اور ان کو خطرناک طبقاتی جنگ (کیپٹل وار) مین مبتلا کر دیا جاتا ہے، جس کی شعلہ باریون سے انسانون کے ردی اور فاسد عناصر کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور بقائے اصلح کے قدرتی تصور کے مطابق وہ صالح عناصر باقی رہ جاتے ہین، جو صحیح طور پر خدا کی زمین مین امن و مساوات اور عدل و انصاف کی ضائع شدہ متاع سے دنیا کو روشناس کرتے ہین، اور اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے بحر و بر پر چھا جاتے ہین،

قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ	خدائے قدوس اس پر قادر ہے کہ بلندی
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ	سے عذاب اُتارے یا زمین کے
اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ	نیچے سے یا تم کو کئی حلقون مین تقسیم
بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (انعام - ۸)	کرکے آپس مین ٹکرا دے،

اقوام سابقہ کی بہت سی مثالین قرآن حکیم نے وضاحت سے بیان کر دی ہین، جو ارتکاب منکرات کی وجہ سے قدرت کے بطش شدید مین آئین، اُن کے پُررونق شہر، سربفلک عمارتین اور اموال و املاک کو ایک ہی لمحہ مین پیوند خاک کر دیا گیا، اور بستیان اس طرح ویران ہوئین کہ اس کے بعد پھر کبھی آباد نہ ہو سکین،

لَمْ تُسْکَنْ مِّنْ بَعْدِھِمْ اِلَّا قَلِیْلًا (قصص - ۶)

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ان قومون کی تباہی کی وجہ سے نوامیس فطرت کی توہین اور ان کے طرز اجتماع کا فساد و اختلال تھا، اُن کے فکر و عمل اور طریق تمدن مین رخنہ پیدا ہو گیا تھا، اور ضابطۂ اخلاق کی کڑیان ڈھیلی پڑ گئی تھین،

وَکَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ بَطِرَتْ	بہت سی ایسی بستیان جنھون نے فطری

معیشتها فتلك مساكنهم لم تسكن	طرزِ معیشت کے حدود توڑ دیئے تھے، ہم نے
من بعدهم الا قليلا ه	اُن کو ہلاک کیا، اب یہ اُن کے مکانات ہیں
(قصص)	جو غیر آباد اور سنسان پڑے ہیں، اور اُن کے
	بعد بہت ہی کم آباد ہوئے،
اذا اردنا ان نهلك قرية امرنا	جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں
مترفيها ففسقوا فيها ،	تو اس میں بہت سے امرا پیدا کر دیتے
(آیہ)	ہیں، یا ان کی دولت بڑھا دیتے ہیں جس کا
	لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

یہاں اَمَرنا کے معنی اَکثرنا کے لئے گئے ہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کی جو تفسیر نقل کی گئی ہے، اس میں انھوں نے امر کے معنی کثرت کے بیان فرمائے ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں :-

کنا نقول للحی اذا کثروا فی الجاهلیة	زمانۂ جاہلیت میں جب کسی قبیلہ کے افراد
اَمِرَ بنو فلان ،	بڑھ جاتے تھے، تو ہم کہتے تھے، کہ فلان
(بخاری کتاب التفسیر)	قبیلہ کے لوگ بڑھ گئے،

قرآن کریم میں ہر قوم کی دو حالتیں دکھائی گئی ہیں، ایک حالت یہ ہے کہ وہ قوانین طبعی (لاز آف نیچر) کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے، اخلاق و سیرت، حضارت و تمدن اور معاشی اعتبار سے بہت اونچی سطح پر کھڑی ہے، امن و خوش حالی اور یسر و فراغ کے تمام وسائل اسے میسر ہیں، اور آزادی و حریت کی نعمت سے مالامال ہے،

اور دوسری حالت یہ ہے کہ دولت و ثروت کی فراوانی اور سامانِ معیشت کی کثرت نے اُسے

اندھا کر دیا ہے، اور اب وہ نشۂ دولت مین مخمور اور نوامیس مذہب سے بے نیاز ہو چکی ہے، اخلاقی قیود و اقدار اور طبعی قوانین سے آزاد اور خلاف فطرت شہوات کی غلام بن چکی ہے بس اجتماع و سوسائٹی کی یہی وہ ناقابل اصلاح حالت ہے جس سے قدرت کا ضابطہ انتقام حرکت مین آجاتا ہے،

وکذلک اخذ ربک اذا اخذ	خدا ے بزرگ و برتر کی پکڑ ایسی ہی ہے
القریٰ وھی ظالمۃ ان اخذہ	جب کہ وہ ظالم اقوام کو پکڑتا ہے بیشک
الیم شدید، (ہود - ۹)	اس کی پکڑ بہت سخت اور دردناک ہے

مثال کے طور پر قوم سبا کا جہان ذکر آتا ہے تو پہلے اس کی حالت فراغ کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا گیا ہے،

لقد کان لسبإ فی مسکنھم	قوم سبا کے لئے ان کے اپنے وطن مین
آیۃ جنتان عن یمین و	قدرت کی نشانی موجود تھی، (یعنی زمین سو
شمال کلوا من رزق ربکم واشکروا	مربع میل تک) داہین بائین باغ ہی باغ
لہ بلدۃ طیبۃ ورب غفور	تھے، اور اُن سے کہدیا گیا تھا کہ خوب کھاؤ
(سبا)	اور خدا کا شکر کرو، رہنے کو پاکیزہ شہر اور
	رب معاف کرنے والا ہے،

مگر اس کے بعد ان کی دوسری حالت کا جس رنگ مین تذکرہ کیا گیا ہے، وہ بھی ملاحظہ کرین،

وظلموا انفسھم فجعلناھم	انھون نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اور ہم نے
احادیث ومزقناھم کل ممزق	اُن کو (حقیقت سے) افسانہ بنا کر رکھدیا، اور
(سبا)	اُن کے ٹکڑے اُڑا دیئے،

ومزقت سبا فی کل ناحیۃ   فما التقی رائح بینھم بمتبکر   (ابن عبدون)

یعنی ملک کے ہر حصہ مین سبا کے پندے اڑا دیئے گئے، اور کسی جمع کرنے والے کو ان کی ہوا بھی نہ لگ سکی،

اقوامِ حاضرہ کا طرزِ اجتماع اور طریقِ سیاست بھی اسی مرحلہ پر پہنچ چکا ہے، اور یہ صرف مین ہی نہین کہتا، بلکہ خود اہلِ مغرب کے اہلِ دماغ اور سنجیدہ طبقے، اس امر کا اعتراف کرتے ہین، کہ آج یورپ کی سیاست و مدنیت ایک خطرناک حالت کو پہنچ چکی ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ اقوامِ مغرب کی مادہ پرستی جذبۂ زر پرستی، اور مذہب و روحانیت سے قطعِ تعلق ہے، جس نے ان اقوام کو اخلاقی قیود و اقدار اور نوامیسِ فطرت کی پابندی سے بے نیاز کر دیا ہے، اور عالمگیر اخوتِ انسانی کئی گروہون مین تقسیم ہوکر رہ گئی ہے، اور اسی چیز نے اُن کو دائمی اضطراب و بے چینی اور شورش و بدامنی کے بے کنار سمندر مین ڈھکیل دیا ہے، یہان تک کہ آج وہ خود ہی اس جدید مہلک تمدن کے ہاتھون سخت مصائب کا نشانہ بن چکے ہین، اور آنے والے خطرات اُن کی آنکھون کے سامنے منڈلا رہے ہین، اس ہلاکت خیز تمدن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے ہر چند یہان کے اہلِ فکر حضرات کوشش کر رہے ہین، مگر اب جب اس مدنیتِ فاسدہ کی لہرون نے یورپ کو اپنی لپیٹ مین لے لیا ہے، کوئی کوشش کامیابی کی منزل کو نہین پہونچ سکتی، چنانچہ مشہور فرانسیسی مصنف فیرنس جیا فرت (Fierens Geavert) اپنی کتاب الغمۃ الحاضرۃ (Latristesse contemporaine) مین رقمطراز ہے، جو لوگ فقر و فاقہ اور رنج و مصیبت مین مبتلا ہین، اُن کے دلون مین بغض و عناد اور عداوت و دشمنی کی چنگاریان پہلے سے زیادہ مشتعل ہو رہی ہین، اور اسی اندازہ کے ساتھ سرمایہ پرست طبقون مین کبر و نخوت کا جنون بڑھتا جا رہا ہے، اور یہ ترقی پذیر الحاد ہماری جماعات کے جذبات حریت و مساوات کو ایک دائمی اور شدید انتقامی جذبہ مین تبدیل کر دیا گیا، ہم یہ سمجھے بیٹھے ہین کہ نوعِ انسانی کے مصائب کا ان خزائن سے مداوا کر سکین گے، جو ایک زمانہ سے ہمارے آگے پڑے ہین، جتنے علماے مہندسین صناع میکانکیا (میکینکس) حیاتِ دنیوی کے عروج کے لئے جان توڑ کوشش مین مصروف ہین، مگر ان اکتشافات

سے صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ عوامی طبقے بھی اس متعدی مرض کا شکار ہو رہے ہیں،

(مجلۃ الازہر ربیع الاول ۱۳۵۵ھ)

غرض اس طرح کے بہت سے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں، مگر ہم نہیں چاہتے، کہ اصل مقصد سے ہٹ کر دور از کار باتوں میں الجھ جائیں،

یہاں تک تو صرف کتاب اللہ سے استشہاد کیا گیا ہے، اور آیاتِ بینات سے ثابت کیا گیا ہے، کہ منافی فطرت تصور اجتماع سے جو مدنیت فاسدہ اور ظالمانہ طرز اجتماع عالم وجود میں آتا ہے، وہ کائناتِ انسانی کو سخت خطرات و مہالک میں مبتلا کر دیتا ہے، اب ہم احادیث و آثار سے بھی اس سلسلہ میں چند شہادتیں پیش کرتے ہیں،

عن عبادۃ بن الصامتؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اللہ اذا اراد بقوم بقاءً او نماءً رزقھم السماحۃ والعفاف واذا اراد بقوم اقتطاعاً فتح علیھم باب خیانۃ ثم قرء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنا ھم بغتۃ فاذا ھم مبلسون ه (اخرجہ ابن عساکر)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی قوم کا بقا یا اس کا نشو ونما منظور ہوتا ہے، تو اس میں فیاضی اور عفت و پاکدامنی کی طرح کی صفات پیدا کر دیتا ہے، اور جب کسی قوم کو ختم کرنا مقصود ہوتا ہے، تو اس پر خیانت، بددیانتی اور اس قسم کے صفاتِ ذمیمہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، حتی اذا فرحوا بما اوتوا (الآیہ)
عن علی قال ان اللہ فرض علی الاغنیاء فی اموالھم ما یکفی فقراءھم و	اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار فرض کی ہے، جو غربا

ان جاعوا وعروا وجهدوا فبمنع
الاغنياء وحق على الله ان يحاسبهم
يوم القيامة ويعذبهم،
(اخرجه البيهقي وسعيد ابن منصور
في سننه)

کے لئے کافی ہو سکے، اس کے باوجود اگر
وہ بھوکے اور ننگے ہوں، تو یہ صرف دولتمندوں
کے بخل کی وجہ ہی سے ہوگا، اور اللہ نے
اپنے پر یہ لازم قرار دیا ہے، کہ ان امراء سے
قیامت کو محاسبہ لے، اور ان کو عذاب دے"

جس طرح قوموں کے طرز اجتماع کا فساد و اختلال اُن کی تباہی کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح صالح طرز اجتماع نظام عالم کے بقاء اور قوم وملت کی فلاح و نجات کو مستلزم ہے،

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے اس مشہور واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے،

یہود خیبر نے حضرت عبداللہؓ ابن رواحہ کو بیش بہا زیور اور کافی مال رشوت کے طور پر دینا چاہا اور آپ سے درخواست کی کہ مالیہ کی رقم میں کچھ تخفیف کر دی جائے، اس موقع پر عبداللہؓ بن رواحہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا، اور پھر یہود کی زبان سے بے ساختہ جو الفاظ نکلے وہ بعینہٖ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

فقال عبد الله ابن رواحه يا معشر
اليهود انكم لمن ابغض خلق الله
الي وما ذاك بحاملي على ان احيف
عليكم فاما ما عرضتم من الرشوة
فانها سحت وانا لا ناكلها
فقالوا بهذا قامت السموات و
الارض، (موطا امام مالک)

اے یہود کے گروہ! تم خدا کی مخلوق میں میرے
نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت ہو مگر یہ
نفرت مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ
میں تم پر ظلم کروں اور تم نے میرے آگے جو
رشوت پیش کی ہے وہ حرام قطعی ہے میں اس کو
ہرگز نہیں کھاؤں گا، یہ سن کر یہود پکار اُٹھے
کہ اسی عدل اور دیانت و امانت سے زمین
(و آسمان قائم ہیں)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اس زمانہ میں ہوا جب کہ اقوام عالم میں حسد و رقابت کی چنگاریاں پوری قوت سے مشتعل ہو رہی تھیں، اور وہ ایک خطرناک طبقاتی جنگ میں مبتلا تھیں، طبقہ امراء کا جذبۂ زرپرستی حد انتہا تک پہنچا ہوا تھا، اور پس ماندہ طبقے ان ظالم اور سفاک انسانوں کے پنجہ ہائے استبداد میں جکڑے ہوئے تھے، مگر سردار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی مقدس کوششوں نے اس جاہلی نظام اجتماع کے پرزے اڑا دیئے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء کے پندار و غرور کو مٹانے اور غریب طبقوں کو ابھارنے کے لئے جو کامیاب جد و جہد فرمائی، اس کے نتائج روز روشن کی طرح واضح ہیں، ایک موقع پر آپ نے غرباء کی عظمت شان کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا،

هل تنصرون وترزقون الا بضعفاءکم، (بخاری)

اے طبقہ امراء غریبوں کی بدولت ہی تمھیں ہر قسم کی مدد اور روزی ملتی ہے،

مجھے آیندہ مباحث میں یہ بتانا ہے کہ یہ تمام مفاسد و معائب جو موجودہ اجتماع انسانی میں پائے جاتے ہیں، اُن کا اصل سرچشمہ کیا ہے ؟ مگر اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی روش فکر اور ان کے طرز اجتماع میں تبدیلی پیدا کرنے والے کیا اسباب ہیں، اور کس طرح مسلمانان عالم بالعموم اور مسلمانانِ ہند بالخصوص اسلامی طریق فکر و عمل کو ترک کر کے غیر اسلامی سیاست و اجتماع کے دام ہمرنگ زمین میں الجھ کر رہ گئے ہیں،

یا یہ کہ جاہلی افکار و نظریات کس کس راستہ سے اسلامی نظریۂ اجتماع میں نفوذ کر کے اس کے فساد و اختلال کا موجب بنے ہیں، (باقی)

گھکڑنامہ

از
مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورناکلر سوسائٹی، احمد آباد،

۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء کا دن میرے لئے یادگار رہیگا، اسی دن احمد آباد مین انسانی خون کی ارزانی شروع ہوئی، اور اسی دن مین اپنے وطن جانے کے لئے مع اہل وعیال پابرکاب تھا، اسٹیشن جانے کے لئے گاڑی آچکی تھی، کہ اچانک میرے دوست راجہ گلزار خان تشریف لائے، اور ایک کتاب دیکر ترجمہ کی فرمایش کی، بات کرنے کی بھی فرصت نہ تھی، اُن سے کتاب لیکر رکھ لی، اور وطن چلاگیا،

مئی سنہ ۱۹۴۳ء مین واپسی کے بعد کتاب کا مطالعہ شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ یہ گھکڑون کی تاریخ ہے، اسی زمانہ مین ایک اور کتاب مرقاۃ الوصول شیخ احمد کھٹوی کے حالات مین دستیاب ہوگئی، جس کی عرصہ سے مجھے تلاش تھی، مین نے دونون کا ترجمہ ایک ساتھ شروع کردیا، لیکن چند ہی دنون مین معلوم ہوگیا کہ دو گھوڑے کی سواری بیک وقت ناممکن ہے، اس لئے مرقات کو چھوڑ کر تاریخ گھکڑ کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کردی[۱]،

موقرہ رسالہ معارف جون سنہ ۱۹۴۳ء مین ایک سوال گھکڑون کے متعلق نظر سے گذرا، جس مین جناب محمد اسلم صاحب (بکرانہ ضلع جہلم) نے گھکڑون کی اصل دریافت کی تھی، دل مین آیا کہ اس کا تحقیقی جواب لکھکر بھیجدون، پھر خیال آیا کہ پہلے اس کا ترجمہ ہوجائے تو بہتر ہے، سنہ ۱۹۴۴ء مین اس اہم کام سے فارغ ہوگیا، لیکن کارِ دنیا نے مہلت نہ دی کہ اس پر قلم اٹھاؤن، خدا کا شکر ہے کہ اب اس کا موقع ملا

---

[۱] اب یہ کتاب مرقات بھی مع مقدمہ کے تیار ہوگئی ہے، اور عنقریب پریس مین جانے والی ہے؛

جو ہدیۂ ناظرین ہے،

نام کتاب | کتاب کا نام "کے گوہر نامہ" ہے، متوسط تقطیع، خط نستعلیق صاف، کاغذ دیسی صفحات زائد از دو سَو، زبان فارسی، ابتدا میں حمد و نعت ہے، پھر ایک مقدمہ میں مصنف نے اپنا ذاتی حال لکھا ہے، اور اس کتاب کی وجہ تصنیف بتائی ہے، مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس کے چند حصّے ہیں جن کو مختلف بابوں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر باب میں ایک خاندان کا حال تحریر کیا ہے، اس وقت تک اس کتاب کے چند نسخوں کا پتہ چلا ہے، ایک جناب گلزار احمد خان بی اے راولپنڈی، دوسرا رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، تیسرا برٹش میوزیم لندن (ریوج ۳ ص ۱۱۲) چوتھا راجہ گلزار خان احمد آباد، اور کل نسخے منقول ہیں اصل کتاب سے جو گلیانہ (راولپنڈی) میں ہے،

مصنف کا مختصر حال | کتاب کا اصل مصنف رائے زادہ دونی چند برہمن عرف پال ہے، جو بہادر خان کے عہد (۱۱۳۷ھ) میں قانون گوئی کے عہدہ پر ممتاز تھا، گلیانہ تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی اس کا وطن مالوف تھا، سات سال کی عمر تھی، کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگیا، عام دستور کے مطابق فارسی کی معمولی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد درندوں کے شکار، پرندوں کے شکار اور موسیقی کی طرف توجہ کی، اس وقت اس کی عمر پندرہ سال کی تھی، پھر نیزہ بازی، تیر اندازی، لاٹھی، بنوٹ اور پٹہ بازی سیکھی، اس کے بعد گھوڑے کی سواری کی مشق بہم پہنچائی، اور آخر میں طب کی چند کتابیں پڑھ کر حکیم ہوگیا، اور کشتہ بنانا شروع کیا، چونکہ اُس کی طبیعت سیمابی واقع تھی، استقلال سے اس پر بھی قائم نہ رہ سکا، اور آخر اپنے باپ کی جگہ متصدیوں میں داخل ہوگیا، یہ دلاور خان گکھڑ کا عہد تھا، اور روشن علی خان اوس کا دیوان مصنف کی اس سے نہ بنی، اور آخر ایک دن اچانک اس کو گرفتار کرکے قید کر دیا، جب رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو پیران پیر حضرت عبدالقادر جیلانی کے وسیلہ سے دعا مانگی، جو مقبول ہوئی، چونکہ گکھڑ ابھی

ا غالباً مصنف کی عمر اس وقت ۱۸-۲۰ برس کی ہوگی،

آستانہ کے نیازمندون مین سے تھے، اس لئے ہر شخص نے اس رہائی کو اُن کی کرامت سے تعبیر کیا، مصنف لکھتا ہے، کہ اسے بغداد جاکر زیارت کا بے حد شوق پیدا ہو گیا، اور بغیر سامان سفر کے چل پڑا، مدت کے بعد بغداد مین داخل ہوا، اور بارہ سال رہ کر موے مبارک کے ساتھ اپنے وطن پوٹ ہار واپس ہوا، مگر یہان دل نہ لگا، اس لئے بلوٹ، ملتان، جھنگ سیال، خوشاب، بھیرہ، گجرات، وزیرآباد، سودھرا، سیالکوٹ، کی سیر کرتے ہوئے جمون پہنچا، وہان راجہ کے مصاحبون مین داخل ہو کر خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگا۔[۱]

ایک دن مجلس مین جمون، جسروٹھ، ہنڈور، اور کھلورہ کے راجے جمع تھے، اسی اثنا مین ڈھاری (مراثی) آئے، ستار اور سنے کے ساتھ رزمیہ نظمین گانے لگے، جن مین ان کے بزرگون کی شجاعت بیان کی گئی تھی،

مصنف کا بیان ہے کہ مجھ سے نہ رہا گیا، اور لشکر خان ولد سلطان آدم کے جمون پر حملہ کا ذکر کر دیا، ان لوگون نے انکار کیا، اس دن تو مین گھر واپس آگیا، اور فہرگل میراثی کو بلا کر گکھڑون کا نسب نامہ مرتب کرکے اس کو یاد کرایا، لیکن پھر چند دنون کے بعد اس مجلس مین سب کے سامنے فہرگل سے سب حالات بیان کرائے، دلائل اور شواہد سے ان کو منوایا، اس کے بعد راجہ کا دل مجھ سے صاف نہ رہا، اس لئے بغیر اطلاع وہان سے چل کر سلطان بودھا خان کے قلعہ مین پہنچا، اس نے میری بڑی عزت افزائی کی، اس درمیان مین فہرگل میراثی سلطان مبارز خان کے دربار مین عید کے دن حاضر ہوا، اور اس نے وہ سب کچھ سنایا، جو جمون کے راجہ کے سامنے بیان کیا تھا، اور مصنف کے حالات سے بھی آگاہی دی، سلطان نے فوراً طلبی کا فرمان سلطان بودھا خان کے پاس بھیجا، اُس نے مصنف کو سلطان کے پاس بھیج دیا، جہان سلطان مبارز خان نے بڑی عزت افزائی کی، اور خلعت سے سرفراز فرما کر ارشاد کیا، کہ فردوسی نے شاہان عجم کو زندہ کیا، گکھڑون کی تاریخ لکھ کر تم شاہان کے (خاندان کے خسرو) کو زندہ

[۱] مصنف کی ولادت ۱۱۰۰ھ اور ۱۱۱۰ھ کے درمیان ہوئی، اور جب جمون پہنچا، تو ۳۵، اور ۴۰ کے درمیان عمر ہوگی،

کرڈالو، مصنف کا بیان ہے کہ اگرچہ ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت پیغمبر شعرا فردوسی طوسی کی اتباع میرے لئے ناممکن تھی، لیکن حکم حاکم کی تعمیل بھی ضروری تھی، اس لئے ۱۱۳۱ھ بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی موافق ۱۳ سنہ جلوس ماہ ذوالقعدہ یکشنبہ کے دن اس کی ابتدا کر دی، اور اسی سال کے آخر مین اس کتاب کو ختم کرکے اس کا نام "کیگوہر نامہ" رکھا، اس کے بعد اس کا تتمہ اس کے لڑکے راے زادہ برج ناتھ نے تحریر کیا، اور اس کی اولاد مین سے رتن چند نے اس کا تکملہ انگریزون کے عہد تک لکھ کر اس کو مکمل کر دیا،

کتاب فارسی زبان مین ہے، اور چونکہ راے زادہ دونی چند مصنف کتاب عرصۂ دراز تک ایران اور بغداد مین مقیم رہا، اس لئے یہ تو نہین کہہ سکتا، کہ وہ اہل زبان کی طرح لکھتا ہے لیکن اس مین بھی کوئی شک نہین کہ وہ بہترین الفاظ مین پسندیدہ استعارات کے ساتھ، اپنے مطلب کو شیرین طور پر ادا کرتا ہے کتاب نثر مین ہے لیکن جگہ جگہ نظم کے موتیون سے اس طرح اس کو پرو دیا ہے، کہ پڑھنے والے کے دل کی کلی کھل جاتی ہے، ابتدا مین اس نے زیادہ تر فارسی اشعار دیئے ہین لیکن جون جون وہ آگے بڑھتا جاتا ہے، اس پر وطنیت غالب آتی جاتی ہے، اور اشعار پوٹھاری زبان مین لکھتا گیا ہے، یہانتک کہ وہ آخر مین صفحے کے صفحے لکھتا چلا گیا ہے، اور اسی پر اس کا خاتمہ ہے،

مواد تاریخ گکھڑان اس تاریخ کا مواد مصنف کو کہان سے دستیاب ہوا، اس کا ذکر صریح طور پر مصنف نے کہین نہین کیا، صرف دو کتابون کا تذکرہ کیا ہے، ایک تاریخ فتح خانی مصنفہ مرزا قابل خان ابن مرزا زمان خان، اور دوسری تاریخ بڈھالان ہے یہ دونون گکھڑون کی ضمنی تاریخین ہین، بہت ممکن ہے کہ اسی طرح کی اور ضمنی تاریخین مصنف کے پیش نظر ہون، اغلب ہے کہ مندرجۂ ذیل شکلون سے اس کا مواد موجود ہوگا (۱) خاندانی کرسی نامہ (نسب نامہ) (۲) دیوانی دفتر کے کاغذات (۳) خاص خاص واقعات کی یادداشت (۴) مشہور جنگون کی رزمیہ نظمین جو بھاٹون نے بنائین (۵)

خاص حکمرانوں کے مشہور واقعات جو خاص و عام کے زبان زد تھے، (۲) اور بہت ممکن ہے کہ کوئی مختصر سی تاریخ بھی اس کو دستیاب ہوگئی ہو، جو اس کے پیش نظر ہو "تاریخ اقوام کشمیر، پنجاب جنھیں سرلیپل گریفین اور جہلم ضلع کے گزیٹیر میں بھی کسی ایسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، جو اس کتاب کے ماخذ پر روشنی ڈال سکے،

لفظ گکھڑ کی اصلیت | مصنف کے بیان کے مطابق اس لفظ کی اصلیت کے گوہر ہے، جو بانی خاندان کا اصلی نام تھا، اس ملک کے لب ولہجہ نے بدل کر گکھڑ کر دیا، ممکن ہے کہ یہ بیان صحیح ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اسی کتاب کے صفحہ ۱۹ پر شاہ قابل (کابل) کے پانچ لڑکے مولف نے لکھے ہیں، ان میں سے بڑے کا نام گکھڑ ہے، جس کو باپ کے بعد ملک کی سرداری ملی، اس لئے اغلب یہی ہے کہ اسی کے نام سے آگے چل کر قوم مشہور ہوگئی،

تاریخ کی ابتداء | مؤلف نے تاریخ کی ابتداء اس طرح کی ہے، کہ

"سلطان کے گوہر جو کیکاؤس، کیقباد، اور قیصر کا ہم عصر تھا، وہ صفاہان کا بادشاہ تھا، کیکاؤس کی تخت نشینی انہی سردار ان کیانی کی ممنون تھی"

ظاہر ہے کہ اس وقت ایران میں عراق عرب سے لے کر ترکستان کی سرحد تک صرف ایک ہی خود مختار سلطنت تھی، جس کا شہنشاہ کےخسرو یا کیقباد تھا، اور فردوسی کا مشہور ہیرو "رستم" اس کا قوت بازو تھا، پس صفاہان کا کوئی خود مختار بادشاہ تو ہو نہیں سکتا، اس لئے جس طرح خود رستم باوجود اس قدر عروج کے زابلستان پر ایک باجگذار کی حیثیت سے شاہ ایران کی طرف سے حاکم تھا، اسی طرح کے گوہر بھی صفاہان کا حاکم ہوگا،

مؤلف نے آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ سلطان کید بن کیگوہر کو فتح ممالک کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بڑے سامان کے ساتھ اس نے ملک تبت پر حملہ کیا، اور فتح کرکے وہیں مقیم ہوگیا، اس کا لڑکا سلطان تبت،

پھر سلطان جنت، سلطان شجار، سلطان مارگ، سلطان بہرو مند، سلطان نیظر، سلطان قالب، سلطان دولت، سلطان خان، سلطان قاب ہوا، یہ کل گیارہ پشتین تبت مین حکومت کرتی رہین،

مؤلف کا یہ بیان کہ کیگوہر کے لڑکے سلطان کید کو فتوحات کا شوق ہوا، ممکن ہے کہ صحیح ہو، کیونکہ فردوسی کے بیان کے مطابق کے کاؤس کی ساری زندگی فتوحات اور مدافعت مین گذری، اور فرشتہ کا خیال ہے کہ شمالی ہند ہمیشہ ایران کا باجگذار رہا، اور جب کبھی خراج مین غفلت کی گئی، ایرانی فوج نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا، اس لئے ہو سکتا ہو کہ انہی حملہ آورون کے ساتھ کیگوہر بھی آیا ہو اور اسی جگہ رہ پڑا ہو، جیسا کہ آج تک ہندوستان کے فاتحون کا دستور رہا، جن مورخون نے یہ لکھا ہے کہ گھگڑ قوم پہلی دفعہ محمود غزنوی کے ساتھ آئی، وہ یقیناً خلاف واقعہ ہے، کیونکہ فرشتہ نے تفصیل سے تحریر کیا ہے، کہ انند پال (راجہ پنجاب) سے محمود غزنوی جنگ آزما ہوا، تو گھگڑ قوم انند پال کے ساتھ تھی، اور ایک دن تو بڑی جان فروشی کے ساتھ سلطانی فوج مین گھس کر تین چار مسلمانون کو شہید کر گئی،[1] لیکن صحیح ترین اور قرین قیاس وہ روایت مجھے معلوم ہوتی ہے، جو فرشتہ نے ابراہیم غزنوی کے حالات مین تحریر کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ ۴۷۲ھ مین ابراہیم غزنوی پنجاب پہنچا، پہلے اجودھن، پھر قلعہ ردپال کو فتح کیا، (اس قلعہ کو میرے خیال مین کشمیر کے نیچے راولپنڈی اور جمون کے درمیان ہونا چاہئے) اس کے بعد وہ شہر درہ کی طرف بڑھا، اس مین خراسانی نسل کے لوگ آباد تھے، درہ کے عام باشندے ان سرکش خراسانیون کی یادگار تھے جو افراسیاب کے حملون کے باعث ہندوستان ہجرت کر گئے تھے، گو خود یہ شہر بڑا آباد تھا لیکن باشندے بت پرستی مین مبتلا تھے، اس شہر مین ایک حوض (تالاب) تھا جس کا قطر ایک میل تھا، اور اس کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ تھاہ کا بالکل پتہ نہ چلتا تھا، اس حوض مین پانی اس کثرت سے جمع ہوتا تھا کہ باوجودیکہ حیوان انسان سب ہی سال بھر تک استعمال مین لاتے تھے، مگر کم نہ ہوتا تھا

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص۴۰ حیدر آباد،

شہر کے چاروں طرف گنجان جنگل تھے، اس لئے شہر بھی دکھائی نہ دیتا تھا[1]، میرے خیال میں یہ وہ گکھڑ تھے، جو کابل نہ گئے، اور اسی جگہ مقیم رہ گئے، جس کا ذکر آگے آئے گا،

فرشتہ کی تائید خود اس کتاب سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ مولف لکھتا ہے کہ

"تاریخ بڈھالاں میں لکھا ہے کہ ملک دھن جس جگہ آج آباد ہے، ایک زمانہ میں کشمیری ڈل کی طرح زیرآب تھا، اکبر بادشاہ نے اس کو پسند کرکے آباد کرنے کا حکم دیا، ملوک چند قانون گو اس کام کے لئے متعین کیا گیا، ان لوگوں نے گھوڑی گالہ کی طرف سے پانی نکال ڈالا، اور خشک ہونے پر کئی گاؤں آباد کئے، اور گھوڑی گالہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چند سوار اس کی گہرائی معلوم کرنے کے لئے اس میں گھس گئے، لیکن چونکہ وہ خاصہ گہرا تھا، اور کیچڑ زیادہ، گھوڑی اس میں پھنسکر غرق ہوگئی، اور سوار بڑی مشکل سے جان بر ہوا، اسی لئے گھوڑی گالہ کے نام سے یہ مقام مشہور ہوا"

مندرجۂ بالا تحریروں سے سلسلہ کی کڑی اس طرح مل سکتی ہے کہ کیقباد کے عہد میں گیگوہر اصفہان کا حاکم ہوگا، اور کیخسرو کے عہد میں افراسیاب کی ترک تازیوں کو روکنے کے لئے خراسان کی سرحد پر بھیجا گیا ہوگا، اور آخر شکست کھاکر یا تنگ آکر خراسان سے زیریں کشمیر آگیا ہوگا، اور پھر جب استقلال حاصل ہوگیا ہوگا، تو تبت پر مستقل قبضہ کرکے سلطنت جمائی ہوگی، کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہندوستان میں غیرملکی برابر داخل ہورہے تھے،

ایک بات اور توجہ کے قابل ہے، اور وہ حکمرانوں کے نام ہیں، اولی تو ان سب کے ساتھ "سلطان" کا لفظ لگا ہوا ہے، جو قطعاً صحیح نہیں، اور جیسا کہ راقم الحروف تاریخ ہند جلد دوم میں لکھ آیا ہے کہ تاریخ میں سلطان محمود غزنوی سے قبل اس معنی میں یہ لفظ قطعاً رائج نہ تھا، سلطان محمود پہلا شخص ہے، جس کے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۷۷، ۱۰، (حیدرآباد)

نام کے ساتھ اس لفظ کا اضافہ کیا گیا اس لئے یہ محقق سمجھو کہ سلطان کا لفظ مولف نے اپنے آقا کی شان بڑھانے کے لئے استعمال کیا ہے، مؤلف نے سلطان کید کے لڑکے کا نام "سلطان تبت" تحریر کیا ہے' ظاہر ہے کہ سلطان تبت لقب ہوا نہ کہ نام، پھر یہ بھی تاریخون سے واضح نہین ہے، کہ تبت کس زبان کا لفظ ہے[1]، اور ۲½ ہزار سال قبل اس ملک کو تبت ہی کہتے تھے، یا اس کا دوسرا نام کچھ اور تھا، اس کے بعد جس قدر نام آتے ہین، کوئی اصلی رنگ مین نہین ہے، سب نے فارسی اور عربی قالب اختیار کر لیا ہے، اس کی مثال تاریخون مین بکثرت ہے، اسلامی تاریخون مین نوشیروان کا عدل مشہور ہے، اور بزرجمہر کی وزارت سے کون ناواقف ہے لیکن ہر مورخ جانتا ہے کہ اصل نام کی یہ بگڑی اور عربی قالب مین ڈھلی ہوئی شکل ہے، گجرات کا پایۂ تخت نہروالہ اسلامی تاریخ مین آپ کو ملے گا لیکن ہر گجراتی جانتا ہے کہ اس کی اصل انہل واڑہ ہے،

تاریخ فرشتہ کا مقدمہ اگرچہ کچھ زیادہ اعتماد کے قابل نہین ہے، پھر بھی ۲½ ہزار سال قبل کی تاریخ جو اس نے سنی ہوگی، یا کہین پڑھی ہوگی، وہی اوس نے درج کی ہے، اُس نے لکھا ہے کہ خاندان تنشکل کی سلطنت ختم ہونے پر مارواڑ کے ایک سردار نے طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر سلطنت پر قبضہ کر لیا، اور چالیس سال حکومت کر کے جب فوت ہوا، تو اس کا بھانجا کیدراج حاکم ہوا، رستم کے مارے جانے سے پنجاب مین جو ضعف آیا، تو کیدراج نے موقع پاکر قبضہ کر لیا، اور شہر بھیرہ مین قیام کر کے جمون کا قلعہ بنوایا، اور اپنے ایک عزیز کو جو گھگڑا مین سے تھا، وہان کا حاکم بنایا، اس تاریخ سے آج تک ۱۰۱۵ھ

---

[1] کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل سنسکرت مین "تروِشٹپ" ہے، (ترِ ؛ ترِوِش ٹ پ ا) اور اسی سے کثرت استعمال کے باعث "تروتپ" پھر "تبوت" اور آخر "تبٹ" ہوا، مسعودی نے اس کو تبع شاہ یمن کے فتوحات کی یادگار بنا کر لفظ "تُبّت" بضم اول لکھا ہے، لیکن مورخین کا ابھی اس پر بھی اتفاق نہین ہے، کہ یہ لفظ اصل سے سنسکرت ہی ہے،

یہ قلعہ اس فرقہ کے قبضہ مین ہے، پھر گھکڑون نے ہمسایون سے اتحاد کرکے کیدراج کی سلطنت پر حملہ کیا، آخر عاجز آکر اُس نے اُن لوگون کی خود مختاری تسلیم کر لی، اور اس وقت سے یہ قوم مختلف سرداران کے ماتحت پنجاب کے کوہستانون مین آباد ہے ظاہر ہے کہ وہی قوم افغان ہے[1]

مؤلف نے بھی کیگوہر کے لڑکے کا نام "کید" لکھا ہے، اور فرشتہ نے گشتاسپ شاہ ایران کا ہم عصر بتایا ہے، اس لئے تجزیہ کرنے سے ترتیب اس طرح قائم ہوگی، کہ "کے گوہر" کی اولاد مین سے "کیدراج" جو تبت کا حاکم تھا، اس کی بہن سے مہاراج کچھوا ہہ (سردار مارواڑ) نے شادی کی، اور باثر ہونے کے باعث مہاراج کے مرنے پر خود اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا، اور کیدراج گھکڑون مین سے تھا، اس کی تائید فرشتہ کے اس بیان سے ہوتی ہے، کہ

"کیدراج نے پنجاب اور جمون پر قبضہ کر لیا، اور جمون کا قلعہ بنا کر کے اپنے ایک عزیز کو جو گھکڑون مین سے تھا، وہان کا حاکم بنایا، اور آج تک لوگ اس پر قابض ہین"،

اور یہ واقعہ ہے کہ گھکڑ فرشتہ کے زمانہ تک ان علاقون پر قابض رہے، بلکہ آج بھی جمون کے نیچے کے علاقون مین یہ سب پھیلے ہوئے ہین، اور فرشتہ کا یہ کہنا، کہ ظاہر ہے کہ یہی قوم ہے، جسے افغان کہتے ہین صریح غلط ہے، کیونکہ آج تک افغان اور گھکڑ دو علٰحدہ قومین رہی ہین، اور دونون مین کبھی اتحاد اور مراسم شادی وغیرہ نہین ہوئے، بلکہ ایک دوسرے کے مخالف رہے،

پھر فرشتہ نے لکھا ہے کہ کیدراج نے ۴۳ برس حکومت کی، اور اس کے مرنے پر اس کے سپہ سالار تیج خند نے حکومت پر قبضہ کر لیا، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ کیدراج کے خاندان سے شمالی ہند کی سلطنت نکل گئی، صرف جمون اور زیرین جمون اس کے قبضہ مین رہ گیا،

مؤلف لکھتا ہے، کہ سلطان کید کی گیارہوین [illegible] سلطان [illegible] نے موقع پاکر

---

[1] فرشتہ [illegible] ص ۲۳ حیدر آباد،

کشمیر پر قبضہ کرلیا، اور چک قوم کا سردار تنو ہر نامی نے اپنی لڑکی کی شادی سلطان تاب کے لڑکے فرخ نامی سے کردی، اس سے یزداد اور اس کا لڑکا نور بدر، اور اس کا فرزند سلطان مراد، اور اس کا نواسہ نظر سلطان بختیار، پھر اس کا بیٹا سلطان عالم، اور اس کا لخت جگر سلطان سمند تخت نشین ہوا، اس کے بعد سلطان محراب اور پھر سلطان رستم ہوا، اور آخرمین سلطان قابل، یہ سب تخت کشمیر پر دنق افروز ہوئے۔

یہ بات قابلِ تحقیق ہے کہ چک قوم اس وقت موجود تھی، یا نہین، کیونکہ تاریخ مین چک قوم کا ذکر سلطان زین العابدین کے بعد آتا ہے، ممکن ہے کہ اس سے چک قوم کے آباو اجداد مراد ہون، اور بعد مین وہ چک کے نام سے مشہور ہوئے ہون،

تاریخ کشمیر کے مطالعہ سے مولف کے اس بیان کی تائید نہین[1] ہوتی، البتہ یہ ممکن ہے کہ حملہ کرکے کشمیر کے کسی حصہ پر قابض ہوگئے ہون، اور چونکہ جمون کشمیر مین داخل ہے، اس لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ گھگڑ نے کشمیر پر حکومت کی، آگے چل کر مؤلف لکھتا ہے کہ کشمیریون نے موقع پاکر سلطان رستم کو قتل کر ڈالا، اور سلطان قابل وہان سے کابل چلا گیا، اور تیاری کے بعد اُس نے دوبارہ کشمیر فتح کیا،

ظاہر ہے کہ کشمیر سے کابل چلے جانے کے یہ معنی ہوئے کہ یہ شکست خوردہ قوم اپنے ہمسایہ ملک پر اچانک (یا پناہ گزین کے طور پر) قابض ہوگئی، کیونکہ اس سے قبل قبضۂ کابل کا کوئی تذکرہ خود ان کی تاریخ مین بھی نہین آتا، یہ بہت ممکن ہے کہ یہان اپنی حالت درست کر لینے کے بعد انھون نے دوبارہ کشمیر پر حملہ کیا ہو، لیکن یہ قطعی ہے کہ وہان وہ حکومت جما نہیں سکے، یہ صرف انتقامی حملہ ہوگا، کیونکہ اس کے بعد حکومتِ کشمیر کا کوئی ذکر مؤلف نے اپنی کتاب مین نہین کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کشمیریون کو شکست دیکر اور لوٹ مار کرکے یہ لوگ واپس ہوگئے، اس کی جزدی تائید فرشتہ سے بھی ہوتی ہے، کلامِ دیو راجہ نے جمون فتح کرلیا، اور جمون کا راجہ بھاگ گیا، اس کے تعاقب مین فوج روانہ کی گئی، آخر عاجز آکر

---

[1] تاریخ کشمیر قلمی کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد،

معافی کا خواستگار ہوا، جو قبول ہوئی، اور راجہ اپنے لڑکے کی شادی ان کی لڑکی سے کرکے واپس گیا[۱]
غالباً اُس نے جمون پر اپنے لڑکے کو حاکم بنا دیا ہوگا، جہان بظاہر رام دیو کے لڑکے کی حکومت ہوگی، اُنہ
بباطن سسرالی لوگ (گھکڑ) قابض ہون گے، میرا خیال ہے کہ اسی کو مؤلف نے دوبارہ فتح کشمیر سے
تعبیر کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے، کہ رام دیو کے مرنے پر خانہ جنگی کے باعث
جو بدامنی ہوئی، اس سے فائدہ اٹھا کر گھکڑون نے حملہ کرکے انتقام لیا ہو، یہ سب قیاسی باتین ہین، جن
کی صحت اور عدم صحت کا پہلو مساوی ہے،

مؤلف نے آگے چل کر لکھا ہے کہ رستم کا لڑکا سلطان قابل ہوا، جو کابل پر مستقل قابض تھا، میرے
خیال مین سلطان قابل کا اصلی نام کچھ اور ہوگا، اور یہ لفظ در اصل "سلطان کابل" ہے، جس کو نام کی شکل
دیکر سلطان قابل کر دیا ہی،

البتہ قبضۂ کابل کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مؤلف کے اس بیان کی تائید ابوریحان بیرونی
کی تحریر سے بھی ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ

> " کابل مین بھی ہندوؤن کے راجہ تھے، جو ترک تھے، کہا گیا ہے، کہ ان کا خاندان تبت کا تھا،
> ان مین کا پہلا شخص "برہتگین" نامی تھا، جو کابل کے ایک غار مین کھانا لے کر داخل ہوا، غار کے
> اندر پانی موجود تھا، وہ کچھ دن وہان رہا، اس نے پہلے ہی سے کچھ کاشتکارون کو ملا لیا تھا
> جو وہان آس پاس ہر وقت موجود رہتے، چونکہ غار کا راستہ بہت ہی تنگ تھا، اس لئے وُ
> اس وقت جب کہ تمام لوگ موجود تھے، اس غار مین سے لیٹ کر ایسا ہی نکلا، جیسے مان کے
> پیٹ سے بچہ نکلتا ہے، لوگون نے اس کو مقدس سمجھ کر اپنا سردار بنایا، اس کا لباس ترکون
> جیسا تھا یعنی قبا، ٹوپی، موزہ اور ہتھیار، لگائے تھا، اس کا لقب شاہ کابل رکھا، اس نے

---

[۱] فرشتہ جلد اوّل ص ۴۲، حیدرآباد،

اس علاقہ پر کامل تسلط حاصل کر لیا، اور کئی قرن تک اس کی سلطنت رہی، اس خاندان کو شاہیہ خاندان کہتے ہیں، اور نگرکوٹ کے قلعہ میں ریشم پر ان کا نسب نامہ موجود ہے، مجھے اس کے دیکھنے کا بڑا شوق تھا، لیکن بعض وجوہ سے محروم رہا"

اس کے بعد بیرونی نے لکھا ہے کہ

"پشاور کا اصلی راجہ گنگ (گنگا) تھا، اس کے خاندان کا آخری راجہ "لک تورمان" ہوا، جس سے اس کا وزیر کلر برہمن نے سلطنت چھین لی، اس خاندان کا پہلا خود مختار راجہ سامند (سمند) ہوا، پھر کملو بعدہ بھیم، پھر جے پال، انند پال، تروجن پال ہوا، جو ۴۱۲ھ میں قتل کیا گیا، اور اس کے پانچ سال کے بعد اس کا بیٹا بھیم پال قتل ہوا، اور اسی پر اس خاندان کا خاتمہ ہو کر مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی، اس کا پایہ تخت لاہور تھا، اور کابل کی سرحد لمغان تک اس کا راج تھا"[۱]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ جس وقت گھگڑوں کا قبضہ کابل پر ہوا، اس وقت لمغان سے اٹک تک خاندان جے پال، اور پنجاب سے لے کر بہار تک راجہ قنوج حاکم تھا، پھر پنجاب راجہ قنوج کے قبضہ سے نکل کر خاندان جے پال کے طاقت ور ہاتھوں میں چلا گیا، مصنف نے لکھا ہے کہ ۳۶۹ھ میں ناصر الدین سبکتگین میں اور شاہ کابل میں صلح ہو گئی، اور ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے، اور بیرونی نے بتایا ہے کہ شاہ کابل کی سلطنت ساٹھ برس رہی، اس حساب سے کابل پر گھگڑوں کا قبضہ چوتھی صدی کی ابتدا (۳۰۰ھ) میں ہوا،

بلاذری نے لکھا ہے کہ عہد معاویہ میں مہلب بن ابی صفرہ نے تقریباً ۵۰ھ میں کابل فتح کیا، (ص ۴۰۲) اس کے چلے جانے کے بعد شاہ کابل نے مسلمانوں کو نکال دیا، پھر عبد اللہ بن ابی بکرہ والی سجستان نے

---

[۱] کتاب الہند للبیرونی، باب ۴۹ کا آخری حصہ (تواریخ کا اجمالی بیان) مطبوعہ لیڈن،

کابل والون سے صلح کرلی جس کے معنی یہ ہوئے کہ شاہ کابل اپنی جگہ پر مستقل رہا، یزید کے مرجانے پر کابل والون نے غدر کیا، اور ابو عبیدہ بن زیاد کو گرفتار کرلیا، اور جب اس کی آزادی کے لئے فوج بھیجی گئی، تو سردار یزید بن زیاد شہید ہوگیا، پھر طلحۃ الطلحات نے پانچ لاکھ فدیہ دیکر ابو عبیدہ کو رہا کرایا، اس کے بعد مامون الرشید متوفی ۲۱۸ھ کے عہد مین کابل فتح ہوا، اور شاہ کابل مسلمان ہوگیا،[۱]

بیرونی اور بلاذری دونون کے بیان سے واضح ہوا کہ مسلم شاہ کابل کا خاندان تیسری صدی کے آخر تک حکمران رہا، اور اس کے بعد گھکڑون کا اس پر قبضہ ہوگیا،

مؤلف نے لکھا ہے، کہ یہ سلطان کابل غزنہ کے امیر سبکتگین کا ہم عصر ہے، ظاہر ہے کہ یہ سلطان کابل وہ نہین ہوسکتا جس نے ۲۳۰ھ کی ابتدا مین کابل پر قبضہ کیا تھا، بلکہ اسی خاندان کا دوسرا کوئی فرد ہوگا، اور ممکن ہے کہ کابل کی آب و ہوا کی موافقت سے عمر طویل پائی ہو، غرض کابل اور غزنہ کے دونون امیرون مین لمغان کے مقام مین خوب جنگ ہوئی، اور آخر مین صلح ہوگئی، اور دونون کے حدود مقرر ہوگئے، مؤلف کے اس بیان کی تائید گو صریح طور پر فرشتہ سے نہین ہوئی،

تاہم فرشتہ کے بیان کے مطابق سبکتگین کا پشاور تک آکر حملہ آور ہونا اور پڑوس کے مشہور شہر کابل سے درگذر کرنا صریح دلیل اس بات کی ہے کہ دونون مین کوئی معاہدہ ہوگیا تھا، مورخ جوزجانی نے بھی سبکتگین کے واقعات مین کابل کے متعلق کوئی تذکرہ نہین کیا ہے[۲] (باقی)

---

[۱] کتاب البلدان بلاذری ص ۴۰۹ مصر [۲] طبقات ناصری ص ۸ و کلکتہ

اعلان

خط کتابت یا چندہ بھیجتے وقت مراسلہ یا کوپن پر نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کرین ورنہ تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر نہ عائد ہوگی،

"مینیجر"

ادبیات

قطعۂ تاریخ فتح پاکستان

از

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب حسرت شروانی حبیب گنج علی گڑھ

بفضل و رحمتِ ربّی باہل دین شدہ حاصل
ظفر بر ملک پاکستان زہے طالع زہے قسمت
"مبارک فتح پاکستان بپاکان با دتا رحشر"
۱۳۶۶ھ
بُریدہ فرقِ بدر اختر تم گفتہ بصد فرحت

اعلان

یکم جنوری ۱۹۴۷ء سے مستقل تاجرون کے لئے کمیشن پر پندرہ فی صدی، اور دوسری مطبوعات پر بیس فی صدی کردیا گیا ہے، اب اس کے متعلق خط و کتابت بے سود ہو گی،

"منیجر"

مطبوعات جدید

مشاہدات و معارف ترجمہ فیوض الحرمین، از جناب پروفیسر محمد سرور ناشر سندھ ساگر اکادمی نمبر ۵ ٹمپل روڈ لاہور حجم ۱۱۰ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی قیمت : للعہ ر

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ کی فیوض الحرمین، اہل علم مین عام شہرت رکھ خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر محمد سرور کے پختہ کار قلم سے یہ رسالہ اردو زبان مین منتقل ہو گیا ہے، مترجم اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ بھی لکھا ہے، جس مین کتاب کے مطالب و مباحث کے خلاصہ یا لب لبا کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے، نیز مترجم نے کتاب مین مندرج ایسے واردات مشاہدات کو جو موجودہ زمانہ کے مذاق سے بظاہر کچھ بے میل معلوم ہوئے، ان کو نئے زمانہ کی زبان طرز اسلوب بیان مین سمجھانے کی کوشش کی ہے، یہ تاویلات بحث و نظر کے لئے محل نظر بن سکتے ہیں ترجمہ نہایت سلیس، روان اور شستہ ہے، اور اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ شراب کہنہ جام نو مین ا متناسب اور خوش مذاقی سے پیش کی گئی ہے، کہ اس پر زمانہ حال کی ایک بہترین تصنیف ہونے کا خیا ہوتا ہے، ہم لائق مترجم کو اس خدمت پر مبارکباد دیتے ہین، امید ہے کہ اہل علم کے حلقہ مین ا و قبولیت حاصل ہوگی،

اسلام کا نظام سیاست و عدالت : از مولوی یعقوب الرحمن صاحب عثمانی، حجم ۲۵۶ صفحے، تقطیع چھوٹی ناشر نفیس اکیڈیمی، عابد روڈ، حیدرآباد دکن، قیمت :- عہ ر

مصنف نے اس تصنیف مین اسلام کے نظام سیاست و عدالت پر تفصیلی گفتگو کی ہے

دکھایا ہے کہ اسلام مین سیاست کا مطمح نظر اجتماعی زندگی مین عدل وانصاف کو قائم کرنا ہے، اس سلسلہ مین سیاست کے متعلق اسلامی تعلیمات، خلفاء، سلاطین اور عام مسلمان عہدہ دارون کے تاریخی واقعات اوران کے نتائج کو پیش کیا ہے، مصنف کی یہ محنت لائق ستایش ہے، کہ اسلامی نظام سیاست پر روشنی ڈالنے والے اچھے خاصے واقعات کا مواد یکجا ہو گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کو نظم و ترتیب سے پیش کرنے اوران مین تصنیفی ربط پیدا کرنے کی بڑی حد تک کمی رہ گئی ہے، بایں ہمہ اسلامی نظام سیاست کے تصور کا ایک خاکہ اور اسلامی حکومت مین غیر مسلمون کی حیثیت اوران کے حقوق کے مباحث نگاہون کے سامنے آجاتے ہین، نیز مباحث پر گفتگو کرنے مین ایک قسم کا انتشار اور بے ترتیبی بھی ہے، مثلاً ایک جگہ اسلام مین سیاست کے مقام پر گفتگو ہے، اسی جگہ لالہ ہردیال کی کتاب "مذاہب وانسانیت" سے استشہاد لایا جاتا ہے یا اسلامی حکومت کے تصور پر گفتگو ہے، تو ارسطو افلاطون اور ابوالبقاء کے نظریے ایک ساتھ اور پھر روسو اور ابن تیمیہؒ کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے، یہی مواد جو اس مین یکجا ہو گیا ہے محض نظم و ترتیب اور نتائج اخذ کرنے کی زحمت اٹھا کر نئے سرے سے اس کو مرتب کیا جائے، تو اسلامی نظام سیاست پر یہ بہترین کتاب بن سکتی ہے، نیز ضرورت تھی کہ سیاست کے متعلق کتاب وسنت کے متن اور عہد رسالت کے واقعات کو ایک خاص باب مین پیش کیا جاتا،

کتاب کا دوسرا باب اسلام کے نظام عدالت پر ہے، اس مین اسلامی نظام عدالت اس کے قوانین اور طریق انفصال مقدمات کو بیان کرنے کے سلسلہ مین فصل مقدمات کی بکثرت مثالین درج کی گئی ہین، واقعات کی بہتات اوران مین ربط ونظم کی کمی اس باب مین بھی موجود ہے، بایں ہمہ مصنف نے جس عرق ریزی سے واقعات یکجا کئے ہین، اور جابجا اُن سے جو نتائج اخذ کئے ہین، وہ خود اپنی جگہ لائق ستایش ہے اُمید ہے کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

جہانگیر کا روزنامچہ حصہ اول از جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی، حجم ۱۱۲ صفحے تقطیع

چھوٹی، ناشر خواجہ اولاد کمپنی دہلی، قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ

جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کی روزنامچہ نویسی کو عام شہرت حاصل ہے، خواجہ صاحب موصوف نے اسی انداز مین "تزک جہانگیری" کا اردو ترجمہ "جہانگیر کا روزنامچہ" کے نام سے شائع کیا ہے، جسمین جہانگیر کی پیدایش سے تخت نشینی تک کے حالات قلمبند ہو گئے ہین، خواجہ صاحب نے اس کو تزک کے دونون نسخون کو سامنے رکھکر مرتب کیا ہے، اور بعض جگہ کسی چشتیہ نام کی کتاب سے اضافے بھی کئے ہین، اور بعض مقامات پر حسب ضرورت مفید حاشیے اور تعلیقات بڑھائے ہین، مجموعی حیثیت سے اس مین جہانگیر کے سوانح حیات دلکش انداز مین قلمبند ہو گئے ہین، یہ رسالہ خصوصاً اسکول کے طلبہ کے لئے مفید ہوگا، امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

گلبانگ حرم از جناب حمید صدیقی لکھنوی، حجم ۱۴۴ صفحے قیمت عہ پتہ: مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنو

"گلبانگ حرم" زائر حرم حضرت حمید صدیقی لکھنوی کی پر کیف نعتیہ نظمون کا ایک دلکش مجموعہ ہے، جن مین بڑی روانی، شگفتگی، اور ادب شناسی، اس کے ساتھ کمال سرشاری و سرمستی سے بارگاہ نبوت مین عقیدت و محبت سے لبریز جذبات کی نذر پیش کی گئی ہے، ان مین سے مختلف نظمین، مختلف شعراء کی نظمون یا غزلون پر بھی کہی گئی ہین، اور حضرت جگر اور بعض دوسرے شعراء کو جو تو ہو گوشے بھی شاعر کی زبان آگئی مین، مثلاً بینظیر شاہ کا شعر ہے

ادھر ڈھونڈھتی ہے اُدھر ڈھونڈھتی ہے کسے ہر طرف چشم تر ڈھونڈتی ہے

حمید صاحب فرماتے ہین :-

ادھر ڈھونڈتی ہے ادھر ڈھونڈتی ہو خدا جانے کس کو نظر ڈھونڈتی ہے،

کتاب پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی جناب جگر مرادآبادی، حضرت امجد حیدرآبادی اور مولانا مناظر حسن گیلانی نے حوصلہ افزا تقریظین لکھی ہین اور شروع مین جناب عبدالحی صاحب نے زائر حرم کے عنوان سے شاعر کی زیارت حرم کی روداد قلمبند کی ہے، امید ہے کہ اہل ذوق کے حلقہ مین یہ مجموعہ مقبول ہوگا، "س"

اور تاریخی کتابین

یخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی
لاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے
لاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف
یتون سے نقد و تبصرہ ہے،
نفہ: مولانا عبد السلام ندوی، ضخامت ۲۷۶ صفحے،
قیمت : عہ

ندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان
، قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی
سلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسون اور
لیم گاہون کا حال معلوم کرنا چاہین تو نہین مل سکتا،
ولوی ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے
بد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہون پر معارف
ین ایک مقالہ لکھا تھا جس کو اہل نظر نے بے حد پسند کیا،
ب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت مین نہایت
ہتمام سے شائع کیا ہے،
ضخامت ۱۴۴ صفحے، قیمت : ۱۲ر

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے
یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے
لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان
کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات
انجام دی ہین، وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و
ملت معلوم ہو جائین،
اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری
مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یوپی
نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے
خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت : عہ

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب
مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی
تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر
لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور
آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے
دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،
ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت : عہ

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا
رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے تاکہ
مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے
پڑھ اور سمجھ سکین، اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے
اور اب کیا ہین، ضخامت ۷۶ صفحے، قیمت : عہ
مرتبہ: مولوی عبد السلام قدوائی، ندوی،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشار
اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار
کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ
تک کے تمام واقعات و سوانح پر، خود عالمگیر کے خطوط و
رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،
۲۹۰ صفحے، قیمت : للعہ

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و
رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ
کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، ان سے
ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف
ہوتا ہے، مرتبہ: سید نجیب اشرف ندوی ایم اے،
ضخامت: ۴۰۸ صفحے،
قیمت : ے ر

سوانح

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیاں اور معترضین کے جوابات، قیمت: ہے، ضخامت ۳۲۹ صفحے، طبع سوم با اضافہ حواشی، (از مولانا سید سلیمان ندوی)

سیر عمرؓ بن عبد العزیز

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز خلیفۂ اموی کے سوانح حیات اور اُن کے مجددانہ کارنامے، ضخامت ۳۰۲ صفحے، قیمت: ۱۲ر از مولانا عبد السلام ندوی،

حیات امام مالکؒ

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی ... موطاے امام مالکؒ پر تبصرہ، قیمت: عہ، (۱۰۶ صفحے) از مولانا سید سلیمان ندوی،

الغزالی

امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کا فلسفہ اور علم کلام، اخلاق اور تصوف مین اُن کے مجددانہ ... ضخامت ۲۲۵ صفحے، قیمت: عہ ر از مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تا... رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرامؓ کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہو، اس مین چھیانوے اکابر تابعینؒ ... سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ...

ضخامت: ۵۶۰ صفحے، قیمت: للعہ ر

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱ اگست ۱۹۴۷ء

معارف

مجلس المصنفین دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

اردو میں اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر حکومتوں کی سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ہو اس لئے دار المصنفین تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ خاص اہتمام سے مرتب کرایا ہے جس کے بعض حصے یہ ہیں اور بعض زیر طبع ہیں، اور اکثر زیر تالیف و تکمیل ہیں، جو بتدریج جیسے جیسے حالات مساعد ہوں گے شائع ہوتے رہیں گے،

تاریخ اسلام حصہ اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ)

اس میں آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مفصل مذہبی، سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ ہے (زیر طبع)

ضخامت: ۴۸۷ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصہ دوم، (بنو امیہ) اس میں اموی حکومت کی صد سالہ سیاسی و علمی و تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے،

ضخامت ۴۳۰ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصہ سوم (تاریخ بنی عباس جلد اوّل)

اس میں خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے خلیفہ ابو اسحٰق متقی للہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی بہت مفصل سیاسی تاریخ ہے، ضخامت ۵۰۴ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصہ چہارم (تاریخ بنی عباس جلد دوم)

اس میں خلیفہ مستکفی باللہ کے عہد ۳۳۳ھ سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۶۵۶ھ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ ہے،

ضخامت ۴۳۲ صفحے، قیمت: صہ ر

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

تاریخ دولت عثمانیہ حصہ اوّل، اس میں عثمان اوّل سے مصطفےٰ رابع تک سلطنت عثمانیہ کے چھ سو برس کے کارناموں کی تفصیل ہے، ضخامت: ۵۰۰ صفحے

قیمت: سے ر

تاریخ دولت عثمانیہ حصہ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارناموں کی تفصیل از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء تا جنگ عظیم ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء

ضخامت: ۴۶۸ صفحے، قیمت: ۰ صہ ر

مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے علیگ سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، حکومت کا قیام، اور عہد بعہد کی ترقیوں اور عروج کی پوری اور مفصل داستان ہے،

۵۴۶ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ صقلیہ حصہ دوم، یہ سسلی کے تمدنی و علمی ترقیوں کا مرقع ہے، جس میں عہد بعہد کے مفسرین، محدثین، فقہاء ادباء و شعراء کے مفصل حالات اور ان کی تصنیفات کا ذکر ہے،

۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ

مرتبہ: مولانا سید ریاست علی ندوی،

مسعود علی ندوی — منیجر — دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۰ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۷ء عدد ۲

مضامین

شذرات

ہندوستان مین دوسو برس کی برطانوی حکومت کی تاریخ کا آخری باب ۱۵ اگست ۴۷ء کو ختم ہوجائے گا، قومون اور ملکون کی تاریخ مین ایسے جشن مسرت کے موقعے شاذونادر آتے ہین، اس دن ہندوستان کا ہر باشندہ خواہ وہ اس کے حصہ "انڈیا" کا رہنے والا ہو، یا نو قائم حکومت "پاکستان" کا، دنیا کی آزاد قومون کے افراد کے دوش بدوش کھڑا ہوگا، اور آزاد انڈیا اور پاکستان، دوسرے آزاد ملکون کی طرف سے تہنیت کے پیامات وصول کرین گے، اور جشنِ مسرت منائین گے،

معارف کی اشاعت ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہوتی ہے، اس ماہ کا پرچہ جب شائع ہوگا آزادی کی صبح طلوع ہوچکی ہوگی، اور اُسی دن ملک کے طول و عرض مین دوسو برس کے سامراجی جھنڈے سرنگون کرکے اُتارے جائین گے، اور ان کی جگہ دو نو قائم حکومتون کے دو قومی پرچم حکومت کے ایوانون پر لہرائے جائین گے، جن کو ان حکومتون کے رہنے والے شہریون نے خواہ وہ اکثریت کے فرقہ کے ہون یا اقلیت کے، عام اتفاق سے نشانِ عزت مان لیا ہے، ہم اپنے ماہنامہ کی تاریخ اشاعت سے فائدہ اٹھاکر ان سربلند ہونے والے پرچمون کا دلی مسرت اور فخر سے خیر مقدم کرتے ہین، کہ وہ ہمارے سالہا سال کی جدوجہد کا مآل اور ایک مدت کی تمناؤن کے خواب کی تعبیر ہین، نیز ہم جنگ آزادی کے ان سرفروش جانبازون کو عقیدت کے پھول نذر کرتے ہین، جو اگرچہ اب ہمارے درمیان موجود نہین، مگر اُن کے روشن کارنامون سے ان کی یاد تازہ ہے، اور ان پرچمون کے ان لہرانے والون کی خدمت مین جوشِ مسرت و عقیدت کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کرتے ہین، جن کی مدبرانہ حکمت عملیون اور شبانہ یوم جدوجہد سے یہ روزِ سعید دیکھنے مین آیا، اور اب جن کے ہاتھون مین اس ملک کے مستقبل کی تعمیر کی عنان ہوگی،

برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے والے ملکون امریکہ، آئرلینڈ، اور مصر اور دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اور اس کے نتیجہ مین اگرچہ بعض مماثلتین پائی جاتی ہین، لیکن

ہندوستان کی ۳۰ سالہ جدوجہد کی یہ امتیازی شان رہی ہے کہ یہان کی تحریک عدم تشدد کے اصول پر چلائی گئی، اور آج دنیا کی عام روش کے خلاف حکومت کے اختیارات پرامن طریقہ سے اس ملک کے رہنے والون کے ہاتھون مین منتقل ہورہے ہین، خوش قسمت ہین وہ رہنما اور وہ رہرو جو اس امن کی راہ سے منزل مقصود کو پہنچے ہین،

آزادی کی جدوجہد کے اس تیس برس کے مختصر وقفہ مین سیاست کے طوفان مین مختلف اتار چڑھاو آیا کئے، اور اگرچہ ادھر چند سال سے مسلمانون کی اکثریت ایک سیاسی جماعت سے ناراض رہی لیکن یہ حقیقت تاریخ کے صفحہ سے مٹائی نہین جاسکتی، کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی مین مسلمانون نے لگاتار بیش از بیش حصہ لیا، اور اپنی ناقابلِ فراموش قربانیان پیش کین، آج جس طرح بال گنگادھر تلک، پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سی آر داس اور لالہ لاجپت راے کے عزیز خدمات کی یاد تازہ ہوگی اسی طرح حضرت مولانا محمود الحسن، مسیح الملک حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسٹر مظہر الحق، مولانا عبد الباری، فرنگی محلی، مسٹر حسن امام، مولانا محمد علی، مولانا ابو المحاسن محمد سجاد اور مولانا شوکت علی (اللہ تعالیٰ ان کی تربتون کو ٹھنڈا رکھے) کی روحین خوش ہون گی، کہ انھون نے جس نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے زندگی بھر اپنی جدوجہد جاری رکھی، اور مصیبتین جھیلین، بالآخر اُن کے اخلاف اس مقصد عزیز کو حاصل کرلینے مین کامیاب ہوگئے،

دوسری طرف مسلمانون کے ایک دوسرے مکتبِ خیال کے ارباب حل وعقد نے ۱۹۰۶ء مین ہندوستان کی اصلاحات اور آزادی کے ثمرات مین سے مسلمانون کے جداگانہ حقوق واختیارات کی تعین کے لئے سیاسی مجلس کی بنا ڈالی تھی، ملک مین ہندو مسلم اختلافات کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہین کہ اگر بعض موقعون پر اکثریت کے فرقہ والون کے رہنماؤن سے بعض لغزشین نہ ہوئی ہوتین، تو معلوم نہین کب یہ مسئلہ طے ہوچکا ہوتا، لیکن کشمکش کے پیہم جاری رہنے، اور حالات کے بدل جانے سے اس مجلس مین سرفروش و آزمودہ کار جانباز بھی داخل ہوگئے، اور اس مجلس کی ہیئت ترکیبی بدل گئی، اور اس نے اپنا نصب العین ایک جداگانہ ریاست کا قیام قرار دے لیا، اور جو بالآخر ایک کامیاب قیادت مین پورا ہوا، مبارک ہو مسلمانانِ پاکستان کو کہ وہ فائز المرام ہوئے، اور مسلمانون کی ایک نئی سلطنت کا وجود عمل مین آیا،

اگرچہ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ جب سات سال کی مسلسل جدوجہد اور مذہبی منافرت کے پھیل جانے کی

وجہ سے ہزاروں ہزار مسلمانوں کے جام شہادت نوش کر لینے کے بعد نتیجہ برآمد ہونے کا موقع سامنے آیا، تو دوسری طرف سے تقسیم در تقسیم کی تحریک اٹھائی گئی، اور صرف تین مہینے کی تنگ مدت میں وہ بھی منظور کر لی گئی، — یہی سبب ہے کہ آج اس تاریخی موقع پر ملک میں حقیقی مسرت کی عام لہر موجود نہیں، ملک کا ایک طبقہ اس سے اگر اس لئے مایوس ہے کہ ایک متحد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور آزاد صوبوں کی متحدہ وفاقی حکومت قائم کرنے کی کوششیں رائگاں گئیں، تو دوسرے حلقہ میں اس لئے کامل مسرت نہیں کہ ان کی اکثریت کے وہ صوبے جو اصل جان تھے، تقسیم ہو گئے، با اینہمہ دونوں طبقوں کے نصب العین حاصل ہوئے، ایک تقسیم شدہ ہندوستان — لیکن وہ آزاد ہوا، اور ایک ادھورا پاکستان — بہر حال وہ قائم ہو گیا،

دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں مختلف قوموں طبقوں اور جماعتوں کی کشمکش میں تلخیوں کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں، یہ صحیح ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ ابھی جوں کا توں لاینحل پڑا ہے، اور بعض ممتاز ہندو قوم پرور جو ساری عمر اپنے مسلک میں راسخ العقیدہ رہے، اس موقع پر اپنے کو سنبھالے رکھنے میں کامیاب نہیں رہے، اور اس منصوبہ کے ردعمل کے طور پر اشتعال اور جذبۂ انتقام میں ہندوستانی زبان کے بجائے ہندی کو "قومی" زبان قرار دینے اور انڈیا یونین میں رہنے والی اقلیت کے شہری حقوق تک پر پابندیاں لگانے کی آوازہ اٹھا رہے ہیں، یہ افسوس کی بات ہے کہ وہ اس طوفانی سیلاب میں اپنا دامن بچا نہ سکے، لیکن ہمیں امید ہے کہ اُن کے یہ وقتی اور جذباتی تاثرات سیاسیات کے طوفانی بحران کے خاتمہ پر ختم ہو جائیں گے، کہ ملک کو ترقی اور نئی تعمیر کی راہ پر لگانا ہے تو جذبات خیالات اور عام حالات میں سکون پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی، نیز یہ خوشی کی بات بھی ہے کہ بعض حلقوں میں پچھلی تلخیوں کی یاد کو فراموش کر دینے کا جذبہ بھی پیدا ہو چکا ہے اور یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ان سیاسی جماعتوں نے وقت اور ماحول سے متاثر ہو کر اس منصوبہ کو دونوں نو قائم حکومتوں میں تلخیوں اور اختلافات کو برقرار رکھنے کے بجائے پائدار امن اور دوستی قائم کرنے کے لئے قبول کیا ہے، توقع ہے کہ ایک وہ دن بھی آئے گا جب پچھلی کدورتیں مٹ جائیں اور انتقام کے جذبات فنا ہو جائیں، کہ جب روز روز کے نئے معاشی مسائل سامنے آئیں گے اور دونوں ریاستوں کی نگاہیں وسائل ترقی پر مرکوز ہوں گی، تو پھر انتظامی امور میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور باہم ایک دوسرے کی خیرسگالی کی آرزومند رہنے کی ضرورت محسوس ہوگی، کہ ان کی متحدہ کوششوں سے اس ملک کی پچھلی شاندار روایات زندہ ہوں، اور دنیا کی قوموں میں اس کو بلند مرتبہ حاصل ہو،

اسلامی ہند کی تاریخ کا وسیع سلسلہ جو دارالمصنفین میں زیر تالیف ہے، یہ فال نیک ہے کہ اس کی پہلی جلد تاریخ سندھ اس وقت شائع ہو رہی ہے، جب سندھ اسلامی ہند کا نیا مرکز حکومت بن رہا ہے، یہ سندھ کے اسلامی فتوحات کی پہلی مفصل تاریخ ہے، اور اس موقع پر خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہے،

مقالات

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

(۵)

لیکن ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کے مقابل مین عقل کو شکست دی ہے، وہ رندانہ عشق سے بالکل مختلف ہے، رندانہ عشق اور عقل مین تضاد کلی ہے اس لئے دونون کا اجتماع ایک جگہ نہین ہوسکتا اور اسی بنا پر خواجہ حافظ فرماتے ہین :-

بر ہوشمند سلسلہ ننہا دہ است عشق خواہی کہ زلفِ یار کشی ترک ہوش کن

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کار عشق مجنون کن کہ عاشق را زیان دارد مقالاتِ خردمندی

اے کہ از دفترِ عقل آیتِ عشق آموزی ترسم این نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

لیکن چونکہ اس عشق مین جیسا کہ خواجہ حافظ فرماتے ہین،

ایکہ دایم بخویشں مغروری

گر ترا عشق نیست معذوری

خودی قائم نہین رہ سکتی، اور ڈاکٹر صاحب عشق کو خودی کی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہین،

بهر دل عشق رنگ تازه بر کرد   گهے با سنگ و گهے با شیشه سر کرد
ترا از خود در بود و چشم تر داد   مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

اس لئے وہ اس خود فراموشانہ عشق کو عقل کا حریف مقابل نہین قرار دیتے، بلکہ انھون نے جس عشق کو عقل کا حریف مقابل قرار دیا ہے، وہ عقل و ہوش سے خالی نہین ہے، اور یہی عشق ہے جس کی تعبیر انھون نے جنون صاحب ادراک، جنونِ فرزانہ اور جنونِ زیرک سے کی ہے، اور چونکہ عام طور پر جنون کی حالت مین عقل باقی نہین رہتی اس لئے جنون کو صاحبِ عقل و ادراک قرار دیکر ایک شاعرانہ لطافت بھی پیدا کر دی ہے،

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ   کسے خبر کہ جنون بھی ہو صاحبِ ادراک

چمن با زان جنون دیوانہ گردد   کہ از ہنگامہ ہا بیگانہ گردد
از ان ہوے کہ انگندم درین شہر   جنون ماند و لے فرزانہ گردد

دگر آئین تسلیم و رضا گیر   طریق صدق و اخلاص و وفا گیر
مگو شعرم چنین است و چنان نیست   جنونِ زیرکے از من فرا گیر

رندانہ عشق مین معشوق جس قدر معزز و موقر ہوتا ہے، اسی قدر عاشق ذلیل و خوار ہوتا ہے، اور اپنی ذلت و خواری پر ناز کرتا ہے، اسی نظریہ کے مطابق خواجہ حافظ فرماتے ہین،

گرچہ بدنامی است نزد عاقلان
مانمی خواہیم ننگ و نام را

اردو کا ایک شاعر کہتا ہے:-

ہمین دیکھے ذلت وہ محفل مین اپنی
معزز کرین گے گرامی کرین گے

لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک عشق بجائے خود ایک عزو شرف ہے، اور اس کا آخری درجہ شہادت ہے، ذلت کی زندگی نہیں ہے،

عشقِ تبان سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی مین ڈوب جا   نقش و نگار دیر مین خون جگر نہ کر تلف

کھول کے کیا بیان کرون سرِ مقام مرگ و عشق   عشق ہو مرگ با شرف مرگ حیات بے شرف

اگرچہ اس عشق با شرف مین بھی بعض اوقات سلبی اخلاق مثلاً صبر و تحمل، تواضع و انکسار اور عفو و درگذر سے کام لینا پڑتا ہے، اور مکہ معظمہ مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زندگی، اسی قسم کے سلبی اخلاق کا نمونہ تھی، اور ہمارے صوفیہ نے اپنے لئے اسی زندگی کو اسوۂ حسنہ بنایا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اصل اس مکی زندگی اور صوفیہ کی اخلاقی زندگی مین ذوقی طور پر نہایت دقیق فرق نظر آتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے صبر و تحمل تواضع و انکسار، اور عفو و درگذر مین تحیر و ذلت کا شائبہ نہ تھا، بلکہ ان مین بھی مجاہدانہ شان موجود تھی، اور مکہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت فرار نہ تھی، بلکہ جہاد کی تیاری کا مقدمہ تھی، اور ڈاکٹر صاحب نے اس اخلاقی فرق کو نہایت لطیف شاعرانہ انداز مین اس طرح بیان کیا ہے،

کہہ گئین راز محبت پردہ داریہائے شوق

تھی فغان وہ بھی جسے ضبطِ فغان سمجھا تھا مین

اس لئے یہ عشق کبھی عملی طاقت سے خالی نہین ہوتا، البتہ کبھی یہ طاقت بالقوۃ ہوتی ہے، اور کبھی بالفعل، لیکن اس مین عملی طاقت ہر حالت مین موجود رہتی ہے،

عقل در پیچاک اسباب و علل   عشق چوگان باز میدان عمل

اور جب قوت سے فعل مین آتی ہے، تو قوم کے سامنے ترقی کا وسیع میدان کھل جاتا ہے،

لیبان نے لکھا ہے کہ قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق ہی کے ستون پر قائم ہے، عقل و دماغ

کا حصہ اس مین بہت کم ہے، رومن قوم اپنے تنزل وانحطاط کے زمانے مین عقلی حیثیت سے اپنے آبا واجداد کی بہ نسبت زیادہ طاقتور تھی، تاہم چونکہ اپنی آبائی وراثت یعنی اقدام، عزم، شجاعت، جانبازی، غرض ان تمام اخلاق کو جن کے ذریعہ سے اُن کے آبا واجداد نے ترقی کی تھی کھو چکی تھی، اس لئے بالآخر تنزل کے غار مین گر پڑی، بعینہٖ یہی حال مسلمانون کا بھی ہوا، وہ اپنے دورِ تنزل مین عقلی حیثیت سے اہلِ عرب سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے، لیکن چونکہ اہل عرب جیسی اخلاقی اور عملی طاقت نہین رکھتے تھے، اس لئے اُن کو اپنے مفتوحہ ممالک سے بھی ہاتھ دھونا پڑا،

لیکن عقلی ترقی اس عملی قوت کا بالکل خاتمہ کر دیتی ہے،

انجام خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہاے بے صوت　　ہین ذوقِ عمل کے واسطے موت
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار　　بحث مین آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات

کیونکہ :-

(۱) عمل کی بنیاد عقیدہ کی وحدت و یکرنگی پر قائم ہوتی ہے، اسلام نے صرف ایک کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی دعوت دی، اور اسی عقیدہ کی وحدت اور یکرنگی نے صحابۂ کرام کو جوشِ عمل سے لبریز کر دیا، لیکن عقلی نظریون مین یہ وحدت و یکرنگی نہین پائی جاتی، بلکہ وہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہین،

زمان زمان شکند آنچہ مے تراشد عقل　　بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است
عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے　　عشق بیچارہ نہ مُلّا ہے، نہ زاہد نہ حکیم

اس لئے وہ انسان کی عملی طاقت کو کسی ایک مرکز پر جمع نہین ہونے دیتی، بلکہ اس کو منتشر رکھتی ہے،

(۲) اس وحدت و یکرنگی کے ساتھ عقیدہ کے لئے استحکام اور پختگی بھی ضروری ہے، جس کو شریعت

کی اصطلاح میں ایمان و یقین کہتے ہیں، اور یہی ایمان و یقین انسان کو آمادہ عمل کرتا ہے، لیکن ایک طرف تو عقلی نظریات کا یہ اختلاف انسان کے دل میں یقین و ایمان پیدا نہیں ہونے دیتا، بلکہ اس کو تلون، تذبذب اور شک میں مبتلا رکھتا ہے، دوسری طرف ان نظریات کو سینکڑوں دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے، اور انسان اگرچہ ان دلائل کی کثرت سے حیرت زدہ ہو جاتا ہے،

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی، حیرت کی فراوانی

لیکن اوس کے دل میں یقین کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی، جس پر عمل کی بنیاد ہے،

علاج ضعف یقین اُن سے ہو نہیں سکتا غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

بلکہ وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اس حالت میں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عقل اُن دلائل سے انسان کی رہبری کرنا چاہتی ہے لیکن درحقیقت وہ راہزنی کرتی ہے، یہی وجہ ہے، کہ ڈاکٹر صاحب ان دلائل کو مکر، فریب اور حیلہ قرار دیتے ہیں،

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد کہ میر قافلہ و ذوق رہزنی دارد
نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد
عشق صید از زور بازو افگند عقل مکار است و دامے می زند

(۳) ایک طرف تو علم و یقین کا یہ ضعف عقل کو عملی میدان میں ناکامیاب رکھتا ہے، دوسری طرف عملی زندگی میں جو خطرات و مہالک پیش آتے ہیں، اُن کے مقابلے کے لئے جس جرأت، استقامت، اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ عقل میں بہت کم پائی جاتی ہے، عشق آگ میں نہایت بے باکی کے ساتھ کود پڑتا ہے، لیکن عقل دیکھ بھال میں رہ جاتی ہے،

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

کیونکہ عشق خود ایک آگ ہے، جو دل مین زندگی کی حرارت پیدا کردیتا ہے، اس لئے آگ کو آگ سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے، لیکن عقل مین زندگی کی یہ حرارت نہین پائی جاتی، اور ڈاکٹر صاحب نے ایک "فرضی" خیالی حکایت مین اس نکتہ کو نہایت لطیف شاعرانہ انداز مین بیان کیا ہے،

شنیدم شبے در کتب خانۂ من ۔۔۔ بہ پروانہ می گفت کرم کتابی
باوراق سینا (بوعلی سینا) نشیمن گرفتم ۔۔۔ بسے دیدم از نسخۂ فاریابی
نفہمیدہ ام حکمتِ زندگی را ۔۔۔ ہمان تیرہ روزم ز بے آفتابی
نکو گفت پروانۂ نیم سوزے ۔۔۔ کہ این نکتہ را در کتابے نیابی
تپش می کند زندہ تر زندگی را ۔۔۔ تپش می دہد بال و پر زندگی را

اس لئے اگرچہ عقل بھی بڑے بڑے میدان فتح کرنا چاہتی ہے، لیکن جرأت وہمت کی کمی سے وہ دفعۃً ان میدانون کو فتح نہین کرسکتی، بلکہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہے،

عقل ہم خود را بدین عالم زند ۔۔۔ تا طلسم آب و گل را بشکند
می شود ہر سنگ رہ او را ادیب ۔۔۔ می شود برق و سحاب او را خطیب
جنبش از ذوق نگہ بیگانہ نیست ۔۔۔ لیکن او را جرأتِ رندانہ نیست
پس ز ترس راہ چون کورے رود ۔۔۔ نرم نرمک صورت مورے رود
تا خرد پیچیدہ تر بر رنگ و بوست ۔۔۔ می رود آہستہ اندر راہ دوست
کارش از تدریج می یابد نظام ۔۔۔ من ندانم کے شود کارش تمام

لیکن جرأت وہمت کی کمی سے عقل جو کام برسون مین کرتی ہے، اُس کو عشق آن کی آن مین طے کر سکتا ہے،

می نداند عشق سال و ماہ را ۔۔۔ دیر و زود و نزد و دور راہ را

عقل در کوہے شگافے می کند | یا بگرد او طوافے می کند
کوہ پیشِ عشق چون کاہے بود | دل سریع السیر چون ماہے بود
زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست | قوتش از سختیِ اعصاب نیست
عشق با نانِ جوین خیبر کشاد | عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
کلۂ نمرود بے ضربے شکست | لشکرِ فرعون بے حربے شکست
عشق سلطان است و برہانِ مبین | ہر دو عالم عشق را زیر نگین

اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کو عقل کا حریفِ مقابل قرار دیا ہے وہ بے کار رندوں اور اوباشوں کا مشغلہ نہیں بلکہ عقل و اخلاق کا مجموعہ ہے، اور عقل و اخلاق کی آمیزش نے اُس کو ایک معجزانہ عملی طاقت بنا دیا ہے، اس زمانہ میں گرچہ سائنس بھی ایک عملی طاقت بن گئی ہے لیکن با این ہمہ سائنس اور عشق میں مختلف حیثیتوں سے فرق ہے،

(۱) سائنس میں اخلاق کی آمیزش نہیں، اس لئے وہ زندگی کے ایک ضروری عنصر سے خالی ہے،

(۲) سائنس کے لئے غیر معمولی مصارف، غیر معمولی ساز و سامان اور غیر معمولی آلات کی ضرورت ہے، اور عشق کے لئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ بے سر و سامانی کے ساتھ بھی دنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے، جیسا کہ اولوالعزم پیغمبروں نے کیا ہے،

(۳) ڈاکٹر صاحب نے جس عشق کو عقل کا حریفِ مقابل قرار دیا ہے، وہ عملی قوت ہونے کے ساتھ ایک تخلیقی قوت بھی ہے، اس لئے ان کا نظریۂ عشق مولانا روم کے نظریۂ عشق سے مختلف اور زیادہ ترقی یافتہ ہے، خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں،

"رومی کا جذبۂ عشق بہت حد تک محویتِ ذاتِ الٰہی کے تاثرات میں رہ جاتا ہے، اقبال کے یہاں جذبۂ عشق ایک جذبۂ تخلیق، جذبۂ تسخیر، اور جذبۂ ارتقا بن گیا ہے، اسی پہلو سے

اقبال نے ایسے مضامین پیدا کئے ہیں، جن کا مرشد کے یہاں شمس سے کوئی نشان نہیں
اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مولانا روم کے سامنے اشراقی حکما کا نظریۂ عشق تھا، جو محبت ذات الٰہی تک محدود تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے عشق کا جو اعلیٰ ترین نمونہ اپنے سامنے رکھا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق ہے، اور اس عشق کا ظہور غار حرا کی خلوت نشینی سے ہوا اس لئے عشق خلوت کی چیز ہے اور عشق کی یہی امتیازی خصوصیت ہے، جو اس کو عقل سے ممتاز کر دیتی ہے، فلسفہ و سائنس کتنی ہی ترقی کر جائیں لیکن اُن کی تگ و دو صرف انسان کی بیرونی دنیا تک محدود ہے، اور وہ صرف مظاہر فطرت کی ایک ایک چیز کو لے کر اس کے اوصاف و خواص بیان کرتے ہیں، مثلاً پانی میں کیا خاصیت ہے؟ حرارت کے کتنے درجے ہیں؟ بھاپ میں کس قدر طاقت ہے؟ اس لئے ان کا میلان صرف جلوت کی طرف ہوتا ہے، اور وہ ان اوصاف و خواص کے انکشاف سے صرف انسان کی بیرونی دنیا میں حرکت پیدا کر سکتے ہیں لیکن عشق خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، بلکہ وہ صرف انسان کے روحانی اوصاف و خواص کی جستجو میں رہتا ہے، اس لئے وہ خلوت سے باہر قدم نہیں نکالتا، اور اس طرح عقل و عشق کی ترقی کے میدان الگ الگ ہو جاتے ہیں،

عقل او را سوے جلوت می کشد

عشق او را سوے خلوت می کشد

اس لئے عقل سے اگرچہ خارجی دنیا کی تمام چیزوں کے اوصاف و خواص نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن خود انسان کے روحانی اوصاف و خواص پر پردہ پڑا رہتا ہے، عقل بجلی کے چراغ جلا کر تمام دنیا کو تو روشن کر سکتی ہے لیکن اس چراغ کی روشنی انسان کی روحانی زندگی تک نہیں پہونچ سکتی، اور اس کو صرف عشق ہی روشن کر سکتا ہے،

۱؎ رسالہ اردو اقبال نمبر صفحہ ۵۳۳،

جلوتِ او در حضور از فیضِ صفات خلوتِ او مستنیر از نورِ ذات

حالانکہ انسان کی حقیقی زندگی یہ نہیں ہے کہ وہ بیرونی چیزوں کے اوصاف وخواص سے تو واقف ہو اور خود اس کے اندرونی اوصاف وخواص پر پردہ پڑا رہے، بلکہ اس کی اصلی زندگی یہ ہے، کہ خود اس کو اپنی ذات کے اوصاف وخواص بے پردہ ہو کر نظر آئیں،

برمقامِ خود رسیدن زندگی است ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

مردِ مومن در نسازد با صفات مصطفیٰ راضی نہ شد الا بذات

جلوت وخلوت کی اس تفریق نے اگرچہ عقل وعشق کے حدود الگ کر دیئے لیکن صوفیائے نظریۂ عشق اور ڈاکٹر صاحب کے نظریۂ عشق کے درمیان حدِ فاصل قائم نہیں ہوئی، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی طرح ہمارے صوفیہ بھی عشق کو خلوت ہی کی چیز سمجھتے ہیں، لیکن اُن کے نزدیک اس خلوت نشینی کا مقصد، محویت، استغراق اور مشاہدۂ ذاتِ الٰہی ہے، اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کو ایک اعلیٰ درجہ کا مقصد سمجھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے انسان کو خود اپنی ذات یعنی اپنی خودی کا مشاہدہ کرنا چاہئے، اوپر کے اشعار میں انھوں نے جہاں جہاں ذات کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے خود اپنی ذات یعنی خودی مراد ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا میں جو خلوت نشینی اختیار کی تھی، اس کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے نزدیک صرف یہ تھا، کہ خود اپنی ذات یعنی خودی کے مشاہدہ کو ذاتِ الٰہی کے مشاہدہ کا ذریعہ بنائیں، ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مشہور قطعہ:-

زمن گو صوفیانِ باصفا را خدا جویانِ معنی آشنا را

غلامِ ہمت آن خود پرستم کہ از نورِ خودی بیند خدا را

میں جس خود پرست کی غلامی پر فخر کیا ہے اس سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے لیکن اگر

خلوت نشینی مین خودی کو فنا کر دیا جائے، اور صرف ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ مقصود ہو تو اس صورت مین عشق محض ایک تحقیقی چیز ہوکر خلوت سے جلوت مین آجاتا ہے، اور اس مین اور عقل مین کوئی فرق باقی نہین رہ جاتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود خدا کی ذات کو بے پردہ دیکھنا چاہا، اور اگر وہ ان کو بے پردہ نظر آجاتی تو اس سے صرف ان کی عقل کی تحقیقی قوت کو تشفی ہوجاتی، لیکن خود اُن کی ذات یعنی خودی کی اندرونی صلاحیتون اور قابلیتون پر پردہ پڑا رہجاتا،

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور کہ جانِ تو زخود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

لیکن اگر خلوت نشینی مین خود اپنی ذات یعنی خودی کا مشاہدہ کیا جائے تو انسان کو اپنی اندرونی قابلیتون اور صلاحیتون کا علم ہوجاتا ہے، اور اس صورت مین عشق عقل کی طرح صرف تحقیقی قوت نہین رہ جاتا، بلکہ ایک تخلیقی جذبہ بن جاتا ہے، اور انسان کو یہ معلوم ہوجاتا ہے، کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے کام لیکر ایک نئی دنیا پیدا کرسکتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ حرا مین خلوت نشین ہوکر خود اپنی ذات یعنی اپنی خودی کی تخلیقی قوتون کا مشاہدہ کیا، جس سے مسلمانون کی ایک نئی قوم پیدا ہوئی،

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ ما را در دلِ او ریختند ملتے از خلوتش انگیختند
گرچہ داری جان روشن چون کلیم ہست افکار تو بے خلوت عقیم
از کمِ آمیزی تخیل زندہ تر زندہ تر، جوئندہ تر، یابندہ تر
علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات ہر دو می گیرد نصیب از واردات
علم از تحقیق لذت می برد عشق از تخلیق لذت می برد
صاحبِ تحقیق را جلوت عزیز صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز

چشم موسیٰ خواست دید ار وجود این ہمہ از لذت تحقیق بود

اب صرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غارِ حرا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت نشینی کا جو مقصد بتایا ہے، وہ اسلامی روایات کے مطابق ہے یا نہیں؟ جہاں تک روایات کا تعلق ہے، غارِ حرا کی خلوت نشینی کے اعمال و اشغال اور مقاصد و اغراض کا کچھ پتہ نہیں چلتا، شراح حدیث نے قیاسی طور پر بہت سی وجہیں بتائی ہیں، لیکن یہ محض ان کی قیاس آفرینیاں ہیں، کسی روایت سے ان کی تائید نہیں ہوتی، بعینہٖ اسی طور پر ڈاکٹر صاحب نے اس کا مقصد ذات یعنی خودی کے مشاہدہ کو قرار دیا ہو اگرچہ یہ بھی ایک قیاسی چیز ہے، تاہم کسی روایت کے مخالف بھی نہیں ہے، اور یہ تو یقینی ہے کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد صور غیبیہ کا مشاہدہ نہ تھا، ورنہ حضرت جبریلؑ کے مشاہدہ سے آپ کے دل میں اضطراب نہ پیدا ہوتا، بلکہ آپ کو اُس سے تسکین ہوتی، بہرحال عالمِ غیب کی صورتوں کا مشاہدہ محققین صوفیہ کے نزدیک بھی روح انسانی کا کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہے، مجدد الف ثانی کے نزدیک یہ تو بچوں کے کھلونے ہیں، اصلی چیز خود روح کا تصفیہ و تزکیہ ہے، اور وہ خود روح یا خودی کے مشاہدے سے حاصل ہو سکتا ہے،

(باقی)

اعلان

یکم جنوری ۳۷ء سے مستقل تاجروں کے لئے کمیشن بجائے پندرہ فی صدی اور دوسری مطبوعات پر بیس فی صدی کر دیا گیا ہے، اب اس کے متعلق خط و کتابت بے سود ہوگی

"منیجر"

اسلامی نظریۂ اجتماع

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی پٹھان کوٹ

(۲)

اسلامی نظام اجتماع کے اختلال کا تاریخی پس منظر

زمانۂ رسالت سے لے کر خلافت راشدہ کے آخری دور تک اسلام کا مقابلہ جاہلیت محضہ کے ساتھ تھا، یہ جاہلیت اگرچہ بڑی سخت جان تھی، مگر اسلام کی نظریاتی اور عملی قوت کے مقابلہ مین اسے ہر قدم پر شکست کھانی پڑی، دنیا کے جس حصہ مین بھی اسلام سے متصادم ہوئی، اس کے پاؤن اکھڑ گئے، اور بالآخر مقہور و مجبور ہو کر رہ گئی، مگر اس حقیقت سے انکار نہین کیا جا سکتا، کہ جو چیز ایک دفعہ کتم عدم سے منظر وجود پر آگئی، وہ دنیا سے کبھی بالکلیہ فنا نہین ہو سکتی، کیونکہ اس عالم رنگ و بو مین ہر نوع کی چیز سما سکتی ہے، اور متخالف و متضاد حقائق و امور کے لئے اُس نے کبھی تنگی داماں کا عذر پیش نہین کیا، بالخصوص ہر ایسی چیز جو انسانی طبائع کی مرغوب اور ہوائے نفس سے کچھ مناسبت رکھتی ہو، اس سے انسان کا دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے، یہ دوسری بات ہے، کہ وہ کس وقت اپنی ظاہری ہئیت و لباس کو بدل دے، اور کسی دوسرے لباس مین دنیا کے سامنے آجائے، مگر لباس کی تبدیلی سے حقیقت نہین بدل جایا کرتی، چنانچہ جاہلیت خالصہ جب ہر معرکۂ جنگ مین شکست کھا چکی، یہان تک کہ اس کا سیاسی اور اجتماعی وجود ختم ہو کر رہ گیا، تو اُس نے اپنی بقا کے لئے اسلام کے دامن مین پناہ لینی چاہی، اب وہ شخصیتین اٹھ چکی تھین، جو اسلام کے حصن حصین کے لئے

بِ متعلق کا کام دے رہی تھیں، ان کی موجودگی میں باہر کی کوئی چیز اس قلعہ کے اندر گھسنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی،

اِنَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهَا بَابًا مُغْلَقًا تمہارے اور اس کے درمیان ایک بند دروازہ ہے،
(بخاری)

مگر جونہی یہ بابِ مغلق سامنے سے ہٹا تو جاہلیت نے اندر گھسنے کے کئی راستے بنالئے، اب کیا تھا، سالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق فتنوں کی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی،

انی لاری الفتن تقع فی بیوتکم کوقع المطر (بخاری) میں تمہارے گھروں میں بارش کی طرح فتنوں کو برستا دیکھ رہا ہوں،

مگر پھر بھی جاہلیت کے لئے یہ ممکن نہ تھا، کہ اپنے پہلے لباس میں اسلام کے سامنے آتی، چنانچہ اب اُس نے نیا چولا بدلا، اور اسلام سے ساز باز کرنی شروع کر دی، کچھ دیا، اور کچھ لیا، اور بالآخر وہ اسلام سے جوڑ توڑ کرنے میں کامیاب ہوگئی، اب وہ بظاہر دیکھنے والوں کو مسلمان نظر آتی تھی، مگر باطن میں اسی طرح لات منات کی چہیتی تھی!

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم جوان ہیں لات و منات

تاریخِ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ دولت بنی اُمیّہ کے آغاز سے آج تک برابر جاری رہا، مگر یہ جاہلیت کم بخت اتنی زمانہ شناس واقع ہوئی ہے، کہ تاریخ کے ہر دور میں احوال و ظروف کے قالب میں ڈھلنے کی اسے پوری مہارت حاصل ہے، اس کے سامنے تو صرف ایک ہی مقصد رہا ہے، کہ اسلام کے نظامِ اجتماع میں کس طرح اختلال پیدا کیا جا سکتا ہے؟ کس راستہ سے اس پر حملہ و ہجوم ہو سکتا ہے، اور کس لباس میں اُسے اپنی جانب مائل کیا جا سکتا ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے طرز و طریق بھی بدلتے رہے، خلافتِ راشدہ کے انقطاع کے بعد سب سے پہلے اُس نے ملوکیت و استبداد کا لباس زیب تن کیا، کہ اس کے بغیر

کسی طرح اس کا اثر و نفوذ نہیں بڑھ سکتا تھا، اور ملوکیت ہی وہ چیز ہے کہ ہر زمانہ میں جاہلیت کی پشت پناہی کرتی رہی ہے، پس ملوکیت کے قیام کے ساتھ اس نے نقشۂ زندگی کے ایک ایک خانہ پر اپنا رنگ جمانا شروع کیا، اور نظریۂ حکومت میں تبدیلی رونما ہونے کے ساتھ ہی اجتماع و تمدن کے تمام شعبوں میں انقلاب معکوس شروع ہوگیا،

خلافت راشدہ کا عہد مقدس عہد رسالت سے مناسبت تامہ رکھتا تھا، اور اس کا نظام فکر و عمل بالکل طریق سنت اور منہاج نبوت پر قائم تھا، یہی وجہ ہے کہ سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین رض کے عمل و کردار کو لفظ سنت سے تعبیر کیا ہے،

عن العرباض ابن ساریۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ، .... (اخرجہ ابوداؤد و ترمذی)

میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو، اس کے ساتھ تمسک کرو اور نہایت مضبوطی سے اسے پکڑ لو،

عن زید ابن ارقم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی تارک فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی احدھما اعظم من الآخر وھو کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اھل بیتی، لن یفترقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیھما (اخرجہ الترمذی)

میں وہ چیز تم میں چھوڑ کے جا رہا ہوں کہ اگر تم اس سے تمسک کروگے تو میرے بعد گمراہ نہ ہوسکوگے، (اس چیز کے دو حصے ہیں) ایک ان میں سے دوسری کی نسبت بڑا ہے، وہ اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی رسی ہے، اور دوسرا میری اولاد یعنی اہل بیت ہیں یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ قیامت کو میرے پاس حوض کوثر کے مقام پر وارد ہوں گے، دیکھیں تم لوگ میرے بعد ان سے کیسا سلوک کرتے ہو،

یہ دونوں روایتیں بظاہر الگ الگ مفہوم رکھتی ہیں، مگر درحقیقت ان کا مفہوم ایک ہی ہے، احادیثِ نبوی میں جہاں خلفائے راشدینؓ کا ذکر آیا ہے، ان میں اہلِ بیت بھی شامل ہیں، اور جہاں عترت یا اہلِ بیت کا ذکر ہوا ہے، اس میں خلفائے راشدینؓ بھی داخل ہیں، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے، گویا عترت اور اہلِ بیت سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی اولاد ہے، جو صحیح طور پر اپنے روحانی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے والی ہے، لیکن میرے خیال میں یہ دونوں حدیثیں اپنے منشا و مصداق کے اعتبار سے بعد میں آنے والے مجددینِ ملت اور مصلحینِ اُمت پر بھی حاوی ہیں، کیونکہ اُن کا مسلک و طریق بھی خلفاء و اہلِ بیت کے مسلک کے عین مطابق ہے، اور یہ مقدس ہستیاں گویا خلفاء الخلفاء ہیں، لہذا اولاً و بالذات نہ سہی، مگر بالتبع یہ بھی ان احادیث میں شامل ہیں،

غرض خلفائے راشدینؓ کا وہ مقدس دور دینی، اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بالکل عہدِ نبوت سے مشابہ تھا، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، صورت و سیرت، اخلاق و معاشرت اور عمل و کردار میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ نمونہ تھے، اور وہ جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا، ان کا کردار اور کیرکٹیر دوسروں پر اثر انداز ہوتا تھا، مگر وہ خود کسی سے متاثر نہ ہوتے تھے، اور انہی نے دنیا کے انسانوں کو صحیح اسلامی فکر و عمل اور سیاست و اجتماع سے روشناس کیا، مگر خلافتِ راشدہ کے انقطاع کے بعد زمامِ سیادت بنی امیہ کے ہاتھ آگئی، اور اسی وقت سے اسلامی طرزِ سیاست اور حریتِ اجتماع میں ایک ناخوشگوار انقلاب رونما ہوا، اب خالص اسلامی جمہوریت کے بعد ملوکیت و استبداد کا دور شروع ہوا، اور اس ظالمانہ طرزِ سیاست نے اجتماعِ اسلامی کی جڑیں کھوکھلی کردیں، اگرچہ اس عہد میں صحابۂ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، مگر بقول سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ الملک و الدین توامان "یعنی دین کا قیام حکومت کے بغیر ممکن نہیں، چونکہ قوتِ مقتدرہ جن کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تھی وہ

انتہائی درجہ کے عیاش، بدکردار اور ظالم تھے، اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے اخلاق و معاشرت اور اجتماع و تمدن پر سب سے زیادہ ملکی سیاست ہی اثر انداز ہوتی ہے، اس نے صحابۂ کرام کی مجاہدانہ جد و جہد بھی اس سیلاب کو نہ روک سکی،

دورِ خلافتِ راشدہ میں آزادیٔ فکر ورائے، حریتِ اجتماع اور مساواتِ عامہ کو جس قدر اہمیت حاصل تھی، اس سے اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا مخالف بھی جرأتِ انکار نہیں کر سکتا، جس کی تفصیل میں اسلامی نظریۂ سیاست میں کر چکا ہوں، مگر دورِ بنی اُمیہ کے آغاز ہی میں طبقاتی نظامِ اجتماع اور ظالمانہ تمدن کی بنیاد پڑ گئی، وہی جاگیردارانہ سسٹم، شریف و وضیع کے امتیازات اور امیر و غریب کی تفریق جو اسلام کے دورِ اول میں ختم کر دی گئی تھی، دوبارہ مسلمانوں کے طرزِ اجتماع میں داخل ہو گئی، افکار و عقائد میں فساد رونما ہونے لگا، اسلامی دستورِ اخلاق کو بدل دیا گیا، تعلیم و تربیت کے طرز و طریق میں تجدد کا سلسلہ جاری ہوا، شراب نوشی، بدمستی، عیش کوشی، جبر و تشدد اور تمام ملوکانہ صفات بروے کار آنے لگیں،

مگر تاریخِ اسلام کی یہ ایک درخشندہ حقیقت ہے، کہ وہ پرستارانِ ملوکیت اور داعیانِ تجدد و تلبیس کے ساتھ ساتھ مردانِ راہِ حق، داعیانِ حریت و آزادی، مجددینِ ملت اور مصلحینِ امت کی شاندار روایات بھی پیش کر رہی ہے، اگر ایک طرف خود مسلمانوں سے ہی کوئی جابر و قاہر اور مختارِ مطلق حکمران پیدا ہوتا ہے، جو اپنے ظالمانہ کردار اور تجدد پسندی سے جاہلی افکار و اعمال کا احیاء کرتا ہے، اور دینِ خداوندی کو ہوائے نفس کے تحت چلانا چاہتا ہے یا فرقِ باطلہ کے فاسد عقائد اسلامی اور قرآنی طریقِ اجتماع و سیاست میں تزلزل رونما ہونے لگتا ہے، تو ساتھ ہی ایک پُر اسرار قوتِ روحانی کا حامل مردِ مجاہد بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جو اپنی بے پناہ قوتِ عمل سے پرستارانِ باطل کے تمام منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے، اور دینِ خداوندی کو سالہا سال کی آمیزشوں سے پاک کر کے تجدیدِ ملت اور احیاءِ دین کے کٹھن مراحل کو ایک محدود عرصہ ہی میں طے کر جاتا ہے،

وگر تو نے کہ ذکر لا از امشش ‏ ‏ بر آرد و از دل شب صبح گاہش

شناسد منزلش را آفتابے ‏ ‏ کہ ریگ کہکشان رہ بندراہش

یہ ہے وہ حقیقت باہرہ جو اسلامی تاریخ کے ہر دور مین آپ کو نمایان نظر آئے گی، اور کیون نہ ہو کہ خود سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کبری کو ان الفاظ مین ظاہر فرما دیا تھا،

انّ اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ	اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال
راس کل مائۃ من یجدد لھا	کے خاتمہ پر کوئی ایسی جامع شخصیت
دینھا،	بھیجے گا، جو اس امت کے دین کی
(اخرجہ ابو داؤد والحاکم والطبرانی)	تجدید کرے گی،

یہ بحث اگرچہ ایک مستقل موضوع رکھتی ہے، اور اس کے تفصیلی گوشے ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہین مگر اجتماع اسلامی کے فساد و اختلال کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے علی وجہ التبعیہ اس کا ذکر بھی آجانا لازمی ہے،

قریبًا نصف صدی کے اس دور ضلالت و ملوکیت کے بعد خدائے قدوس نے بنی امیہ ہی سے ایک جلیل القدر شخصیت حضرت عمر بن عبد العزیز کو مجددیت کے منصب پر فائز فرمایا، آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وراثت و جانشینی کے اس جاہلی تصور کو مٹایا اور مجمع عام مین اعلان فرمایا،

ایّھا النّاس انی اُبتلیت بھذا الامر	اے لوگو مجھے میری رائے اور خواہش کے بغیر عام
من غیر رای منی و لا طلبۃ و	مسلمانون کے مشورہ کے بغیر ہی حاکم بنا دیا
لا مشورۃ من المسلمین وانی	گیا ہے، اور اب مین اپنی بیعت سے تمھین آزاد
خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی	کرتا ہون، اور میرے سوا جس کو چاہو
فاختاروا لانفسکم غیری	اپنا امیر بنا لو،

چنانچہ اسلامی طریقِ انتخاب سے اُن ہی کو خلیفہ چنا گیا، اور اس طرح ملوکیت کا بُت اُن کے ہاتھوں سے چور چور ہو کر رہ گیا،

اس کے بعد تجدید دین اور احیائے ملت کا کام شروع کیا، کتاب و سُنت کے علوم کی طرف خاص توجہ دی گئی، اسی زمانہ سے احادیث کی ترتیب و تدوین کی مہم شروع ہوئی، ثقافت و تہذیب اسلامی کو غیر اسلامی آمیزشوں سے پاک کیا گیا، نظامِ تعلیم و تربیت اور فکر عامہ میں از سرِ نو اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہونے لگا، اور تمدن کے تمام شعبوں کی کتاب و سُنت کے مطابق تشکیل ہونے لگی، یہاں تک کہ جاگیردارانہ نظام کا قلع قمع کر دیا گیا، شاہی خاندان میں جس قدر جاگیریں تھیں، وہ بیت المال کی ملکیت قرار دی گئیں، شاہ و گدا امیر و غریب اور دیگر نسلی وطنی اور قومی امتیازات کو مٹا کر از سرِ نو مساواتِ عامہ حریتِ اجتماع اور آزادی فکر کو رواج دیا گیا، مگر افسوس ہے کہ یہ کام ابھی تشنۂ تکمیل ہی تھا، کہ عمر ثانی رضؓ کی عمر نے وفا نہ کی، اور آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے،

اب مجدد اوّل کی وفات کے بعد مستقل طور پر عنانِ اقتدار جاہلیت کے ہاتھوں میں چلی گئی، اور پھر آج تک دنیا کے کسی حصہ میں کوئی پائدار اسلامی طرز کی حکومت قائم نہ ہو سکی، چونکہ مذہب اور اقتدار دونوں قوتیں لازم و ملزوم ہیں، اس لئے تاوقتیکہ یہ دونوں یک تخت کسی جامع شخصیت کے ذریعہ عمل پذیر نہ ہوں، دنیا میں امن و نظم کا قیام دشوار ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے،

این دو قوت حافظ یک دیگر ند

کائنات زندگی را محور ند (اقبال)

مگر اب اقتدار نے مذہب سے پیچھا چھڑا لیا، اور جاہلیت کے راستہ میں اب کوئی رکاوٹ نہ رہی، چنانچہ اب اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر مختلف راستوں سے ملتِ اسلامیہ پر یلغار شروع کر دی، ہر نئے دور میں ایک نیا روپ بدل کر سامنے آئی، اور جسد ملی میں اس کا اثر و نفوذ بڑھتا ہی چلا گیا، مگر

حضرت مجدد اول نے اپنے ڈھائی سالہ دورِ خلافت میں فکرِ اسلامی کو جس سطح پر لا کھڑا کیا تھا، اُس کے دوررس نتائج کو روک دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی، اب ایک طرف جاہلیت کی قوتیں مصروفِ کار تھیں، اور دوسری طرف مجدد اول کی نہضتِ علمی اور حرکتِ دینی اپنا رنگ دکھا رہی تھی،

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (اقبالؒ)

بنی امیہ کا دورِ استبداد ۱۳۲ھ تک قائم رہا، اس عہد میں بہت سی اسلامی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جن میں حضرت امام ابو حنیفہ (پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ) اور حضرت امام مالکؒ (پیدائش ۹۵ھ وفات ۱۷۹ھ) فکر و اجتہاد اور تبحر علمی کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں، مگر مصیبت یہ تھی کہ سلاطین و امراء کے فکر و ذہن کو جاہلیت نے اس قدر ماؤف بنا دیا تھا، کہ اب وہ فکرِ اسلامی سے بالکل تہی دست ہو چکے تھے، اور کتاب و سنت کی اصل روح کو ہوائے نفس کے تہ در تہ پردوں میں چھپا رکھا تھا، اب اگر کوئی مردِ خدا ان پردوں کو ہٹا کر روحِ اسلامی کو بے نقاب کرنا چاہتا، تو ملوکیت کی تمام طاقتیں اُس کے خلاف صف آرا ہو جاتیں، حقیقت یہی ہے کہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک جاہلیت کے جتنے نقشے بنے ہیں ان میں یہ رنگ زیادہ نمایاں رہا ہے، امراء کو کچھ ایسے علماء سو مل جاتے تھے، جو بندگانِ حرص و آز اور پرستارانِ سیم و زر تھے، اور ان کی زبان سے اہلِ حق پر کفر کے فتوے لگوائے جاتے تھے، اور پھر ان کو قید و بند میں ڈالا جاتا، کوڑوں سے پیٹا جاتا، قتل کی دھمکیاں دی جاتیں، غرض وہ سب کچھ ہوتا رہا، جو اہلِ حق کو اعلاءِ کلمۃ الحق کے صلہ میں اربابِ جور کی طرف سے بطورِ انعام مل سکتا ہے، مگر ان مردانِ خدا نے اس راہ میں خوف و طمع کی تمام زنجیروں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا، قید و بند کی صعوبتیں اور کوڑوں کی بارش بھی اُن کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہ کر سکی،

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اور دولت و ثروت، جاہ و عزت کے مزدے بھی سنائے گئے، مگر ان مردان راہ حق کو کوئی چیز جادۂ مستقیم سے نہ پھیر سکی،

یہ دونون جلیل القدر امام بنو امیہ کے عہد مین پیدا ہوئے، اور عہد عباسی مین اُن کی وفات ہوئی یہی وہ مقدس نفوس تھے، جن کی طبع رسا اور نظر حق شناس نے قرآن و حدیث کے غوامض و اسرار کو آشکارا اور فکر و اجتہاد اور اخذ و استنباط کے ذریعہ احکام و شرائع قوانین سیاست، اور نظام اجتماع و تمدن کو مرتب کیا،

یہ دونون اصحاب عملی سیاسیات اور ارباب سیاست سے الگ تھلگ رہے، اور ان کی علمی کاوشین کسی امیر و سلطان کی رہین منت نہ ہوئین، بلکہ اُن کی طبع غیور نے انھین سلاطین کی منت پذیری سے ہمیشہ بے نیاز رکھا، کئی سلطنتین بنین اور بگڑین کئی انقلاب آئے، سلاطین کی باہم رقابتون نے خدا کی زمین کو تہ و بالا کر دیا، مگر یہ مردان حق شناس اپنے مقام و موقف پر قائم رہے،

جہان تک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے ان دونون حضرات کے متعلق صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ مدینہ منورہ مین جب حضرت امام حسنؓ کے پڑوتے، محمد مہدی نے خلافت کا دعویٰ کیا، تو منصور عباسی کی ایک بہت بڑی فوج نے مدینہ پر چڑھائی کر دی، محمد مہدی کے پاس تھوڑی سی فوج تھی، جب انھون نے دیکھا کہ کامیابی کی کوئی امید نہین تو انھون نے اپنے لشکریون سے فرمایا، کہ جو لوگ اپنی جان بچانا چاہتے ہین، وہ اپنے گھرون مین چلے جائین، اب صرف تین سو تنہا سوار رہ گئے، مگر خاندان سادات کے چشم و چراغ محمد مہدیؒ کی تنہا تلوار نے ایک سو بہادرون کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر آخر شکست کھائی، اس لڑائی مین امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ نے محمد مہدی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ان حضرات کو سخت سزائین دی گئین، امام ابو حنیفہؒ کو جیل مین ڈالا گیا، اور اسی حالت مین زہر دلایا گیا، اور امام مالکؒ کے کوڑے لگائے گئے، اور اُن کی مشکین کسی گئین، یہان تک کہ ہاتھ بھی ٹوٹ گیا،

غرض ۱۳۲ھ سے عباسیون کا دور امامت شروع ہوا، اور بدقسمتی سے یہ لوگ اس معاملہ مین

راسے بنی امیہ سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے، چنانچہ اس دور میں جاہلیت نے یک لخت کئی روپ دھار لئے،
مرا ذخشہ اقتدار میں بدست تھے، لادینی اور لامذہبیت کا ایک متلاطم خیز سمندر امنڈ کر آگیا، اور اسلامی نظام فکر
ل پر ہر طرف سے یورش ہونے لگی،

خاندانِ سادات کے چھٹے امام حضرت امام جعفر صادقؒ تک شیعہ فرقہ میں اتحاد رہا، مگر اُن کے بعد
فرقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا، ایک بڑا گروہ حضرت موصوف کے بڑے بیٹے حضرت امام کاظم کو امام
ماننے لگا، اور کچھ لوگ اُن کے دوسرے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو امامت کا حقدار تسلیم کرنے لگے، ثانی الذکر گروہ
سماعیلی فرقہ کے نام سے موسوم ہوا، اور یہ گروہ بھی آگے چل کر دو گروہوں میں منقسم ہو گیا، ایک گروہ وہ تھا
جو اپنے عقائد لوگوں سے چھپاتا تھا، اور اندرونی طور پر اپنے خیالات و افکار کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف
تھا، یہ گروہ باطنی فرقہ کے نام سے مشہور تھا، اس گروہ نے سارے ملک میں تبلیغ کا وسیع جال پھیلا رکھا تھا۔
اور دوسرا گروہ جو قرمطی کہلاتا تھا، وہ اگرچہ اتنا منظم نہ تھا، مگر اس کے ماننے والے بڑے دلیر اور بہادر
تھے، علم کلام میں ان فرقوں کے عقائد پر مفصل بحث کی گئی ہے، ان کا مذہب دراصل اسلام اور مجوسیت
سے مرکب تھا، کیونکہ یہ لوگ ایرانی الاصل تھے، اس لئے ایران کے قدیم مذہب اور تہذیب و تمدن کا اُن کے
خیالات پر گہرا اثر تھا،

باطنی فرقہ کا بانی ایک شخص عبداللہ بن میمون قداح نامی تھا، اُس نے بیت المقدس میں اپنی
تبلیغ کا وسیع سلسلہ شروع کر رکھا تھا، اور اپنے آدمی جگہ جگہ بٹھائے ہوئے تھے، جو کبوتروں کے ذریعہ
اس کو خبریں پہنچاتے تھے، اس بنا پر لوگ اس کے معتقد ہو گئے تھے،

ان فرقوں کے علاوہ فرقۂ معتزلہ نے بھی اسی دور میں عروج حاصل کیا، یہ لوگ ایک جدید فلسفیانہ
مذہب کے موجد تھے، اور انھوں نے دینِ خداوندی میں دل کھول کر تحریف کی، یہاں تک کہ فکر اسلامی
کی پوری عمارت کو متزلزل کر دیا، اور پھر بات یہیں تک ختم ہو جاتی، تو کوئی بات نہ تھی، مگر اس سے بھی

بڑھکر جاہلیت نے ان لوگون پر بھی دست درازی شروع کر دی، جو اہل السنت کہلاتے تھے، اور علم و فضل مین یگانۂ روزگار تھے، انھون نے ان نئے فرقون کے دفاع و مقابلہ کے لئے اسی قسم کے جاہلی ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیئے، اور یونانی فلسفہ کے اوہام و خرافات کو افکار اسلامی کے ساتھ مخلوط کر دیا، چنانچہ اس عہد کی کتب تفسیر اور دیگر اسلامی لٹریچر بھی ان نئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا،

مگر اس دور جاہلیت مین بھی اللہ کے کچھ مقدس بندے پیدا ہوئے، جنھون نے جاہلیت کے ان ہمہ گیر ہجوم کا پامردی سے مقابلہ کیا، ان مین امام اجل حضرت احمد بن حنبلؒ، امام شافعی اور امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہین،

حضرت امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ) جن کا نام زبان پر آتے ہی دل مین عقیدت و محبت کے جذبات اُمڈ آتے ہین، ایک بہت بڑے امام حدیث اور مجدد دین تھے، اسلام کے اس بطلِ جلیل اور علمبردار علوم نبوت کو زندگی کے جن دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑا، ہماری طرح کے کمزور اور نحیف لوگ اس کا تصور بھی مشکل سے ہی کر سکتے ہین، مگر خدا کو جن لوگون سے کام لینا منظور ہوتا ہے، ان کی ذہنی اور جسمانی بناوٹ بھی عام انسانون سے مختلف ہوتی ہے،

حضرت امام نے چار عباسی حکمرانون کا زمانہ دیکھا، اپنے جسمِ اطہر پر ظلم و تشدد کے پہاڑ گرتے ہوئے بھی دیکھے، اور پھر عقیدت و محبت کے پھولون کی بارش بھی دیکھی، یہ دونون حالتین اگرچہ صبر شکن تھین، مگر کیا کہنے ان اللہ والون کے کہ کسی حالت مین اپنے دامن بے نیازی کو دنیاوی نجاست سے ملوث نہ ہونے دیا، جن لوگون نے اللہ کے ساتھ اپنی جان کا سودا کر لیا ہو وہ کسی نفع و سود کے متلاشی نہین ہوتے،

دل دادم و جان دادم و ایمان دادم
سوداست ولے سود نمی دانم چیست

غرض ان چار بادشاہون مین سے مامون، معتصم اور واثق کے زمانہ مین حضرتِ امام پر شدائد و مظالم

کی انتہا کردی گئی، انسان تو انسان ہے، پہاڑ بھی ان مصائب کی تاب نہ لاسکیں، مگر مستان خمخانۂ احدیت کے رنگ ہی نرالے ہیں، اُن کے آہنی عزم کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کرسکتی، اور وہ اس دنیا کی فانی لذت، حیاتِ دنیوی کی پرفریب چمک دمک، بادشاہی جلال وجبروت اور طلسم زخارف پر لات مار کر اپنے نصب حیات کی تکمیل میں مصروف سعی رہتے ہیں، اور درحقیقت یہ بلند ترین مقام ان خوش بخت اور نیک طالع انسانوں کو ہی میسّر آتا ہے جن پر خدا سے قدوس کی خاص نظرِ التفات ہو،

بلند مرتبہ زان خاکِ آستان شدہ ام

غبار کوے توام گر بہ آسمان شدہ ام

امام موصوف کی نسبت خود اُن کے معاصرین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے، کہ ان کے عزم بلند کے سامنے بادشاہوں کا جاہ وجلال دنیا کی ہر چیز سے حقیر تھا، ابراہیم بن مصعب کوتوال کہتے ہیں، کہ میں نے بادشاہوں کے آگے امام احمدؒ سے زیادہ کسی کو دلیر اور نڈر نہیں پایا، اون کے الفاظ ہیں :-

یَوْمَئِذٍ مَا نَحْنُ فِی عَیْنَیْہِ اِلَّا کَامْثَالِ الذُّبَابِ، (ترجمہ) ہم (کارپردازانِ حکومت) ان کی نظر میں ایسے تھے، گویا ان کے سامنے مکھیاں بھنک

بشر حافی جو اس زمانہ کے بہت بڑے زاہد وعابد تھے، فرماتے ہیں، کہ جب امام احمدؒ کو قید کرکے پابزنجیر طرطوس روانہ کیا گیا، تو ابوبکر الاحول نے سوال کیا، ان عرضت علیک السیف تجیب؟ اگر تم پر تلوار پیش کی جائے تو پھر جواب دوگے ؟ فرمایا "لا" ہرگز نہیں،

بشر حافی سے کہا گیا کہ وہ ان کی سفارش کیوں نہیں کرتے، تو فرمایا مجھ میں ان مصائب کے تحمل کی قوت نہیں، قام احمد مقام الانبیاء احمد تو انبیا کے مقام پر کھڑے ہیں،

اس مردِ خدا کی بے نیازی کا یہ عالم تھا، کہ حسن بن عبد العزیز نے ہزار ہزار روپیہ کی تیس تھیلیاں

آپ کی خدمت میں پیش کیں، اور عرض کیا یہ مال مجھے ترکہ میں ملا ہے، اور بالکل طیب ہے، آپ اسے قبول فرمائیں، تو فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں، میرا مالک مجھے رزق دے رہا ہے،

جب متوکل کا زمانہ آیا، تو صورت حال بدل گئی ظلم و تشدد کی جگہ انعام و اکرام کی بارش شروع ہو گئی، تو یہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھے،

هذا امر اشد علیّ من — یہ عقیدت و محبت کا جال میرے لئے

ذاك " — کوڑوں کی مار اور قید سے زیادہ سخت ہے'

حضرت امام شافعی (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) بھی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے، فکر و اجتہاد اور فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے نمایاں کام کیا، مگر حکومت وقت نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور یمن سے بغداد تک انھیں پابہ زنجیر لایا گیا،

امام بخاری (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ) کے تفقہ فی الدین اور تبحر علمی سے ساری دنیا روشناس ہے، یہ جلیل القدر امام حدیث جب فراغت علم کے بعد اپنے وطن بخارا تشریف لائے تو حکومت بخارا کی طرف سے ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا، مگر چند ہی دن قیام کیا تھا کہ امیر بخارا ان کی بے نیازی و استغنار اور بے باکانہ تبلیغ سے چلا اٹھا، امام بخاری سے مطالبہ کیا کہ آپ شاہی محل میں تشریف لاکر شاہزادوں کو درس حدیث دیا کریں، مگر امام صاحب نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہوگا، اگر خواہش ہو تو بچوں کو میرے پاس بھیج دیا کرو، مگر امیر نے کہا کہ اچھا پھر اتنا تو ضرور کرو کہ جب میرے بچے تعلیم کے لئے آئیں تو اس وقت کسی جولاہے یا موچی کا لڑکا وہاں بیٹھنے نہ پائے میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جہاں میرے لڑکے بیٹھے ہوں وہاں گھٹیا درجہ کے لوگ بھی ان کے ساتھ بیٹھیں، مگر علوم نبوت کا یہ عالم متبحر اور اسلامی نظام حیات کا شارح کیونکر یہ برداشت کرسکتا تھا، کہ ان کے حلقہ درس میں امیر و غریب اور شریف و رذیل سے جدا جدا سلوک ہو، انھوں نے صاف جواب دیا کہ علم حدیث وراثت رسول ہے کسی شاہ و امیر کی جاگیر نہیں یہاں

شاہ و گدا اور امیر و غریب ایک ہی صف میں بیٹھنے لگے، اس بات پر امیر سخت ناراض ہو گیا، اور علمائے سوء نے تو سیطاسے آپ پر کفر کے فتوی لگائے گئے، آخر امام صاحب کو اپنے وطن مالوف سے ہجرت کرنی پڑی در سمرقند کے ایک گاؤں میں پہنچے، جہاں انہوں نے بعد نماز عصر بارگاہ رب العزت میں بصد عجز و نیاز دعا کی کہ

"اے خدا تیرے اس بندے پر زمین کی وسعتیں تنگ آگئی ہیں، اب تو اسے اپنے پاس بلالے"

چنانچہ چند دنوں ہی میں اس دعا نے اثر دکھایا، اور آپ نے اسی گاؤں میں فرشتہ اجل کو لبیک کہی، انا للہ وانا الیہ راجعون،

غرض عباسیہ کا دور حکومت ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ یعنی پورے پانصد سال تک جاری رہا، اور اس کے بعد مصر میں اس خاندان کے کچھ افراد نے ۹۲۳ھ تک حکومت کی، مگر دور بنی امیہ کے آغاز میں جس فتنۂ جاہلیت نے سر اٹھایا تھا، وہ دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا، اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کا جاہ و جلال تیسری صدی کے اختتام تک زور دن پر رہا، مگر اس کے بعد باہم سیاسی اختلاف و نزاع کی وجہ سے اسلامی سلطنتوں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک پہنچ گئی، بیرونی طاقتیں بھی سر اٹھانے لگیں، خلافت عباسیہ کی شوکت ایک افسانہ بن گئی، ہسپانیہ کی حکومت کا بھی یہی حال تھا، ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی انتہائی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، اگرچہ کس سے بجائے ایک مسلمان ہی مسلمان تھے، مگر ان میں کوئی مؤثر طاقت نہ تھی، دوسری طرف قرامطہ کا فتنہ زوردن پر تھا، ان حالات میں خدائے قدوس نے کچھ مردان حق کو پیدا کیا جنہوں نے اصلاح ملت اور تجدید دین کا بیڑا اٹھایا، ان میں ایک حضرت محی الدینؒ ہیں، جنہوں نے چوتھی صدی میں اندرونی اور بیرونی فتنوں کے سد باب کے لئے زبردست کوشش کی، تمام دنیا میں اپنے خلفاء کو پھیلا دیا، اور ان کی بے لوث کوششوں سے پانچویں صدی میں مسلمانوں کی قوت و شوکت بھی نصف النہار پر پہنچ گئی، دوسری طرف امام غزالیؒ نے

قلمی جہاد کے ذریعہ فلسفۂ یونان کے بڑھتے ہوئے الحاد اور فرق باطلہ کی فتنہ انگیزیون کا زبردست مقابلہ کیا اور اپنے مخصوص رنگ مین اسلامی نظریۂ حیات کی شرح کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ دہریت و الحاد کا وہ سیلاب عظیم جو عام مسلمانون کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جا رہا تھا، رک گیا، اور پھر اسلامی فلسفۂ حیات کا رنگ اُبھرنے لگا،

اسی طرح امام ابن تیمیہ جو ساتوین صدی کے ایک بہت بڑے بلند پایہ عالم سنت اور فاضل اجل تھے، انھون نے بھی اسی زمانہ کے اعتقادی اوہام و خرافات کا نہایت عزم و استقلال سے مقابلہ کیا، اور اسلام کے عقائد و افکار اور نظام اجتماع و تمدن مین اس وقت تک جس قدر مشرکانہ اثرات پیدا ہو چکے تھے ان کو ایک ایک کرکے نکالا، اور خالص اسلامی نظام فکر و عمل مرتب کیا، اور ان کی فاضلانہ تصانیف نے عالم اسلامی کے اعتقادی ناسور کے لئے نشتر کا کام دیا، مگر انھون نے صرف قلمی جہاد پر اکتفا نہین کی، بلکہ اس وقت کی سب سے بڑی قاہرانہ طاقت یعنی تاتاری وحشت کے مقابلہ مین جہاد بالسیف بھی کیا،

لا تنال بغير السيف نزلة

ولا ترد صدور الخيل بالكتب

ہندوستان مین اسلام اور جاہلیت کی ٹکر	اسلام کے دور اول مین عرب تاجرون کے قافلے ہندوستان مین آئے، مالابار اور کالی کٹ کی سرزمین نے سب سے پہلے ان کا خیر مقدم کیا، چونکہ ان لوگون پر

اسلامی نظریۂ اجتماع و مدنیت کا گہرا اثر تھا، اس لئے ان کی سادگی، خلوص اور بلند اخلاقی نے ان علاقون کے باشندون کو بھی اپنے رنگ مین رنگ دیا، دیانت و امانت اور عمل و کردار کی عمدگی کی وجہ سے ان کا اثر و نفوذ اس حد تک بڑھا کہ ہندو راجے بھی ان کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگے، یہی وجہ ہے کہ آج تک ان علاقون مین اسلامی تہذیب و مدنیت کا کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے، بنی امیہ کے زمانہ مین محمد ابن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا، اور انھون نے ہندو راجاؤن کو شکست دی، مگر بنی امیہ کے نزدیک ان علاقون

کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی، اس نے محمد بن قاسم کو واپس بلالیا، ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام محمد غوری کے غلاموں کے ہاتھ سے عمل میں آیا، جن کا پہلا حکمران قطب الدین ایبک سنہ ۶۰۲ھ میں تخت نشین ہوا، یہ خاندان اصل و نسل کے اعتبار سے ترکی تھا، اس وجہ سے اس میں نسلی شرافت، سادگی اور شجاعت بسالت تو طبعی تھی، مگر اسلام نے ان میں عدل و دادرسی اور کچھ بلند نظری بھی پیدا کر دی تھی، اس کے بعد کئی خاندانوں نے ہندوستان پر حکومت کی، اور حق یہ ہے کہ دبدبۂ شوکت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے ان میں کوئی کمی نہ تھی، البتہ اگر ان میں کوئی کمی تھی، تو وہ یہ کہ اسلام کی اصل روح سے بہت حد تک نابلد تھے، اگرچہ بعض حکمران ایسے بھی ہوئے ہیں، جو فطرۃً صالح اور نیک نہاد تھے، مثلاً ناصر الدین محمود اور مغل شہنشاہ عالمگیرؒ وغیرہ، مگر افسوس کہ صحیح اسلامی نظام سیاست و اجتماع کے نفاذ و اجراء کی ان کو بھی توفیق نصیب نہ ہوئی، اس ملک میں اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی اگر کوئی کوشش ہوئی، تو وہ صرف اولیاء اللہ و علمائے حق کے ذریعہ سے حضرت معین الدین چشتیؒ پشاور کے راستہ سے آئے، لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر کو اپنا مرکز تبلیغ بنایا، انھوں نے اپنے خلفاء کو ملک کے کونے کونے میں بھیج دیا، خواجہ قطب الدین بختیارؒ کو دہلی میں متعین کیا، خواجہ فرید گنج شکر کو پاکپٹن میں اور جلال الدین تبریزی نے بنگال میں اشاعت دین کا سلسلہ جاری کیا، ان حضرات کی تبلیغی جدوجہد سے ہندوستان میں کسی حد تک شعائر اسلامی نے رواج پایا،

جاہلیت کا نیا کارنامہ ہندوستان کی سرزمین ہر بات میں نرالی واقع ہوئی ہے، جو بات دنیا کے کسی کونے میں دیکھی اور سنی نہ جا سکتی ہو، اسے ہندوستان میں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے، اس سے پہلے بنی امیہ ہوں یا شاہان عباسیہ، حکومت مصر ہو یا سلطنت ترکیہ، سب میں ایک امر مشترک ضرور تھا، کہ وہ خالص اسلامی فکر و نظر اور طریق اجتماع و سیاست سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مستغنی تھے، اور جاہلی فکر و عمل نے اُن کے دل و دماغ پر گہرا اثر جما لیا تھا، مگر باایں ہمہ ان میں ایک قسم کی اسلامیت کا تصور موجود تھا، اور جس کی

بنا صرف اسلام کے بنیادی افکار و اعمال پر تھی، یہ دوسری بات ہے کہ اسلامی فکر و عمل میں بھی ان لوگوں نے بہت کچھ ہیر پھیر کر دیا تھا، تاہم برائے نام ہی سہی مگر دائرۂ اتحاد اب تک اسلامی عقائد و اعمال ہی متصور ہوتے تھے، مگر ہندوستان کے شہنشاہ اکبر (دی گریٹ امپرر) نے یہ کسر بھی پوری کر دی، اس کے تصور نے اسلام کے مخصوص نظام اجتماعی کو سخت نقصان پہنچایا، اور جسد ملی کے جوڑ جوڑ کو مضمحل کر دیا، لیکن بمقتضائے لِکُلِّ فرعونِ موسیٰ خدا نے اسی جنم بھومی میں ایک مردِ حق بین کو بھی پیدا کر دیا، جس کے عصائے کلیمی کی ایک ہی ضرب سے یہ صنم اکبر پاش پاش ہو کر رہ گیا،

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

میری مراد حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے ہے، جنہوں نے صرف علمی جہاد ہی نہیں کیا، بلکہ وقت کی برسرِ اقتدار طاقت نے آپ کو قید و بند اور ہر قسم کی بلا و آزمائش میں ڈالا، مگر اُن کے عزم و ہمت میں بال برابر بھی فرق نہ آسکا،

عشق بازی را تحمل بایدا ے دل عشق باز   گر بلائے بود بود و گر خطائے رفت رفت

عالمگیر کی موت کے بعد سلطنتِ اسلامی حالتِ نزع میں مبتلا ہو گئی، ایک نیم مردہ جسم تھا جس میں مدافعت کی طاقت باقی نہیں تھی، مگر مرتے مرتے بھی اس سخت جان نے کافی عمر حاصل کر لی، اندرونی خلفشار اور خلاف و تنازع نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا، مگر آخری سانس تک افتاں و خیزاں قدم بڑھاتی چلی گئی، مگر تابکے؟ آخر گری، تڑپی، اور جان دیدی،

اس آخری دور میں کئی مردانِ حق شناس پیدا ہوئے، ان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ، مولینا اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں، ان حضرات نے خالص اسلامی رنگ میں اسلامی نظریۂ حیات کو بروئے کار لانے کی مجاہدانہ جد و جہد کی، ان کی علمی کاوشوں اور سر فروشانہ سرگرمیوں نے اگرچہ وقتی طور پر

کوئی نمایان کامیابی حاصل کی، مگر ملتِ اسلامی کی تعمیر فکر میں ان کو کافی دخل ہے،

یہ دور صرف مسلمانانِ ہند ہی کے لئے پرفتن نہ تھا، بلکہ تمام عالمِ اسلامی ایک خطرناک انقلاب کے دروازہ پر کھڑا تھا، اور تمام اسلامی سلطنتیں اس آگ کے شعلہ کے لپیٹ میں آگئی تھیں،

دولِ یورپ مسلمانانِ عالم کی مرکزیت کو نیست و نابود کرنے کے لئے کس طرح لگاتار کوشش کرتی رہیں، اور کس طرح وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئیں؟ یہ تاریخ عالم کا ایک افسوسناک باب ہے، مگر اس سے زیادہ افسوسناک خود مسلمانوں کا نامۂ اعمال ہے جس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے، اغیار کی ریشہ دوانیاں تو زمانۂ رسالت سے جاری رہیں، مگر جب تک مسلمانوں کا قومی کردار مضبوط و مستحکم رہا، اس وقت تک وہ ہر بیرونی طاقت کا کامیاب مقابلہ کرتے رہے، اور جو طاقت اُن سے ٹکرائی، وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئی، مگر دنیاے اسلام کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا جب کہ پہلی دفعہ ملتِ اسلامیہ کی بنیان مرصوص میں رخنہ پیدا ہوا، یہی وہ خطرناک فتنہ تھا جس کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی خبر دی تھی،

التی تموج کموج البحر (بخاری) جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا آئے گا، اور مسلمانوں کے قومی وقار کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا، مگر پھر بھی جب تک مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں اسلامی فکر و عمل کا کم سے کم حصہ بھی موجود رہا، تمام دنیا پر فرمان روائی کرتے رہے، ان کی افواج نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا اور جو لوگ اسلامی جھنڈے کو سرنگون کرنے کے لئے آگے بڑھے، وہ خود ہی اس کے آگے سرنگون ہوگئے، مگر انیسویں صدی کے اوائل میں دنیاے اسلام کو ایسے سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ ان کی تاب نہ لاسکے، لیکن نہایت رنج و افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ عالمِ اسلامی کی تباہی و بربادی میں اغیار کی فتنہ انگیزیوں کو اتنا دخل نہیں، جتنا کہ غدارانِ ملت کی سیہ کاریوں کو ہے،

من آنچہ دیدہ ام زدل دیدہ دیدہ ام — گاہے ز دل کنم گلہ گاہے ز دیدہ ام

علامہ افغانی کا ایک مضمون | اس سلسلہ میں اس زمانہ کے بطلِ جلیل اور مُدبّرِ اعظم علامہ جمال الدین افغانیؒ کے ایک مضمون کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس زمانہ میں دنیائے اسلام کن مصائب سے دوچار ہو رہی تھی، اور ان مصائب کی زیادہ ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ فرماتے ہیں،

"شاہ سلطان حسین کے زمانہ میں روسی جب اصفہان پر حملہ آور ہوئے تو عثمانیوں نے روس کی حمایت کی، بلکہ ایران کے مقابلہ میں روس کو مدد بہم پہنچائی گئی، یہ کتنا احمقانہ فعل تھا، اور انھوں نے آتنا بھی محسوس نہ کیا کہ روس ترکوں کے ساتھ آج تک کیا معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے، ترکی مقبوضات مثلاً بلغاریہ، یونان اور رومانیہ میں اس نے کیا ریشہ دوانیاں شروع کر رکھی ہیں، نتیجہ یہ ہوا ....

.... روس آذربائی جان کے کئی مقامات پر قابض ہو گیا، ....

عباس مرزا جب روس کے ساتھ لڑ رہا تھا، تو عین اسی زمانہ میں ترکوں نے ایران سے جنگ چھیڑ دی اور اس مداخلت کی وجہ سے روس آذربائی جان کے کئی شہروں پر قابض ہو گیا، سلطان ٹیپوؒ کا سفیر دربار ترکی میں گیا، اور اس نے سلطان کی طرف سے یہ پیشکش کی، کہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے عوض بصرہ ان کے حوالہ کیا جائے، مگر ترکی نے اس پر توجہ نہ دی، اور سفیر ناکام واپس آ گیا، سلطان ٹیپوؒ کا مقصد یہ تھا، کہ ترکوں کا ہندوستان میں اثر و نفوذ پیدا ہو جائے، اور انگریزوں کی قوت کو توڑا جائے، اگر ترک اس وقت اس پیشکش کو مان جاتے، تو آج دنیا کا نقشہ شاید کچھ اور ہی ہوتا، جس زمانہ میں افغانیوں نے ہندوستان کو انگریز کے تسلط سے نکالنے کی جدوجہد شروع کی اور ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، تو فتح علی شاہ ایران نے انگریز کو خوش کرنے کے لئے افغانستان کو چیلنج کر دیا ۔ مگر اُس نے اتنا بھی غور نہ کیا، کہ افغانیوں کے خلاف انگریز کے ہاتھ مضبوط کرنا خود ایران

کے لئے کس درجہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، امیر دوست محمد خان والی افغانستان نے انگریز کا مقابلہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا، اور پھر انگریز کے طلسم مین گرفتار ہو کر رنجیت سنگھ کو میدان جنگ مین تنہا چھوڑ دیا، اگر دوست محمد خان مین کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا، تو رنجیت سنگھ سے ہر قیمت پر تعاون کرتا کیونکہ پنجاب کی حکومت افغانستان کو انگریزی خطرہ سے محفوظ رکھ سکتی تھی، اس طرف ہندوستان مین نواب بنگال اور نواب کرناٹک اغیار کا آلۂ کار بن گئے، نواب لکھنو نے تیموری سلطنت کو ضعف پہنچایا، نواب دکن نے ٹیپو شہید کے مقابلہ مین انگریز کا ساتھ دیا"

"اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے اپنی خود مختاری کے لالچ مین ترکون سے بغاوت کی، اور یورپ کے بنیون سے گران شرح سود پر قرضہ لیا، اور اس طرح ملک کو انگریز کے ہاتھ بیچ دیا"

اس مضمون مین علامہ افغانی نے جن دردناک واقعات کا ذکر کیا ہے، ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہین، دراصل علامہ کی سرفروشانہ سرگرمیان اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہین، جو عالم اسلامی کے لئے انتہائی یاس انگیز دور تھا، ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مسلط ہو رہی تھی، ترکی کو تباہ کرنے کے لئے دول یورپ کی دسیسہ کاریان مسلسل جاری تھین، الجیریا، ٹیونس اور مراکو پر فرانسیسی انتداب چھا چکا تھا، طرابلس اٹلی کے چنگل مین گرفتار تھا، اور دوسری طرف روس بخارا اور آذربائیجان پر قبضہ جما رہا تھا، یہ حالات تھے، جن سے تمام دنیائے اسلام دوچار ہو رہی تھی اور اس پرآشوب دور مین تنہا علامہ افغانیؒ کی آواز بدامنی و بے چینی کی ان فضاؤن مین گونج رہی تھی،

اب ظاہر ہے کہ اقوام غالبہ جہان انسانون کے اجسام پر حکومت کرتی ہین، وہان ان کے اذہان و افکار کو بھی ایک خاص قالب مین ڈھالنے کی کوشش کرتی ہین، اور مفتوح اقوام کے فکری اور ذہنی قوی مین وہ ربط باقی نہین رہتا، اور نہ ہی اجتماعی احساسات مین وہ قوت موجود ہوتی ہے، جو

خارجی اثرات کے لئے مانع ہو سکے، ورنہ ظاہر ہے کہ جب تک قومون کے ذہنی قوی مین ربط و تسلسل اور اجتماعی احساسات مین قوت و استحکام موجود رہتا ہے، اس وقت وہ اغیار کے غلبہ و تسلط کو قبول ہی نہین کرتین،

چونکہ اس دور مین مسلمانون کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا تھا، اس لئے اقوام غالبہ کے جاہلی تصورات کو انھون نے نہایت آسانی کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا، اور ان کے نظام اجتماع و تمدن مین اسلامی نظریۂ حیات کا جو تھوڑا بہت اثر باقی تھا، وہ بھی زائل ہونے لگا، اور مسلمان عجیب ذہنی کشمکش مین مبتلا ہو گئے تھے،

(باقی)

حیاتِ شبلی

(حصۂ اول)

حیات شبلی جس کا مدتون سے شائقین کو انتظار تھا، چھپ کر شائع ہو گئی ہے، یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانحعمری نہین ہے، بلکہ اس مین اُن کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس سے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانون کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت، اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لے کر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہین، ضخامت مع دیباچہ و مقدمہ وغیرہ کے ۹۰۰ صفحے، قیمت غیر مجلد علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپیہ، مجلد لعہ

"منیجر"

گھکڑ نامہ

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورناکلر سوسائٹی احمد آباد

(۲)

فرشتہ نے آگے چل کر محمود غزنوی کے حالات مین تحریر کیا ہے کہ ۳۹۹ھ مین محمود نے ہندوستان پر پھر فوج کشی کی، انند پال (راجہ پنجاب) یہ معلوم کر کے بے حد پریشان ہوا، آخر اس نے ہندوستان کے دوسرے راجون سے مدد مانگی، اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر نے اس کی کافی مدد کی، وہ میدان جنگ مین اترا، ہندو گھکڑون نے اس کی طرفداری کر کے اس کے ساتھ کثرت کی، محمود نے ہندی فوج کی کثرت اور حملہ کی تیزی دیکھ کر لشکر گاہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا، لیکن جنگ کے درمیان مین گھکڑ خندق پار ہو کر لشکر مین گھس آئے، اور اس تیزی سے حملہ کیا کہ غزنوی فوج کے تیار ہونے تک تین چار ہزار مسلمان شہید ہو گئے،[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ گھکڑون کی آبادی جمون سے شکست کھانے کے بعد دو جگھون مین تقسیم ہو گئی تھی، شاہی خاندان، امراء، اور فوجی اشخاص کابل چلے گئے تھے، اور عام آبادی جمون یا زیرین کشمیر مین رہی، جو اپنے مذہب پر قائم تھی،

مؤلف کہتا ہے، کہ ۳۶۹ھ مین شاہ کابل کی مدد سے سلطان ناصر الدین سبکتگین نے ہندوستان

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۶۵، ۶۹ حیدر آباد،

پے در پے حملے کیے، اور شاہ کی جرأت، ہمت اور جنگی قابلیت دیکھ کر اس کو سپہ سالار بنا دیا، اور صوبہ کابل کو اپنے ملک کے ساتھ الحاق کرکے اس کو وہاں کا صوبہ دار قرار دیا، کچھ عرصہ کے بعد وہ وفات پا گیا، کوہ غازہ مان عاشقان" پر اس کی قبر بنائی گئی، اس کے پانچ لڑکے تھے، گکھڑ شاہ سب سے بڑا تھا وہی تخت نشین ہوا، ۳۸۷ھ میں سلطان سبکتگین کا انتقال ہو گیا، اور سلطان محمود تخت پر بیٹھا، اس نے گکھڑ شاہ کو کابل کی صوبہ داری پر برقرار رکھکر، اس کی عزت افزائی کی" گو اس بیان کی تائید کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذری، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ناممکن معلوم ہو، کیونکہ غزنوی فوج میں بکثرت ہندو نظر آتے ہیں، اور بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہیں، جیسا کہ بیہقی اور فرشتہ میں مذکور ہے،

اس کے بعد مؤلف نے لکھا ہے کہ ۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں سلطان محمود نے گکھڑ شاہ کو "پوٹ ہار" کا علاقہ جو دریائے بہت (جہلم) اور سندھ کے درمیان تھا، بطور جاگیر کے عنایت فرمایا، اور کابل کی صوبہ داری اپنی جگہ بحال رہی، منشا یہ تھا کہ ہندوستان اور خراسان کے دروازہ کی حفاظت بخوبی ہو سکے، اس کے علاوہ جب سلطان نے دیکھا کہ ہندوستانی گکھڑ تکلیف دہ ہیں تو اس نے کابلی گکھڑوں کو پوٹ ہار (زیرین کشمیر) کا علاقہ دے کر لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی تدبیر اختیار کی، دوسرے جیپال کا ایک بازو زخمی کر دیا، تیسرے کشمیر کے لوہ کوٹ پر حملہ کے وقت یہ گکھڑ بہترین مددگار ثابت ہوں،

ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے، کہ سلطان زین العابدین کشمیری کے عہد میں ملک کد نامی غزنہ کے ایک سردار نے جو حاکم کابل سے تعلق رکھتا تھا، اس جگہ آکر بزور یہ علاقہ (پوٹ ہار) کشمیر والوں سے چھین لیا، جو جہلم اور سندھ کے درمیان ہے[۱] میرے خیال میں مصنف کے بیان؛ در ابوالفضل کے

---

[۱] آئین اکبری ج ۲، ص ۳۲۳ و ۳۲۴ کلکتہ،

تحریر مین توافق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ لوگ جو کابل اور غزنہ مین رہ گئے تھے، وہ بھی اس عہد مین آکر اپنی قوم سے مل گئے، غرض گھکڑ قوم غزنویون کے آخر عہد تک آزادی اور شجاعت کے ساتھ اپنے مقبوضات کے تحفظ اور دفاع مین مصروف رہی،

مؤلف نے لکھا ہے کہ سلطان راجرا ایک دن شکار کے لئے دریاے بھٹ (جہیلم) کے اس پار گیا، اور تیتر کو باز پر حملہ کرتے دیکھ کر اس زمین کی آب وہوا کے صحت بخش ہونے کا یقین کیا، اور واپسی کے بعد ایک جرار لشکر کے ذریعہ اس ملک کو فتح کرکے ۵۰۵ھ مین "دانگلی" نامی ایک شہر آباد کیا، اور اسی کو پایہ تخت قرار دیا، مؤلف کا بیان ہے کہ ایک سو چودہ برس چانہ و نیمبر مین رہ کر دانگلی مین پایہ تخت تبدیل کیا، اس حساب سے معلوم ہوا، کہ محمود غزنوی نے یہ علاقہ ۳۹۱ھ مین ان کو بخشا تھا، حالانکہ مؤلف نے اس کا سنہ ۴۱۲ھ تحریر کیا ہے، راقم الحروف کے خیال مین کچھ لوگ پہلے سے چانہ مین آباد تھے، اور ۳۹۱ھ مین ان کا یہ مرکزی مقام ہوگا، پھر گھکڑ شاہ نے اس سے فاصلہ پر نیمبر آباد کیا ہوگا اس لحاظ سے دونون کی مدت ملاکر ایک سو چودہ برس ہو جاتی ہے،

۴۷۲ھ کے ضمن مین فرشتہ نے سلطان ابراہیم کے شہر درہ[1] فتح کرنے کا حال لکھا ہے اس کا بیان ہے کہ یہ لوگ (اہل درہ) خراسانی الاصل تھے، جن کو ترکون نے وہان سے نکال دیا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ قطعی غیر مسلم گھکڑ تھے، اور جس تالاب کا ذکر کیا ہے، وہ بابر کے عہد تک موجود تھا، یہ گھکڑون کے مختلف قبائل مین سے ایک تھا، ان کا سب سے بڑا سردار مہپال نامی تھا،

تاریخ فرشتہ مین ہے کہ (۶۰۰ھ) شہاب الدین غوری کے قتل کی جھوٹی خبر سے بدامنی ہو گئی

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱ حیدرآباد

کوہ جود وغیرہ کے گھکڑون کے سردار مسمیٰ "سرکہ" نے بھی حکمرانی پر کمر باندھی، اور لاہور پر حملہ کیا، سرکہ کے اس حملہ سے دریاے جہلم اور سودرہ کے درمیانی علاقے مین جنگ کی آگ بھڑک اٹھی،[1]

لیکن اس کتاب مین مؤلف نے (۶۰۰ھ) سرکہ نام کا کوئی سردار نہین لکھا ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اس نام مین تحریف ہوئی، ۵۹۰ھ مین "سیلھر خان" تھا، ممکن ہے اسی سیلھر سے "سُرکہ" بن گیا ہو،

گھکڑون کا اسلام مؤلف نے تاریخ فرشتہ کے حوالہ سے تحریر کیا ہے، کہ سلطان محمد غوری نے ان کو مسلمان بنایا، اور وہ اسی قوم کے ہاتھ سے شہید ہوا، (واللہ اعلم بالصواب)

فرشتہ کی تاریخ ۱۰۱۵ھ ۱۰۱۸ھ مین تالیف ہوئی، (فرشتہ جلد اول ص۳۵) اور مؤلف تاریخ گھکڑ نے تکمیل کی تاریخ ۱۱۳۷ھ تحریر کی ہے، وہ خود اس ملک کا رہنے والا ہے، جس کی تاریخ لکھ رہا ہے اور اسی سے متصل کھوکھر بھی رہتے تھے، اس لئے یقیناً وہ اپنے پڑوسی کھوکھرون سے واقف ہوگا، پس فرشتہ کی تالیف سے تقریباً سوا سو برس بعد کے نسخے مین اس نے لفظ گھکڑ پڑھا، اور سمجھا، یعنی اس کو کھوکھر نہین پڑھا، اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ غالباً اس کے عہد تک زبانی روایت بھی یہی تھی، کہ سلطان کو گھکڑون نے شہید کیا، لیکن مولف کو خود اس کا یقین نہین ہے اسی لئے اس نے آخر مین "واللہ اعلم بالصواب" کا اضافہ کر دیا،

فرشتہ نے ان کے اسلام قبول کرنے کی روایت اس طرح درج کی ہے کہ ۶۰۰ھ مین ہندوستان کی بغاوت فرو کرنے کے لئے سلطان پنجاب مین آیا، اور امن قائم ہو جانے کے بعد وہ لاہور مین مقیم تھا، کہ گھکڑون کے حالات معلوم ہوئے، انھون نے لوٹ مار سے

---

[1] فرشتہ جلد اول ص۲۳،

راستہ بند کر رکھا تھا، تمام راستے خطرناک ہوگئے تھے، یہ لوگ غیر متمدن تھے، کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے، لڑکیاں فروخت کرتے تھے، کثرت بعول کی رسم جاری تھی[۱]، سلطان کے آخر عہد میں (غالباً جب وہ لاہور میں تھا) ایک صالح مسلمان بطور قیدی کے ان کے یہاں پہونچا، اس کے اخلاق وعادات اور طریقۂ عبادت سے اس قوم کا سردار بڑا متاثر ہوا، اس نے پوچھا، کہ اگر میں سلطان کے پاس جاکر اسلام قبول کروں تو میرے ساتھ کیا سلوک کریگا، مسلمان نے جواب دیا، کہ اس کا میں ذمہ لیتا ہوں کہ وہ تیرے ساتھ بہتر سلوک کریگا، اور اس کوہستان کی حکومت تجھ کو عطا کرے گا، چنانچہ اس مرد صالح کے خط پہنچتے ہی سلطان نے خلعت اور مرصع کمر بند اس کو بھیجا اور دربار میں طلب کیا، وہ گیا، اور مسلمان ہو کر حکومت کا پروانہ ساتھ لایا، سردار قوم نے واپسی پر اپنی قوم میں تبلیغ کی، جس سے کثیر حصہ اسلام میں داخل ہوا، لیکن دور دراز مقاموں کے لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے،، پھر لکھتا ہے کہ کوہستان کی ایک اور قوم کو جو تیراہ میں رہتی تھی سلطان نے اس کو بھی نرم وگرم طریقہ سے دائرۂ اسلام میں داخل کیا[۲]، گو اس کی تائید کسی دوسری تاریخ سے نہیں ہوتی، اور خود مؤلف نے بھی اس پر روشنی نہیں ڈالی، پھر بھی یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے جس کو عقل قبول نہ کرے، کیونکہ تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں،

لیکن ایک بات میرے دل میں بار بار کھٹکتی ہے، کہ کابلی گکھڑوں کی مصالحانہ روش کے سبب سے سبکتگین ان سب کا بڑا قدر دان تھا، ان کو سپہ سالاری تک دی تھی، اور محمود غزنوی کے عہد میں بھی ممتاز رہے، البتہ سیاسی مصالح کی بنا، پر ان کو کابل سے پوٹھوہار منتقل کر دیا گیا، پھر بھی

---

[۱] قدیم ہندو قوم میں یہ رسم عام تھی، ہندوستان کا ہر مورخ اس کو جانتا ہے، اور میں نے سنا ہے کہ تبت میں آج بھی اس کا رواج بعض جگہ موجود ہے، اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، کیونکہ گکھڑ تبت سے آئے، جہاں اس کا عام رواج تھا، جیسا کہ تاریخوں میں مذکور ہے [۲] فرشتہ جلد اول ص ۴۲

اس کو کھوکھر کے بجائے گھکڑ ہی پڑھا، حالانکہ وہ فرشتہ سے قریب تر زمانہ یعنی محمد شاہ ۱۱۴۲ھ کے
عہد مین تھا، اور پھر جب خود فرشتہ نے لکھا ہے کہ گھکڑ قوم کی بڑی تعداد شہاب الدین غوری کے
آخری عہد مین خوشی سے مسلمان ہوگئی، اور سلطان نے اس کو خلعت بھیج کر اپنی خوشنودی کا
اظہار کیا اور پھر اس علاقہ کا مستقل حاکم بنا کر اس کے نام کا فرمان جاری کیا، تو یہ بات ذرا
بعید از عقل معلوم ہوتی ہے، کہ اس قوم کے کسی شخص نے اس کو قتل کیا ہو، یہ تسلیم کر لینے پر
بھی کہ قاتل غیر مسلم تھے، یہ بات غور طلب ہے، کہ ایسی اہم سازش کا پتہ مسلم گھکڑون کو نہ ملسکا
جبکہ قربت مکانی اور عزت افزائی کے سبب ہر وقت اس جگہ موجود رہتے ہون گے،

وفاداری | اس قوم کی تاریخ کو اگر آپ گہری نظر سے دیکھین گے، تو آپ کو کہنا پڑیگا، کہ گھکڑ قوم
باوجود شجاع ہونے کے وفاداری ان کی فطرت مین ہے، ان کی ہزار سالہ تاریخ مین بمشکل ایک
دو مثال محسن کشی کی ملے گی، سبکتگین کی نوازش خسروانہ کے عوض اس نے ہمیشہ وفاداری
سے کام لیا، اور غزنویون کے آخر عہد تک ان کا دم بھرتے رہے، بابر اور ہمایون کے فیاضانہ
سلوک نے ان کو اس قدر گرویدہ کر لیا، کہ بڑے بڑے سرداروں نے شیر شاہ اور سلیم شاہ
کے مقابلہ مین اپنی جانین قربان کر دین، اور پھر اکبر کے وقت سے مغلیہ سلطنت کی آخری سانس
تک یہ لوگ وفادار رہے، سکھون کے مظالم سے انگریزون نے نجات دلائی، اس کا نتیجہ یہ نکلا
کہ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ انگریزون کے دست و بازو ثابت ہوئے بلکہ وہ ایسے پکّے وفادار ہو گئے
کہ سکھون کی وفاداری مین خلل آگیا، جس پر انگریزون کو بڑا ناز تھا، لیکن آج تک اس قوم کی
وفاداری قطعاً مسلم ہے، بات صاف ہے کہ یہ قوم محسن کش نہین ہے،

پایۂ تخت | مؤلف کے بیان کے مطابق ان کا پہلا پایۂ تخت اصفہان تھا، پھر خراسان، اس کے

ہوئے تو ایک سو چودہ سال تک چانہ وغیرہ مین رہے، [illegible]ھ مین دانگلی، اس کے بعد پہالہ اور آخر [illegible]ھ میں گکلیانہ کو مستقل دار الحکومت بنایا۔

مذہب | ابتدا مین یہ قوم آتش پرست تھی، جب یہ لوگ تبت پہنچے تو قیاس چاہتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ملکیون کے اثر سے یہ لوگ بدھ ہو گئے ہون گے، لیکن جس وقت کشمیر سے کابل گئے تو اس وقت یہ لوگ ہندو مذہب کے پیرو تھے، بیرونی نے صاف طور پر لکھا ہے، کہ کابل کا شاہیہ خاندان ہندو تھا، غالباً سورج دیوتا کو مانتے ہون گے، کیونکہ تاریخون مین ہم دیکھتے ہین، کہ جو قومین ایران کی طرف سے آئین ان مین سے اکثر سورج دیوتا کے ماننے والے ہین، جیسے ہر، گوجر، راجپوت وغیرہ، میرے خیال کے مطابق غزنوی عہد مین یہ مسلمان ہوئے، اور فرشتہ کی تحریر کے موافق سلطان شہاب الدین غوری کے عہد مین یہ لوگ اسلام سے مشرف ہوئے،

تعداد | اس قوم کی صحیح تعداد بتانی تو مشکل ہے، لیکن عقل خود اس بات کی مدعی ہے کہ ان کی تعداد کافی ہونی چاہیے، افسوس ہے کہ مؤلف نے اس کی طرف کوئی توجہ نہین کی، لیکن یہ مسئلہ یون حل ہو جاتا ہے، کہ اس قوم کے مختلف قبیلے الگ الگ رہتے تھے، اور جب کبھی جنگ کا موقعہ آتا تھا، تو پانچ پانچ ہزار کی تعداد مین فوجی سوار میدان مین نکل آتے تھے، ظاہر ہے کہ عورتین بچے، بوڑھے، غلام، نوکر وغیرہ ان کے علاوہ ہوتے ہون گے،

فرشتہ نے گکھڑون کے اسلام قبول کرنے کے حالات تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ شہاب الدین غوری اسی سال تیراہ کی طرف گیا، جو غزنہ اور پنجاب کے درمیان ہے، اور وہان کے لوگون کو بھی نرمی اور گرمی سے اپنا فرمانبردار بنا کر اسلام مین داخل کیا، اور ان دونون قومون کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی[1]

---

[1] فرشتہ جلد اول ص ۵۹ بیان شہاب الدین غوری نول کشور لکھنؤ،

اس میں سے تیراہ کا علاقہ پہاڑی ہے، اس میں اس قدر سرسبزی اور شادابی نہیں جس قدر دوآبہ جہلم (پوٹھوہار) میں ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہاں کی آبادی تیراہ سے زیادہ ہو، لیکن بالفرض نصف ہی مان لیں جب بھی غوریوں کے عہد میں (۶۰۲ھ) دو لاکھ کی تعداد شمار میں آتی ہے،

خطابات | اس معاملہ میں مؤلف نے ابتدا سے غلط فہمی پیدا کرنے والے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس لئے اس کو نظر انداز کر کے میری تحقیق میں جو آیا ہے وہ درج ذیل کرتا ہوں،

ابتدا میں یہ لوگ جب اصفہان میں تھے، تو بحیثیت شاہزادے کے خاندانی خطاب "کَے" سے ممتاز تھے، جس کا آخری شخص "کَے گوہر" ہے[1]، اس کے بعد جب تبت میں آبسے، اور ہندوستانی قوم میں مل کر رہنے لگے، تو "راجہ" کا خطاب اختیار کیا، جیسے کید راج[2] وغیرہ کشمیر اور جموں تک غالباً یہی خطاب رہا، اس کے بعد جب وہ کابل پر قابض ہوئے، تو انہوں نے شاہ کا خطاب اختیار کیا، اور خاندان شاہیہ سے[3] مشہور ہوئے، اور جب شاہی خاندان کابل سے پوٹھوہار آیا، تو "بوگا" پہلا شخص ہے، جس نے اپنے نام کے ساتھ "ملک" استعمال کیا، اسی خاندان میں ہمت خان کو احمد شاہ ابدالی نے "راجہ" کا خطاب عنایت فرمایا، جو غالباً آج تک اس خاندان میں چلا آتا ہے، ملک گل محمد جس نے گلیانہ آباد کیا، اس کا پوتہ ملک فیروز خان ہوا، اس کے لڑکے جھنڈا خان کو چودھری راول کہا جاتا ہے، اور غالباً آج تک ان کا خاندان چودھری کے نام سے مشہور رہے، مؤلف کے بیان کے مطابق ہاتھی خان پہلا آدمی ہے جس کو بابر بادشاہ نے خلعت کے ساتھ "سلطان" کا خطاب عنایت فرمایا، جو اس خاندان میں اس وقت تک رائج ہے، اس قوم میں لشکر خان پہلا شخص ہے، جس کے نام کے ساتھ "دیوان" کا لفظ اضافہ کیا گیا، سلطان جلال کے بھائی مرزا عمر خان اور مرزا اشرف کو مرزا کہا گیا، جو مغلیہ عہد میں عموماً شاہزادوں کے لئے مقرر تھا، اور غالباً مغلیہ کے آخری عہد

---

[1] کَے گوہر نامہ کا ابتدائی حصہ [2] تاریخ فرشتہ جلد اوّل کا مقدمہ [3] کتاب الہند بیرونی باب ۴۹ کا آخری حصہ،

مین جب صوبہ داری پر سرفراز کئے گئے، تو ان کو نواب بھی کہنے لگے،

انتظام مملکت | اگرچہ گھکڑ ایک جنگی قوم تھی پھر بھی ذاتی قابلیت اور اسلامی دسہاروں کی ما ثر نے ان مین انتظامی قابلیت پیدا کر دی تھی، یہ مختلف قبیلوں مین منقسم تھے، ہر قبیلہ کا سردار علحدٰہ ہوتا تھا، اور ان سب کا سردار ایک ہوتا تھا جس کو بادشاہ وقت کی طرف سے خلعت، خطاب اور سرداری کا مرتبہ ملا ہوتا، یہ سردار (سلطان) خود مختار ہوتا مغلیہ سلطنت سے قبل کسی کو خراج نہین دیا، اس کے ماتحت ایک وزیر ایک دیوان ہوتا، فوج کی سپہ سالاری خود ہی کرتا، جنگ کے وقت ہر قبیلہ اپنی فوج لے کر سلطان کے جھنڈے کے نیچے جنگ کرتا، مؤلف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ سکہ بھی ان کا اپنا ہوتا تھا، دیوان کے ماتحت محکمۂ دیوانی ہوتا، اس کے ماتحت متعدد منشی، اہل کار، متصدی، اہلمد، اور خادم ہوتے، لگان کی وصولی سالانہ ہوتی، کسی ماتحت قوم کی سرکشی پر فوج سے کام لیا جاتا، شکست کے بعد یا تو معافی مانگ کر آباد رہتی، ورنہ ان کو اس جگہ سے بے دخل کر دیا جاتا، مغلیہ عہد مین فوجی تنظیم پر زیادہ زور دیا گیا، اور موجودہ تہذیب کے مطابق اسلحہ اور لباس سے آراستہ کیا جاتا، چنانچہ ممارز خان نے پانچ ہزار سپاہی کو ایک رنگ کے لباس اور ایک رنگ کے گھوڑے پر سوار کر کے اکبر بادشاہ کی نظر سے گذارا، یہ بہادر اور غیرت مند قوم ہے، بہت کم ایسا ہوا ہے کہ میدان جنگ سے فرار کا عار اپنے سر لیا ہو، قانون گوئی کا عہدہ بھی قائم تھا، اور قوم بھگوتان (ہندو) اس عہدہ پر سکھوں کی عملداری تک قائم رہی، اسی نے سلطان جلال خان کے عہد مین تمام گاؤن کی پیمائش کر کے جدید طریقہ سے مالگذاری تشخیص کی،

محکمۂ عدالت بھی ان کے یہان قائم تھا، اور مستقل طور پر ایک قاضی رہتا، اور غالباً بڑے مقامون مین ان کے نائب بھی رہتے تھے، اس قوم کے حکمرانون کی بڑی تعداد عادل گذری ہے

انصاف ان کا پیشہ تھا، بعض دفعہ توان کو انصاف دلانے کے لئے جنگ بھی کرنی پڑی ہے، کاشتکاروں اور عام رعایا کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہی فیاضانہ تھا، لگان کی وصولی میں سختی سے کام نہیں لیتے تھے اور یہی اوصاف تھے جن کے باعث اس قوم کی عمر لمبی ہوگئی، اور دوسروں میں جذب ہونے سے بچ گئی، آخر زمانہ میں آپس کی نااتفاقی نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی، جس ان کی ہوا اکھڑ گئی، اور ان پر سکھ غالب آگئے، اور آج بھی یہ قوم آپس کی خانہ جنگی، کینہ اور حسد سے دل پاک کرکے متحد ہو جائے اور ایک سردار کی ماتحتی میں خوشی سے کام انجام دینے کو تیار ہو جائے تو یقین مانیئے کہ ان کی قدیم عظمت پھر واپس آسکتی ہے، اور اپنے ملک کا انتظام پھر ہاتھ آسکتا ہے، کوئی مرد خدا ہے؟ جو میری آواز پر کان دھرے،

مستورات ان کی عورتیں عفت مآب، غیرت مند اور شرع کی پابند ہوتی تھیں، بزرگوں کی عزت کرتی تھیں، اللہ والوں کے ساتھ دلی عقیدت سے پیش آتی تھیں، اپنی حکومت میں اپنی لڑکی کسی دوسری قوم کو کبھی نہیں دی، دوسروں کی لڑکیاں بھی بہت کم لاتے تھے، اسی لئے ان کے خون میں وہ گرمی آج تک رہی جو ایسی قوم کے لئے ضروری تھی، لونڈیوں کا بھی رواج تھا، اور ان کے لڑکوں کو بھی وراثت میں حق ملتا تھا بلکہ حکومت تک میں ان کو حصہ ملا ہے،

رانی اگر لوگ رضیہ بیگم، چاند بی بی، نورجہان اور اہلیا بائی پر فخر کر سکتے ہیں تو ککھڑ لوگ بھی اپنی ملکہ "رانی منگو" پہ فخر کر سکتے ہیں، دیوان اللہ داد خان کی یہ منکوحہ زوجہ تھی، وہ مردانہ لباس پہن کر دیوان عام میں بیٹھتی اور ملک کا انتظام کرتی، وہ شاہانہ طریقہ سے تمام امور انجام دیتی، بلکہ جنگ کے موقعہ پہ اسلحہ سے مسلّح ہو کر میدان جنگ میں نکلتی،، چند دفعہ جنگ میں کامیاب بھی رہی، عالمگیر اورنگ زیب نے بھی اس کو خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا تھا، اس نے ملک پوٹھوہار کو عدل سے بھر دیا تھا، اس عفت مآب کی یاد مؤلف کے عہد تک لوگوں کے دلوں میں تازہ تھی، اس نے طبعی موت

سے وفات پائی، اور اپنی یادگار ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی،

آبادی | حکمرانون نے اس ملک کو آباد کرنے مین بڑی کوشش کی، متعدد گاؤن بسائے مثلاً چانہ، نبیر، پہ ہالہ، ڈانگلی، اکبر آباد، گلیانہ، راولپنڈی، وغیرہ، جن باغی قومون کو شکست دے کر باہر نکال دیا جاتا، یا خود بھاگ جاتین، پوٹھوہار کے حکمران کچھ عرصہ کے بعد جب امن اور سکون ہو جاتا تو پھر واپس آنے کی اجازت دے دیتے، اس سے آبادی مین کمی نہین ہونے پاتی، آبادی کو برقرار رکھنے کیلئے تالاب بنواتے قحط کے ایام مین غریبون کی بیحد مدد کرتے، تاکہ بھوکون کو فاقہ سے باہر نہ جانا پڑے،

حب وطن | اس قوم مین اپنے وطن کی محبت بدرجۂ اتم ہے، بابر بادشاہ نے اپنے فتوحات کے دو حصے کرکے جب اس قوم کو دونون مین سے ایک لینے کا اختیار دیا، تو ان لوگون نے دوسرے حصّے کے بجائے اپنے وطن کو ترجیح دی اسی طرح اس قوم کے سردار کابل، سندھ، اودھ، اور متعدد مقامات پر حاکم بناکر بھیجے گئے، اور جاگیرین بھی انکو ملین، مگر اپنے وطن کو یہ نہ بھولے اور وطن چھوڑ کر کسی دوسری جگہ آبادی نہین بسائی، یہی سبب ہے کہ پوٹھوہار، پڑوس کے ملک کشمیر کے علاوہ کسی ملک مین ان کی کوئی مستقل آبادی نظر نہین آتی،

تنبیہ: موٴلف نے یہ کتاب حاکم وقت کی فرمایش سے لکھی ہے، اسلئے یہ خوشامد اور مبالغہ سے خالی نہین ہے، لیکن راقم الحروف نے اس مقدمہ مین صرف وہی واقعات لئے ہین جو صحیح اور مبالغہ سے خالی معلوم ہوئے،

ترجمہ | ترجمہ کی نسبت راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکا صاف اور سادہ زبان مین ڈھالنے کی کوشش کی ہے، پیچیدہ جملون کو ہر جگہ صاف کر دیا ہے، البتہ فارسی نظمون کا صرف ترجمہ کر دیا ہے، اگر نظم بھی بالمقابل ہو تو بہت ہی بہتر ہو، اور یہی حال پوٹھوہاری زبان کا ہے، جس محنت کاوش، اور تاریخی کتب کی ورق گردانی کی ضرورت تھی مین نے اس مین کمی نہین کی، پھر بھی یہ نہین کہا جا سکتا کہ غلطیون سے یہ کتاب مبرا ہو گی، اہل علم سے درخواست ہے کہ ان لغزشون سے مجھے آگاہ فرما کر شکر گذار فرمائین گے، وفوق ذی کل علم علیم، وما توفیقی الا باللہ،

چند کتابون کے قلمی نسخے

(۱)

از مولٰنا سید عبد الرؤف صاحب ندوی، اورنگ آباد گیا،

دیوان برہمن

ماہ مارچ و مئی سنہ ۳۷ء کے معارف مین پنڈت چندر بھان برہمن کی تصانیف و حالات اور دیوان سے بحث کی جا چکی ہے، دیوان برہمن کا ایک عمدہ نسخہ مولٰنا شیخ نور علی محدث سہسرامی[1] کے کتبخانہ مین بھی دیگر علمی و ادبی نوادر کے ساتھ موجود ہے،

دیوان مذکور لیلیٰ مجنون منظوم فارسی از ہاتفی کے ہمراہ ایک ہی شیرازہ سے بستہ ہے، دیوان نامکمل ہے، ردیف الف سے دال تک مسلسل ہے، باقی حصہ ناقص ہے، خاتمہ کتاب پر یہ عبارت ہے "تمام شد دیوان برہمن سنہ ۱۲۰۹ فصلی" کاتب کا نام مذکور نہین، مگر کتابت پختہ اور عمدہ نستعلیق ہے، کل ۱۱۹ غزلین ہین، تقطیع کتاب ۹ انچ طویل اور ۶ انچ عریض ہے، ہر صفحہ پر ۱۰ سطرین ہین، کاغذ اروی، ناصری گنجی ہے، چند اشعار متفرق ردیف سے لطف اندوزی کے لئے ذیل مین پیش ہین،

اے برتر از تصور و وہم و گمان ما ۔۔۔ اے در میان ما و بیرون از میان ما

مانند غنچہ گرچہ خموشیم برہمن ۔۔۔ لیکن برابر است چو بلبل زبان ما

---

[1] محدث موصوف کا تذکرہ معارف بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۳۲ء مین تفصیل سے آچکا ہے انکے اخلاف مین مولوی حکیم محمد فخر الحسن صاحب سہسرامی مین جنکی ملکیت مین کتب خانہ مذکور ہنوز محفوظ ہے مگر دیگر نوادر علمی و ادبی کے ساتھ دیوان مذکور کے نسخہ کو بھی علٰحدہ کر دینے کا خیال رکھتے ہین،

بگشا و چو در صحن چمن بند قبا را | بوے دگر افزود دم باد صبا را

ارباب نظر بر اثر شاہد مقصود | در راہ طلب دیدہ گذارند نہ پا را

کیفیت احوال جہان در نظرم بود | آن روز کہ برآب نہادند بنا را

فروغ دل ز فیض بادہ روشن شود پیدا | دماغ رفتہ از سیر گل و گلشن شود پیدا

کجا پنہان کنم این گریہ طوفان خیز را | کہ گر در آستین گم گردد از دامن شود پیدا

کردم شبے خیال تو در دیدہ میہمان | ریزد بجائے اشک بدامنم آفتاب

گذارد قافلۂ فیض در شب بارات | فروغ صبح طرب در شب سیاہ طلب

مارا بکارہاے جہان احتیاج نیست | آزاد را بسود زیان احتیاج نیست

رمزیست در میان دل ما جلوۂ عشق | تقریر شوق را بزبان احتیاج نیست

قرار در شکن زلف یار خواہم کرد | باین قرار دل بے قرار شد باعث

بقدر حاجت خود ہر کسی طلبگار است | جہانیان ہمہ باشند در جہان محتاج

مرا ز غارت گلہاے روے او چہ زیان | کہ ہست در چمن خویش باغبان گستاخ

ز روے صدق برہمن قدم براہ بنہ | کہ رہ روان رہ عاشقی ریا نکنند

اشعار برہمن صوفیانہ خیالات سے لبریز اور موحدانہ عقائد سے پر ہیں،

(۲)

از جناب عبدالباسط صاحب دہلوی، اجمیری دروازہ دہلی،

منشآت برہمن

معارف کی ماہ مارچ اور ماہ مئی کی اشاعتوں میں "منشآت برہمن" پر کافی بحث ہوئی ہے خاکسار کے پاس بھی منشآت برہمن کا ایک قلمی نسخہ ہے جس کا سنہ کتابت ۱۱۰۰ھ ہے، صفحات سادہ، کاغذ

معمولی، خط صاف اور تحریر جلی ہے، کتاب کسی قدر کرم خوردہ ہے، مگر مطالعہ مین چندان حائل نہین،
کتاب کے ہر صفحہ پر ۱۰ سطرین ہین، کل صفحات ۱۲۶ ہین، اس نسخہ مین ایک دیباچہ بھی ہے، جو چندربھان
برہمن کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اور جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چون از عنفوانِ شباب این برہمن عقیدت کیش را میل و رغبت بدریافت دقائق شعر و انشا بہم رسید، بعد فراغ مطالعۂ کتب و تواریخ و نسخہ ہاے نظم و نثر متقدمین و متاخرین بمقتضاے سعادت ازلی نفس خدمت و عبودیت در بارگاہ سلاطین پناہ، سلیمان جاہ، جمشید بارگاہ و صحبت وزراے عظیم الشان مثل عضد الخلافۃ آصف خان، رکن السلطنت اسلام خان، سپہ سالار و علامۃ العصر والدوران افضل خان، ارسطو فطرت سعد اللہ خان وزیر اعظم معظم خان، افلاطون شیم جعفر خان دست نشست و خدمت منظر (؟) مسودۂ فرامین بہ این مور ضعیف تعلق یافت و اشعار این ذرۂ بے مقدار بدرجۂ تحسین رسیدہ در اندک ایام دیوان غزل و مثنوی نسخہ چند مثل گلدستہ چہار چمن و تحفۃ الانوار و کارنامہ تحفۃ الفصحا و مجمع الفقرا و یرا (و این را) ترتیب داد، از ہنگامی کہ این نیازمند قلم بدست گرفتہ رقعات متفرقہ در ہر باب خصوص در آمور (امور) خیر نوشتہ اگر نقل آن را احاطہ می شود نسخۂ دیگر ترتیب می یافت الحال بہ تحریر بعضی از ان نوک قلم را اجازت می دہد و این نسخہ را کہ مشتمل است بر نقل عرائض کہ بدرگاہ آسمان جاہ ارسال داشتہ و رقائم خطوطے کہ بوزراے نامدار و بزرگان روزگار و امیران بلند قدر و دیگر عزیزان سخن سنج مرقوم قلم شکستہ رقم گردیدہ، بمنشآت برہمن موسوم می سازد، امید کہ پسند طبع خوردہ شناس ارباب سخن گردد و باصلاح منت بر این نیازمند گذارند،

اس کے بعد عرائض کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، عرائض کے لحاظ سے کتاب کو دو قسموں مین منقسم کیا گیا ہے پہلی قسم مین وہ خطوط ہین جو شہنشاہ شاہجہان اور عالمگیر[1] کو تحریر کئے گئے ہین، دوسری قسم مین اس عہد کے وزرا، امرا، علما، اور شرفا وغیرہ کو بترتیب مراتب مخاطب کیا گیا ہے،

معارف مارچ ۲۴ء مین تحریر ہوا ہے کہ پہلی عرضی "چون ادای شکر نعمای حضرت صمدیت" سے شروع ہوتی ہے، لیکن اس نسخہ مین ایسا نہین، بلکہ پہلی عرضی اس طرح شروع ہوتی ہے، (شکرفی حروف مین)

قسم اول مشتمل بر نقل عرائض کہ بہ درگاہ آسمان جاہ ارسال داشتہ

کمترین بندگان عقیدت نشان پندر بھان بعد از ادای لوازم بندگی و عقیدت و تقدیم مراسم اخلاص و عبودیت ذرہ وار بموقف عرض باریافتگان محفل جاہ و جلال واستادہای بزم دولت (و) اقبال می رساند کہ بروز دسہرہ از خدمت سراسر سعادت مرخص شدہ میخواست کہ در عرصہ یک ہفتہ بمطلب رسد چون برفاقت کسان زبدہ راجہای والا تبار مامور بود و بپای مردی آنہا طی مسافت نمودہ روز مبارک دوشنبہ بتاریخ بست یکم شہر ذی الحجہ سنہ ۲۸ بہ اودی پور رسید الخ.

کتاب کا خاتمہ اور سنہ کتابت اس طرح ہے،

تمام شد نسخہ منشآت برہمن بروز چہارشنبہ بتاریخ بست و یکم شہر ربیع الاول بوقت سپہری از دست بندہ بدہ چند ولد سہاجیت این ہغل (؟) شاگرد میاں محمد رضی الدین در سنہ یکہزار و یکصد ہفت ہجری النبویہ و مطابق سنہ ۱۴ فصلی باختتام پیوست،

مفتاح الفلاح ؟

معارف بابت ماہ دسمبر ۲۶ء مین مفتاح الفلاح کے متعلق آپ کا مضمون نظر سے گذرا، اس کا ایک

---

[1] پہلی قسم مین دو عرضیان عالمگیر کے نام ہین پہلی عرضداشت مین اسکو تخت نشینی کے وقت مبارکباد پیش کی گئی ہے، اور دوسری مین اپنی جوانی کے رخصت ہونے اور بڑھاپا آجانے کی وجہ سے مستعفی ہونے کی درخواست کی ہے،

نسخہ میرے پاس بھی ہے، جس کا مجھے یقین ہے کہ یہ مصنف کا خود نوشتہ ہے،

کتاب کی تقطیع ۸ ½ × ۵ ½، کاغذ نفیس، سفید اور چکنا، جلد پرانی ہے، لیکن اصل نہیں، تعداد صفحات ۳۳۵ (کتاب پر صفحات درج نہیں ہیں شمار کر لئے گئے ہیں) ہر صفحہ پر ۱۲ سطریں، فہرست ابواب موجود نہیں، بلکہ سرورق پر صرف کتاب کا نام شنگرفی رنگ میں اس طرح تحریر ہے، مِفْتَاحُ الفَلاحْ، سرورق کی پشت پر جہاں سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے، نہایت عمدہ سنہری کام ہے جو رنگ برنگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ قسم قسم کے نقش و نگار سے پیراستہ ہے اس صفحہ کو عروس روز اوّل کی طرح 'عروس صفحۂ اوّل' کہا جائے تو بجا ہے، بہرحال کتاب بھی اسی طرح نہایت خوش خط اور جلی قلم سے لکھی ہوئی ہے، اور اس پر جا بجا حاشیہ آرائی کی گئی ہے، حاشیے بقول لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب واقعی اصل کتاب سے زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں، کتاب میں جہاں جہاں دعائیں لکھی ہوئی ہیں ان کا بین السطور ترجمہ فارسی زبان میں شنگرفی روشنائی سے خوش خط لکھا ہوا ہے، جو بہت دیدہ زیب ہے، کتاب اس طرح ختم ہوتی ہے،

.... فرغت بعون الله من تالیفه مع تراکم

افواج العلائق وتلاطم امواج العوائق وتوزع البال

بالحل والترحال فی اوائل العشر الثالث من شهر الثانی

من السنة الخامسة من العشر الثانی بعد الالف

ببلدة گنجه وانا اقل الانام محمد المشتهر

ببهاء الدین العاملی تجاوز الله عن سیئاته

والحمد لله اولاً وآخراً وظاهراً وباطناً

برحمتك یا ارحم الراحمین

خواجہ صاحب موصوف کے نسخہ مین جو ۱۰۵۶ھ درج ہے وہ اصل کتاب کے سنہ تصنیف کے اعتبار سے غلط ہے، جیسا کہ معارف نے لکھا ہے، کتاب مفتاح الفلاح کے خاتمہ کی عبارت کے بعد ہندسہ مین ۱۰۵۶ھ غلطی کی بنا پر کتابت کے لحاظ سے صحیح ہے جس کاتب نے اس کتاب کو نقل کیا ہے اس نے اپنا سنہ کتابت درج کر دیا ہے چنانچہ مصنف کے خاتمہ کے بعد کاتب کا اپنا خاتمہ لکھنا اس بات پر دال ہے،

کتاب کے آخری ورق کے ذیل مین جہان کتاب مذکورۂ بالا خاتمہ پر ختم ہوتی ہے، یہ فقرہ لکھا ہوا ہے،

هٰذا اعطیا من السید الاجل مولانا سید مختار الرضوی ارسلنی)

من الکشمیر حین کنت فی بلد اللاهور ..... (مٹا ہوا ہے، یا بندہ کا نام معلوم ہوتا ہے)

عفی الله عن جرائمه،

اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب لاہور بھیجی گئی ہے، اور خواجہ صاحب کی کتاب بھی لاہور ہی مین لکھی گئی[۱]، چنانچہ یہ اغلب ہے کہ موصوف کا نسخہ اسی کتاب کی نقل ہو،

مثنوی زاد المسافرین

معارف بابتہ دسمبر ۱۹۴۶ء مین اس مثنوی کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئین، اس کا ایک نسخہ راقم کے پاس بھی ہے، جو ۱۲۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے، خط صاف، کاغذ معمولی، تعداد صفحات ۹۶ اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطرین ہین، اشعار کی مجموعی تعداد ۱۴۰۸ ہے، لیکن سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے ۱۴۵۶ تحریر فرمائی ہے، یہ واضح ہے کہ موصوف کا نسخہ واقعی قابل قدر اور قدامت کے لحاظ سے بیش قیمت اور نایاب ہے، اسی بنا پر مین اپنے نسخہ کے متعلق زیادہ لکھنا مناسب نہین سمجھتا، ہان صرف اس قدر بتا دینا چاہتا ہون، کہ جب مین نے موصوف کے نقل کردہ اشعار کا اپنے نسخہ کے اشعار سے مقابلہ کیا تو ان دونون نسخون مین الفاظ کے اعتبار سے کافی ردوبدل پایا، اس کے علاوہ صمدنی صاحب کے نسخہ مین کئی اشعار بھی نہین ہین، حالانکہ میرے نسخے مین موجود ہین، مثلاً ؎

---

[۱] جیسا کہ ان کی کتاب کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے،

بشنو پسرا بیانِ حالت علم جدلیست قیل و قالت

کے بعد یہ شعر ان کے نسخہ مین نہین ہے

پندار خود از میانہ بردار توحید تو ترک تست بش دار

یا این جائے حوالہ نیست ...... کے بعد یہ دو اشعار ہے

ہان اے دلِ گم شدہ کجائی کز خود نفسی بخود نیائی

میسوز ترا ہمین تمام است سودا چہ پزی کہ کار خام است

یا یک نکتہ او کہ جان .... کے بعد یہ اشعار ہے

در باغ حقیقت این نہالیست کز وی ہمہ باغ را جمالیست

روحش بنشاند عقل پرورد نادان بر این درخت کم خورد

یہ صرف اسی نسخہ کی تخصیص نہین، بلکہ میرے نسخہ مین بھی بہت سے اشعار نہین ہون گے، اور کافی ردوبدل ہوگا، جیسا کہ اشعار کی مذکورہ مجموعی تعداد کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے، جب ان چند اشعار کے مقابلہ کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، تو تمام اشعار کا مقابلہ کئے جانے کی صورت مین کیا کچھ نہ

تاریخ سندھ

(اردو مین سندھ کی پہلی جامع و محققانہ تاریخ)

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور انکی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال اوپر یہان کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے ان کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ نہین تھی، دارالمصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین سندھ کی بھی یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کی ہے، اس مین اسلامی سندھ کی ایکہزار سال کی سیاسی، علمی، تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کرچکے تھے پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے،

مرتبہ: - مولنا سید ابوظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ

استفسار و جواب

احادیث عاشوراء

جناب ابو احمد محمد عبداللہ صاحب مقلح (۱ مرحتسر)

۱- روایات کتب حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر جس روز مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تھے اُس روز یہود نے عاشورا کا روزہ رکھا ہوا تھا، اس روزہ کی وجہ یہود نے یہ بیان کی تھی، کہ یہ روزۂ شکریہ میں رکھا جاتا ہے، کہ اس تاریخ کو اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر فتح دی تھی، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ تمھاری نسبت میں موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تر قریب ہوں، اس لئے آیندہ سال سے میں بھی عاشورا کا روزہ رکھوں گا، بدین وجہ اس دن سے آج تک مسلمانوں میں عاشورا کا روزہ محرم کی دس تاریخ کو رکھا جاتا ہے اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ حضور کا داخلہ مدینہ منورہ میں ماہ ربیع الاول میں ہوا تھا، اس لئے یہود نے عاشورا کا روزہ ربیع الاول میں رکھا تھا، پھر مسلمانوں میں عاشورا کا روزہ عاشورۂ محرم کے دن کیوں رکھا جاتا ہے؟

۲- روایات کتب حدیث میں ہجرت فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ میں دوشنبہ کے دن داخل ہونا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دن یہود کے عاشورہ کا تھا، اور علامہ البیرونی نے جو علم ہیئت کے عالم ہیں، کتاب آثار الباقیہ عن القرون الخالیہ میں لکھا ہے کہ

یہود کا عاشورہ حضور کے داخلہ مدینہ منورہ کے ایک دن کے بعد سہ شنبہ کے دن تھا، اندریں صورت روایات کتب احادیث سے علامہ البیرونی کے قول کا غلط ہونا، اور علامہ البیرونی کے قول سے روایات کتب حدیث کا مخلف ہونا لازم آتا ہے، اس لئے ان میں سے جو امر صحیح ہو، اس کا مدلل بیان کیا جائے،

معارف: ۱- کتب حدیث میں یہیں درج ہے کہ جس روز حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے، وہ یہود کے عاشورا کا دن تھا، حدیثوں میں جو کچھ مذکور ہے، وہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو عاشورا کے دن روزہ رکھتے دیکھ کر ایک دن اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت قرار دیا، اس لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے زیادہ ہم لوگوں کو اتباع موسیٰ کا حق ہے،

۲- علامہ بیرونی نے محض قیاس تخمین سے یہ فرض کر لیا، کہ جس عاشورا کی بابت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود میں گفتگو ہوئی تھی، وہ یہود کے صوم کفارہ کا دن تھا، اس بے بنیاد مفروضہ نے حدیث کو حساب سے لڑا دیا، ورنہ اپنی جگہ پر حدیث بھی درست ہے، اور علامہ بیرونی کا حساب بھی،

یہودی سنین وشہور یہودی مہینوں کی اسلامی مہینوں کے ساتھ تطبیق کے لئے ضروری ہے کہ یہود کے ایام وسنین کو اچھی طرح ہم سمجھ لیں،

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ ابیب یعنی نیسان کے مہینہ سے اپنا حساب شروع کیا کریں[1] اس ماہ کی پندرہویں تاریخ کو حضرت موسیٰ نے عید فطیر اور یوم حصاد اور عشر ارض دینے کا دن مقرر کیا تھا[2] اس بنا پر یہود کو ضرورت ہوئی کہ ان کا سال اس طرح شروع ہو کہ ۱۵ ابیب ہمیشہ فصل کاٹنے کے دنوں میں پڑے اور کبھی اس روز شنبہ نہ ہو، اس کے ساتھ ان کو اس حکم کا لحاظ بھی رکھنا تھا کہ

---

[1] خروج ۱۲: ۲، [2] خروج ۲۳: ۱۴ تا ۱۹ مع احبار ۲۳: ۹،

خدا نے چاند کو اوقات کا شمار کرنے کے لئے بنایا ہے[1]، اس کے لئے انھون نے سنین شماری کا ایک طویل طریقہ ایجاد کیا، جس کی صرف دو دفعات کا ذکر ہمارے لئے ضروری ہے،

۱۔ ہر ۱۹ برس مین، ۷ برس ۱۳ ماہ کے ہون،

۲۔ زائد مہینہ کو برسون مین تقسیم کرنے کے کئی قواعد ہین، شام مین قاعدہ بہزیجوح رائج تھا، عرب کے لوگ اسی قاعدہ سے واقف تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بہزیجوح کے حروف کی قیمت جس سال کا عدد ہو اس کے آخر مین زائد ماہ کا اضافہ کیا جائے،

سلسلہ خروج سے سنہ ۱۰ھ تک صحیح حساب کے مطابق ۲۰۴۲ برس شمسی گذرے، اس مدت کو ۱۹ برسون پر تقسیم کیا جائے تو ۱۰ بچتے ہین، احادیث مین وارد ہے کہ حجۃ الوداع کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے روز

استدار الزمان کھیئاتہ یوم	زمانہ چکر کاٹ کر اس ہیئت پر آگیا جو آفرینش
خلق اللہ السّمٰوٰت والارض	کے دن تھی، (بخاری کتاب التفسیر)

ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ استدارۂ زمان کا مطلب جمعہ ۹ ذی حجہ سنہ ۱۰ھ کو آفتاب کا برج حمل مین آنا، اور استواے لیل و نہار ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع کا مہینہ یہود کے ماہ ابیب کے مطابق تھا، بغوی نے معالم (سورۂ مائدہ) مین لکھا ہے کہ جمعہ ۹ ذی حجہ سنہ ۱۰ھ کو یہود، نصاری اور مجوس کی عیدین تھین، مجوس سے ہم کو بحث نہین، حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے ذیل کی مختلف مذہبی تقریبون کے لئے تقریبًا پورے ماہ ابیب کو عید کا ایام بنا دیا تھا،

۱ ابیب :- مقدس مجمع کا دن، ہماری بولی مین یوم الجمعہ

۷ ابیب :- " "

---

[1] زبور ۱۰۴: ۱۹

۱۰ ابیب :- قربانی کے جانور خریدنے کی تاریخ، اس دن روزہ بھی رکھا جاتا تھا،

۱۰ تا ۱۴ ابیب :- بت ایام قربانی،

۱۵ ابیب :- یوم حصاد، یوم زکواۃ،

ان باتون کے پیش نظر اب یہود کے مہینون کو ایام نبوت کے اسلامی مہینون سے ذیل کے نقشہ میں مطابق کر کے دیکھئے،

	سنہ خروج	ماہ ابیب ۱	ماہ تشری ۷	ماہ آذر ۱۲	ماہ کبیسہ ۱۳
	سنہ ۲۰۱۵	(۱) جمادے ۲	ذی حجہ	جمادے ۱	•
ب	سنہ ۲۰۱۶	(۲) جمادی ۲	ذی حجہ	جمادے ۱	جمادے ۲
	سنہ ۲۰۱۷	(۳) رجب	محرم	جمادے ۲	•
	سنہ ۲۰۱۸	(۴) رجب	محرم	جمادے ۲	•
(۵)	سنہ ۲۰۱۹	(۵) رجب	محرم	جمادے ۲	رجب
	سنہ ۲۰۲۰	(۶) شعبان	صفر	رجب	•
ن	سنہ ۲۰۲۱	(۷) شعبان	صفر	رجب	شعبان
	سنہ ۲۰۲۲	(۸) رمضان سنہ ۱ قبل ہجرت	ربیع ۱ سنہ ۱ھ	شعبان	•
	سنہ ۲۰۲۳	(۹) رمضان سنہ ۱ھ	ربیع ۱ سنہ ۲ھ	شعبان	•
ی	سنہ ۲۰۲۴	(۱۰) رمضان سنہ ۲ھ	ربیع ۱ سنہ ۳ھ	شعبان	رمضان
	سنہ ۲۰۲۵	(۱۱) شوال سنہ ۳ھ	ربیع ۲ سنہ ۴ھ	رمضان	•
	سنہ ۲۰۲۶	(۱۲) شوال سنہ ۴ھ	ربیع ۲ سنہ ۵ھ	رمضان	•
ج	سنہ ۲۰۲۷	(۱۳) شوال سنہ ۵ھ	ربیع ۲ سنہ ۶ھ	رمضان	شوال

۲۰۲۸ء	(۱۴) ذی قعدہ [illegible]	جمادی ۱ [illegible]	شوال	•
۲۰۲۹ء	(۱۵) ذی قعدہ [illegible]	جمادی ۱ [illegible]	شوال	•
و ۲۰۳۰ء	(۱۶) ذی قعدہ [illegible]	جمادی ۱ [illegible]	شوال	ذی قعد
۲۰۳۱ء	(۱۷) ذی حجہ [illegible]	جمادی ۲ [illegible]	ذی قعد	•
ح ۲۰۳۲ء	(۱۸) ذی حجہ [illegible]	جمادی ۲ [illegible]	ذی قعد	ذی حجہ
۲۰۳۳ء	(۱۹) محرم	رجب	ذی حجہ	•

یہودی روزے | قبل اس کے کہ ہم احادیثِ عاشورا پر بحث کریں، یہود کے چند روز دن کا ذکر کریں گے، جو اُن کے مہینوں میں کسی ماہ کی ۹ یا دس کو پڑتے تھے،

(۱) صوم مریم:- ابوریحان بیرونی نے لکھا ہے ۱۰ ر نیسان کو حضرت مریم اختِ موسیٰ کی وفات کے دن یہود روزہ رکھتے تھے،

(۲) صوم تابوت:- ابوریحان بیرونی کے مطابق ۱۰ ر آیار کو یہود اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن عیلی کاہن کے زمانہ میں تابوت مقدس کو دشمن چھین لے گئے تھے،

(۳) یوم الخراب ۱۰ ر آوب کو نبو زردان نے خانۂ خدا سمیت سارے شہر یروشلم کو جلا دیا تھا، اس کے غم میں بھی روزہ رکھا جاتا تھا،

(۴) صوم کفارہ: ۱۰ ر تشری کو رکھا جاتا تھا، یہ درحقیقت وہ دن تھا جس دن قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ نے کہا تھا،

یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ	اے قوم تم نے بچھڑے کو اپنا کر اپنے نفسوں
الْعِجْلَ فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوْا	پر ظلم کیا، اس لئے اپنے رب کی طرف پلٹو
اَنْفُسَکُمْ	اور اپنے (خطاکار) افراد کو قتل کر دو،

"اس دن کی بابت حضرت موسیٰؑ نے حکم دیا تھا کہ

"یہ تمھارے لئے ابدی قانون ہے، ساتویں ماہ کی دسویں تاریخ کو تم میں سے ہر ایک اپنی جان کو دکھ دے، (احبار ۱۶: ۲۹) یہ کفارہ کا دن ہے، (احبار ۲۳: ۲۸) اس دن ہر شخص خود کو غمگین بنائے، (احبار ۲۳: ۲۷) جو شخص اس دن اپنے آپ کو غمزدہ نہ رکھے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے گا" (احبار ۲۳: ۲۹)

اس حکم کی تعمیل کا طریقہ روزہ رکھنا، ٹاٹ اوڑھنا اور راکھ پر بیٹھنا تھا، (زبور ۳۵ و یسعیاہ ۵۸)

ابو ریحان بیرونی نے حدیث کے اندر مذکور عاشوراء یہود کو اسی سے تطبیق دینے کی وجہ سے حدیث کو غیر صحیح کہا ہے

(۵) صوم حصار: بنوکد نصر (بخت نصر) نے جس روز یروشلم کا محاصرہ کیا تھا، اس کی یادگار کا روزہ بائبل میں ۱۰ر تاریخ کو مذکور ہے، بیرونی نے ۹ر تاریخ لکھی ہے،

ان میں سے صوم اول بحث طلب ہے، صوم چہارم فرض تھا، باقی تین روزے قوم نے بطور خود فرض کر لئے تھے، ۲ سنہ جلوس دارا بن ارتخششتا (۵۱۸ ق م) خروج میں جب کہ یروشلم دوبارہ آباد اور خانۂ خدا پھر سے تعمیر ہو چکا تھا، ایک شخص نے فتوی پوچھا تو حضرت زکریاؑ نے (قرآن کے زکریا نے نہیں بلکہ اور زکریاہ نے) فتوی دیا کہ

"رب الافواج فرماتا ہے کہ چوتھے ماہ، پانچویں ماہ، ساتویں ماہ اور دسویں ماہ کے روزے آئندہ سے بنی اسرائیل کے لئے خوشی اور خرمی کے دن اور طرب انگیز عیدیں ہوں گے،"

(زکریاہ ۸: ۱۹)

(۶) اس عبارت میں ساتویں ماہ کے روزہ سے مراد صوم تشری کا روزہ ہے جس کا نام جدلیاہ تھا،

عید عاشوراء | احادیث میں جس عاشوراء یہود کا ذکر ہے، وہ انہی روزوں میں سے ایک

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں،

کان یوم عاشوراء تعدہ الیھود عیداً، (بخاری)	عاشوراء کے دن کو یہود عید کا دن سمجھتے تھے،
کان اھل خیبر یصومون یوم عاشوراء و یتخذونہ عیداً و یلبسون نساءھم حلیھم و شارتھم (مسلم)	اہل خیبر عاشوراء کے دن روزے رکھتے، اس دن عید مناتے اور اپنی عورتوں کو اپنے زیورات اور لباس فاخرہ پہناتے تھے،

جس روزے کو ابوریحان بیرونی نے عاشوراء سے تطبیق دے کر حدیث کو غلط بتایا ہے، اس پر عاشوراء کی یہ تعریف صادق نہیں آتی، کیونکہ وہ سراپا غم تھی،

عاشوراء محرم حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں سنہ ۱ھ کا محرم گذار کر ربیع الاول میں مدینہ تشریف لائے، آپکے ورود مدینہ کی صحیح تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ہے، آپکے ورود مدینہ سے قبل یہود کے صوم کفارہ کا دن گذرچکا تھا، سنہ ۲ھ کے محرم میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عاشوراء کے دن روزہ رکھا، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں،

کان یوم عاشوراء تصومہ قریش فی الجاھلیۃ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصومہ فی الجاھلیۃ فلما قدم المدینۃ صامہ و امر بصیامہ، (بخاری)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش عاشوراء کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آپ بھی اس دن روزہ رکھا کرتے تھے جب آپ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے خود بھی روزہ رکھا، اور دوسروں کو بھی حکم دیا،

یہ وہ روزہ نہیں ہے جس کی بابت احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور یہود کا مکالمہ مروی ہے سنہ ۲ھ میں یہود کا ساتوان مہینہ تشری ربیع الاول کے مطابق تھا، اس لئے اُن کا پانچوان مہینہ آب تھا، جس کی ۹، ۱۰ تاریخ کو پہلے بربادی کا غم مناتے تھے، پھر سنہ ۷۰ھ خروج سے دوبارہ تعمیر کی عید منانے لگے، یہ دن محرم کے مہینہ میں واقع ہوا تھا، اس روزہ کے بعد ۶ ماہ گذرے تھے، کہ شعبان سنہ ۲ھ میں رمضان کے روزون کا حکم نازل ہوا، محرم سنہ ۳ھ وسنہ ۴ھ میں آپنے عاشوراء کے دن روزہ نہیں رکھا،

حضرت عائشہؓ فرماتی ہین،

فلما فرض رمضان ترك عاشوراء فمن شاء صامه ومن شاء تركه، (بخاری)

جب رمضان کے دن روزے فرض ہوئے، توآپ نے عاشوراء کے دن روزہ رکھنا چھوڑ دیا، پھر جس کے جی مین آتا، اس دن روزہ رکھتا جس کے جی مین آ

روزۂ عاشوراء | عاشوراء کا لفظ عشر سے نکلا ہے، لغوی معنی اس کے دسوین تاریخ کے ہین، مگر تاریخین گننے کے عرب مین کئی طریقے تھے،

۱۔ منازل قمر طلوع وغروب کے لحاظ سے تاریخ گننا،

۲۔ رویت ہلال سے دنون کو شمار کرنا، قرآن پاک نے (من شهد منكم الشهر) فرماکر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (فصوموا لرؤيته) کہہ کر اس طریق کو مستقل رواج دے دیا،

۳۔ آخری لیلۃ السرار ہونے یعنی چاند کے غائب ہوجانیکی تاریخ سے گننا اس تیسرے طریق کے مطابق دسوین وہی ہے جو دوسرے طریق کے مطابق نوین کہلاتی ہے، عاشوراء کا لفظ اس زمانہ مین وضع ہوا، جب تیسرے طریق کا رواج تھا، نوین کو عاشوراء بولا جاتا تھا، مگر مراد ہلال کے لحاظ سے نوین تاریخ ہوتی تھی، چنانچہ ایک تابعی الحکم بن الاعرج نے حضرت ابن عباسؓ سے فتوی پوچھا، تو انھون نے فرمایا، "محرم کا ہلال دیکھ کر دنون کو گنو

تو نویں کی صبح سے روزہ رکھو، الحکم نے پوچھا کیا رسول اللہ بھی یوں ہی روزہ رکھتے تھے؟ فرمایا ہاں
(مسلم شریف)

بنوامیہ پر الزام | ابوریحان بیرونی نے لکھا ہے کہ محرم کی دسوین کا نام عاشورا ہے، پہلے لوگ اس دن کی تعظیم کرتے تھے، یہاں تک کہ اس دن امام حسین شہید ہوئے،..... پھر لوگ اسے منحوس ماننے لگے، مگر بنوامیہ اس دن نئے کپڑے پہنتے تھے آرایش کی چیزیں استعمال کرتے تھے، سُرمہ لگاتے تھے، اور عید مناتے تھے ..... مگر شیعہ اس دن روتے ہیں اور ماتم کرتے ہیں"

بنوامیہ کے متعلق ابوریحان نے جو کچھ لکھا ہے وہ شیعی اور ہاشمی بیانات پر غیر منصفانہ اعتماد کا نتیجہ ہے، بنوامیہ نے کوئی بدعت ایجاد نہیں کی تھی، البتہ یہ یہود کا دستور تھا. کہ وہ اپنے پانچویں اور دسوین ماہ کی دسوین تاریخ کو اصلاً اس کے یوم غم ہونے کے باوجود خوشی اور عید مناتے تھے، اس یہودی رسم کو بنی امیہ کے نامۂ اعمال میں ڈال دیا گیا، بات صرف اتنی ہے کہ بنی اُمیہ عاشوراے محرّم کو روزہ رکھنا واجب نہیں سمجھتے تھے،

حدیث معاویہ | عہدِ صحابہ میں عاشورار کی بابت خیالات کچھ متصادم ہوگئے تھے، بعض اشخاص ان لوگون پر معترض ہوا کرتے تھے، جو اس دن روزہ نہیں رکھتے تھے، عام اشخاص پر ترک عاشورا کے باعث جس انداز میں حرف گیری کی گئی ہوگی، اس کا ہم کو علم نہین ہے، مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عاشورا کے دن اشعث بن قیس کو ناشتہ پر بلایا، تو انھون نے کہا کیا آج عاشورا کا دن نہین"؟ مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے، کہ اشعث بن قیس نے حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کو کھاتے دیکھ کر اعتراض کیا، کہ اے ابوعبدالرحمٰن! آج کا دن عاشورا کا دن ہے، اسی طرح معلوم ہوتا ہے، کہ لوگ بنی اُمیہ پر بھی معترض تھے، کہ یہ لوگ عاشورا کے دن روزے کیون نہین رکھتے، رواجی روزون کے ترک پر اس سے پہلے اناجیل کی روایت کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام پر بھی اعتراض کیا گیا تھا، حضرت

امیر معاویہؓ نے تارکان عاشوراء پر لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا،

"اے اہل مدینہ! تمھارے علما کہاں رہ گئے؟ مین نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ یہ عاشوراء کا دن ہے، اللہ نے اس دن کا روزہ تم پر فرض نہین کیا ہے لیکن آج مین روزہ سے ہون، اس لئے تم کو اجازت ہے، جو چاہے، روزہ رکھے، جو چاہے نہ رکھے (بخاری)

زمانۂ حدیث | اس حدیث کے راوی اول حمید بن عبد الرحمن کا بیان ہو کہ انھون نے مدینہ مین عاشوراء کے دن منبر پر حضرت امیر معاویہؓ کی زبان سے یہ بات سُنی، سال سماع کا ذکر انھون نے "جس سال معاویہؓ نے حج کیا" کے الفاظ مین کیا ہے، اس لئے امیر معاویہؓ کی اس تقریر کا زمانہ ۹ر محرم ۴۴ھ یا ۵۰ھ ہے، حضرت امیر معاویہؓ نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کسی محرم کی نوین کو سُنی تھی، امیر معاویہؓ رمضان ۸ھ کو مسلمان ہوے، اس لئے یقینی طور پر اس حدیث کا زمانہ محرم ۹ھ یا اس کے بعد کا کوئی محرم ہے، ہجرت کے بعد محرم ۲ھ مین اور محرم ۹ھ مین عاشوراء کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ رکھنا ثابت ہے، ۳ھ لغایت ۸ھ کے محرمون مین حدیث عائشہؓ کے مطابق کچھ تو آپ نے ضرور ناغہ کئے، معلوم نہین، ان برسون کے اندر کسی سال آپ نے عاشوراء کا روزہ رکھا یا نہین،

محرم ۹ھ یہود کے ماہ ایار ۱۳۸۰ خروج کے مطابق تھا، اس ماہ کی دسوین تاریخ کو یہود صوم تابوت رکھتے تھے، اس لئے حساب کے رو سے ۲ھ کے عاشوراء محرم کی طرح ۹ھ کا عاشوراء محرم بھی ایک عاشور یہود کے مطابق تھا، لیکن یہ بھی وہ عاشوراء نہین، جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان ایک مکالمہ ہوا تھا،

حضرت امیر معاویہؓ نے جس ارشاد نبوی کا ایک ٹکڑا بیان کیا، غالباً اسی کا دوسرا ٹکڑا حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے، ان دونون بزرگون کے اقوال کو ملانے سے صورت واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے،

ذکر عند رسول اللہ یوم عاشوراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عاشوراء

فقال كان يوماً يصومه اهل الجاهلية	کے دن کا ذکر ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ
(مسلم عن ابن عمر) وانه كتب الله	اس دن اہل جاہلیت روزہ رکھتے تھے
عليكم وانا صائم فمن احب منكم	اللہ نے تم پر یہ روزہ فرض نہیں کیا ہے
ان يصوم فليصم ومن احب	مگر میں روزہ سے ہوں، اس لئے تم کو
منكم ان يفطر فليفطر	اختیار ہے چاہو روزہ رکھو، اور چاہو
(مسلم عن معاویہ)	تو افطار کرو،

ان ہی ایام کا یہ واقعہ ہے کہ

رجل اتى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال	ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
كيف تصوم فغضب رسول الله	آیا، اوس نے کہا آپ کیسے روزہ رکھتے
صلى الله عليه وسلم فلما رأى عمر رضي الله	ہیں، اس سے مزاج اقدس برہم ہوگیا،
عنه غضبه قال رضينا بالله ربا	حضرت عمرؓ نے تیور دیکھ کر کہنا شروع کیا
وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا	کہ ہم خوش ہیں کہ رب ہمارا اللہ ہے دین
نعوذ بالله من غضب الله وغضب	ہمارا اسلام ہے، نبی ہمارا محمد ہے، ہم اللہ
رسوله	کے غضب سے اور اس کے رسول کے
(مسلم عن ابی قتادہ)	غضب سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں،

بہتیروں کا خیال ہے کہ رسول اللہ کے غضب کی وجہ کثرت سوال کو آپ کا ناپسند کرنا تھا، سائل کا خشا صرف مزید معلوم کرنا تھا، خیال صرف سائل کے ایمان کامل پر اعتماد کا نتیجہ ہے، یہ تفرقہ شتہ کا ہے جب فود عرب آیا کرتے تھے، یہ لوگ آکر مسلمان تو ہو جاتے تھے مگر ان کو اس نئے ادب و تہذیب سے لگاؤ نہیں ہوتا تھا جس کا اسلام نے پرانے صحابیوں کو پابند بنا دیا تھا، صوم عاشوراء کو غیر مفروض اور اہل جاہلیت کا دستور بتانے

کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "وانا صائم" اسی پر کسی مسلم نے کیف تصوم؟ کہہ دیا تھا، اور اس کا طرز سوال قدیم زمانہ کے معترضانہ انداز سے خالی نہ تھا، اس لئے آپ نے برہمی ظاہر فرمائی، یہ اظہار برہمی درحقیقت بغرض تادیب تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے بعد خود چند سوالات کئے، جن کا جواب دیتے ہوئے آخر میں آپ نے فرمایا "مجھے خدا سے امید ہے کہ عاشوراء کے دن کا روزہ گذشتہ برس کی خطاؤں کا کفارہ ہوگا۔" (مسلم)

صوم کفارہ | صوم عاشوراء کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہر اس شخص کو جو توراۃ سے واقف ہے دس تشری کی بابت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کو یاد دلاتا ہے کہ

"ساتویں ماہ کا دسواں دن کفارہ دینے کا دن ہوگا، (احبار ۲۳ : ۲۷) اس روز تمہارے واسطے تمہاری پاکیزگی کے لئے کفارہ دیا جائے گا، تاکہ تم اپنے سارے گناہوں سے خدا کے آگے پاک ہو جاؤ۔" (احبار ۱۶ : ۳۰)

غالباً اسی بنا پر بعضوں نے حدیث کے اندر مذکور عاشوراء محرم اور یہود کے عاشور تشری کو ایک چیز سمجھ لیا، اس تماثل اسم اور تماثل مفاد سے دونوں کی تاریخوں کا ہمیشہ متحد ہونا ضروری نہیں، ابوریحان بیرونی نے شاید اسی تماثل سے اثر لے کر پہلے دونوں کا اتحاد باور کر لیا، پھر حسابی دلیل سے جب یہ ثابت ہوگیا، کہ دونوں کا عہد نبوت میں توافق ناممکن تھا، تو بجائے اس کے کہ حدیث کو اپنی جگہ پر بیان واقعہ قرار دے کر اپنی غلطی تلاش کرتے، انھوں نے روایت ہی کو مسترد کر دیا، حالانکہ حدیث بھی سچی ہے، ان کا حساب بھی درست تھا، غلطی یہ تھی کہ انھوں نے عاشوراء احادیث کو یہود کا عاشور تشری باور کر لیا، اور یہ بھی نہ بتایا کہ آخر کس دلیل سے انھوں نے ایسا سمجھا، دوسرے لوگوں کے خیال کی تو ایک بنیاد ہے جس کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا، لیکن ابوریحان نے جو حدیث پیش کی ہے، وہ تو اس خیال کی تردید کے موقع پر پیش کی جا سکتی ہے، جس کی بنا پر انھوں نے حدیث کو غلط کہا،

حدیث ابن عباسؓ | غالباً انہی ایام میں جب کہ آپنے عاشورار کے روزہ کو گذشتہ برس کی خطاؤن کے کفارہ کا لقب دیا، آپسے کسی نے یہ بھی پوچھا کہ فرض نماز اور فرض روزون کے بعد کونسی نماز اور کونسا روزہ سبسے افضل ہے، توآپ نے فرمایا کہ نمازون مین جوف لیل کی نماز (تہجد) اور روزون مین عاشورار کا روزہ سبسے افضل ہے، (مسلم عن ابی ہریرۃؓ) انہی دنون مین ایک شخص نے جو قبیلۂ اسلم کا تھا، رسول اللہؐ کی اجازت یا حکم سے قبائل انصار مین اعلان کیا، کہ آج عاشورار کا دن ہے، اس لئے جس نے اب تک کچھ نہ کھایا ہو، وہ تو روزہ رکھے، اور جس نے کچھ کھالیا ہو وہ بھی شام تک کچھ نہ کھائے (مسلم و بخاری) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہین کہ

حین صام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم عاشوراء وامر بصیامه قالوا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انه یوم تعظمه الیهود والنصاری فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان العام المقبل ان شاء اللہ صمنا الیوم التاسع،	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورار کے دن روزہ رکھا، اور اس کا حکم دیا تو لوگون نے کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس دن کی یہود اور نصاری بھی تعظیم کرتے ہین، فرمایا اچھا آیندہ سال بھی ہم یوم تاسع کا روزہ رکھین گے،

امام مسلم نے اس حدیث کی دو سندون سے تخریج کی ہے، ایک سند مین اُن کے شیخ ابوبکر بن ابی شیبہ ہین، حدیث نقل کرکے امام صاحب نے لکھا ہے،

وفی روایة ابی بکر قال یعنی یوم العاشوراء،	ابوبکر کی روایت مین یہ بھی ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا یوم تاسع بول کر آپ نے یوم عاشورار کو مراد لیا تھا،

زمانہ حدیث | حدیث کے پہلے جملہ (یعنی صام وامر بصیامہ) سے یہ دعویٰ کا ہوتا ہے کہ یہ گفتگو محرم سنہ ۲ھ سے تعلق رکھتی ہے لیکن آخر مین ہو کہ

فلم یأت العام المقبل حتی توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر آیندہ سال آنے سے پہلے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ محرم سنہ ۱۱ھ سے تعلق رکھتا ہے،

حدیث مین جو یہ کہا گیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونون اس دن کی عزت کرتے ہین، اس سے معلوم ہوا کہ عاشورار سے اس جگہ ۱۰ ارابیب یا ۱۰ ارتشری مراد ہے، اور ایام جن کا ہم نے ذکر کیا، نصاریٰ کے یہان معمولات مین داخل نہ تھے، تشری کی دس تاریخ ہم اس لئے نہین مراد لے سکتے، کہ نقشۂ سنین یہود مین ہم دیکھ آئے ہین کہ مدنی زندگی کے دوران مین کبھی تشری کا مہینہ محرم کے آس پاس نہین پڑا، البتہ سنہ ۹ھ اور سنہ ۱۰ھ کا ذی حجہ یہود کا ماہ ابیب تھا، جس کی دس تاریخ کو قربانی کا جانور خریدا جاتا، اور صوم مریم رکھا جاتا تھا، ۱۴ تا ۲۱، ایام قربانی، اور ۱۵ یوم فطیر یوم حصاد، یوم زکواۃ وغیرہ تھا، عید فسخ کی نصاریٰ بھی عزت کرتے تھے، اسی ۱۰ ارابیب کے خیال سے لوگون نے کہا تھا کہ اس دن یعنی یوم عاشورار کی اہل کتاب کے فریقین عزت کرتے ہین،

۱۰ ارابیب اور عاشورا ے محرم مین وجہ مماثلت یہ ہے کہ دونون ایام درخت کی دونون شاخون یعنی اسماعیلؑ و اسحاقؑ کی نسلون کے ماہ اول کی دسوین تاریخین تھے، علاوہ برین ہم نے جو نقشۂ سنین یہود کا دیا ہے، اس سے ظاہر ہے سنہ ۲۳۲ خروج کا پہلا مہینہ محرم تھا، اگر ہم سنہ خروج کو صرف ایک سال قبل سے شروع کرین، تو سنہ خروج کا پہلا ماہ محرم ہی قرار پاسکتا ہے، سنین کی مجموعی تعداد جوڑتے وقت عام محاسبین کی تقلید مین ہم نے ۷ نیاہ کے ۲ ماہ نہین جوڑے ہین، اور نہ جمادی الاولیٰ سنہ ۱ھ سے ذی حجہ سنہ ۱ھ تک کا حساب سامنے رکھا ہو سکتا ہے، بلکہ غالب گمان کہتا ہے کہ سنہ ۱ خروج

کا پہلا یہودی مہینہ محرم کے مطابق تھا، بہر صورت عاشورائے محرم کو اگر یہود کے (۵) عاشورون مین سے کسی کے ساتھ نسبت مساوات حاصل ہے تو وہ ۱۰ رابیب ہے، اسی کا لحاظ کرکے عاشورائے محرم کی بابت کہا گیا تھا، کہ اس دن (یعنی سال کے ماہ اول کی دسوین) کا احترام تو اہل کتاب بھی کرتے ہین،

حدیث کا مکالمہ | حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہین کہ

لما قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ آئے
فرأی الیہود تصوم یوم عاشوراء	تو آپ نے یہود کو عاشوراء کے دن روزہ
فقال ما ھذا، قالوا ھذا الیوم	رکھتے دیکھکر فرمایا، کہ یہ کیا ہے، بولے یہ
صالح، ھذا یوم نجی اللہ بنی اسرائیل	ایک مبارک دن ہے، اس دن خدا نے بنی
من عدوھم فصامہ موسیٰ	اسرائیل کو اُن کے دشمن سے نجات دی،
قال فانا احق بموسیٰ منکم فصامہ	اس لئے موسیٰؑ نے روزہ رکھا تھا آپنے فرمایا
وامر بصیامہ،	کہ تب موسیٰ کی پیروی کا حق تم سے زیادہ
(بخاری)	مجھے ہے، آپ نے بھی روزہ رکھا، اور لوگون کو بھی حکم دیا

(فلما قدم) کے لفظ سے یہ بات سمجھی گئی کہ یہ گفتگو ۱ھ سے متعلق ہے، مگر حسابی دلیل مجبور کرتی ہے کہ

۱- یا تو اس حدیث کو غلط مانا جائے، کیونکہ ۱ھ مین ماہ محرم کے آس پاس وہ یوم عاشوراء نہین پڑا تھا، جس کا اس حدیث مین ذکر ہے،

۲- یا یہ سمجھا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ نے (فلما قدم) کا لفظ زمانہ متعین کرنے کے لئے نہین بلکہ وجہ مکالمہ بتانے کے لئے استعمال کیا،

علامہ بیرونی نے پہلی صورت اختیار کی اور فرمایا "یہ حدیث غیر صحیح ہے کیونکہ حساب اس کے خلاف گواہی دیتا ہے" مگر اس کے ساتھ ایک غلطی اور کی، اس حدیث کے اندر مذکور عاشورائے یہود کو ۱۰ تشری

قرار دیا، حالانکہ اشری کے روزہ کے وجوب کی علت وہ نہین، جو اس حدیث مین یہود کی زبان سے مروی ہے جس ماہ مین خدا نے بنی اسرائیل کو فرعون اور آلِ فرعون سے نجات دی تھی اس کا نام توراۃ مین کئی مقام پر بصراحت ابیب مذکور ہے جس کو اب نیسان کہتے ہین،

اس حدیث کو ہم چند ٹکڑون مین تقسیم کر سکتے ہین،

۱۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ مین تشریف لائے تو یہود کو عاشورا کے دن روزہ رکھتے دیکھا، مراد اس عاشورا سے ۱۰ ابیب ہے، نقشہ سنین یہود مین دیکھو ابیب کا مہینہ عرب کے کن کن مہینون مین پڑا تھا،

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے پوچھا یہ کیا ہے؟ ضرور نہین کہ یہ سوال پہلے ہی سال کیا گیا ہو، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ کسی نہ کسی ۱۰ ابیب ہی کو یہ سوال آپ نے کیا، رمضان ۱ھ مین یہ گفتگو ہوئی ہوتی، تو پھر اور حدیثون کی جو اوپر مذکور ہوئی ہین، کبھی ضرورت ہی پیش نہ آتی، رمضان ۲ھ مین بدر کی وجہ سے اور شوال ۳ھ مین احد کی بدولت، شوال ۵ھ مین غزوۂ قریظہ کی وجہ سے اس گفتگو کا موقع نہ تھا، ذی قعدہ ۶ھ، ذی قعدہ ۷ھ اور ذی قعدہ ۸ھ، اور ذی حجہ ۱۰ھ مین آپ مدینہ کے اندر نہین تھے، لے دے کے اس گفتگو کا وقت ذی حجہ ۹ھ فرض کیا جا سکتا ہی،

ہمارے اس بیان پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ اگر یہ بات ذی حجہ ۹ھ مین ہوئی، تو پھر ۱۰ھ مین لوگون کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ اس دن کی تعظیم تو یہود بھی کرتے ہین، روایت مین اگر صرف یہود کا لفظ ہوتا، تو اعتراض بجا تھا، مخبرین کا منشاء یہ بتانا تھا کہ اس دن کی تقدیس یہود کی طرح نصاریٰ بھی کرتے ہین،

۳۔ یہود نے بتایا کہ اس تاریخ یعنی ۱۰ ابیب کو خدا نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنون سے نجات دی، ان کا یہ بیان سفر خروج وغیرہ کی لمبی تشریحات کا خلاصہ ہے،

۴۔یہود نے اس دن کے روزہ کی وجہ یہ بتائی کہ حضرت موسیٰؑ نے بطورِ شکر یہ روزہ رکھا، جو فرض تو نہیں مگر سُنتِ موسیٰ ہے، حدیث کا یہ ٹکڑا ۱۰ ارتشری کے روزہ کی مشہور وجہ سے لڑتا ہوا ہے، اس دن کو صوم مریم کہا جاتا ہے، لیکن اس فرق کو ہم صرف فقیہانہ اختلافات پر مبنی قرار دے سکتے ہیں،

۱۰ ارتشری کو موسیٰ نے روزہ رکھا،

۱۰ ارتشری کو خدا نے بنی اسرائیل کو نجات دی،

۱۰ ارتشری کو مریم نے وفات پائی،

یہ تین واقعات ہیں، بعض نے واقعۂ اوّل کی علت واقعۂ دوم کو بعض نے واقعۂ سوم کو قرار دیا، مومن بموسیٰ کے لئے صرف اتنا علم کافی ہے، کہ ماہ اوّل کی دسوین تاریخ کا روزہ سُنتِ موسیٰ ہے،

۵۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم سے زیادہ ہم کو حق ہے کہ موسیٰ کا اتباع کرین" ایسا آپ نے اس لئے فرمایا کہ سورہ انعام مین خدا نے انبیاء کے نام لے کر جن مین سے ایک حضرت موسیٰ بھی ہین، ارشاد فرمایا،

اولئِک ھَدیٰ اللہُ فبھداھم اقتدہ، ان کی راہ نمائی خدا نے کی تھی، تو بھی ان کی راہ نمائی کی اقتدار کر،

یہان پر جناب مستفسر کے سوالات کا جواب ختم ہوگیا، لیکن دو باتین اور عرض کر دینا ضروری ہے،

ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کے ماتحت لکھا ہے کہ

واستشکل رجوعہ الیھم فی ذلک اس پر سوال ہوا کہ آپنے اُن لوگون پر

واجاب المازری باحتمال ان	کیسے اعتماد کیا، مازری نے کہا ہو سکتا ہو
یکون اوحی الله بصدقهم او	کہ خدا نے ان کی صداقت کو وحی کے ذریعہ
تواتر عنده الخبر بذلك،	ظاہر کیا ہو یا یہ خبر آپ کے پاس متواتر
زاد عیاض او اخبرهم من	ہو، عیاض نے کہا یا آپ کو ابن سلام
اسلم منهم کابن سلام	جیسے مومنوں نے خبر دی ہو، پھر بات یہ
ثم قال لیس فی الخبر انه ابتدأ	ہے، کہ حدیث سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ
الامر بصیامه بل فی حدیث	پہلے پہل آپ نے اسی وقت یہ حکم دیا، بلکہ حدیث
عائشة التصریح بانه	عائشہ رض سے ظاہر ہے کہ آپ پہلے سے
کان یصومه قبل ذلك،	اس روزہ کے عادی تھے،

ان جوابوں میں کوئی تشفی بخش نہیں ہے، حدیث عائشہ رض میں جس روزہ کا ذکر ہے، اس کو آپ اب سے پہلے اہل جاہلیت کی بدعت حسنہ سمجھتے تھے، جیسا کہ حدیث ابن عمر رض سے ظاہر ہے، اس حدیث اور اس سے قبل والی حدیث ابن عباس رض سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب ہی کے عمل کی شہادت نے آپ کا یہ خیال بدل دیا کہ یہ روزہ محض اہل جاہلیت کی بدعت حسنہ ہے، قاضی عیاض کا یہ قول کہ ابن سلام جیسوں نے بتایا ہوگا، محض احتمال ہی احتمال ہے، خبر آپ کے نزدیک متواتر ہوتی، تو آپ اس وقت سے پہلے اسے اہل جاہلیت کی بدعت حسنہ قرار نہ دیتے، رہا خدا کی طرف سے بذریعہ وحی یہود کے بیان کی تصدیق کا ماجرا، تو اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہود کے بیان پر آپ کے یقین کرنے پر مشکل عائد کرنا بذات خود قابل اعتراض امر ہے، خداوند عالم نے سورۂ نساء (ع-۱۱) کے اندر مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی خبر امن یا خوف کی آئے تو وہ اس خبر کو پیغمبر کے پاس، اور پیغمبر نہ ہو تو اولی الامر کے پاس پہنچا دیں تاکہ جن کو استنباط کا ملکہ ہے مخبروں کے جھوٹ کو سچ سے ممتاز کر لیں،

صحابہ نے آپ کو عاشوراء کی بابت خبر دی کہ یہود اور نصاریٰ بھی اس دن کی تعظیم کرتے ہیں، آپنے کچھ یہودیوں سے اس خبر کی حقیقت کر دی، اور نفس واقعہ معلوم کر لیا،

دوسری چیز جو اس موقع پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دینا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ حدیث میں یہود کے عاشوراء کا ذکر ہے، اور اگرچہ اس عاشوراء یہود کی بنا پر آپ نے روزۂ عاشوراء کو سنّتِ موسیٰ کے اتباع کی حیثیت عطا فرمائی، پھر بھی یہ ثابت نہیں کہ آپنے کبھی یہودیوں کے طریق ایام شماری کو مرعی رکھنے کا یا یہودیوں کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے دیکھ کر عین اُس دن سُنّتِ موسیٰ کی اقتدا کا حکم دیا ہو، سُنّتِ موسیٰ صرف یہ ہے کہ سال کے پہلے ماہ کی اس تاریخ کو جس کا نام یوم عاشوراء ہے، روزہ رکھا جائے، آنحضرت صلعم نے صرف محرم کی نویں کو یا بخیال عوام دسویں کو روزہ رکھا، تمام مذہبی معاملات کے لئے مسلمانوں کا طریق ایام شماری صرف ان دو ہدایتوں پر مبنی ہے،

۱- اللہ کے پاس مہینوں کی گنتی بارہ ہے،

۲- چاند کو خدا نے مواقیت للناس بنایا،

اگرچہ قرآن مجید نے شمس و قمر دونوں کے حسبان، اور منازل قمر کے طلوع و غروب کا مفاد عدد سنین اور حساب کو جاننا بتا کر دور شمس ... اور دار قمر کی توفیق کو روا قرار دیا ہے لیکن اس رواداری کا اثر مذہبی اور عبادتی معاملات کے لئے ایام شماری پر نہیں پڑتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ناپسند تھا کہ عوام کو جوتش اور حساب کواکب جاننے والوں کا پابند بنایا جائے، اس لئے آپ نے فرمایا۔

"ہم لوگ ان پڑھ لوگ ہیں، حساب نہیں جانتے، اس لئے چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر کھولو" (بخاری مسلم)

"دوسرے مذہبی حقائق کی بابت قرآن مجید میں ہے، کہ تم کو اگر بینات و زبر کا علم نہ ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو،

ادبیات

انقلابِ حاضر کا پیامِ نو

از جناب یحییٰ اعظمی

دمِ سرد میں بھی ہو کیوں نہ اب التہابِ تازہ — کہ اُفق پہ جلوہ افگن ہو اک آفتابِ تازہ
اٹھ اب اے دلِ فسردہ نئی کروٹیں بدل کر — کہ حیات کی بشارت ہے یہ اضطرابِ تازہ
نہ وہ بادۂ کہن اب نہ وہ میکدہ نہ ساقی — خُمِ نو میں ساقیِ نو نے بھری شرابِ تازہ
ہوے ساز سب شکستہ و قدیم زمزموں کے — کہیں چنگِ نو ہے محفل میں کہیں ربابِ تازہ
جسے سرسری نگاہوں سے تم آج دیکھتے ہو — ہے کتابِ زندگی کا وہ عجیب بابِ تازہ
ہمیں بھی ہے اب بدلنا یہ نظامِ زندگانی — کہ پیامِ نو ہے دیتا ہمیں انقلابِ تازہ
جسے تم سمجھ کے دوڑے ہو زلالِ آبِ حیوان — وہ نظر فریب جلوہ ہے مگر سرابِ تازہ
رہے کیوں ہمیشہ غیروں پہ نگاہِ خردہ گیری — کبھی اپنی زندگی کا بھی ہو احتسابِ تازہ
وہ ملی ہے ذرہ ذرہ کو نویدِ پر فشانی — کہ دیارِ ہند میں ہے اب اک اضطرابِ تازہ
بڑی شان سے شبستان میں ہے صبحِ نو کا مقدم — کہ اُبھر رہا اُفق سے ہے اک آفتابِ تازہ

ہے تمھارے واسطے بھی سبق اس میں کچھ عزیزو!
یہ وطن میں رونما ہے جو اک انقلابِ تازہ

مطبوعات جدیدہ

اسلامی سیاست، از جناب ابوالسلام نعیم صدیقی، جم ۱۷۵ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی بہتر، قیمت عہ/، پتہ:۔ نشاۃ ثانیہ، چپل گوڑا، حیدر آباد، دکن،

"اسلامی سیاست" جناب مصنف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو وہ "جماعت اسلامی" کی تحریک کی حمایت مین وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہین، کتاب دو حصون مین تقسیم کی گئی ہے، پہلا حصہ مسلسل مضامین کے مجموعہ پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصہ مین چند متفرق مضامین ہین، کتاب کے مسائل ومباحث کا اندازہ مضامین کے عنوانون سے کیا جاسکتا ہے، مثلاً "اسلامی تنظیم" "جماعت اسلامی کی قیادت" "اسلامی تحریک کا طریقہ اقدام" "اسلامی قیادت کے نازک فرائض" "اقامت دین فرض ہے یا نہین" "اسلام کاروبار ہے یا خدمت" "سواد اعظم آئینہ کے سامنے" اور "مسلم مورچہ کیمونسٹ" وغیرہ، "جماعت اسلامی" کی تحریک کے بعض محل نظر تعبیرات سے قطع نظر کر کے دین اور مسلمانون کے حق مین اس کے مفید نتائج واثرات کو نظر انداز نہین کیا جاسکتا، اب پاکستان کے قائم ہوجانے کے بعد اس تحریک کے فروغ پانے کے امکانات پیدا ہوگئے ہین، امید ہے کہ مضامین کا یہ مجموعہ مسلمانون کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرے گا،

آسودگان ڈھاکہ:۔ از جناب حکیم حبیب الرحمن صاحب مرحوم، جم ۱۵۸ صفحے، چھپائی بہتر، خوشخط، مجلد مع گرد پوش، قیمت ہے، پتہ ۱:۔ امدادیہ لائبریری، چوک بازار، ڈھاکہ،

حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم (ڈھاکہ) اور ان کی علمی صلاحیتوں کا تذکرہ "وفیات" کے تحت چند مہینے پہلے معارف مین تفصیل سے آیا ہے، مرحوم کی زندگی کی آخری یادگار "آسودگان ڈھاکہ" کے نام سے شائع ہوئی تھی اس مین ڈھاکہ کے مزارات کا تفصیل سے ذکر آیا ہے، ڈھاکہ میونسپلٹی مین شہر کو کئی حصون (وارڈون) میں تقسیم کیا گیا ہے، اس تصنیف مین اسی ترتیب سے ہر وارڈ کے مقابر کی تعیین، صاحب مزار کا اجمالی حال، اور قبرون کی موجودہ حالت کو بیان کیا گیا ہی، اس ضمن مین مشرقی بنگال کے بہت سے ممتاز بزرگون، اور دوسرے ارباب کمال کے حالات قلمبند ہوگئے ہین، یہ تصنیف ایک اچھی خاصی صحیفۂ تراجم بن گئی ہے، مصنف کے پیش نظر ڈھاکہ کی مفصل تاریخ کی ترتیب تھی، "مساجد ڈھاکہ" "ڈھاکہ آج سے پچاس برس پہلے" "شعرائے ڈھاکہ" وغیرہ نامون سے وہ اس کے مختلف حصے مرتب کر چکے تھے، لیکن افسوس کہ اب وہ خود آسودگان ڈھاکہ کے درمیان ہمیشہ کے لئے محو استراحت ہوگئے، مصنف کی وصیت کے مطابق ان مسودون کے نسخے ڈھاکہ یونیورسٹی مین جانے چاہئے تھے، اگر لائق مصنف کے اخلاف نے وصیت کی تعمیل کی ہے، تو ڈھاکہ یونیورسٹی کے پاس یہ قیمتی امانت پہنچ چکی ہوگی، اب اس شہر کے مشرقی بنگال کے پایہ تخت قرار پا جانے کے بعد اس کی اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے، توقع ہے، کہ یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس قیمتی سرمایہ کو شائع کرکے منظر عام پر لائین گے، اور ڈھاکہ کی عظمت کو دوبالا کرین گے،

ہندوستانی معاشیات کے مبادی، از جناب شرف الدین صاحب بی، اے، ضخامت ۲۵۸ صفحے،

بڑی تقطیع، قیمت عار، پتہ:۔ قادریہ نشیمن، ترپ بازار، حیدرآباد دکن،

"ہندوستانی معاشیات کے مبادی" مین ہندوستان کے معاشی مسائل کو عام فہم انداز مین پیش کیا گیا ہے، کتاب چند بابون "قدرتی ذرائع اور آبادی" "ہندوستان مین معاشی تغیر" "زراعت" "صنعتی ترقی" "حمل ونقل اور تجارت" "زر، قیمتین اور بینک کاری" "مالیات" مین تقسیم ہے، جن

اپنے عنوانوں کے مطابق مباحث درج ہیں، نیز ہر باب میں حیدرآباد کے معاشی حالات کو خاص طور پر یکجا کیا گیا ہے، معاشیات سے تعلق رکھنے والے طلبہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

نشاط خاطر، از جناب خواجہ حمید صاحب لکھنوی، حجم ۵۲ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت ۸ر پتہ:۔

حمیدیہ دواخانہ، کٹرہ ابوتراب خان، لکھنؤ،

حضرت ثاقب لکھنوی مرحوم دور آخر کے اساتذۂ فن میں سے تھے، جناب خواجہ حمید لکھنوی نے، جنھون نے شعر و سخن کا ذوق اپنے جد امجد حضرت خواجہ عزیز لکھنوی سے ورثہ میں پایا ہے "نشاط خاطر" کے نام سے اپنے اور حضرت ثاقب کے کلاموں کا انتخاب شائع کیا ہے، اور ان دونوں اہل ذوق شعرا میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کے کلام کو منتخب کرنے کی خدمت انجام دی ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق اس گلدستہ سے لطف اندوز ہوں گے،

پھندہ، جناب قیسی رامپوری، ناشر رائل ایجوکیشنل بک ڈپو، اردو بازار، دہلی، حجم ۲۰۷ صفحے.

لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ع‌ہ

جناب قیسی رامپوری نے اس ناول میں اسلام و اشتراکیت اور رواجی مذہب اور دین کی حقیقی روح میں امتیاز دکھانے کیلئے چند سیرتوں کو پیش کیا ہے، اسی سلسلہ میں ایک نوجوان مودودی تحریک میں داخل ہوتا ہے، لیکن اس کے دل میں ایک دوشیزہ کی محبت مستور رہتی ہے، وہ اس کی زندگی سے دلچسپی لیتا ہے، اس کو صحیح راہ پر لانے کے خیالات کی پرورش کرتا ہے، لیکن دراصل اس جذبۂ اصلاح میں اس کی محبت و وارفتگی کے جذبات پنہاں رہتے ہیں، بالآخر وہ اس تحریک سے نکل آتا ہے، اور خدمت خلق کے نام سے اپنی زندگی کا نیا دور شروع کرتا ہے، اور اس دوشیزہ کی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آنے کے بعد اس کو وہ بالآخر اسکی رنگین زندگی سے نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے، اگرچہ یہ سادہ پلاٹ ایک قسم کا تیار ہو گیا ہے، لیکن جا بجا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اتفاقی حادثات سے مدد لی گئی ہے، مختلف مباحث کے ضمن میں اسلام و اشتراکیت

کے موازنہ مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مطالعہ نوجوانون کے لئے سودمند ہوگا، اسی طرح بعض دوسرے اصلاحی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، لیکن وہ نامکمل اور تشنہ معلوم ہوتی ہے، اگرچہ یہ مباحث اس کتاب مین بار بار آئے ہین لیکن اس کے باوجود اس کی دلچسپی مین کوئی فرق نہین آیا ہے، کسی جگہ یہ معلوم نہین ہوتا کہ ناول کے بجائے کوئی مذہبی یا اصلاحی لٹریچر زیر مطالعہ ہے، اور اس لحاظ سے اس کو ایک کامیاب ناول کہا جا سکتا ہی،

ہفت سورہ و قربات عند اللہ، مترجمہ مولنا احمد سعید صاحب دہلوی ناشر دینی بکڈپو، اسعد بازار، دہلی، حجم ۱۹۲ صفحے قیمت عکر

مولنا احمد سعید صاحب نے قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ سہل اور آسان زبان مین کرنا شروع کیا ہی، اور نمونہ کیلئے ہفت سورہ کا ترجمہ شائع کرایا ہی، ترجمہ مین خانوادہ ولی اللٰہی اور حضرت مولنا تھانوی علیہ الرحمہ کے ترجمہ کو سامنے رکھا گیا ہی، ۶۰ صفحون مین سات سورتین مع ترجمہ درج ہین، اور ۱۳۲ صفحون مین قربات عند اللہ کے نام سے ورد و وظیفہ کیلئے دعاؤن کا مجموعہ ہے جو گویا مقبول عام مجموعہ "مناجات مقبول" ہی کا مکمل نقش ہی، مولنا احمد سعید دہلی کی دلآویز پاکیزہ زبان مین لکھتے ہین، امید ہی کہ ان کے قلم کے اس مجموعہ کو بھی مقبولیت عام حاصل ہو،

اپنا اور ماحول کا کارٹون، از جناب شیخ اکبر علی صاحب ایڈوکیٹ، ناشر کمال پبلشرز، نمبر ۲۶ مال روڈ لاہور، حجم ۱۲ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت عل

مصنف نے اس مین گویا اپنے سوانح حیات مزاحیہ انداز مین لکھے ہین، اور اس ضمن مین مختلف سیاسی، تعلیمی اور تمدنی مسائل پر اظہار خیال کیا ہی، مزاح نگاری کا فن نہایت لطیف ہی، اس تصنیف مین کچھ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مصنف کا قلم کارٹون بنانے کیلئے اٹھایا گیا ہے، لیکن کارٹونون مین خود قوت گویائی پوشیدہ ہوتی ہی، ان کو کھول کر بیان کرنے مین شاید اصل لطف باقی نہین رہ سکتا،

ہمالیہ کی گود مین، از جناب ساگر چند رگور کھا، حجم ۱۹۹ صفحے تقطیع ۲۲×۱۸/۴ ناشر راج محل پبلشرز، جمون، کشمیر، قیمت ۲ر

"ہمالیہ کی گود مین" مصنف کے ایسے مختصر افسانون کا مجموعہ ہی جنکے پلاٹ کا تعلق ہمالیہ کے پرفضا مقامات سے ہے، ان افسانون مین وادیون کی دلچسپیان، وہان کی آبادی کے مختلف طبقون کی زندگی کی تصویر، اور مختلف پرفضا مقامات اور انکے ماحول کا مرقع پیش کیا گیا ہی، بعض افسانے جیسے "کلزم" خاصے پڑھنے ہین، افسانون کی زبان سلیس اور روان ہی، جناب راجندر سنگھ بیدی نے اس مجموعہ پر اپنا مقدمہ لکھا ہے، یہ کتاب ادبی حلقون مین پسند کئے جانے کے قابل ہے،

"م س"

اور تاریخی کتابین

تاریخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

مصنفہ: مولانا عبد السلام ندوی، ضخامت ۲۷۶ صفحے،

قیمت: ۲عہ/

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسون اور تعلیمگاہون کا حال معلوم کرنا چاہین تو نہین مل سکتا، مولوی ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہون پر معارف مین ایک مقالہ لکھا تھا جس کو اہل نظر نے بے حد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت مین نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے،

ضخامت ۱۳۴ صفحے، قیمت: ۱۲/

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہین، وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائین،

اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یوپی نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ/

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،

ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ/

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے، تاکہ مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے اور اب کیا ہین، ضخامت ۷۶ صفحے، قیمت: عہ/

مرتبہ: مولوی عبد السلام قدوائی، ندوی،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشار اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر، خود عالمگیر کے خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

۳۹۷ صفحے، قیمت: للعہ/

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، ان سے ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، مرتبہ: سید نجیب اشرف ندوی ایم اے،

ضخامت: ۴۸۷ صفحے،

قیمت: ے/

سوانح

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیاں، اور معترضین کے جوابات، قیمت: ۳ ضخامت ۳۲۹ صفحے، طبع سوم با اضافہ حواشی، (از مولنا سید سلیمان ندوی)

سیر عمرؓ بن عبدالعزیز

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز خلیفۂ اموی کے سوانح حیات اور اُن کے مجددانہ کارنامے، ضخامت ۲۰۲ صفحے، قیمت: عا ر از مولنا عبدالسلام ندوی،

حیات امام مالکؒ

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی کتاب موطاے امام مالکؒ پر تبصرہ، قیمت: - عہ (۱۰۶ صفحے) از مولانا سید سلیمان ندوی،

الغزالی

امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کا فلسفہ اور علم کلام، اخلاق اور تصوف مین اُن کے مجددانہ کارنامے ضخامت ۲۳۵ صفحے، قیمت: عہ ر از مولنا شبلی رحمۃ اللہ علیہ،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرامؓ کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہو اس مین چیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: - ۵۰۶ صفحے، قیمت: - للعہ ر

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۵۱

ستمبر ۱۹۴۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

اردو مین اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب نہین تھی جس مین تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر حکومتون کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ ہو، اس لئے دار المصنفین نے تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ خاص اہتمام سے مرتب کرایا ہے، جس کے بعض حصے چھپ چکے ہین اور بعض زیر طبع ہین، اور اکثر زیر تالیف و تکمیل ہین، جو بتدریج جیسے جیسے حالات مساعد ہون گے شائع ہوتے رہین گے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل (عہد رسالت وخلافت راشدہ) اس مین آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مفصل مذہبی، سیاسی وتمدنی اور علمی تاریخ ہے (زیر طبع)،
ضخامت: ۳۸۰ صفحے، قیمت: سے ٣ر

تاریخ اسلام حصۂ دوّم، (بنو امیہ) اس مین اموی حکومت کی صدسالہ سیاسی وعلمی وتمدنی تاریخ کی تفصیل ہے،
ضخامت ۳۷۴ صفحے، قیمت: سے ٣ر

تاریخ اسلام حصۂ سوم، (تاریخ بنی عباس جلد اوّل) اس مین خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے خلیفہ ابو اسحق متقی للہ ۳۳۳ھ (۹۴۴ء) تک دو صدیون کی بہت مفصل سیاسی تاریخ ہے، ضخامت ۵۰۴ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصۂ چہارم (تاریخ بنی عباس جلد دوم) اس مین خلیفہ مستکفی باللہ کے عہد ۳۳۳ھ سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۶۵۶ھ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ ہے،
ضخامت ۴۳۴ صفحے، قیمت: صہ ر
(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ اوّل، اس مین عثمان اوّل سے مصطفیٰ رابع تک سلطنت عثمانیہ کے چھ سو برس کے کارنامون کی تفصیل ہے، ضخامت: ۵۰۰ صفحے
قیمت: سے ر

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارنامون کی تفصیل از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) تا جنگ عظیم ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء)
ضخامت: ۴۶۰ صفحے، قیمت: صہ ر
مرتبہ مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے علیگ سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی وجزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، حکومت کا قیام، اور عہد بعہد کی ترقیون اور عروج کی پوری اور مفصل داستان ہے،
۵۴۶ صفحے، قیمت: للعہ ر

تاریخ صقلیہ حصۂ دوم، یسلی کے تمدنی وعلمی ترقیون کا مرقع ہے، جس مین عہد بعہد کے مفسرین، محدثین، فقہاء اوباء وشعراء کے مفصل حالات اور ان کی تصنیفات کا ذکر ہے،
۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ ر
مرتبہ: مولانا سید ریاست علی ندوی،

مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۰ ماہ شوال المکرم ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۴۷ء عدد ۳

مضامین

شذرات

کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوگئے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت ملک کے مختلف حصون مین وغارتگری وبربادی جو انتہائی سنگدلی سے ہورہی ہے، وہ ہر ہندو اور مسلمان کے لئے سخت قابلِ افسوس ہے، کے معنی یہ ہین کہ ابھی تک اہلِ ہند آزادی کی سچی قدر کرنے سے محروم ہین، اگر یہی لیل ونہار ہین تو ڈر ہے ہوئی نعمت بھی اُن سے زائل نہ ہوجائے،

وقت تو یہ تھا کہ دونون قومین اپنے اپنے دائروں مین ملک کی خوشحالی، باشندوں کی راحت رسانی کی تجویزون کو زیرِ عمل لانے مین اپنی کوششین صرف کرتین، لیکن اس کے بجائے ملک کی تباہی وبربادی کا کیا جارہا ہے ڈر ہے کہ کہیں دنیا کی نگاہ مین یہ اس بات کی دلیل نہ بن جائے، کہ یہ ملک ابھی غلام ہی بننے لائق تھا، اور جو امانت اس کے سپرد کی گئی ہے، اوس کی حفاظت کی اہلیت اس مین پیدا نہین ہوئی ہے،

جولائی کے شذرات مین روس مین احیاے اسلام کی تحریک کے سلسلہ مین جو کچھ لکھا گیا، اس سے احباب کے بعض ن مین غلط فہمی پیدا ہوئی، ہمارے لائق دوست ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز نے کوثر کے دو نمبرون مین پر اپنا اختلافی افتتاحیہ لکھا، اور برادر عزیز مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے بھی اپنے مکتوب میں اس جانب دلائی ہے،

لیکن ان دوستون کو ہمارے طرزِ بیان سے شاید غلط فہمی پیدا ہوئی، ہمارا مقصود صرف یہ دکھانا تھا دوسری بڑی لڑائی کے بعد روس نے ایک نئی کروٹ لی ہے، وہ ملک جو کبھی الحاد وزندقہ کا مرکز تھا اسلام نام پر وہان مسلمانون کی شیرازہ بندی کی جارہی ہے، اور یہ ہمارے نزدیک ایک خوشگوار تبدیلی ہے یہ ہو کہ اسلام واشتراکیت کا میل نہین ہوسکتا، لیکن وہان کے مسلمانون مین اگر اپنے اشتراکی تعصبات کے ساتھ لام کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوجائے، تو وہ بھی سراہنے کے لائق ہے، ہمارے نزدیک اسلام صرف وہ قوت رہ نہین جس کے آگے گردنین جھکائی جائین، بلکہ اسلام کے مفہوم مین وسعت موجود ہے ھلا شققت قلبہ

کے بموجب وہ جس حد تک اسلام سے اپنا تعلق ظاہر کرین گے، اسلام اپنے آغوش کو ان کے لئے وا کریگا کہ شاید اسی راہ سے وہ اسلام کی صحیح روشنی کو پاسکین،

ابوبکر ابن دُریا زدی، چوتھی صدی کے ممتاز عرب شعراء مین سے تھا، جناب بدرالدین صاحب علوی ام اے استاذ مسلم یونیورسٹی نے اس کے کلام کا مجموعہ اپنی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مصر سے چھپوا کر شائع کیا ہے، اہلِ ذوق اس کے نسخے مرتب موصوف سے نذیر احمد رو ڈ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پتہ سے منگا سکتے ہین

علامہ ابن حزم اندلسی کی جمہرۃ الانساب، انساب کی تاریخ مین اہم تصنیف ہے، اس مین عرب کے مشہور قبائل و بطون اور اُن کے باہمی ربط کو تفصیل سے بیان کیا ہے، نیز بربر، بنی اسرائیل اور ایرانیون کے قدیم نسب کو بیان کیا گیا ہے، اور ایام عرب اور مختلف عرب قبائل اور خانوادون کے ضمن مین ممتاز مشاہیر و ارباب کمال کو روشناس کیا گیا ہے، جناب مسعود حسن صاحب لکچرر پٹنہ کالج شکریہ کے مستحق ہین کہ انھون نے اس نادر تصنیف پر اپنا وقت صرف کیا، اور اس کے چھ قلمی نسخون کی مدد سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ اس کو مرتب کر لیا ہے، اس سلسلہ مین موصوف نے جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مین علامہ ابن حزم کے سوانح پر ایک قیمتی مقالہ بھی لکھا ہے، اور اس ذیل مین جمہرہ کے ایڈٹ کرنے کا ذکر آیا ہے، اب موصوف اپنے والا نامہ مین لکھتے ہین، کہ اگر کوئی ادارہ اس نسخہ کی اشاعت کے لئے آمادہ ہو تو وہ اس کو اپنا نسخہ پیش کر سکتے ہین بمبئی کے عربی کتابون کے تاجرون مین سے اگر کوئی صاحب اس خدمت پر آمادہ ہو جائین تو ایک مفید علمی خدمت انجام پا سکتی ہے، اس سلسلہ مین موصوف سے "عربک ڈیپارٹمنٹ، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ" کے پتہ سے مراسلت کی جا سکتی ہے،

پی ای ان، (پوایٹس، ایڈیٹرز، ناولسٹ) آل انڈیا سنٹر کے نام سے ایک بین الاقوامی علمی مجلس بمبئی مین قائم ہے، اس کی داغ بیل ۱۹۲۱ء مین مسز ڈاوسن اسکاوٹ نے بین الاقوامی بنیاد پر ڈالی تھی، اور آل انڈیا سنٹر کے پہلے صدر نشین ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور وائس پریذیڈنٹ مسز سروجنی نائڈو تھین، ٹیگور کی وفات کے بعد مسٹر راما نند چٹرجی اس کے صدر اور حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی اور پنڈت جواہر لال نہرو اس کے نائب صدر منتخب کئے گئے، یکم جولائی ۱۹۴۸ء تک، ہندوستان مین اس کے ارکان کی تعداد ۱۴۳ تھی، اس مجلس کے زیرِ اہتمام ہندوستان کی مختلف زبانون کے اربابِ قلم، اپنے مقالے پڑھتے رہے، اور ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے عمومی اجلاس منعقد ہوے اس کا آخری اجلاس

۱۹۴۵ء میں جے پور میں ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں کے ارباب علم جمع ہوئے تھے، نیز یورپ کے مختلف ملکوں کے نمایندوں نے بھی شرکت کی تھی، اب اس مجلس کا سالانہ اجلاس ۳۰ر نومبر کو بنارس میں منعقد ہو رہا ہے، امید ہے کہ اہلِ علم اس سے دلچسپی لیں گے،

پی ای ان کا ایک ماہنامہ بھی، انڈین پی ای ان کے نام سے شائع ہوتا ہے، جو اس کے ارکان کو ہدیۃً اور ۵ر سالانہ قیمت پر آریا سنگھا نرائن روڈ بھولکر روڈ، مالابار ہل بمبئی کے پتہ سے مل سکتا ہے، اس ماہنامہ میں کتابوں پر عام ریویو کے علاوہ مختلف ہندوستانی زبانوں، بلوچی، بنگالی، ہندی، ملیالم، مرہٹی، اوڑیا، سنسکرت، سندھی، تامل، تیلگو، اور اردو کی ماہانہ خدمات اور مطبوعات کا جائزہ لیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ اردو کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے، وہ محض سطحی معلومات پر مبنی ہوتا ہے، حالانکہ بمبئی میں اردو کی دنیا سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم کی کمی نہیں ہے، اس ادارہ کو کسی مستند صاحبِ علم کے خدمات حاصل ہو سکتے ہیں،

انجمن تحفظ اردو، یو پی، لکھنؤ میں ایک نو قائم مجلس ہے، جو تقریباً ایک سال سے جناب محسن نظامی کی سرکردگی میں اردو زبان کی خدمت انجام دے رہی ہے، اس انجمن نے اردو کی عام اشاعت کے لئے اردو ٹائم ٹیبل چھاپنے کا اہتمام کیا ہے، اور سر دست چار ریلوے، ایسٹ انڈین، او ٹی، بی بی اینڈ سی آئی، اور جی، پی، آئی، کے ٹائم ٹیبل کو اردو میں شائع کیا ہے، اور ہر ایک کی قیمت صرف ۲ر رکھی گئی ہے، یہ ٹائم ٹیبل بڑے اسٹیشنوں پر مل سکتے ہیں، اور ۳ر کے ٹکٹ بھیج کر دفتر انجمن تحفظ اردو، یو پی، لکھنؤ سے بھی منگائے جا سکتے ہیں

جناب ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے مضامین نثر کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے شائع ہوا ہے، یہ مولانا موصوف کے ۴۲ سال کے مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف علمی، ادبی، اور تاریخی مقالات پر مشتمل ہے، اردو کی مشہور کتابوں پر ریویو، مختلف شعراے اردو و فارسی کے کلام پر نقد، اور کتب خانہ حبیب گنج کے مختلف نوادر کو ان مقالات میں روشناس کیا گیا ہے، توقع ہے، کہ ملک کے علمی و ادبی حلقہ میں اس مجموعہ کو عام قبولیت حاصل ہو گی،

مقالات

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبد السلام ندوی

(۶)

(۱۰) مسئلۂ ارتقاء اثبات خودی کا یہ دسواں مقدمہ بلکہ خودی کی ترقی جد وجہد اور تگ و دو کی آخری منزل ہے، عملی حیثیت سے عجمی تصوف اگرچہ بالکل شکستہ پا اور غیر متحرک ہے، لیکن اخلاقی اور روحانی ترقی کی راہ مین اس کا قدم کسی منزل پر نہین رکتا، اور ہمیشہ خوب سے خوبتر کی تلاش مین رہتا ہے،

ہر نگارے کہ مرا پیش نظر می آید　　خوش نگاریست و لے خوشتر ازان می باید

اس لئے ہمارے صوفیہ موجودہ انسان اور موجودہ انسانی دنیا پر قناعت نہین کرتے، بلکہ اس سے کامل تر انسان اور اس سے کامل تر دنیا کی تلاش کرتے ہین، خواجہ حافظ فرماتے ہین،

آدمی در عالم خاکی نمی آید بدست
عالمے دیگر بباید ساخت از نو آدمے

قدیم حکمائے یونان مین جو لوگ صوفیانہ زندگی بسر کرتے تھے، وہ بھی اسی قسم کے برگزیدہ انسان کی تلاش مین رہتے تھے، دیوجانس کلبی کی نسبت مشہور ہے، کہ وہ دن مین چراغ لے کر منڈی مین پھرا تھا،

یونان کے لوگ اس کو ایک پاگل حکیم سمجھتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ حضرت دن دھاڑے چراغ لے کر کیا ڈھونڈھ رہے ہیں؟ کہنے لگا کہ آدمی کو ڈھونڈھتا ہوں لیکن جب اس سے کہا گیا کہ آدمیوں کا ہجوم تمھیں نظر نہیں آتا؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ سب ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہے، آدمی اُن میں ایک بھی نہیں، چونکہ انسان کامل کی جستجو کا یہ ایک بہترین شاعرانہ طریقہ تھا، اس لئے مولانا روم نے اس کو بعینہٖ نظم کر دیا ہے،

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
ازیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست[1]

ڈاکٹر صاحب کا منتہائے آمال بھی یہی انسان کامل ہے، اور انھوں نے اس کی جستجو اور نایابی کو دیو جانس کلبی سے زیادہ مبالغہ آمیز طریقہ پر بیان کیا ہے، ع خدا ہم در تلاش آدمی ہست

فلسفہ و حکمت نے اگرچہ قدیم زمانہ میں بھی بہت کچھ ترقی کر لی تھی، اور اب اس سے بھی زیادہ ترقی کر رہے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وہ اب تک انسان کامل کے پیدا کرنے میں ناکامیاب ہیں،

حکیمان گرچہ صد پیکر شکستند مقیم سومنات بود و ہستند
چسان افرشتہ و یزدان بگیرند ہنوز آدم بفتراکے نہ بستند

یہ انسان اصولِ فطرت کے مطابق صرف روحانی ارتقار سے پیدا ہو سکتا ہے، چنانچہ ارباب رسائلِ اخوان الصفا نے اس مسئلہ پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معدنیات کی ترقی کا آخری درجہ نباتات ہے اور نباتات کا آخری درجہ حیوانات سے اور حیوانات کا آخری درجہ انسان سے اور انسان کا آخری درجہ ملائکہ سے ملا ہوا ہے، اور ملائکہ کے بھی مختلف درجے ہیں جن میں باہم اسی طرح ابتدار و انتہا ملتی ہے[2]،

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۳۰۰ و ۳۰۱، [2] رسائل اخوان الصفا جلد ۲ ص ۲۳۳

علامہ ابن مسکویہ نے الفوز الاصغر میں انسان کی ترقی کے مختلف مدارج نہایت تفصیل سے دکھائے ہیں اور اس ترتیب پر استدلال کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ پھر حیوان ترقی کرکے حیوانیت کے منتہائی درجہ پر پہنچ جاتا ہے، اور انسان کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے، گو یہ درجہ باعتبار حیوانیت کے اعلیٰ ہے، مگر بہ نسبت انسانیت کے بہت نیچا ہے، اسی درجہ پر بندر وغیرہ کا ہے جو انسان سے بالکل مشابہ ہیں، اور ان میں اور انسان میں تھوڑا ہی سا فرق ہے جس کو اگر بندر طے کرلیں تو بالکل انسان ہوجائیں، جب حیوان اس درجہ پر پہونچ جاتا ہے تو اس کا قد سیدھا ہو جاتا ہے، اور اس میں تھوڑی سی تمیز کی قوت آجاتی ہے، اور وہ تربیت سے سمجھدار ہو سکتا ہے، یہ درجہ اگرچہ جانوروں کی بہ نسبت زیادہ بلند ہے، لیکن انسان کامل کے درجہ سے بہت پست ہے، یہ حیوان نما انسان زمین کے آباد حصے کے انتہا، اور اس کے اطراف مثلاً شمال وجنوب اور زنگستان میں پائے جاتے ہیں، کیونکہ ان میں اور بندروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا، نہ ان کا کوئی فلسفہ منقول ہے، اور نہ انھوں نے اپنی ہمسایہ قوموں سے علم وفن حاصل کیا ہے، اسی طرح عقلِ انسانی درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ زمین کی وسط آبادی یعنی تیسری، چوتھی اور پانچویں اقلیم میں پہنچکر درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے، اور ان میں ذہانت، سمجھ، بیدار مغزی اور صنعتی ذکاوت پیدا ہوجاتی ہے، اور وہ علوم کے پیچیدہ مسائل حل کرنے لگتے ہیں، اور علوم وفنون کو وسعت دیتے ہیں، پھر اس درجہ میں بھی فرق مراتب پیدا ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگ اس قدر سریع الفکر، صحیح النظر اور صائب الرائے ہوتے ہیں کہ آیندہ ہونے والے واقعات کی پیشینگوئی کرسکتے ہیں، گویا یہ لوگ غیب کی باتوں کو ایک باریک پردہ کے آڑ سے دیکھ لیتے ہیں، جب انسان اس بلند درجہ تک پہنچ جاتا ہے، تو وہ ملائکہ کی سرحد میں داخل ہوجاتا ہے یعنی ایک ایسی شخصیت عالم وجود میں آجاتی ہے جو انسانی شخصیت سے بلند ہوتی ہے، اور اس میں اور فرشتوں میں بہت تھوڑا سا فرق رہ جاتا ہے، ترقی کے ان مدارج کو سامنے رکھکر انسانیت کے بلند درجہ کی انتہا معلوم ہوسکتی ہے، اور رسالت اور نبوت کی بلند پایگی سمجھ میں آسکتی ہے،[1]

---

[1] الفوز الاصغر ص ۹۰-۹۱-۹۲،

ڈاکٹر صاحب نے بھی ارتقاے انسان کا یہی فلسفیانہ نظریہ اختیار کیا ہے،

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہین ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

لیکن یہ مہ کامل اب تک ضوفشان نہین ہوا ہے، اس لئے دنیا اس کے طلوع کے انتظار میں ہے،

درین عالم بہشتِ خرمے ہست ۔۔۔ بشاخِ اوز افغانِ من نمی ہست

نصیب او ہنوز آن یا وہو نیست ۔۔۔ کہ او در انتظار آدمے ہست

بدہ او را جوانِ پاکبازے ۔۔۔ سرورش از شرابِ خانہ سازے

قوی بازوے او مانند حیدر ۔۔۔ دلِ او از دو گیتی بے نیازے

زمن ہنگامۂ دہ این جہان را ۔۔۔ دگرگون کن زمین و آسمان را

زخاکِ ما دگر آدم بر انگیز ۔۔۔ بکش این بندۂ سود و زیان را

نقشِ دگر طراز دہ آدم پختہ تر بیار ۔۔۔ لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

ان اشعار سے اس انسانِ کامل کے اوصاف بھی معلوم ہوتے ہین، یعنی وہ ایک ہنگامہ خیز، پاکباز، قوی ہیکل، بے نیاز، پختہ مغز، انقلاب انگیز اور بادۂ خودی کا سرمست انسان ہوگا، اور اس کے سامنے موجودہ انسانون کی حیثیت مٹی کے کھلونون سے زیادہ نہین ہوگی لیکن علم و حکمت اور فلسفہ و سائنس کے ذریعہ انسان کامل نہین پیدا ہوسکتا، بلکہ اوس کو صرف ایک روحانی جذبہ یعنی عشق پیدا کرسکتا ہے،

بیا اے عشق اے رمزِ دلِ ما ۔۔۔ بیا اے کشتِ ما اے حاصلِ ما

کہن گشتند این خاکی نہادان ۔۔۔ دگر آدم بنا کن از گلِ ما

یہ انسان کامل چونکہ خود عقل، عشق اور اخلاقِ حسنہ کا مجموعہ ہوگا، اس لئے وہ جس دنیا مین زندگی بسر کرے گا، یا جس عالمِ نو کو وہ پیدا کرے گا، اوس کی ترکیب بھی انھی تینون اجزا سے ہوگی،

عالمی در سینهٔ ما گم هنوز   عالمی در انتظار قم هنوز
عالمی بی امتیاز خون و رنگ   شام او روشن تر از صبح فرنگ
عالمی پاک از سلاطین و عبید   چون دل مومن کرانش ناپدید
عالمی رعنا که فیض یک نظر   تخم او افگند در جانِ عمرؓ
لایزال و وارداتش نو بنو   برگ و بار محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیر بی غمی   ظاهر او انقلاب هر دمی
اندرونِ تست آن عالم نگر   می دهم از محکماتش او خبر
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنه   عشق را با زیرکی آمیز ده
شعلهٔ افرنگیان نم خورده ایست   چشم شان صاحب نظر دل مرده ایست
سوزِ مستی را مجو از تاکِ شان   عصر دیگر نیست در افلاک شان
زندگی را سوز و ساز از نار تست   عالم نو آفریدن کار تست
مصطفیٰ کو از تجدد می سرود   گفت نقش کهنه را باید زدود
نو نگردد کعبه را رخت حیات   گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آهنگ نو در چنگ نیست   تازه اش جز کهنهٔ افرنگ نیست
سینهٔ او را دمی دیگر نبود   در ضمیرش عالمی دیگر نبود
لاجرم با عالمی موجود ساخت   مثل موم از سوز این عالم گداخت
طرفگیها در نهادِ کائنات   نیست از تقلید تقویم حیات
زنده دل خلاق اعصار و دهور   جانش از تقلید گردد بی حضور
چون مسلمانان اگر داری جگر   در ضمیر خویش و در قرآن نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر برِ او چون قباست

چون کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآن جہانے دیگرش

یہ کامل ترین انسان جو اس قسم کا ترقی یافتہ عالم نو پیدا کر سکتا ہے، خودی کی ترقی کی آخری منزل ہی، اور اسرارِ خودی میں ڈاکٹر صاحب نے خودی کی تربیت و ترقی کے اسی آخری مرحلہ کو نیابت الٰہی کے نام سے موسوم کیا ہے، اور اس نائب الٰہی کا خیر مقدم نہایت پرجوش اشعار میں کیا ہے،

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہا آباد شو

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

خیز و قانونِ اخوت سازدہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویان را بدہ پیغامِ صلح

نوعِ انسان مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر
چون بہاراں بر ریاضِ ما گذر

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

از وجودِ تو سرا فرازیم ما
پس با آلامِ جہاں سازیم ما

یہ سوارِ اشہبِ دوراں زمانہ کے ہزاروں تغیرات و انقلابات کے بعد پیدا ہوتا ہے،

طبعِ فطرت عمرہا در خون تپید
تا دو بیتِ ذاتِ او موزوں شود

اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اس کے مدارج ارتقار کی توجیہ فرانس کے مشہور فلسفی برگسان کے نظریۂ زمان ومکان سے کی ہے جس کا خلاصہ ایک مختصر لفظ "دائمی تخلیق" مین کیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ کوئی چیز ہے نہین بلکہ ہوتی رہتی ہے ہر چیز اپنے سے مختلف بنتی رہتی ہے، کائنات ساکن نہین بلکہ متحرک ہے[۱]

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے مین ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے مین

---

[۱] شوپنہار از مجنون گورکھپوری ص ۲۷

دار المصنفین کی نئی کتاب

تاریخ سندھ

(اردو مین سندھ کی پہلی جامع ومحققانہ تاریخ)

ہندوستان مین مسلمانون کا پہلا قافلہ سندھ مین اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہین قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہان کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے درودیوار سے اُن کے آثار نمایان ہین، لیکن اس کے باوجود اردو مین اسلامی سندھ کی کوئی مفصل ومحققانہ تاریخ نہین تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ مین یہ جامع ومحققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس مین اسلامی سندھ کی ایک ہزار سال کی سیاسی وعلمی وتمدنی تاریخ کی تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے،

ضخامت:- ۴۰۰ صفحے، قیمت روپئے،

مرتبہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ

منیجر

مآل و مشیّت

از

جناب صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب لکھنو

حقیقت و مجاز ظاہر و باطن، حق و باطل، ادب، مذہب اور فلسفہ کا مشترک موضوع رہا ہے اور ان مین فرق طریق تعبیر اور اسلوب بحث کا ہے، ادب کا نقطۂ نظر تخیلی، مذہب کا وجدانی اور فلسفہ کا تنقیدی و عقلی ہوتا ہے، ادب کی نگاہ تخیل، حجابِ مجاز مین حقیقتِ منتظر کی جھلک دیکھتی ہے، مذہب کے ہمہ گیر وجدان کو مخلوق مین خالق، کائناتِ عالم مین پروردگارِ عالم، اور ارض و سما مین فاطر السمٰوٰت والارض کا جلوہ نظر آتا ہے، فلسفہ اپنے سلوکِ حقیقت مین مذہب و ادب کا حریف نہین، اس کی راہ مذہب و ادب سے بالکل الگ ہی، فلسفہ کا آغاز و انجام، سرتاسر نمود حقیقت کی تفریق او صلبیت و نمایش کے امتیاز پر ہے، "کیا ہے اور کیا معلوم ہوتا ہے" فلسفہ کا سب سے پہلا اور سب سے آخر سوال ہے، اور سارا فلسفہ اسی اجمال کی تفصیل ہے، جس قدر ہم اپنے تجربہ اور تعلیم و ہدایت مین ترقی کرتے جاتے ہین، اصل و ظاہر کا فرق اور گہرا ہوتا جاتا ہے، اور نمود و حقیقت کی مثالین ہم کو قدم قدم پر ملتی ہین، زمین کا ظاہری سکون اور باطنی حرکت، ظاہری دوستی اور باطنی خود غرضی اور اس قبیل کے دیگر تفریقات سے انسان، تعلیم اور تجربہ کے ابتدائی مراحل ہی مین روشناس ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم کو اپنے مشاہدات مین تناقض نظر نہین آتا، ہم اُن کو اصلی اور صحیح تسلیم کرتے ہین، اور اُن مشاہدات کی اصلیت یا عدم اصلیت کا سوال ہی نہین پیدا ہوتا، اور نہ اس امر کی تنقید کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان مین سے ہر ایک مین کتنی اصلیت ہے،

کاش ہمارے تمام مشاہدات اس طرح غیر متناقض ہوتے اور اس لئے غور وخوض کی ضرورت ہی نہوتی، اگر ایسا ہوتا تو نہ فلسفہ کا وجود ہوتا، اور نہ غلطی کا لفظ کبھی شرمندہ معنی ہوتا، لیکن جب دو مشاہدے ہمارے حواس کی تصدیق کے باوجود، عقل سلیم کو متناقض نظرآتے ہین ہم دونون متناقض مشاہدون کی صحت بیک وقت اور بیک معنی باور نہین کرسکتے، اس لئے کہ عقل کہتی ہے، کہ دونون مین سے ایک ہی صحیح ہوسکتا ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونون کے دونون فریب نظر ہون، اور حقیقت کسی تیسری شے مین مرکوز ہو،

غرض کہ فلسفہ کی مسلسل سعی یہی ہے کہ ظواہر کو عقل مین چھان کر حقیقت کو ظواہر سے جدا کرے فلسفہ کی ساری تاریخ اسی چھان بین کی ایک طولانی حکایت ہے جس کو ہر فلسفی نے اپنے نقطۂ خیال سے بطرز نو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، کبھی کائنات عالم کی حقیقت، علت ومعلول کا سلسلہ بیان کیا جاتا ہے مگر پھر اس سلسلہ کے نا متناہی ہونے سے جو تناقض عائد ہوتا ہے، تو اس نظریہ سے گریز کیا جاتا ہے، کبھی حقیقت نظام اقدار مین جلوہ پذیر ہوتی ہے، اور جو تصور امل تعبیر ہوتا ہے، اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہین ہوتی کبھی ناامیدیون کی شورش بالآخر قنوطیت پر ختم ہوتی ہے، اور ہر چیز ہیچ نظرآنے لگتی ہو، لیکن یہ سب جیسا ہم نے پہلی صحبت مین کہین اشارہ کیا تھا، جزو ذہن کے جزو کائنات پر عمل کی ناقص مثالین ہین، عقل محض کی نظر مین جو کائنات عالم اسباب تھا، ارادہ محض کی نظر مین نظام امل اور جذبہ محض کی نظر مین الم آباد نظرآتا ہے، کل ذہن کی نظر مین کل حقیقت کیا ہوگی، یہ ہمارے فلسفۂ حیات کا اصل موضوع ہے، ذہن انسانی کے ہر سہ یک طرفہ فیصلون کے مقابلہ مین ذہن کے یکجائی سہ پہلو عمل کی مثال اگر تلاش کرنا ہو، تو تھوڑی دیر کے لئے فلسفہ کے روکھے پھیکے مضمون سے قطع نظر کرکے، ادب کے کسی شاہکار کو لیجئے اگر وہ نظم ہے تو ایک طرف سوائے الفاظ کے مجموعہ کے کیا ہے، اور عقل دوڑائی تو الفاظ کے اس مجموعہ کو صرف ونحو اور عروض کے بندھے ٹکے قواعد کے ماتحت پایا، لیکن کیا کسی شاہکار ادب کی یہ مکمل تعریف ہوگئی، کہ وہ صرف ونحو اور عروض کے مطابق الفاظ

کا مجموعہ ہے؟ کیا کسی شاہکار کی جان اس کا پلاٹ، محاکات اور وہ غرض وغایت نہین جو قواعد وعروض سب پر حاوی ہے، اور بسا اوقات اس کی قواعد شکنی بھی بھلی معلوم ہوتی ہے، اور نقادان فن سے جواز کا سند حاصل کرتی ہے، الفاظ کا در وبست، محاکات، پلاٹ اور تصنیف کی اصل غرض وغایت جو ان سب کا محرک اور نگران ہے، یہ سب چیزین مل کر شاہکار کا تصور پیدا کرتی ہین،

اسی طرح حقیقت کائنات صرف ہمارے محسوسات ومشاہدات کا نام نہین بلکہ یہ تمام وہ کچا مال مسالہ ہے، جن کی ترکیب سے بالآخر حقیقت بنے گی، قوانین فطرت، علت ومعلول کے علائق وتصورات کائنات کے اندر وہی مرتبہ رکھتے ہین، جو ادب مین صرف ونحو کے قواعد، حقیقت کی جان کائنات کا نظام ہے اور چونکہ ہر نظام اپنی آخری تحلیل مین مآلی ہوتا ہے، اس لئے مآل کل کائنات کی روح رواں ہے، ہر شے کے معنی اس کا مقصد ہے، اور بغیر کسی مقصد کے ہر شے بے معنی ہے، سلسلۂ اسباب محض بغیر کسی غایت کے مہمل نظر آتا ہے، انسان کے ذہن ہی کے مختلف اعمال لے لیجئے، ارادہ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی غرض وغایت سے وابستہ ہوتا ہی ہے، غور کیجئے تو عقل اور جذبہ کی ماہیت بھی مآلی ہے، حق وباطل کا امتیاز عقل کا مقصد وحید ہے، جو ہر عمل امتیاز مین پورا ہوتا ہے، لذت، مقصد وری اور الم مجبوری مقصد کا دوسرا نام ہے، حقیقت مین الم ہی ہم کو کائنات کی مآلی ماہیت سے روشناس کراتا ہے، اور ہم کو اپنے دلی ارادون اور اغراض کا پتہ کچھ کھو کر ہی چلتا ہے، کسی محبوب سے محبت اور اس کے جانب اپنے ارادون کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے چھن کر دوسرے کے قبضہ مین چلی جاتی ہے، غرضکہ ہم اپنے اغراض وغایات کا ابتدائی درس اپنی شکستون، ناامیدیون اور مایوسیون ہی کی زبان سے لیتے ہین،

لیکن کائنات عالم کا مآلی تصور، قنوطیت کا مرادف نہین ہے، رنج ومحن، ابتلاء وکشمکش حیات مآلی نظریہ کے رو سے گویا زینہ ہین کسی اور بلند ترین مقصد حیات تک پہنچنے کا، رنج والم ہی ہمارے دل مین امید کا چراغ روشن رکھتے ہین،

شہد کی مکھی، چیونٹی یا کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو لے لیجئے اس کی ترتیب عمل و تقسیم کار میں تاٰل شناسی کی جھلک نظر آئے گی، مخلوقات، ارتقار کے زینہ پر جس قدر اوپر چڑھتے جاتے ہیں، تاٰل اندیشی ان کے اعمال میں اور زیادہ کار فرما ہوتی جاتی ہے، ارتقار کے نیچے درجوں یعنی نباتات و جمادات کے نظا ہر بھی ترتیب و نظام سے خالی نہیں، اور ترتیب و نظام جہاں بھی پائے جائیں، سمجھ لیجئے کہ وہاں تاٰل کارفرما ہے، سارا فلسفہ کون و فساد عناصر کے ترتیب و انتشار ہی میں منحصر ہے،

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے ؟ انھی اجزار کا پریشاں ہونا

کونیات کی ساری تاریخ کا راس المال اسی نظم و ترتیب کا انکشاف ہے، آسمان پر بظاہر بے ترتیب بکھرے ہوئے تارے، زمین کے جا بجا منتشر ذرے، درخت کے پتوں کے بظاہر بے ربط رگ و ریشے ایک عامی و جاہل کی نظر میں مہمل و بے معنی ہوں لیکن ایک عارف حقیقت کے سامنے دفتر حقیقت کھول دیتے ہیں،

برگ درختانِ سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اس مقام پر اس امر کی تشریح مقصود نہیں کہ جو ترتیب و نظام ہم جمادات، نباتات، اور حیوانات میں دیکھتے ہیں اُن کے پس منظر کون تاٰل پوشیدہ ہیں ؟ یعنی تاٰل جمادی کیا ہے ؟ تاٰل نباتی کی کیا تعریف ہے، اور تاٰل حیوانی کی نوعیت کیا ہے ؟ جمادیات میں ظہورِ ترتیب، نظامِ شمسی میں ریاضوی نظم کا اشارہ کس تاٰل کی جانب ہے، نظامِ نباتی اور نظامِ حیوانی اپنی اپنی جگہ پر کس مخصوص تاٰل کی تفسیریں ہیں ؟ آیا ان تمام انتظامات اور بندوبست عالم کا تاٰل آخر استقرار وجود یا استحصال بقا ہے، یا کوئی دوسری قدر ؟ بیان اس سے بحث نہیں، اس مقام پر بتانا صرف اس قدر منظور ہے کہ

تال ایسی چیز نہین ہے کہ اس کو توڑ کر مو الیہ ثلاثہ پر تقسیم کر دیا گیا ہو اس لئے کہ یہ پھر ایک مصنوعی تحلیل کی مثال ہو گی جس کی دوسری مثالین کسی اور صحبت مین بیان کی جا چکی ہین، عالم کون و مکان ایک ہے اور کائنات عالم کی ہر شے ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہے، کہ اس کی تجزیہ صرف عقلی طور پر کی جا سکتی ہے، اور جو ہمارے خیال مین عقل کا ناقص ترین مصرف ہے، حقیقت مین وہ سب ایک ہین، اور تمام نظر ہی تمام حقیقت کو دیکھ سکتی ہے، تجریدی نظر، اجزاء، شئون، اور صفات مین پھنس کر رہ جاتی ہے، تال کائنات ایک کلی شے ہے، اس کا تجزیہ کیجئے گا تو وہ بھی مسخ ہو جائے گا،

چنانچہ ترتیب و تنظیم، تعلیل و تسبیب تال کے وہ خصوصیات اور نشانات ہین، جن سے ہم کو تال کا پتہ چلتا ہے، اور فہم انسانی کو تصور تال تک پہنچنے مین مدد ملتی ہے "مشیت" کے لفظ کا استعمال بحث کی اس منزل پر ابھی قبل از وقت ہے، اس مقام پر صرف یہ کہنا کافی ہوگا، کہ تال اندیشی حصول مقصد کے لئے ایسے تدابیر و اسباب اختیار کرتی ہے، جو اس مقصد تک پہنچنے مین ممد و معین ہوتے ہین، اور مناسب حال اسباب کا انتخاب ایک ایسے نظام کا خاکہ پیش کر دیتا ہے، کہ انسان اُسے دیکھ کر اور وجد کیا کرے، تال رسی چونکہ ایک صعودی عمل ہے، اور اس لئے میکانکی محاورہ مین گویا کشش ثقل کے قانون کی خلاف ورزی ہے، اس لئے وہ کوئی خوشگوار عمل نہین ہو سکتا، زینہ پر چڑھنا مشکل اور اس لئے تکلیف دہ لیکن اترنا آسان اور اس لئے خوشگوار ہوتا ہے، اس قیاس پر علم کی ہر بلندی پر رسائی مستلزم الم ہے، اور تال رسی جو مرادف ہے کائنات عالم کی حقیقت رسی سے، اس سے مستثنیٰ کس طرح ہو سکتی ہے، بلکہ جیسا اوپر کسی مقام پر اشارہ کیا گیا ہے، علم اور الم کے ڈانڈے اس قدر ملے ہوئے ہین، کہ فہم انسانی منزل علم تک الم کے گذرگاہ ہی مین ہو کر پہونچ سکتی ہے،

اس لحاظ سے، تال کے خصوصیات مین تنظیم و تعلیل کے اوپر الم کا اضافہ بھی کر لینا چاہئے اور حقیقت کائنات

س کے معنی رنج و محن بھی ضرور ہین لیکن تاَل کے تجزیہ سے ہم کو صرف یہ معلوم ہو سکا کہ کائنات
شے سے ہے اس کا نام تاَل ہے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ تاَل کا ہیولی کیا ہے، آیا
ری تحلیل مین کسی دوسری لطیف تر شے سے مرکب ہے، یا وہ عقل انسانی کی آخری حد
الم کا جزو لایتجزی ہے،

م نے تاَل کے خصوصیات تعلیل اور الم بیان کئے جن کا مستقر مسلمہ طور پر زمان ہے اس لئے
زمان ہی کی مستلزم شکلین ہین، اور کیفیات ذہن کیا الم کیا لذت، اپنی روانی کے لحاظ
مان ہی ہین، فرق اتنا ہے، کہ لذت شاید وقت سے اس قدر دور ہے کہ اس کو و قت
تا ہے، بخلاف اس کے الم وقت سے اس قدر قریب ہے، کہ وقت بہت بڑا معلوم ہوتا ہے
یان باتون مین ختم ہو جاتی ہین جشن و سرور کے کیفیات مین وقت گذرتا معلوم نہین
وغم کے عالم مین منٹ، گھنٹے اور گھنٹے دن معلوم ہوتے ہین، وقت کاٹے نہین کٹتا،
ے، وقت ساکت وقائم ہے، حرکت کا عدم شعور بالعموم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم
شے کے قلب مین داخل ہو جائین، چنانچہ چلتی ہوئی ٹرین ہم کو ساکت اور درخت بھاگتے ہوئے
زمین کی حرکت کا ہم کو تمام عمر احساس ہی نہین ہوتا، یہان تک کہ اس کا علم محض قیاسی
ے، اس لئے شبہہ ہوتا ہے کہ کیفیت الم شاید عین قلب زمان مین واقع ہے یا بالفاظ دیگر شاید خود قلب زمان ہے،
ن ہم نے الم کو شعور اور علم اور ابھی ابھی تاَل سے اس قدر وابستہ پایا تھا، کہ اس کو ان سب کے لئے ایک
نشان بلکہ دلیل راہ قرار دیا تھا، لیکن وقت کے ساتھ بھی الم کا تعلق ایسا ہی راسخ معلوم ہوتا ہے،
، علم، تاَل، اور زمان کے باہم دگر ہم جنس یا پھر ایک ہی شے کے مختلف نام ہونے کا شبہہ
ہے جس کی تحقیق کے لئے وقت کی ماہیت پر تبصرہ ضروری معلوم ہوتا ہے،

(باقی)

نامۂ نامی

از

جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی

عربی اور فارسی ادبیات مین فن انشا، ایک مخصوص ادبی شعبہ کی حیثیت رکھتا ہے، اسلامی حکومتون مین دارالانشا، کا ایک خاص محکمہ ہوتا تھا، جس مین بڑے بڑے قابل ادیبون اور انشا پردازون کا تقرر ہوا کرتا تھا، عربی اور ایرانی سلاطین کے دربارون مین اس محکمہ اور اس کے افسر کی ایک خاص سیاسی اہمیت ہوتی تھی جس کے نقوش قلم بعض اوقات ملکون اور سلطنتون کی قسمت کا فیصلہ کر دیا کرتے تھے، اگرچہ سیاسی اور ملکی ضرورتون نے اس فن کی بنیاد ڈالی تھی، اور عموماً اس سے یہی کام لیا جاتا تھا، لیکن آگے چل کر اس فن نے ادبی حیثیت اختیار کر لی، چنانچہ بڑے بڑے نامور انشا پردازون نے اس پر بکثرت کتابین لکھی ہین، جن مین اصلی مکاتیب یا ان کے نمونے درج کئے گئے ہین، اور مدت دراز تک یہ کتابین ہمارے مدارس مین داخل درس رہی ہین،

فارسی زبان کے فن انشا، مین ایران اور ہندوستان مین بکثرت مجموعے تیار کئے گئے، جن مین سے اکثر نے نصابی درجہ حاصل کر لیا ہے، ہندوستان کے عہد مغلیہ مین ایرانی اور ہندی ادیبون کے منشآت بکثرت ملتے ہین، لیکن اس عہد کے ابتدائی زمانے کی منشآت بہت کم کتابین ملتی ہین، اس اعتبار سے بابر اور ہمایون کے عہد مین لکھے ہوئے ایک مجموعۂ انشا کا ذکر

دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

غیاث الدین محمد بن ہمام الدین معروف بہ خوندمیر[۱] صاحب روضۃ الصفا میر خوند کے نواسے (بھانجی کے بیٹے) تاریخ حبیب السیر کے مصنف، فارسی کے مشہور مورخ، ادیب اور انشا پرداز تھے، ۸۷۹ھ میں ہرات میں پیدا ہوئے، ترک سلاطین اور مغلوں کے دربار میں میر منشی اور مورخ کی حیثیت سے ملازم رہے، آخر میں بابر اور ہمایون کے دربارون میں بڑی عزت سے بسر کی، اور ۹۴۲ھ میں بعمر ۷۰ سال دہلی میں وفات پائی، اور اپنی وصیت کے مطابق حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا اور حضرت خواجہ امیر خسرو قدس اللہ سرہما کے مزارات مقدسہ کے قریب مدفون ہوئے، متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں جن میں سے صرف بارہ[۲] کتابون کے نام تذکرون میں ملتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی تصانیف ہون گی، جن کا آج پتہ نہیں ملتا، ان کی تصنیف سے فن انشا میں ایک رسالہ ہے، جس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا، اس کا نام نامۂ نامی ہے، اب تک اس کے صرف تین قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں، ایک نسخہ کتبخانہ ملا فیروزہ (بمبئی) میں (جو اب کاما انسٹیٹیوٹ کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے) موجود ہے، اور ۱۰۱۶ھ کا لکھا ہوا ہے[۳]، دوسرا نسخہ انڈیا آفس کے کتبخانہ

۱؎ ان کے مفصل حالات کے لئے دیکھو، تحفہ سامی ص ۸۴ مطبوعہ ایران، لطائف نامۂ فخری ص ۱۰۲ مطبوعہ لاہور، تذکرۂ طاہر نصرآبادی ص ۴۰ مطبوعہ ایران، ہفت اقلیم (در فہرست کتبخانۂ کلیہ بمبئی ص ۱۱)؛ فہرست ادبیات فارسی از براؤن جلد ۳ ص ۴۳۴؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۲ ص ۸۹۹؛ فہرست مخطوطات فارسی از ریو جلد ۱ ص ۹۶ تا ص ۹۸، ج ۳ ص ۱۰۴۲؛ تاریخ الیٹ ج ۴ ص ۱۰۵

۲؎ انکی تصنیفات کے نام یہ ہیں (۱) مآثر الملوک (۲) خلاصۃ الاخبار (۳) مکارم الاخلاق (۴) دستور الوزراء (۵) اخبار الاخیار (۶) جواہر الاخبار (۷) منتخب تاریخ وصاف (۸) منتخب تاریخ وصاف (۹) نامۂ نامی (۱۰) روضۃ الصفا جلد ہفتم (۱۱) حبیب السیر (۱۲) قانون ہمایونی یا ہمایون نامہ، ان میں سے اب تک نمبر ۱۱ اور ۱۲ شائع ہو چکی ہیں، ان کی تصانیف کیلئے ملاحظہ ہو کشف الظنون ج ۱ ص ۱۴۹، ص ۴۷، ص ۴۹۲؛ تاریخ الیٹ ج ۴ ص ۱۴۳؛ تاریخ ادب فارسی ہمہ منقول از عبد الغنی ج ۱ ص ۹۶، ص ۱۴۳؛ ۳؎ فہرست کتبخانۂ ملا فیروزہ مرتبہ ریٹسک،

مین نمبر ۵۵-۲۰ پر ہے، تیسرا نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے خزانۂ مخطوطات مین موجود ہے، جو ۹۲ اوراق مین بخط نستعلیق ۱۱۰۰ھ کا مکتوبہ ہے،[1]

یہ کتاب نایاب ہے، انڈیا آفس کے کتبخانہ مین مخطوطہ کا ذکر کرتے ہوئے ایتھے نے بھی اس کو نایاب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا صرف واحد نسخہ انڈیا آفس مین ہے، (اس نے ایک اور ناقص نسخہ کا بھی ذکر کیا ہے جو نمبر ۲۱۶۱ پر موجود ہے) حالانکہ ان تین نسخون کے علاوہ ایک چوتھا نسخہ راقم کے کتبخانہ مین موجود ہے، جس پر یہان تبصرہ کرنا مقصود ہے،

ہمارے پاس "نامۂ نامی" کا جو مخطوطہ ہے، وہ ۱۱۰۹ھ کا لکھا ہوا، اور خط نسخ مین ہے، ۸۲ صفحات مین ۵"×۸ کی تقطیع پر ہے، اس مین سے اوراق ۱-۳-۳۲ اور آخر مین سے بعض صفحات غائب ہین، کتاب کا سنہ تصنیف کہین لکھا ہوا نہین ہے، لیکن دیباچہ مین مصنف نے ذکر کیا ہے، کہ اس کی تصنیف کے وقت ان کی عمر ۴۶ یا ۴۷ سال سے متجاوز تھی، سنہ ۹۴۲-۹۴۳ھ مین ان کی وفات ہوئی، اور ۶۰ سال کی عمر پائی، اس لحاظ سے اس کتاب کا سال تصنیف ۹۲۵ھ مین پڑتا ہے، سبب تالیف کے ذکر مین مصنف رقم طراز ہین:-

"بحسب مناسب ازلی، بلکہ بمحض ارادت لم یزلی، از مبادی سن رشد و تمیز تا غایت کہ سنین عمر عزیز از حدود اربعین و شش ہفت تجاوز کردہ ہموارہ بانشاء مولفات عزیب و املاءمنشآت بدیع مائل وراغب می بود، و ہرگاہ از شواغل جزئیل فراغتے دست می داد بسواد الفاظ و عبارات بلاغت آیات اشتغال می نمود، و این معنی بمثابہ عادت طبیعت این بی بضاعت شد کہ باوجودیکہ درین ایام بواسطۂ نوایب روزگار و تمنائے لیل و نہار عناکب نسیان بر مناکب فن انشا تنیدہ، و دیدۂ بینا اجزاء آن را جز بر طاق فراموشی ندیدہ بود این خیال در سر و این اندیشہ در خاطر پیدا شد کہ سطرے چند از نہانخانۂ ضمیر بر صفحۂ ظہور آرد، و الفاظے دل پسند در شیوۂ ترسل بر صحائف خاطر نگارد" (ورق ۴)

---

[1] اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء صفحہ ۸۶

اس کتاب کو مصنف نے ایک عنوان، نو سطر اور ایک تتمہ پہ تقسیم کیا ہے، پھر عنوان کی تقسیم دو لفظ میں کی ہے،

"لفظ اول دربیان ہدایت ظہور انشا، و صنعت کتابت و ذکر ابتدا مکاتیب باسماء اللہ تعالیٰ و بعضی دیگر از رسوم کتاب و الکحل"

اس عنوان کے ماتحت کتابت کی ابتدا اور خطوط اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرنے کی مختصر تلمیح از روے روایات اسلامی بیان کی ہے، اس مین جن کتابون کے حوالے دیئے ہین، ان کے نام یہ ہین:-

(۱) کتاب المعارف لابن قتیبہ

(۲) آداب الوزراء لاحمد بن جعفر بن شادان

(۳) شرح دیوان حضرت علیؓ از قاضی کمال الدین امیر حسین یزدی،

(۴) تاریخ حافظ آبرو،

لفظ دوم کا عنوان ہے، "دربیان ترتیب و تقسیم و تتمیم" یعنی طبقات انسانی کی ترتیب و تقسیم تین طبقات، اشرف، اوسط اور ادنیٰ مین کی ہے، اسی ترتیب سے ۱ تا ۴ سطر مین انھون نے ان طبقات کے لوگون کے نام سے مکاتیب کے نمونے لکھے ہین، اور سطر پنجم مین اعزہ اور احباب وغیرہ کے نام خطوط ہین، سطر ششم مین تہنیت نامے، اور سطر ہفتم مین تعزیت نامے لکھے ہین، سطر ہشتم مین فرامین اور سطر نہم مین متفرق رقعات ہین، تتمیم مین رباعیات، قطعات، معمیات، تواریخ اور وقائع درج ہین،

عنوان کے لفظ اول مین مصنف نے آداب مراسلت کے سلسلہ مین تین چیزون کی مختصر تاریخ لکھی ہے:-

(۱) خط کے آغاز مین خدا کا نام لکھنے کا رواج۔

(۲) خط کی تحریر پر خاک چھڑکنے کا رواج

(۳) خط کے آخر میں مہر لگانے کا رواج

مصنف تاریخ حافظ ابرو کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے خطوط کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام لکھا وہ بہمن بن اسفندیار تھا، پھر لکھا ہے، کہ اہل عرب قبل از اسلام مکاتیب کے شروع میں "باسمک اللھم" لکھا کرتے تھے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث بہ رسالت ہوئے تو آپ کے چار مکاتیب کے شروع میں باسمک اللھم لکھا گیا،[۱] اس کے بعد سورہ ھود نازل ہوئی تو اس آیت بسم اللہ مجرٖیھا و مرسٰھا کی بنا پر باسمک اللھم کی بجائے لفظ بسم اللہ لکھنے لگے، پھر سورہ بنی اسرائیل نازل ہوئی تو اس کی آیہ قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن پر سے الرحمٰن اور سورہ نمل کے نزول کے بعد آیۂ انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے تتبع میں رحیم کا اضافہ کرکے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے لگے،[۲] پھر ایک مدت کے بعد اس میں اختصار کیا گیا اور خطوط کی نوعیت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں کو خطوط کی پیشانی پر لکھنے لگے، مثلاً فتح ناموں میں ھوالفتاح، تعزیت ناموں میں ھوالقیوم لکھا جانے لگا، اور آگے چل کر اس قدر اختصار ہونے لگا کہ اکثر مکاتیب میں صرف لفظ "ھو" کے سوا کچھ بھی نہ لکھا جاتا تھا،

لفظ اما بعد، جو خطوط میں لکھا جاتا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کی اختراع کعب بن لوی بن غالب نے کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد عظام میں سے تھے،

---

[۱] مکاتیب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجموعہ حال ہی میں ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر حاجی محمد حمید اللہ صاحب حیدرآبادی نے شائع کیا ہے، اس میں جو مکاتیب چھپے ہیں ان میں سے صرف ایک مکتوب کے شروع میں باسمک اللھم لکھا ہوا ہے، (دیکھو مجموعہ الوثائق السیاسیہ ص۱۳۲) غیر مسلموں کے جواب اور عموماً صلح ناموں اور دستاویزوں کے شروع میں باسمک اللھم پایا جاتا ہے، [۲] یہ تمام تفصیل قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں مفصل طور پر لکھی ہے دیکھو اس کا صفحہ ۲۹۲ صح السفر

اسی طرح خط کے آخر میں کاتب کا نام لکھنے کی ایجاد حضرت اُبی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ نے کی تھی، جو کاتبان وحی میں سے تھے، خطوط پر خاک چھڑکنے کی جو رسم ہے، اس کا سبب یہ ہے، کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بن عبد اللہ انصاری حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا، اذا کتب احدکم فلیترّبہ فان التراب مبارک وھو انجح للحاجۃ[1]، مصنف آداب الوزراء کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان معجز بیان سے اطراف کے فرمان رواؤں کے نام مکاتیب لکھے گئے، تو نجاشی کے مکتوب پر خاک چھڑکی گئی اور وہ بادشاہ عالیجاہ اس کو پڑھنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہوا، اور کسریٰ کے خط پر اتفاق سے خاک نہیں چھڑکی گئی تھی، چنانچہ وہ اس سعادت سے محروم رہا، اگر یہ روایت اور جو حدیث اوپر نقل ہوئی ہے، صحیح ہوں تو حاجت برآری کیلئے خاک چھڑکنا لازم و واجب ہے"

اسی طرح خط کے آخر میں مہر لگانے کا طریقہ بھی بقول مصنف عہد اسلام میں رائج ہوا، چنانچہ ۶ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین اطراف کو دعوت اسلام کے خطوط لکھنے کی فرمائش کی تو بعض صحابہؓ نے جو قیصر روم اور بعض بادشاہوں کے درباروں میں جا چکے تھے، عرض کی کہ جس خط کے آخر میں مہر نہیں ہوتی، سلاطین اس کا اعتبار نہیں کرتے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسم شریف کی مہر بنوانے کا حکم فرمایا، اور انگشتری کے نگینہ پر محمد رسول اللہ[2] اور ایک روایت کے مطابق لا الٰہ الا اللہ کندہ کرایا، اس کے بعد سے خلفا اور سلاطین اسلام نے اس کا اتباع کیا،[3]

---

[1] النہایہ لابن اثیر میں یہ حدیث اسطرح منقول ہے، اترّبوا الکتاب فانہ انجح للحاجۃ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مکتوب بنام منذر بن ساوی کے عکس میں آخر میں جو مہر لگی ہے، اس میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہے (دیکھو مجموعۃ الوثائق ص ۱۱۱ کے بالمقابل عکس مذکور) [3] دیکھو صبح الاعشیٰ صفحات ۳۹۵، ۴۰۶، ۴۴۲، علی الترتیب، ما بعد خاتم اور تتریب کیلئے،

کتاب کے ضمن مین بعض مفید معلومات ملتی ہین، مثلاً ہر طبقہ کے لوگون کے القاب وآداب کے سلسلہ مین مصنف نے وزراء، مستوفی، صدر وغیرہ کے متعلق بعض ضروری معلومات مہیا کی ہین، مثلاً یہ کہ ان عہدون کی ابتدا کب سے ہوئی اُن عہدون کون کون مشاہیر فائز ہوئے، ساتھ ہی ان اصطلاحات کی تشریح بھی کر دی ہے، علاوہ ازین اس مین بعض تاریخی معلومات بھی ملتی ہین، اور اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے، مستشرق ایتھے کی رائے ہے کہ

"یہ کتاب بڑی تاریخی قدر وقیمت رکھتی ہے، اس لئے کہ اس کے اکثر خطوط اور رقعات وغیرہ جو خطوط نویسی کی مختلف اقسام کے نمونے ہین، مصنوعی اور فرضی نہین ہین، بلکہ خوندمیر کے زمانہ کے مستند دستاویز ہین"[1]

اس کتاب مین مصنف کا ایک مکتوب بنام بابر بادشاہ منقول ہے، جو بابر کے فرمان کے جواب مین لکھا گیا ہے، اور اپنے نہ آسکنے کا عذر پیش کرتے ہوئے، مصنف نے صحاح ستہ مین سے کسی کتاب کے ترجمہ کے چند اجزا، بابر کے نام پر معنون کر کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے، بہت ممکن ہے، کہ یہ کتاب جواہر الاخبار ہو جو نامۂ نامی سے بیشتر لکھی گئی ہو گی، اس خط سے جو مصنف کی انشا پردازی کا نمونہ ہے، بابر بادشاہ کے ساتھ ان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے ہم اس کو درج ذیل کرتے ہین :-

در جواب فرمان ہمایون حضرت بادشاہی خلافت پناہی
ظہیر الدین محمد بابر لازال محمد وحاً بلسان العبد والحر نوشتہ

فرمان ظفر نشانِ عالیجاہی منشور جہان مطاع شاہنشاہی

چون ہر زمان ز عاطفت کرد طلوع شد موجب افتخار دولت خواہی

---

[1] فہرست مخطوطات فارسیہ ص۱۱۱

نشانی بسان آفتاب تابان منور زاویۂ محقران خاکسار، و فرمانے مانند اختر نورافشان ضیابخش کاشانۂ بندگان بیمقدار از ذروۂ ہمایون و ساحۂ سعادت مقرون، از افق خلافت و سروری و مشرف عنایت و ذرہ پروری طلوع نمودہ، از پاے فتادہ ما کہ جز وصول بدان آستان اقبال آشیان مرادی ندارد، بدست مرحمت از خاک برداشت، و از دست رفتہ ما کہ غیر مدح و ثناے خدام درگاہ سپہر احتشام[1]، سر دولت بادج عزت افراشت،

رباعی:- فرمان ہمایون تو مانند مہر   بر اوج کرم نقاب بکشود ز چہر

برداشت بدست لطف از خاک مرا   ز انسان کہ ز فخر سود فرقم بسپہر

اشارتی کہ درباب توجہ این بے بضاعت بجانب درگاہ عالم پناہ مرقوم قلم عنایت گشتہ بود، چنان اقتضا نمود کہ فی الحال قدم از سر ساختہ بلکہ مدہوش وار سر از پای نشناختہ احرام طواف آن کعبۂ امانی و آمال بندد، ولیکن زنان پای در راہ نہادہ بعد از قطع بوادی مباعدت بسدۂ سنیہ بمنزل پیوندد، اما بواسطۂ بعضی از موانع کہ نواب کامیاب بعرض خواہند رسانید، روزی چند حصول آن مامول در حیز تاخیر افتاد، و ورقی چند کہ در ترجمۂ بعضی از صحاح اخبار سید اخیار صلی اللہ علیہ وسلم و آلہ الاطہار مرقوم خامۂ این شکستہ گشتہ، و عنوان آن از ذکر اسامی و القاب ملازمان بلند جناب در زیب و زینت از صحف سایر اہل فضل و شرف در گذشتہ، بنظر انور فرستاد، امید آنکہ آن اجزا بعین عنایت ملحوظ گردد و از حسن رعایت محظوظ، دام المطالع اعلیٰ و ارفع" (ورق ۲۰-۱۹)

مصنف نے ہر خط کے شروع میں ایک ایک رباعی لکھی ہے، جو اُن کے اپنے بیان کے مطابق خود انہی کی ایجاد اور انہی کے نتیجۂ فکر سے ہے، چند رباعیاں یہاں نقل کی جاتی ہیں،

۱- قاصد بر من نامۂ نامی آورد   نے نامہ کہ منشور گرامی آورد

---

[1] یہاں سے کوئی فقرہ مثل "کارے ندارد" غائب معلوم ہوتا ہے،

از بہر سرافرازی ارباب نیاز — بے شبہ نشان دوستکا می آورد

۲۔ آمد مرغی سفید از گلشن یار — مکتوب بیالش خطی از مشک تتار
مضمونش آنکہ باز اقبال آثار — شد صید ہمای بخت آن شیر شکار

۳۔ ای گشتہ کیست قلمت خوش رفتار — طے کردہ بساط نامہ را شوق آثار
بنمود چو آن نامۂ نامی دیدار — کم گشت غم ہجر تو از دل بسیار

۴۔ از طرف چمن نسیم اقبال وزید — وز گلبن امید گل لطف دمید
یعنی کہ ز حسن طالع و بخت سعید — پروانۂ التفات عام تو رسید

۵۔ آن نامہ کہ بود غیرت مشک ختن — پروانہ اقبال رسانید بمن
بکشود در بر دی سینہ ابواب سرور — بزدود ز آئینہ دل زنگ حزن

ان اشعار سے مصنف کی قدرت شعر گوئی کا بھی اندازہ ہوتا ہے،

انعام فرحت

فرحت میموریل پرائز

۱۔ یہ مقابلہ کل ہند حیثیت کا ہوگا، انعام کی صورت پانچ سو روپیہ نقد ہوگی،

(۲) ۱۹۴۷ء کے دوران میں جو کتابیں اردو ادب کی طبع ہوں وہ پیش ہوسکیں گی،

(۳) انعام کا تصفیہ ایک کمیٹی کریگی جو ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی اور مولوی فضل الرحمن صاحب پر مشتمل ہوگی، اس کمیٹی کے معتمد ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب ہوں گے،

(نوٹ) انعامی مقابلہ کیلئے کتب یا مسودات براہ راست ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب کے پاس باغ تابخ، خیریت آباد حیدرآباد دکن کے پتہ سے بھیجنے چاہئیں، نیز اسی پتہ سے فرحت میموریل پرائز کے تفصیلی قواعد بھی طلب کئے جاسکتے

اسلامی نظریۂ اجتماع

از

مولوی حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی پٹھان کوٹ

(۳)

انسان کو دو قسم کی ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں، مادّی اور روحانی لیکن انسان کی عجلت پسندی اور غرض پرستی ہمیشہ مادّی ضرورتوں کو روحانی ضرورتوں پر ترجیح دیتی رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف اسی نقطۂ نظر کے تحت آج تک انسانی وحدتیں (یونٹیز) وجود میں آتی رہی ہیں، انبیاء و رسل اور اُن کے سچے تبعین کے سوا کسی نے ثانی الذکر ضرورتوں کا احساس نہیں کیا، اور ظاہر ہے کہ مادی ضرورتوں کا احساس جب حد اعتدال سے بڑھ جائے، یہاں تک کہ روحانی احساس اور اخلاقی تقاضے اس میں گم ہو کر رہ جائیں یا مادی ضرورتیں ثانی الذکر احساس پر غالب آجائیں تو اس حالت کو قرآن حکیم نے ہوائے نفس اور شہوات سے تعبیر کیا ہے،

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي	اے نبی! اگر آپ یہود و نصاریٰ کی مادہ
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ	پرستانہ خواہشات کی پیروی کریں گے،
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ	تو خدا کے مقابلہ میں آپ کا کوئی اور
(بقرہ)	مددگار نہ ہوگا،
فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	ان کے بعد ایسے نالائق خلف پیدا ہوئے

اضاعوا الصلوٰة واتبعوا	جنھون نے فریضہ نماز (روحانیات) کو
الشھوٰت ۰	چھوڑ دیا، اور شہوانی خواہشات (مادیات)
(مریم)	کے پیچھے پڑ گئے،
فخلف من بعدھم خلف	ان کے بعد ایسے لوگ کتاب اللہ
ورثوا الکتاب یاخذون	کے وارث بنے جو متاعِ دنیا پر
عرض ھذا الادنیٰ ویقولون	ٹوٹنے لگے اور دعویٰ یہ کہ ہمین ضرور
سیغفر لنا ۰ (اعراف)	بخش دیا جائے گا،

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اوس نے مادیات اور روحانیات مین توازن قائم کرنا، اور اس کے فلسفۂ اجتماع کے تمام اجزار سیاست و عمرانیت، اقتصاد و معیشت، تہذیب و تمدن اور مذہب و روحانیت باہم اس طرح مربوط ہین، کہ اُن مین سے ہر ایک کا اپنی جگہ پر قائم رہنا امن عالم کے لئے ازبس لازمی ہے، اور اگر اس نظام حیات کی کوئی کڑی اپنی جگہ سے ہل جائے، تو پوری انسانی زندگی مین اختلال و فساد کا رونما ہونا ضروری ہے،

لو اتبع الحق اھوائھم لفسدت	اگر حق (خدائی نظام حیات) اُن کی
السمٰوٰت والارض ومن	خواہشات اور خود ساختہ رسم و رواج
فیھن ۰	کا تابع ہو جائے تو ساری کائنات
(مومنون)	کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے،

انبیاء و رسل کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے منتشر اجزار مین از سر نو ربط نظم پیدا کرین اور انسانون کو افراط و تفریط کی راہون سے ہٹا کر نقطۂ عدل پر کھڑا کر دین،

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت	اور ہم نے رسولون کو بین اور واضح دلائل

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ — اور اُن کے ہمراہ کتاب کے ساتھ بھیجا،

لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ؕ — اور میزان بھی اُتاری تاکہ انسان صراطِ

(حدید) — مستقیم پر قائم ہوجائیں،

بلکہ اسلام میں مقصود بالذات اِس عالمِ رنگ و بو سے ورا الورٰی چند مابعد الطبعیاتی حقائق ہیں جن کی تکمیل کے لئے عالمِ مادّی محض واسطہ ہے، بالکل اس طرح کہ ایک معمار کو مکان کی تعمیر کے لئے چند مخصوص اوزار کی ضرورت ہو، اور یہ اوزار اصل مقصد کے لئے محض ذریعہ ہیں، اور خود مقصود بالذات نہیں، اب ظاہر ہے کہ مقصود بالعرض کو مقصود بالذات تصور کر لینے سے اجزاے حیات میں انتشار پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام اس بے ترتیبی اور بدنظمی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا، اور اس بنا پر وہ اقوامِ حاضرہ کے مادہ پرستانہ مناہج وطرق کی نہایت شدّت سے مخالفت کرتا ہے، اور اُن کی جد وجہد حیات کو ضلالت وگمراہی قرار دیتا ہے،

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا — کیا ہم آپ کو اُن لوگوں کی حقیقت

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ — بتائیں، جو زندگی کی جد وجہد میں خسارہ

الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ — اُٹھا رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں، کہ جن

يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ؕ — کی سعی وکوشش صرف مادّی مقاصد

(کہف) — میں گم ہوکر رہ گئی ہے، اور وہ یہی

سمجھ رہے ہیں، کہ ہم کامیابی کی منزل پر پہنچ رہے ہیں

اور صرف اسی پر بس نہیں، بلکہ قرآن کریم اُن کے منافیِ فطرت عزائم کے ہلاکت انگیز نتائج سے اُن کو متنبہ کرتا ہے،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ — کتنی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے پروردگار

اَمۡرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبۡنٰهَا	اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی پس
حِسَابًا شَدِیۡدًا وَّعَذَّبۡنٰهَا	ہم نے اُن کا سخت محاسبہ کیا، اور اُن کو
عَذَابًا نُّکۡرًا ۝ (طلاق)	خطرناک عذاب مین ڈالا،
وَکَذٰلِکَ اَخۡذُ رَبِّکَ اِذَاۤ اَخَذَ	آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہے جب کہ وہ
الۡقُرٰی وَهِیَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ	ظالم بستیون کو پکڑتا ہے اس کی پکڑ
اَلِیۡمٌ شَدِیۡدٌ ۝ (هود)	دردناک اور بہت سخت ہے،

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھدینا ہی ظلم کہلاتا ہے، اور قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ بات اُبھری ہوئی نظر آتی ہے، کہ اقوام عالم کی تباہی و بربادی کا سبب تنہا ظلم ہی کو قرار دیا گیا ہے،

وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا	ہم نے اُن قومون پر ظلم نہین کیا، بلکہ
اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ (نحل)	وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتی رہین،

سیاست و معیشت اور اخلاق و تمدن کے قوانین طبعی مین شہوات نفسانی کو اس طرح داخل کر دینا کہ ان قوانین کا اصل منشا کالعدم ہو کر رہ جائے، ظلم کے مفہوم مین داخل ہے، مسلمان کی نگاہ اولین اس عالم رنگ و بو کی رعنائیون سے آگے نکل کر ایک دوسرے عالم جاودانی کا مشاہدہ کرتی ہے، اور مرد مومن کے لئے دنیاوی لذات و شہوات مین الجھنا اس کی حقیقی موت ہے، نسلیت، وطنیت، قومیت اور معاشی تقاضے اس کی راہ مین حائل نہین ہو سکتے، بلکہ اس کی جدوجہد کا نقطۂ مرکز انسانیت کبریٰ کا منتہائے کمال ہے،

عقل خود بین دگر و عقل جہان بین دگر است
بال بلبل دگر و بازوے شاہین دگر است

دنیا کی غلاظتوں اور جیم کی راحتوں کے لئے لڑنا دوسری قوموں کا شعار ہے، اور مسلمان اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتا، بلکہ وہ زخارفِ دنیوی اور جاہ و اقتدار کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی اپنی شانِ استغناء کے خلاف تصور کرتا ہے، اور اس کا فقر غیور دنیا کی ہر چیز سے اسے بے نیاز رکھتا ہے،

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا	ہم نے اہل کفر کو دنیا وی زیب و زینت
بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ	کے جو مختلف النوع سامان دے رکھے
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ	ہیں، اے نبی آپ ان کی جانب نظر اٹھا
وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝	کر بھی نہ دیکھیں، ان چیزوں کے ذریعہ
(طٰہٰ)	ہم ان کا امتحان لینا چاہتے ہیں، آپ
	کے لئے آپ کے پروردگار کا رزق ہی

(بہتر اور باقی رہنے والا ہے)

مگر اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے نظرِ حق شناس اور طبع ذوق آشنا کی ضرورت ہے، یہ مادہ پرست دنیا اس بادۂ رنگین کی سرمستیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی ؎

ذوقِ این بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

اقوامِ حاضرہ کا جہاد قومی اور جذبِ ملی وطنیت کی چار دیواری میں محدود اور قوم و نسل کے علائق سے بندھا ہوا ہے، یا ان کے پیٹ کی کمینہ خواہشات انہیں جنگ و قتال پر آمادہ کرتی ہیں، بلکہ وطن، نسل، ثقافت، معاشی تقاضے اور اس قسم کے مادی اور عارضی تصورات ہی اُن کی ہیأت ترکیبیہ اور اجتماع و مدنیت کی تخلیق کرتے ہیں، مگر مسلمان ان چیزوں میں سے کسی کے لئے اپنے اندر کشش محسوس نہیں کرتا، اس کی قومیت کی بنا، وطنیت، قومیت، نسل اور معیشت کا صنم باطل نہیں بلکہ نظریۂ توحید و رسالت ہے،

اندر سالت در جہان تکوین ما　　　از رسالت دینِ ما ایمانِ ما

مسکن یار است شہرِ یارِ من　　　پیشِ عاشق این بود حب الوطن　(اقبال)

اس بنا پر مسلمان کا جہاد ملی بھی دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے، مادی ضرورتوں کا احساس اُسے ہرگز جہاد و قتال پر آمادہ نہیں کرتا، اسے اگر اقتدار حکومت کی ضرورت ہے، تو صرف اس لئے کہ اس کے ذریعہ وہ دینی مقاصد کو بروے کار لاسکتا ہے، ورنہ حصولِ اقتدار بھی اس کے نزدیک صنم باطل بن کر رہ جاتا ہے،

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي	اہلِ ایمان صرف اللہ کی راہ میں لڑتے
سَبِيلِ اللهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا	ہیں، اور اہلِ کفر شیطان کی راہ
يقاتِلون فی سبیل الطاغوت (آیہ)	میں،

عن ابی موسیٰ قال جاءَ	ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے
رجل النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم فقال	عرض کیا، یا رسول اللہ ہم میں کچھ لوگ
یا رسُول فان احدنا یقاتل	غضب و انتقام اور کچھ دوسرے قومی
غضباً ویُقاتِل حمیۃ فقالَ	یا ملکی عصبیت کے لئے لڑتے ہیں، فرمایا
مَنْ قاتَلَ لِتکونَ کلمۃ اللہ	جو اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے جہاد کرے گا
ھی العُلیاء فھو فی سبیل اللہ	صرف اسی کا جہاد، جہاد فی سبیل اللہ
(بخاری)	متصور ہوگا،

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے اس آیت "قاتلوا حتی لا تکون فتنۃ" کی تفسیر دریافت کی گئی، تو آپ نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں فتنہ" کا مفہوم و مصداق بیان فرمایا،

انما کان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقاتل	حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین

المشرکین وکان الدخول فی	سے اس لئے جہاد کرتے تھے، کہ مشرکین
دینھم فتنۃ ولیس کقتالکم	کے دین میں داخل ہونا فتنہ تھا، اور
علی الملک۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری طرح ملک
(بخاری)	کی خاطر نہیں لڑتے تھے،

غرض وطن ہو یا قوم ونسل ہو یا قبیلہ خود ساختہ شعار قومی ہو، یا داعیۂ معیشت، ان میں سے ہر چیز اسلام میں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے، اور اصل مقصد کے لئے محض آلۂ کار کے طور پر کام آسکتی ہے، اگر اسے رکن اوّل کی جگہ دیجائے اور اصل مقصد کو پیچھے ڈھکیل دیا جائے، تو اسلامی فلسفۂ اجتماع کی پوری عمارت متزلزل ہو کر رہ جائے گی، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر وہ چیز صنم باطل ہے جو اسے اصل مقصد سے ہٹا کر اپنی جانب پھیر لے،

مگر اس سلسلہ میں اقوام حاضرہ کے نقطہ ہائے نظر بالکل الگ ہیں، جو چیز ہماری نظر میں سب سے آخر میں جگہ پاتی ہے، وہ اُن کی نظر میں سب سے اوّل مقام رکھتی ہے، بلکہ اُن کی نگاہ میں ان حقیر مادی مقاصد کے سوا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں، اُن کے فلسفہ ہائے اجتماع میں اخلاقی نبود و اقدار کے لئے کوئی جگہ نہیں، وطنی نسلی، قبیلوی عصبیت، اور معاشی محرکات ان کی قومیتون کے بنیادی پتھر ہیں، مگر کون نہیں جانتا کہ یہی وہ چیزین ہیں، جو امن عالم کے لئے مستقل خطرہ بنی ہوئی ہیں، اور موجودہ عالمگیر شورش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں، کیونکہ یہی وہ تصورات ہیں، جو اخوتِ انسانی کو ہزارہا متضاد اور متخالف گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں، وطنیت کا اقتضاء یہ ہے کہ جغرافی حدبندیون کے اعتبار سے سیکڑون انسانی وحدتیں وجود میں آئیں، رنگ ونسل، رسم و رواج اور مخصوص تمدنی شعائر بھی اسی طرح نوع انسانی کو کئی متضاد قومیتون میں تقسیم کرتے ہیں، اور داعیاتِ معیشت کا بھی یہی حال ہے، کیونکہ ہر طبقے کا معاشی مفاد دوسرون سے نہ صرف الگ ہے

بلکہ اکثر حالات مین متصادم بھی ہوتا ہے،

غرض ان تمام داعیات کا ردعمل نفرت وغیرت، حقارت وتذلیل، تسلط و استیلاء، جلب دولت اور اقتصادی تفوق و برتری کا حصول ہے، اور چونکہ ہر ایسی قومیت مین یہ کینہ جذبات بڑی سرعت سے پرورش پا رہے ہین، اس لئے اس کا قدرتی نتیجہ انسانون کے ان متخالف گروہون مین باہم ہلاکت انگیز طبقاتی تصادم کی شکل مین رونما ہو رہا ہے، اور موجودہ شورش و بدامنی کا سبب یہی جذباتِ قومیت ہین، جو حریت و مساوات اور جمہوریت و ڈیموکریسی کے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن کر نوعِ انسانی کی مشکلات مین اضافہ کر رہے ہین،

نیز زمانہ حاضر کے نظریہ ہاے اجتماع چونکہ صرف مادی ضروریات کی پیداوار ہین، اور اُن کا وجود و بقا ان مادی احساسات کا تابع ہے، اس لئے اُن کو کوئی پائدار حیثیت حاصل نہین، بلکہ احوال وظروف کے پیمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے جاتے ہین، یہان تک کہ ان مادی احساسات کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم بھی ہو جاتے ہین، یہی وجہ ہے کہ اُن کے فلسفہ ہاے اجتماع کا کوئی معین دائرۂ عمل نہین، جو ان کے طرزِ اجتماع مین ربط و تسلسل پیدا کر سکے،

نیز وطنی، نسلی، ثقافتی اور معاشی قومیتین من کل الوجوہ باہم متغائر ہین، اور ان مین کوئی امر وجہ اشتراک نہین، ہر قومیت اپنے علیحدہ تشخص (جو اُسے ایک محدود خطہ ارضی مین بسنے یا لسانی اور معاشرتی خصوصیات یا رنگ و نسل کے علائق، یا معاشی مقتضیات کی وجہ سے حاصل ہے) کے تحفظ و بقا ہی کو زندگی کا آخری نصب العین تصور کرتی ہے، اور ہر اُس جد وجہد کو وہ اپنے لئے ذریعۂ نجات تصور کرتی ہے، جو ان ناپائدار احساسات کو اُبھارنے اور اُن عارضی قومیتون کی برتری کے لئے عمل مین لائی جائے، چنانچہ دورِ حاضر کی تمام قومیتون کا یہی حال ہے، ایسی حالت مین کوئی ہمہ گیر صداقت (یونیورسل ٹروتھ) اُن کے مدنظر نہین ہو سکتی، اور نہ ہی یہ قومیتین ان عالمگیر صداقتون، ا

انسانیتِ مطلقہ کے مقتضیات کی جانب توجہ دے سکتی ہین،

اسلام ایک ایسے طرزِ اجتماع و تمدن کا بانی ہے جس کی عمارت پائدار، مضبوط، اور مستقل بنیادون پر قائم ہے یعنی اسلام کا نظامِ اجتماع جن تصورات پر مبنی ہے، وہ ازلی اور ابدی حقائق ہین، کہ رنگ و نسل کے ناپائدار علائق، وطنیت کی مصنوعی حدبندیان اور معاشی تقاضے اُن پر اثر انداز نہین ہو سکتے، اور نہ ہی زمانہ کے تغیر و انقلاب کو ان مین کوئی دخل ہے،

اقوامِ حاضرہ کا نظامِ فکر اور دستورِ اخلاق خارجی حالات اور کائناتی تغیرات کے ساتھ جکڑا ہوا ہے، معاشرہ اور طرزِ اجتماع کی انقلابی حالتون کے ساتھ ساتھ ان کا فکر و ذہن بھی بدلتا چلا جاتا ہے، چنانچہ موجودہ مفکرین نے اس نظریہ کو مستند تسلیم کیا ہے، کہ دماغ ایک آلۂ خیال ہے، اور اس کی ہر داخلی کیفیت خارجی اثرات کا نتیجہ ہے، گویا اُن کے نزدیک ذہنی اور فکری ارتقاء کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی اندرونی قوتین بیرونی احوال و نتائج کی پابند اور تابع ہو جائین، چنانچہ ماہرِ حیاتیات ہربرٹ سپنسر نے اخلاقیات کی تعریف یہ کی ہے، کہ وہ کام اخلاقی ہے، جو انسان کی داخلی کیفیات کو خارجی احوال و ظروف پر منطبق کرنے مین مدد دے،

اس کا مطلب یہ ہو کہ انسانون کے خارجی حالات اگر عالمِ انسانی کو تباہی و بربادی کی طرف سے جا رہے ہون تو فکر و ذہن کی قوتین بھی ان حالات کے ساتھ مل کر تباہی کو قریب تر لانے مین مدد دین، تاکہ دماغ کی اس اطاعت شعاری کو اخلاقیات کے دائرہ مین موزون جگہ مل سکے،

اسلام کا نقطۂ نظر اس بارے مین اس کے بالکل برعکس ہے یعنی اسلام کے الہیاتی نظریے ایک مخصوص طرزِ تمدن اور دستورِ اخلاق کی تخلیق کرتے ہین، اور ان نظریات کی ارتقاء پذیر حرکت کے ساتھ ساتھ اجتماع و تمدن اور اخلاق کے دوائر بھی بدلتے جاتے ہین، یعنی فکر و ذہن کی ترقی حالتون کا اثر انسان کے ظاہری اعمال پر پڑتا ہے، اور ایمان و یقین مین جس قدر قوت و استحکام

پیدا ہوتا ہے اتنا ہی انسان کے اعمال مین حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوتی چلی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ایمان کو ہر جگہ عمل صالح سے مقدم رکھا ہے، اور ایمان باللہ کو پورے نظام فکر و عمل کے لئے مرکز و محور قرار دیا ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى	مرد ہو یا عورت جو بھی نیک کام کریگا
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً	بشرطیکہ وہ مومن ہو اس کی زندگی کو
طَيِّبَةً (آیہ)	ہم نفیس اور پاکیزہ کر دین گے،
عن سُفیان ابن عبد اللہ	راوی نے سوال کیا، یا رسول اللہ!
الثقفی قال قُلتُ یا رسُول اللہ	مجھے آپ اسلام مین کوئی ایسی بات
قل لی فی الاسلام شیئًا لا اسئل	بتائین کہ آپ کے بعد مجھے کسی دوسرے
عَنهُ احدًا بعدك قَالَ قل	سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے، فرمایا
آمنتُ باللہِ ثمّ استقیم	کہو آمنتُ باللہ "اور پھر اُس پر
(رواہ مسلم)	مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ،

غرض اسلام مین اجتماع کے تمام شعبے خواہ وہ خارجی ہون، مثلاً سیاست، معیشت اور معاشرت جن کا عام نام تمدن ہے یا داخلی ہون جیسے نظام تعلیم دستور اخلاق اور ادب و آرٹ جو تہذیب کے دائرہ مین آتے ہین، سب الٰہیاتی تصورات یعنی ایمان باللہ کے تابع ہین،

اعلان

خط و کتابت یا چندہ بھیجتے وقت مراسلہ یا کوپن پر نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں ورنہ تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر نہ عائد ہوگی،

منیجر

تلخیص و تبصرہ

ارتقا کا ایک نیا نظریہ

از

جناب خواجہ احمد فاروقی ایم۔ اے۔ لکچرار اینگلو عربک کالج دہلی

ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے فروغ پاتے ہی لامذہبیت کا سیلاب امڈ آیا، لوگ انسان کو محض "حیاتیاتی حادثہ" سمجھنے لگے، انسانی روح اور نیک و بد کی امتیازی قوت کا انکار عام ہو گیا، زندگی مقصد و مفہوم سے عاری سمجھی جانے لگی، اور متشککین کو یقین ہو گیا، کہ سائنس کی ضرب کاری سے اب مذہب جانبر نہین ہو سکتا،

لیکن مشہور ماہر حیاتیات Dr. Lecomte du Nouy نے حال مین ایک نیا نظریۂ ارتقا پیش کیا ہے، جس کی رو سے پرانے معتقدات میں پھر اگلی سی قوت اور توانائی پیدا ہو گئی ہے، ڈاکٹر لی کامتے دی نووے کا تعلق راک فلر انسٹی ٹیوٹ اور Pasteur انسٹی ٹیوٹ دونوں سے رہا ہے، اس کی کتاب تقدیر انسانی (Human Destiny) حال مین شائع ہوئی ہے، ذیل کے خیالات و نظریات اسی سے ماخوذ ہین،

ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے، کہ سائنس مکمل علم نہین ہے، اس مین غلطی کا امکان ہے،

اسی لئے ہم اس پر کامل بھروسہ نہیں کرسکتے، دنیا کی ہر چیز کے متعلق ہمارا علم نامکمل ہے، حد یہ ہے، کہ ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں، اور ہمارے آلات ان سے زیادہ ناقص، پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے، میدہ اور کالک کو اگر ملا یا جائے تو بھورے خاکستری رنگ کا ایک سفوف سا بن جاتا ہے، لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو صرف خوردبین ہی سے نظر آسکتا ہے، اس کو کچھ سیاہ اور سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے، اس کے مشاہدہ کے پیمانہ مین خاکستری سفوف کوئی چیز ہی نہیں، اسی طرح اس کائنات کے جتنے حقائق ہین، وہ سب اضافی حیثیت رکھتے ہین، لطیفہ یہ ہے کہ اس کائنات کا پیمانہ بھی ہماری سمجھ سے بالا تر ہے،

موجودات کی وسعت اور پہنائی پر غور کیجئے، اور پھر اس بات پر کہ سائینس نے انسان کو علم کے چند کھلونے دیدیئے ہین، لیکن وہ اپنے ذہنی افلاس کی وجہ سے ان ہی کو اصل سمجھتا ہے، حقیقتون پر پردے پڑے ہوئے ہین، اور انسان نے ان پردون کے نقش و نگار کو حقیقت سمجھ رکھا ہے، ہم جس کرہ پر رہتے ہین وہ ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰ برس پرانا ہے، اسی اسٹیج پر انسانی ارتقاء کا ڈرامہ کھیلا گیا ہے، لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ یہ پردہ کس طرح اٹھا، زندگی کس طرح شروع ہوئی، اور ریڑھ کی ہڈی والے جانور کس طرح پیدا ہوئے ؟ ہم اور آپ ان ہی جانورون کی اولاد بتائے جاتے ہین،

غرض ارتقا کا سارا افسانہ اسی قسم کے مستبعد اور بعید از قیاس اسرار سے معمور ہے مثلاً ارتقا مین ایک منزل وہ آتی ہے، جب زندگی نے پیدایش اور افزایش کا طریقہ بدل دیا، برس ہا برس تک نغزمائی خلیے الگ ہوتے رہے، ٹوٹتے رہے اور بڑھتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ ان کو دوامی زندگی حاصل ہے، لیکن دفعۃً اور پر اسرار طور پر ایک نیا طریقہ وجود مین آیا، جس کو افزایش کا جنسی طریقہ کہا جاسکتا ہے، کتنی عجیب بات ہے، کہ جنس کے ساتھ

ساتھ موت کو بھی زندگی میں دخور حاصل ہوگیا،

ارتقا کے متعلق یہ پانچ باتیں ایسی ہیں جن سے انکار ممکن نہیں،

(۱) زندگی بالکل سادہ اور آسان صورتوں میں شروع ہوئی،

(۲) رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ صورتیں وجود میں آئیں،

(۳) اس برسہا برس کے عمل کا نتیجہ انسان ہے جس کو عقل کی دولت عطا کی گئی ہے،

(۴) پھر انسان میں تجریدی Abstract خیالات پیدا ہوگئے،

(۵) اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں از خود اخلاقی اور روحانی خیالات رونما ہوگئے،

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ ہم نہیں بتلا سکتے، ان میں ایک بات کی بھی تشریح سائنس کے رو سے نہیں ہوسکتی، ناچار ہم نے کچھ مفروضات قائم کئے ہیں، کبھی کبھی فرضیہ قائم ہی کرنا پڑتا ہے، آئن سٹائن نے بارہ سے زیادہ مفروضے قائم کئے ہیں، لیکن اسی کی تحقیق کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا، کہ ہمیں جوہر کی قوت معلوم ہوئی، دونووے نے بھی مفروضہ قائم کیا ہے، وہ کہتا ہے، کہ ارتقا کی داستان میں بہت سے اخلاقی مقاصد پوشیدہ ہیں، یہ کائنات یوں ہی وجود میں نہیں آگئی، اس میں تخلیق، نازک کاری، اور چابک دستی کا پورا کمال جلوہ گر ہے، اب تک مادیین یہ کہتے تھے، کہ یہ جو کچھ ہوا، اتفاقی طور پر ہوا، ان کے نزدیک اتفاق کو ہر فانی چیز پر پوری دسترس حاصل ہے، لیکن دونووے کہتا ہے، انسان آزاد ہے، اس کو اختیار ہے، وہ اپنی عقل حیوانی کی پیروی کرے جس سے اس کو جسمانی یا مادی خوشی حاصل ہوتی ہے، یا ایک دوسرے قسم کے مقصد کی جستجو میں لگا رہے، اس دوسرے مقصد تک پہنچنے کے لئے اس کو اپنی حیوانی جبلتوں سے لڑنا پڑتا ہے، اس مقابلہ میں اس کو تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے، لیکن کچھ لوگ اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں، نیک و بد کی یہ تمیز اور عمل کا یہ اختیار صرف انسان کو دیا گیا ہے، بہت

سے لوگ پہلے راستہ اختیار کرتے ہین، اور بہت کم دوسرا، لیکن یہ تھوڑے ہی سے لوگ ہین جنھون نے جریدۂ عالم پر اپنا نام ثبت کر دیا ہے، اور ارتقا کے میدان مین کارہائے نمایان دکھلائے ہین، یہ غیر مقلد قسم کی اقلیت ایک ایسی ہستی کی پیروی کرتی ہے، جو نظر نہین آتی لیکن بے صداقت اور رحمت والی ہے،

پہاڑون کی چوٹیون کی برف پگھل پگھل کر آبشارون اور دریاؤن مین تبدیل ہو جاتی ہے، ان کا بہاؤ کشش ثقل کی وجہ سے، نیچے کی طرف کو ہوتا ہے، لیکن ارتقا مین زندگی کا بہاؤ اوپر کی طرف کو ہوتا ہے، اس مین بھی کشش کا ایسا ہی اصول کارفرما ہے، پہلے بے شکل مادہ تھا، اس کے بعد انسان وجود مین آیا، جس کے پاس عقل اور ضمیر کی دولت تھی، اس سے بڑا ثبوت زندگی کے مائل بہ فراز ہونے کا اور کیا ملے گا ؟

ارتقا کی بلندیان طے کرنے مین اتفاق کا پیرہن اس طرح چاک چاک ہوا ہے کہ بہت سے مالی مادہ پرستون کو بھی کسی نامعلوم قوت کا اعتراف کرنا پڑا، انھون نے اس کا نام خدا نہین رکھا "اتفاق شکن" Anti - Chance رکھا ہے،

.........ابرس پہلے جب انسان سوچنے کی قوت سے محروم تھا، زندگی صرف بقا کے خیال پر سہارا لئے ہوئے تھی، اس کے بعد کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے، جن کو نیک وبد کا فرق معلوم تھا، اور اس کی خاطر وہ اپنی جان بھی دے سکتے تھے،

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک غیبی آواز ان سے یہ کہہ رہی ہے،

اب تک تم نے پیدایش و خورش ہی سے تعلق رکھا، تم مار سکتے تھے، تم کھانے اور عورتون کو چرا سکتے تھے، صرف عقل حیوانی کی تقلید تمہاری زندگی کا مقصد تھا، لیکن اب تم ان جبلتون کے خلاف لڑوگے، تم قتل نہین کروگے، چوری نہین کروگے، تم اسی وقت

اطمینان سے سوؤگے، جب تم اپنے اوپر قابو پالوگے، تم تکلیف اٹھاؤگے، اپنی جان دوگے، لیکن اپنے نصب العین کو نہیں چھوڑوگے، اب تمہارا مقصد محض کھانا اور پینا نہیں ہے،

ارتقا کا خاتمہ انسان پر نہیں ہوا، وہ صرف ایک درمیانی منزل کو ظاہر کرتا ہے، جو ماضی و مستقبل کے بیچ میں ہے، مستقبل کا انسان تخریبی جذبات و ہیجانات سے بالکل آزاد ہوگا، جسم کی مسرتیں اسے ضرور حاصل ہوں گی، لیکن جسم کی اس پر حکمرانی نہیں ہوگی،

مستقبل کا ارتقا، اچھے لوگوں سے وابستہ ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ اچھا کیا ہے اور برا کیا، مادیین اچھے اور برے کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں، دونوئے نہ صرف ان کے وجود کا قائل ہے، بلکہ ان کی تعریف بھی کرتا ہے،

ارتقا کے دوران میں دو قسم کے ذی روح پائے گئے ہیں، اچھے اور برے، یا ارتقائی اور مطابقت پذیر، موخر الذکر نے ہمیشہ مصلحت کا خیال رکھا ہے، ضرورت کے وقت صلح کرلی ہے، یا اپنے آپ کو حالات اور ماحول کے مطابق بدل لیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ اس کے جانوروں کی ترقی بند ہوگئی، لیکن ارتقائی مخلوق نے اپنی آزادی اور تخریبی جذبات سے علیحدگی کو عزیز رکھا، یہ مخلوق ضدی اور باغی قسم کی ہوتی ہے، مطابقت پیدا کرنے کے بجائے اس کی نشو و نما کسی بہتر اور افضل صورت میں ہوجاتی ہے، ان مقاصد کے تضاد اور تصادم سے دونوئے نے اپنا نظریۂ خیر و شر مرتب کیا ہے،

انسان پہلے طبعی، کیمیاوی اور حیاتیاتی قوانین کا غلام تھا، اب وہ ناسمجھ ایکٹر کی طرح کام کرنا نہیں چاہتا، وہ ہر چیز کو سیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے، وہ جمالیاتی خیالات جو اس کے ذہن میں موج زن ہوتے ہیں، ان کی وہ صورت گری کرسکتا ہے، صرف اشتہا کی تسکین اس کا مقصد نہیں رہا،

انسان بھی بڑی حد تک حیوان ہی ہے، لیکن اس کے نومولود ضمیر کی انقلاب آفرین آواز نظام کہن میں ہلچل پیدا کر دیتی ہے، اور نئے نظام کی تخلیق میں مدد دیتی ہے، اس نئے نظام کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا اسے پورا حق حاصل ہے، خودی کی تکمیل کے معنی یہ ہیں کہ انسان نیک و بد میں پوری طرح امتیاز کر سکے، شر کو چھوڑ کر خیر کا راستہ اختیار کر سکے، انسانی عظمت کا معیار اور ارتقا کا مقصد یہی ہے، خیر، انسانی شخصیت کا احترام ہے، اور شر اس کی توہین،

دو نووے کے نزدیک فرد نوع سے زیادہ اہم ہے، اچھے آدمی کم ہیں، لیکن وہی ارتقا کے اصلی نمایندے ہیں، اور مستقبل کے روحانی طور پر مکمل انسانوں کے حقیقی پیشرو،

اس طرح کے لوگ کب پیدا ہوں گے؟ یہ گوہر مقصود کب حاصل ہوگا؟ کیا اس کے لئے پھر ۲۰ کھرب سالوں کی ضرورت ہے، دو نووے کہتا ہے، نہیں، اگر انسان اپنی ذہنی قوتوں سے کام لے تو وہ برسوں کی راہ منٹوں میں طے کر سکتا ہے، پرندوں کو اپنے پر پیدا کرنے میں صدیاں لگی تھیں، لیکن انسان نے تین نسلوں میں پرواز سیکھ لی، اب اس کے ہوش و خرد میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ وہ صد درجہ چھوٹی اور صد درجہ دور کی چیز کو دیکھ سکتا ہے، فاصلہ اب حلقہ بگوش ہے، اور وقت پابہ زنجیر،

بہت سے لوگ ہماری ایجادات و اختراعات کو تہذیب و تمدن کی نشانیاں سمجھتے ہیں، ہمارا مطمح نظر، انسانی آسایش کے بجائے، انسانیت کا احترام ہونا چاہئے، خرد اگر ضمیر کی ملامت سے ناآشنا ہے، تو وہ خیر و شر کے انتخاب میں غلطی کر سکتی ہے، وہ صلح جوئی، عافیت پسندی اور مطابقت پذیری کے لئے مضطرب ہوگی، وہ کبھی بغاوت نہیں کر سکتی، مقابلہ نہیں کر سکتی، خوب سے خوب تر کی جستجو نہیں کر سکتی، تنہا خرد، بڑی خطرناک چیز ہے، اسی نے ایٹم بم بنایا ہے، اخلاقی اقدار اور عقل محض کے درمیان کشمکش بھی اسی وجہ سے ہے،

بدقسمتی سے بہت سے لوگ اب بھی انسان کو زیادہ پرشکوہ قسم کا جانور سمجھتے ہیں، اسی لئے وہ ہمارے تمام مسائل کا حل حیوانی قسم کا تجویز کرتے ہیں، سیاست کی دنیا میں وہ انسانوں کی جمعیت بندی کیڑوں کی طرح کرنا چاہتے ہیں، ان کے یہاں فرد کا مرتبہ زنبور یہ نر سے زیادہ نہیں ہے، اس کی خدمات لیں آمرانہ نظام میں مل جائیں گی،

ہمیں انسانی شخصیت کا احترام کرنا چاہیئے، انسان ارتقا کا نمایندہ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے اشرف ہے، ارتقا کے شروع میں ترقی صرف اللہ تعالیٰ پر منحصر تھی، لیکن اب خدا نے انسان کو ضمیر کی روشنی اور ارادہ کی آزادی عطا فرمائی ہے، اس لئے ارتقا میں اب انسان کی کوششوں کو بھی دخل ہے،

یہ آزادی جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اتنی حقیقی اور اصلی ہے کہ ان حدود میں مطلق کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی، جس قادر مطلق نے اس کائنات کو بنایا ہے، وہی اپنے قوانین کو سختی سے رائج کرتا ہے، ہمیں فطرت میں جو بے ربطی نظر آتی ہے، وہ دراصل ہماری نظر کا قصور ہے، ابھی ہمیں بہت سی منزلیں طے کرنا ہیں،

سطور بالا میں خدا کا اکثر ذکر آیا ہے، اس سائنسی دور میں ایک عام آدمی اپنی معمولی عقل سے خدا کا تصور کرنا چاہتا ہے، لیکن نہیں کرسکتا، لیکن کیا ایک برقیہ electron کا تصور ممکن ہے ؟ کسی سائنسدان سے پوچھئے وہ یہی کہے گا کہ برقیہ کا تصور نا ممکن ہے، اسی طرح برقیہ کی تصویر بنانا بھی ممکن نہیں ہے،

ایک سوال اور ہے، فرد کس طرح مستقبل کے ارتقا میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، اس کا جواب صرف تعلیم اور ہمارے اسکول دے سکتے ہیں، یہ انسانی ارتقا کے سب سے مفید ذریعے ہیں،

ارتقا کا اصول بلندی کے لئے جد و جہد پر مائل کرتا ہے، یہ جد و جہد جاری ہے، فرق یہ ہے کہ اب

لڑائی، مادیت کے محاذ سے ہٹ کر، روحانیت کے محاذ پر شروع ہوگئی ہے، ایزدی محبت کا نور ہمارے سینہ مین جاگزین ہے، ہم چاہین تو اسے قائم رکھین، چاہین تو ختم کردین، لیکن یہ بڑی دولت ہے، اور اس کے قائم رکھنے ہی مین ارتقا کا راز پوشیدہ ہے،

حیاتِ شبلیؒ

(حصۂ اوّل)

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری نہین ہے، بلکہ اس مین ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس کے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندستان کے مسلمانون کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، ادبی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصّل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ واودھ کے مسلمانون کی علمی وتعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش وجستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہین ضمناً ان تعلیمی ادارون کی جن سے مولنا کا تعلق رہا ہے مجمل تاریخ بھی آگئی ہے، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحے ہی، جس مین دارالمصنفین، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اور شبلی کالج کی عمارتون کے تیرہ ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہین، کاغذ اور طباعت اعلیٰ،

قیمت:۔ غیر مجلد، علاوہ محصول ڈاک، صرف آٹھ روپیہ، مجلد للعہ

استفسار و جواب

طبلہ اور ستار کی ایجاد اور امیر خسرو

میر مقصود علی خان برمکان میر مظہر علی خان صاحب
ایڈوکیٹ کٹل منڈی حیدرآباد دکن

ایک واقعہ جو امیر خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس کی بابت آپ کی تحقیق دریافت کرنی ہے، اسی لئے یہ عریضہ آپ کی خدمت مین روانہ کیا گیا ہے آپ اگر مناسب سمجھین، تو معارف کے ذریعہ جواب دین تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے مستفید ہون،

کہا جاتا ہے کہ ستار امیر خسرو کی ایجاد ہے امیر خسرو کا پایہ بحیثیت ایک ولی کامل کے مسلم ہے، پھر یہ سمجھ مین نہین آتا کہ وہ ستار جو غالباً از قسم مزامیر ہے اس کی ایجاد کرکے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عمل کرین گے،

"آج کل" مورخہ یکم دسمبر ۱۹۷۶ء میں شاہد احمد صاحب (مدیر ساقی) نے اپنے مضمون ہندوستانی موسیقی کے ساز مین لکھا ہے، کہ "ستار" طبلہ" اور "ڈھولک" سب امیر خسرو کی ایجادین ہین، بہرحال اُن کی بھی (یعنی طبلہ اور ڈھولک) کی تحقیق مطلوب ہے،

معارف:- گرامی نامہ کا جواب کسی قدر تاخیر سے دے رہا ہون، وطن سے واپسی مین دیر ہوئی امید ہے کہ معذرت قبول فرمائین گے، "آجکل" ہمارے یہان نہین آتا، وہ مضمون میری نظر سے نہین گذرا، بہرحال آپ کا استفسار ان آلات غنا کی ایجاد کے متعلق ہے، جواباً عرض ہے، کہ ستار طبلہ وغیرہ کو

امیر خسرو کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ آلات غنا عہد قدیم سے رائج ہین، اُن کا ذکر تفصیل کو زبور مین آیا ہے، ایک دو اقتباسات ذیل مین پیش ہین،

خدا کی حمد کرنے کی نصیحت مین ہے :-

"سر باندھ کے ایک گیت گاؤ، اور طبلہ اور خوش آواز بربط مین سمیت بجاؤ،

(زبور ۸۱، آیت ۲)

اسی طرح ہے :-

"وے اس کے نام کی ستایش کرتے ہوے ناچین، وے طبل اور بربط بجاتے ہوئے اس کی ثناخوانی کرین، (زبور ۱۴۹، آیت ۳)

پھر آگے چل کر ہے :-

"اس کی ستایش کرو، اس کی بزرگی کی کثرت کے مطابق اس کی ستایش کرو، قرنائی پھونکتے ہوے اس کی ستایش کرو، بین اور بربط چھیڑتے ہوے اس کی ستایش کرو، طبلہ بجاتے ہوے اور ناچتے ہوئے اس کی ستایش کرو، تارون والے سازون اور بانسریون کو بجاتے ہوئے اس کی ستایش کرو، بلند آواز جھانجھ بجا کے اس کی ستایش کرو، خوش آواز جھانجھ بجا بجا کے اس کی ستایش کرو، ہر ایک چیز جو سانس لیتی ہے خداوند کی ستایش کرے، خداوند کی ستایش کرو، (زبور ۱۵۰، آیات ۱ تا ۶)

زبور کی مذکورۂ بالا آیتین آلات غنا مین سے طبلہ اور ستار (تار والے ساز) کی قدامت پر شاہد ہین، اور اب اس باب مین کسی دوسری شہادت کی چندان ضرورت نہین، اُمید ہے کہ جناب کو تشفی حاصل ہو گی،

ہان امیر خسرو کی طرف موسیقی کے چند راگ اور راگنیون کی ایجاد کا انتساب صحیح ہے، وہ مشہور

چشتی تھے، خواجگان چشت کے یہان سماع چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، خواجہ نظام الدین اولیا کو جو تعلق خاطر امیر خسرو سے تھا، وہ معلوم ہے، امیر خسرو نے تصوف مین جو مدارج طے کئے وہ اسی بارگاہ کا فیض تھا، اُن کے شعرون مین جو سوز و گداز تھا، اور جیسی بجلیان کوندتی تھین، وہ اسی وادی مین کی شہ پاریان تھین، اس لئے امیر خسرو کی طرف موسیقی کے راگون کا انتساب اُن کے فقر و تصوف کے منافی نہین ہے، اُن کا یہی کمال تھا جس سے اُن کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا، اُن کے گرویدہ ہوئے، اور وفات کے بعد اپنے ہی پاس اُن کو جگہ دینے کی وصیت فرمائی، رحمہا اللہ تعالیٰ،

امیر خسرو کے راگ کے ایجاد کرنے کا تذکرہ ابو الفضل نے آئین اکبری مین کیا ہے، والسلام، "م"

میرزا کامران اور اس کی اولاد

خان رحمت اللہ عبد الرشید خان | ۱۔ مرزا یا شاہزادہ کامران کس قوم سے تھا،
لیدر برچٹ انڈرسن روڈ کوئٹہ | ۲۔ کامران خاص کر کس نسل سے تھا جس نسل سے

کامران تھا، اس کا اصلی وطن کہان تھا،

۳۔ کامران کے کتنے لڑکے تھے، لڑکے ہوئے بھی ہین یا نہین، ان کے نام اگر معلوم ہون تو بتلائین،

۴۔ موجودہ زمانہ مین اگر ایک خاندان اپنے کو شاہزادہ خاندان اور سردارزادہ خاندان کہے جو کہ ہو بھی کامران کی اولاد سے، تو کیا وہ شاہزادہ یا سردارزادہ کہے جا سکتے ہین، کیونکہ یہان میرے افغان دوست مجھ سے اور جو لوگ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہین، یہ کہا کرتے ہین کہ بابا ان کی شاہزادگی اور سردارزادگی تو اُن کے بزرگون کے ساتھ ختم ہوگئی، اب تم لوگ کیون اسی کو گائے جاتے ہو، اب تو تم صرف ہماری طرح کے سادہ لوگ ہو، نہ خان رہے، نہ سردار،

اب آپ ہی بتلا دین کہ کیا واقعی وہ بچارے اپنے دادے یا پردادے کی طرح شاہزادہ یا سردار یا سردار زادہ کا لقب نہین رکھ سکتے،

مین ان لوگون سے کہا کرتا ہون کہ تم افغان بہت ہی ...."

آپ از راہِ مہربانی کامران کا حال یعنی میرے استفسار کا جواب ضرور معارف کی قریبی اشاعت مین دیوین، از حد مہربانی ہوگی، جناب نے دین کی تو بہت کچھ خدمت کی، اب ایک ناچیز کی اس درخواست کو بھی جو تاریخی ہے، قبول فرماوین، اور جواب معارف مین شائع فرما دین،

آپ کی اس نوازش کا تاحیات شکر گذار رہون گا، والسلام

معارف:۔ آپکے دونون خط ملے مصروفیتون کی وجہ سے فوراً جواب نہ دیسکا،

(۱ و ۲) آپ کا اصرار ہے کہ آپکے استفسار و جواب کو معارف مین شائع کیا جائے آپکے ارشاد کی تعمیل مین یہ سطرین چھاپ دی جاتی ہین، کامران بابر کا لڑکا تھا ۹۱۴ھ یا ۹۱۵ھ مین پیدا ہوا بابر نامہ مین ایک سے زیادہ موقعون پر اس کا ذکر آیا ہے (بابر نامہ ص ۲۹۵ وغیرہ) وہ بابر کے ہمرکاب رہتا تھا، بابر نے اپنی مثنوی مبین اس کی تعلیم کے لئے لکھی تھی، (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۴۳) نیز اس نے کامران کے نام مختلف خطوط لکھے، اور اپنی تزک کا ایک نسخہ اس کو بھیجا، شاہزادگی کے ساتھ تیر اندازی مین کمال حاصل تھا ۹۳۲ھ مین ولایت کابل و قندھار کی گورنری پر مامور تھا، پھر ملتان بھی اس کے زیر حکومت آیا، (ہمایون نامہ ص ۹، اکبر نامہ ج ۱ ص ۹۲، مآثر رحیمی ج ۲ ص ۳۰۳)

بابر کی وفات کے بعد ہمایون اور کامران مین تخت نشینی کے لئے جو کشمکش رہی، وہ تاریخ ہند کے مشہور واقعات مین کسی تاریخ کو اٹھا کر آپ پڑھ لین، ہمایون جب پٹھانون سے نبرد آزما تھا، تو کامران مغربی سرحد پر کابل اور قندھار پر قبضہ جمائے ایرانیون کو روکے ہوئے تھا، پھر آگرہ مین ان بھائیون کی ملاقات ہوئی، ایک دوسرے نے باچشم پرنم معانقہ کیا، اور متحدہ کوششون سے سلطنت

کے منشر شیر اللہ کو کیا کرنے کو باہم طے کیا، اسی اثنا میں مرزا کامران بیمار پڑا، پھر شیر شاہ کا یلغار آیا تو آگرہ چھوڑ کر یہ لوگ لاہور پہنچے، وہاں سب بھائیوں میں مشورہ ہوا، لیکن شیر شاہ یلغار کرتا آگے بڑھتا گیا، اور کچھ دنوں کے لئے ہندوستان سے تیموری سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، پھر ہمایوں ایران سے واپس آکر کامران سے کابل میں لڑا، اور کامران محاصرہ سے چھپ کر نکلنے میں کامیاب ہوگیا، اور کچھ دنوں کے بعد وہ پھر کابل پر قابض ہوگیا، افغان سرداروں نے میرزا کا ساتھ دیا، اور ہمایوں کے خلاف ھوں میں اس کی مدد کی، پھر میرزا کا ستارۂ اقبال گہن میں آیا، بالآخر وہ گرفتار کیا گیا، دولت بصارت سے محروم کیا گیا، اور شاہی نظر بند کی حیثیت سے زندگی کے دن پورے کئے، آخر عمر میں حج کی نیت سے مکہ معظمہ گیا، وہاں تین حج کی سعادت حاصل کی، اور آخر ۱۲ ذی الحجہ ۹۶۴ھ کو مقام منا میں اس کا طائر روح پرواز کر گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ،

یہ تیموری شاہزادہ صاحب دیوان بھی تھا، پروفیسر محفوظ الحق مرحوم نے اس کا دیوان تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے،

۳- میرزا کامران کی پانچ لڑکیاں، گلرخ، حاجی بیگم، گلعذار، حبیبہ بیگم، اور عائشہ سلطان تھیں، لڑکے دو تھے، ایک ابراہیم سلطان میرزا، دوسرے میرزا ابوالقاسم مؤخر الذکر شعراء میں سے تھے، تذکرہ کی کتابوں ہفت اقلیم و مخزن الغرائب وغیرہ میں ان کا ذکر آیا ہے،

۴- تیموری خاندان کے شاہزادوں کو شاہزادہ کہتے آئے ہیں، یہ محض اُن کے اسلاف سے ان کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے، جو لوگ تیموری خاندان کی عظمت سے باخبر ہیں، وہ اُن کے اخلاف کی اُن کے بزرگوں کی نسبت سے قدر کرتے ہیں،

پٹھانوں اور تیموریوں میں قدیم چشمک رہی ہے، لیکن اب یہ داستانیں پارینہ ہو چکی ہیں، آپ لوگ اسلامی برادری کے توسط سے باہم مخلصانہ تعلقات قائم رکھیں، خصوصاً اپنے افغان دوستوں سے

آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے مورثِ اعلیٰ اور افغان سرداروں میں باہمی مودت رہی ہے، اس تعلق سے آپ دونوں بھی ایک دوسرے کے دوست ہو سکتے ہیں،

اسلام میں نسلی امتیازات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں،

کلکم بنی آدم و آدم من تراب — یعنی تم میں سے ہر ایک بنی آدم ہے اور آدم (علیہ السلام) مٹی کے تھے،

کو پیش نظر رکھیں، اسلام کی نظر میں اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی تم میں بزرگ تر وہ ہے جو بارگاہِ الٰہی میں تم میں سے زیادہ متقی ہے، نسلی امتیازات کے سلسلہ میں اصل اصول ہے، مومن کو اپنی نگاہ اسی میں مرکوز رکھنی چاہئے، والسلام "س"

اتحادِ یورپ عیسائیت کی اولین کوشش

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب
استاذ جامعہ عثمانیہ کنل منڈی حیدرآباد دکن

"نواہ کے سفر حجاز دین کے بعد ابھی ابھی گھر پہنچا، کچھ علمی فتوحات کا ذکر انشاء اللہ آیندہ،

جدہ میں ایک معارف سے معلوم ہوا تھا، کہ مولانا عبدالسلام صاحب نے تدوین حدیث پر کوئی رسالہ شائع کیا ہے، براہ کرم میرے کتب فروش حبیب کمپنی، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن کو اس کا ایک نسخہ میرے لئے روانہ فرمادیجئے،

۲- ابھی ابھی جنوری ۱۹۶۲ء کا معارف دیکھا، آپ نے ص ۷ پر ڈیلوس کانفرنس کا ذکر کیا ہے، میں سمجھتا ہوں، یہ اتحاد یونان کے لئے تھی، نہ کہ اتحاد یورپ کے لئے، اسی سلسلہ میں آپ نے ۱۲۹۵ء کی اٹلی میں منعقد شدہ کانفرنس کو اتحاد یورپ[1] کے لئے لکھا ہے،

---

[1] معارف :۔ اتحاد یورپ نہیں اتحاد عیسائیت!

اور شہرت میں تبلیغ مسیحیت کا ذکر کیا ہے، آپ کا منشا واضح نہ ہوسکا، اتحاد عیسائیت کی اولین کوشش میں نے ۱۰۹۵ء سے قرار دی ہے، اتحاد یورپ سیاسی کوشش ہی، اُلمی کی کانفرنس مذہبی تھی، بہر حال اگر میری غلط فہمی دور کرنے کے لئے کچھ مزید وضاحت فرمائیں تو ممنون ہونگا"

زیر بحث تنقید میں یہ امر شاید نظر سے چوک گیا، کہ زیر تنقید کتاب میں علاوہ اقوام متحدہ کے بین الممالک عدالت کا دستور بھی شریک کیا گیا ہے۔"

معارف:- گرامی نامہ ملا، سفر حجاز دکن سے واپسی مبارک ہو، آپ کے "علمی فتوحات" کا انتظار رہے گا، کہ ناظرینِ معارف کی ضیافتِ طبع کا سامان ہو،

۱- مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا کوئی رسالہ "تدوینِ حدیث" کے نام سے نہیں ہے، غالباً جدہ میں آپنے مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی (دارالعلوم) بادشاہی مسجد مئو ناتھ بھجن ضلع اعظم گڈھ کے رسالہ "تدوینِ حدیث" کا ریویو پڑھا ہوگا، وہ رسالہ مولانا موصوف سے مذکورۂ بالا پتہ سے مل سکتا ہے،

۲- آپ ڈیلوس کانفرنس کو اتحادِ یونان کے سلسلہ کی ایک تحریک قرار دیتے ہیں، یونان اس زمانہ کے یونان کو یورپ سے الگ کر کے سمجھنے کا اختیار حاصل ہے، لیکن آپنے اور جو دوسرے واقعات لکھے ہیں، اُن کی تفصیلات میں بھی آپ جائیں تو شاید ایسی صورتیں نکل سکتی ہیں، بہر حال مجھے کوئی عذر نہیں، کہ ڈیلوس کو اتحاد یورپ کے بجائے اتحادِ یونان کی تحریک سمجھا جائے، اسی لئے یہ کہا گیا تھا کہ

"اس کا سُراغ اس سے بہت پہلے ۴۷۷ ق م میں مل سکتا ہے"

ظاہر ہے کہ اس سُراغ کا مفہوم یہی تھا کہ اس سلسلہ کی ابتدائی کوششیں تھیں،

۳- ۱۰۹۶ء کی اس کانفرنس کا ذکر اس سلسلہ میں لایا گیا تھا، کہ "اتحاد عیسائیت" کی کوششوں میں اس کو نمایاں درجہ حاصل تھا، یہ معلوم ہے کہ پہلے پاپائے روما نے راجو کو شمالی افریقہ پر حملہ آوری کے لئے آمادہ کرنا چاہا، اور کہا گیا کہ

"قسم ہے، انجیل کی، یہ ہمارے لئے بہتر ہے اور اُن کے لئے بھی کہ سب مل کر اسلامی ممالک پر حملہ آور ہون کہ تمام اسلامی ممالک عیسائی ممالک بن جائین"

لیکن راقم نے اس کانفرنس کے لئے آقلی کے مقام کو موزون سمجھا، اور ۱۰۹۶ء میں وہان پہلی جنگِ صلیبی چھیڑ جانے کے لئے مشہور کانفرنس ہوئی، اور مختلف عیسائی حکمرانون نے مختلف اسلامی ملکون کی فتح کا منصوبہ باندھا، اور یہ سب کچھ اسی کانفرنس مین سرجوڑ کر فیصلہ کیا گیا، اس کانفرنس کی اہمیت اور اولیت کا تقاضا تھا کہ اس کا ذکر "اتحاد عیسائیت" کی کوششون کے ضمن مین خاص طور پر لایا جاتا، معارف مین یہی عرض کرنا مقصود تھا، اس سے زیادہ اور کوئی بات نہ تھی،

بہرحال ان امور مین جو کچھ کہا جا سکتا ہے، وہ ذوقی ہے، اور یہ صحیح ہو کہ مختلف ارباب ذوق اس سلسلہ مین مختلف راہ اختیار کر سکتے ہین،

اُمید ہے کہ یہ سطرین مفہوم کو واضح کرنے کے کام مین آئین گی، اور اگر تشفی نہ پہنچا سکیں تو ذوق وجدان کے لحاظ سے ان مسائل مین اپنی ایک رائے رکھنے کا حق بہرحال قائم رہے گا،

یہ مناسب معلوم ہوا کہ آپ کے مکتوب گرامی اور اس عریضہ کو اشاعت کے لئے دیدیا جائے اُمید ہو کہ اس کو آپ بھی پسند فرمائین گے،

والسلام "س"

اعلان

یکم جنوری ۴۷ء سے مستقل تاجرون کے لئے کمیشن سیرت پر پندرہ فی صدی، اور دوسری مطبوعات پر بیس فی صدی کر دیا گیا ہے، اب اس کے متعلق خط وکتابت بے سود ہوگی،

"منیجر"

ادبیات

مبارکباد آزادی

از جناب اقبال احمد خان سہیل

(وہ نظم جو جشن آزادی ہند کے موقع پر ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو اعظم گڈھ میں پڑھی گئی)

گلزار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج
سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج

غنچون کا صبا توڑ گئی قفلِ دہن آج
ہے ہر گلِ خندان کی زبان پر یہ سخن آج

صد شکر کہ ٹوٹا درِ زندانِ محن آج

پھر موج نے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا
بگڑی ہوئی تقدیر کو ہمت نے سنوارا

کھوئی تھی جو عظمت وہ ملی ہم کو دوبارا
روشن ہے پھر آزادیِ مشرق کا ستارا

یہ خوشخبری لائی ہے سورج کی کرن آج

ہے جمعۂ آخر مہِ پاکِ رمضان کا
دیکھو وہ جھروکے سے مہِ عید نے جھانکا

اب رنگ بدلنے کو ہے گلزارِ جہان کا
صدیون سے جہان شور رہا فریاد و فغان کا

نغمون سے ہے معمور وہی بیتِ حزن آج

رخصت ہے شبِ تار غلامی کا اندھیرا
وہ سامنے ہے صبح سعادت کا سویرا

بھارت سے بدیسی کا اکھڑنے لگا ڈیرا
لہرائے نہ کیون عظمتِ قومی کا پھریرا

آزاد ہوا قید غلامی سے وطن آج

ہر چند کہ تربیونت سے جو کامین صیّاد
پھر بھی تو بہر حال وطن ہو گیا آزاد

قائم ہوئی جمہوریت ہند کی بنیاد
اب شوق سے پھولے پھلے ہر نخلِ چمن زاد

پھر سبزۂ بیگانہ سے خالی ہے چمن آج

غالب ہوئی طاقت کے مقابل مین سچائی
صیّاد سے چھینی ہے اسیرون نے رہائی

جیتی ہے نہتّھون نے اہنسا کی لڑائی
آزاد[1] کو تبریک جو اصغر کو بدھائی

سچ ہو کے رہا دہر مین گاندھی کا بچن آج

اللہ رے یہ فیض دعاے مدنی[2] کا
آتشکدہ گلزار ہوا حق طلبی کا

لایا رمضان ہند مین مژدہ یہ خوشی کا
ماتھے سے مٹا ہند کے غیر کا ٹیکا

جاتا رہا اس چاند کے چہرے سے گہن آج

وہ زندۂ جاوید وطن کے وہ فدائی
جان اپنی جنھون نے رہ ملّت مین گنوائی

ہمّت نے اُنہی کی ہمین ساعت یہ دکھائی
انصاری و اجمل ہون تلک ہون کہ گسائی

یاد آتے ہین سب ہم کو شہیدانِ وطن آج

دنیا سے اُٹھے داس[3] بھی نہرو[4] بھی نہین ہین
نیتا جی[5] خدا جانے کہان گوشہ گزین ہین

پھر بھی یہی کہتے ہین جو اربابِ یقین ہین
جسم اُن کے کہین ہون مگر ارواح یہین ہین

اور وہ بھی ہین اس جشن مسرت مین مگن آج

دنیا ہی مین تنہا نہین یہ جشن خدا داد
فردوس مین بھی پہنچی ہے اس جشن کی روداد

---

[1] امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد [2] شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ العالی [3] آنجہانی سی آر داس [4] پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی، [5] سبھاش چندر بوس

سندھی[1] یہ خبر سن کے ہوئے خرم و دلشاد   مسرور ہیں مملوک[2] علی قاسم[3] و امداد[4]

دیتے ہیں خبر خلد سے محمود[5] حسن آج

سرمایۂ ملت ہوئی جانبازیِ افراد   قربانی و ایثار کی آخر تو ملی داد

کہتے ہیں یہ اشفاق[6] و بھگت[7] بسمل[8] و آزاد[9]   اللہ نے سن لی دلِ مظلوم کی فریاد

زینہ ہے حکومت کا وہی دار و رسن آج

جس پاؤں سے کل آتی تھی زنجیر کی جھنکار   آج اس نے کیا مشرقِ خوابیدہ کو بیدار

وہ ہاتھ جو کل ہتھکڑیوں میں تھے گرفتار   آزادیِ اقوام کے ہیں آج علمدار

ہیرے سے بھی وزنی ہو جو آہن کا سخن آج

جو لوگ خوشامد کا کیا کرتے تھے بیوپار   تمغے کے ستارے بننے پہ جو رہتے تھے تیار

آج اُن کے لئے سرد ہے اعزاز کا بازار   وہ مفت بکا چاہیں تو پائیں نہ خریدار

ایثار کے سکے کا ہے دنیا میں چلن آج

وہ ننگِ وطن غاصبِ بیگانہ کے حامی   تھا وجہ شرف جن کے لئے طوقِ غلامی

جھک جھک کے جو اغیار کو دیتے تھے سلامی   جو قیدِ غلامی کو سمجھتے تھے دوامی

ہوں کچھ بھی حیادار تو ہو اُن کی مرن آج

اے بادِ صبا خواب سے ٹیپوؒ کو جگا دے   مرحوم ظفر شاہ کے شانوں کو ہلا دے

پہلے تو ادب سے سرِ تسلیم جھکا دے   پھر دونوں کو یہ مژدۂ جان بخش سنا دے

---

[1] حضرت مولانا عبدالرحیم سندھی ریشمی چٹھی کی تحریک آزادی کے ہیرو [2] حضرت مولانا مملوک العلی مسند نشین شاہ عبدالعزیزؒ [3] قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسمؒ بانی دارالعلوم دیوبند [4] حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ [5] شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ [6] اشفاق اللہ خان شہید (کاکوری کیس) [7] سرفروش حریت بھگت سنگھ [8] منشی رام پرشاد بسمل (کاکوری کیس کے ہیرو) [9] پنڈت چندر شیکھر آزاد

آزاد ہے کشمیر سے لے تا بہ دکن آج

ہون گی اسی دنیا مین کہین جھانسی کی رانی   وہ خالدہ[۱] ہند و ہ نوشابہ[۲] ثانی
ہے فخرِ وطن جن کی شجاعت کی کہانی   اُن کو بھی سُنا جا کے یہ پیغام زبانی

پوری ہوئی آزادیِ قومی کی لگن آج

ہے یاد ہمین حضرت جوہر[۳] کا وہ ارشاد   آئین گے نہ وہ ہند مین جب تک نہ ہو آزاد
کہدے کوئی اُن سے کہ ہوئی ختم وہ میعاد   اُجڑی ہوئی محفل ہو کرین اس کو پھر آباد

آجائین کہ پورا ہوا وہ عہد کہن آج

رفتارِ سیاست کے جو نبّاض ہین ماہر   کہتے ہین نئے دور کے آثار ہین ظاہر
مٹنے کو ہین صیّادیِ مغرب کے مظاہر   مشرق کے سپہدار عساکر ہین جواہر[۴]

جاولکے ہم آواز ہین قفقاز و یمن آج

اے قلعۂ سُرخ اے اثرِ شاہجہانی   اے بلدۂ دہلی غم و حسرت کی کہانی
برباد شدہ عظمتِ ماضی کی نشانی   لے تجھ کو مبارک یہ نیا دورِ جوانی

تقدیر نے پھر تجھکو بنایا ہے دلھن آج

اربابِ وطن تم کو مبارک ہو یہ محفل   ہان جشن منالو کہ ہے موقع ہی قابل
ہونا نہ مگر جوشِ طرب مین کہین غافل   تخریب تو آسان تھی تعمیر ہے مشکل

ہے سامنے منزل ابھی کل سے بھی کٹھن آج

---

۱ ٹرکی کی مشہور مصنفہ جو تیغ و قلم دونون کی ملکہ ہین جنھون نے مردون کے دوش بدوش میدان جنگ مین داد شجاعت دی ہے ۲ سرحد ایران پر ایک چھوٹے سے ملک کی رانی جس نے سکندر اعظم کو شکست فاش دی، ۳ مولانا محمد علی جوہر ۴ ایشیاٹک کانفرنس کے صدر پنڈت نہرو،

سچ ہے کہ نہین سب کے مذاہب بھی یہان ایک — اور یون بھی سمجھ لو کہ نہین سب کی زبان ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود و زیان ایک — ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشان ایک

پھر دل مین ہو کیون خارِ عداوت کی چبھن آج

وہ چشمِ فسون گر ہے نہ وہ دورِ شبانہ — کل جو بھی ہوا آج بھلا دو وہ فسانہ
ہر روز نئے رنگ بدلتا ہے زمانہ — اچھا نہین سوتے ہوئے فتنون کو جگانا

جائز نہین آپس مین جبینون کی شکن آج

وہ دھرم ہو ہندو کا کہ ہو مذہبِ اسلام — جو دین بھی ہو دیتا ہے محبّت ہی کا پیغام
مذہب کو خدا کے لئے مت کیجیے بدنام — کُل شیر و شکر ہون یونہی کُل ہند کی اقوام

سنگم یہ ہین جس طرح ملی گنگ و جمن آج

گوتُم نے چراغان کیا کل ملک مین یکسر — روشن کرو الفت کا دیا دل کے بھی اندر
کیون حرفِ سُہیل آج نہ ہو ہیل کے دفتر — اک شاعرۂ ہند ہین صوبہ کی گورنر

اُٹھے دلِ شاعر سے نہ کیون موجِ سخن آج

اشارات

از

جناب انور کرمانی، لودھیانہ

ظلماتِ عدم مین نظر آئے ترے انوار — کھل جاتے ہین اسرار اگر آنکھ ہو بیدار
نفس مین نہ آفاق مین ٹھہرا دلِ عارف! — شہباز نہین ہوتا نشیمن کا گرفتار
کرتے ہین طواف اس کا شب و روز و مہ و سال — مومن ہے جہان مین صفتِ نقطۂ پرکار
بے معرکہ ممکن نہین تکمیل جنون کی — از بسکہ قیامت ہے قیامت کی خریدار

آمر کی حکومت ہو کہ سلطانی جمہور | اک فتنۂ اوہام ہے اک فتنۂ افکار
لادین سیاست کی ہے مغرب میں جو چاک | چنگیز کی بیٹی ہوئی رسوا سر بازار
جہر دمہ و انجم کا ہے وہ فقر شکاری | شبنم کی طرح جس کی بصیرت ہو سبکبار

پھونکا وہ فسون ساحر انگلیس نے انور
تہذیب میں داخل ہوا اسلام کا انکار

رنگِ حسرت

از

جناب ندیم جعفری ڈیرہ غازی خان

مجھے کیونکر نہ ہوگی شادکامی | درِ جانان کی حاصل ہے غلامی
مرے لب کس لئے ہوں وقفِ شکوہ | کہ جاری ہے جفاے التزامی
کتاب زندگی کے بابِ غم میں | لکھا ہے آپ کا اسم گرامی
تعارف کی نہیں چنداں ضرورت | وہ میرا جانتے ہیں نام نامی
جفاے یار کی مشق فروزاں | مری ایذا پسندی کی ہے حامی

کیفیات دل

از جناب حافظ حاجی شاہ حمید الدین صاحب عارف مرحوم اسلام پوری

نکلی حسرت نہ کوئی بھی دل کی | آرزو دل میں رہ گئی دل کی
دل کی لیتا نہیں خبر کوئی | آرزو کرتے ہیں سبھی دل کی
غنچے کھلتے ہزاروں دیکھے ہیں | کھلتے دیکھی نہیں کلی دل کی
دل پہ وہ ہاتھ رکھ کے کہتے ہیں | اب تو حسرت نکل گئی دل کی

ایک لحظہ نہیں قرار اسے — جائے گی کب یہ بے کلی دل کی
کیوں یہ دل لگیا پسند تمہیں — کون سی بات بھاگئی دل کی
دل کی باتوں پر آج پچھتائے — کیجئے اور بندگی دل کی
چل دیئے آپ دل کو تڑپا کر — کون دیکھے یہ بے بسی دل کی

لاکھ انکار تم کرو عارف
نہیں چھپتی کبھی لگی دل کی

کلام شفقت

از جناب سید فضل الحق شفقت کاظمی ڈیرہ غازیخان

مجبور کرم اُن کی نظر ہو کے رہے گی — سرمایۂ تسکین جگر ہو کے رہے گی
کر جائیں گی کام اُن کی فسوں ساز نگاہیں — دنیائے سکون زیر وزبر ہو کے رہے گی
عالم ہے یہی تیرے جمالوں کا تو دنیا — آوارۂ ہر راہ گذر ہو کے رہے گی
آؤں گا پس مرگ بہت یاد میں اُن کو — آنکھ اُن کی مرے سوگ میں تر ہو کے رہے گی
ناکام تمنا وہ مجھے کر کے رہیں گے — تقدیر مری خاک بسر ہو کے رہے گی
جانکاہ سہی لاکھ غم ہجر کے صدمے — یاد اُن کی مگر عیش اثر ہو کے رہے گی

راضی ہیں جو وہ نامہ و پیغام پہ شفقت
اب شام جدائی کی سحر ہو کے رہے گی

آئین وفا

از جناب شفق جوالاپوری

یہی آئین وفا ہے تجھے کچھ یاد بھی ہے — جو ہے پابند سلاسل وہی آزاد بھی ہے

ترے دمساز سبھی لالہ و گل سرو و سمن
بلبلِ نغمہ سرا باغ میں صیاد بھی ہے

نہیں کھلتا نہیں کھلتا ہے معمّہ دل کا
کبھی برباد ستم ہے کبھی آباد بھی ہے

مرے ارمان ترے انداز تغافل کے نثار
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

جوئے شیرین تو ابلنے کو ہے بیتاب مگر
تیشہ زن، آج کہیں ہمتِ فرہاد بھی ہے

آج مجبورِ فغاں غمِ فرقت ہے شفق
لب پہ آہیں بھی ہیں نالے بھی ہیں فریاد بھی ہے

جہانِ آرزو

از

جناب عرشی شاہ آبادی حیدر آباد دکن

کہاں تک انتظارِ دید کی یہ فکر سامانی
نگاہ لطف پیہم کیجئے یہ عہد و پیمان کیا

یہ کہہ سکتا ہے رحمت سے تجھے انکار ہے زاہد
کہاں کی پرسش فردا، سزائے جرم و عصیان کیا

یہ قیدیں دانشِ گم کردہ منزل کیلئے ہونگی
جنونِ شوق کے عالم میں بستی کیا بیابان کیا

اگر مقدور ہو تو چاک کر دوں جامۂ ہستی
دل وحشت زدہ کے واسطے یہ جیب و دامان کیا

کلیات شبلی اردو

مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ، جس میں مثنوی صبحِ امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی سیاسی، مذہبی، اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی چہل سالہ جدوجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، قیمت :۔ عہ/

باب التقریظ والانتقاد

نواے حیات[1]

مجموعۂ کلام جناب یحییٰ اعظمی

از شاہ معین الدین احمد ندوی

جدید قومی وسیاسی شاعری جس کی ابتدا حالی اور شبلی نے کی، اور اقبال نے اس کو کمال تک پہنچایا، مسلمانون کی ملی زندگی مین بانگِ درا کا حکم رکھتی ہے، سب سے اول انہی بزرگون نے بتایا کہ شاعری محض بزم طرب کا نغمہ وساز نہین ہے، بلکہ اس سے کاروانِ ملت کے لئے حُدی کا، میدانِ جہاد مین تکبیر کا اور حیاتِ ملی کی تجدید واحیا مین نفخ صور کا کام لیا جاسکتا ہے، چنانچہ مُسدّس حالی، مولانا شبلی کی نظمون اور اقبال کے کلام نے مسلمانون مین بیداری کی جو روح پیدا کی، وہ سیکڑون کتابون سے ممکن نہ تھی، حالی کے زمانہ سے لیکر مولانا محمد علی مرحوم کے دور تک مسلمانون کی سیاست مذہبی تھی، اس لئے قومی ترانون مین بھی مذہبی لَے شامل تھی ع

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

لیکن اس کے بعد جو سیاست پیدا ہوئی، وہ سراسر مادی اور یورپ کی لادینی سیاست کی صدائے بازگشت تھی جس سے نوجوانون کا طبقہ زیادہ متاثر ہوا، یہی طبقہ انقلابی جوش کے ساتھ شاعری کے میدان مین اترا عموماً اس کی علمی استعداد بھی نہایت خام تھی، اس لئے اس دور مین جو قومی وسیاسی شاعری پیدا ہوئی اس کا بڑا حصہ شاعری کے محاسن اور اسلامی روح دونون سے خالی ہے،

---

[1] ضخامت ۵ ، ا صفحے کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ ر، پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

ان نوجوانون کی شاعری کا مدار زیادہ تر فطری مناسبت اور ذوق کی رہنمائی پر ہے، فن سے اس کو بہت کم علاقہ ہے، اس لئے جہان تک ذوق کی رہنمائی کام دیتی ہے، وہ چلتے ہین، اور جہان فن کی ضرورت پڑتی ہے، بھٹک جاتے ہین، انھون نے محض سیاسی اور انقلابی خیالات اور الفاظ کو خاص بحر و وزن مین کھپا دینے کا نام شاعری رکھا ہے، بلکہ جدید ترقی پسند شاعری نے یہ قید بھی اٹھا دی ہے اور بعضون نے تو بحر و وزن کی آزادی کے ساتھ معنی و مفہوم کی ذمہ داری سے بھی گلو خلاصی حاصل کر لی ہے، جس کا ثبوت ترقی پسند شاعری ہے،

اس شاعری کی معنوی حیثیت اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے، جدید سیاست بالکل لادینی اور اس کا مقصود صرف مادی انقلاب ہے، اس لئے ان انقلابیون کے نزدیک قومی تعمیر کے مذہبی و ملی عناصر کی کوئی اہمیت نہین، اور ان کی سیاست تمام تر تخریبی ہے، چنانچہ ان کی سب سے پہلی بغاوت خدا اور اس کے احکام سے ہوتی ہے، اور ان کے انقلاب کی زد سب سے پہلے خود اُن کے مذہب و ملت اور ان کی تہذیب و معاشرت پر پڑتی ہے،

ان کی مثال اس اناڑی سرجن کی ہے، جسے جسم کے ماؤف اور صحیح و تندرست حصون مین امتیاز نہین، جسم سے فاسد مادہ کے اخراج کی ضرورت سے کسی کو انکار نہین، لیکن اسی کے ساتھ اس کی احتیاط بھی ضروری ہے، کہ نشتر کسی نازک رگ پر نہ پڑنے پائے، کہ علاج ہی موت کا سبب بن جائے، اور ہمارے ان نئے سرجنون کو ملت کی رگ جان یعنی مذہب پر بھی نشترزنی مین باک نہین، اس کی تصدیق ترقی پسند شاعرون کے کلام سے ہو سکتی ہے،

یہ ظاہر ہے کہ جسم کے صحیح و متوازن نشو و نما کے لئے اس کے ہر حصہ اور ہر عضو کو یکسان خون کی ضرورت ہے، ورنہ جس حصہ مین خون نہ پہنچے گا وہ خشک ہو جائے گا، یا صحیح نشو و نما سے محروم رہے گا، وہ ہمارے نئے شاعر قومی زندگی کے بعض پہلوؤن پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہین، اور بعض کو بالکل نظرانداز

کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے قومی زندگی کا جو پیکر بن کر تیار ہوگا، وہ کیسا ہوگا،

لیکن ہر کلیہ اور عموم میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں، چنانچہ اس نئے طبقہ میں بھی ایسے شعرا نکل آتے
ہیں، جن کا کلام فنی حیثیت سے شاعری کہلانے کا مستحق اور معنوی حیثیت سے قوم کے لئے واقعی پیام زندگی
ہے، انھی شعرا میں جناب یحیٰی اعظمی اور اُن کے کلام کا اسم بامسمّٰی مجموعہ نوائے حیات ہے، گو وہ جدید دور سے
تعلق رکھتے ہیں، اور اُن کی شاعری کی بنیاد قومیات و سیاسیات پر ہے، لیکن ان میں شاعری کی فطری
صلاحیت کے ساتھ اس کی فنی استعداد بھی ہے، اور وہ مذہب و ملت کا بھی درد رکھتے ہیں، اور اُن
کی شاعری کا آغاز اور اس کا نشو و نما دار المصنفین کی علمی و ادبی فضا اور مولانا اقبال احمد خان صاحب
سہیل جیسے استادِ فن کی رہنمائی میں ہوا، اور انھوں نے ابتدا سے خیالات اور طرزِ ادا دونوں میں مولانا
شبلی مرحوم کا تتبع کیا، اور پندرہ بیس سال تک برابر اُن کی مشق جاری رہی، اس لئے اُن کا کلام ظاہری
لباس اور اندرونی روح دونوں پہلوؤں سے جدید قومی شاعری میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اور
صحیح معنوں میں قومی و ملی شاعری کہلانے کا مستحق ہے، اس میں شاعرانہ محاسن بھی ہیں، مشق و مہارت
کی پختگی بھی ہے، مذہبی روح بھی ہے، قومی و ملی حمیت بھی ہے، اخلاق کا درس بھی ہے، سیاسی رجز بھی ہے،
غرض حیاتِ ملی کے تمام عناصر پورے اعتدال و توازن کے ساتھ موجود ہیں، اور وہ قوم کے لئے نوائے حیات
کے ساتھ جدید دور کے گم کردہ راہ شعراء کے لئے پیام اصلاح بھی ہے، کتاب کے شروع میں حضرت الاستاذ
مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے قلم سے حقیقی اور اصلی شاعری اور جناب یحیٰی کے کلام کی خصوصیات
پر مختصر مگر حکیمانہ تبصرہ ہے، جو قومی و ملی و مذہبی شاعری کے لئے بنیادی نصاب کی حیثیت رکھتا ہے

اس مجموعہ پر تفصیلی نقد و تبصرہ کی گنجائش نہیں، اس لئے صرف ان کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں :-

مذہبی اصلاحی نظمیں | جناب یحیٰی کی شاعری کی بنیاد مذہب آمیز سیاست پر ہے، اور ان کی بہت کم نظمیں
اس روح سے خالی ہیں، بعض مثالیں ملاحظہ ہوں،

موجودہ زمانہ کے مسلمانون کی حالت کا نقشہ :-

حیف یہ دور ہے محروم رسولِ عربی زندہ سینہ مین ہے اس کے شررِ بولہبی
جس کی گرمی تھی حیاتِ دلِ مومن کا فروغ ہم مین باقی نہین وہ ولولۂ حق طلبی
نہ وہ خمخانۂ یثرب کا ہے فیضانِ نشاط نہ وہ رندان مے آشام کی ہو تشنہ لبی
ملت حق سے یہ بیگانگی اللہ اللہ جیسے اس دور کو مطلوب نہین دینِ نبی
دل افسردہ ہے بیگانہ سوزِ غم عشق نالہ ہاے سحری ہین نہ دعاہاے شبی
امتِ خیرِ بشر اور یہ احوال زبون نظر آتی ہے زمانہ مین یہ کیا بوالعجبی
کیا تری شرع گرامی کی یہی ہے تعلیم ایکہ قربان تو صد مرتبہ اُمّی و اَبی

ہم اور اپنے کو کہین پیرو پیغمبر حق
اس سے بڑھکر نہین دنیا مین کوئی بے ادبی

عہدِ حاضر کے گم کردہ راہ نوجوانون کے اوہام باطلہ کی تصویر

اک باخبر بزرگ سے پوچھا جو مین نے کل دنیا مین کیون ہین آج رذائل نئے نئے
چھایا ہے کیون دماغون پہ یورپ کا فلسفہ مغرب کی حکمتون کے ہین قائل نئے نئے
ورد زبان نظام معیشت ہین نو بہ نو بحثین نئی نئی ہین مسائل نئے نئے
سرمایہ کا کہین کہین محنت کا ہے سوال ہین خدمتِ سکم کے وسائل نئے نئے
الحاد کا شکار ہین، ملت کے نوجوان ہین تیغ کارل مارکس کے گھائل نئے نئے
شرع و نظام ملتِ اسلام کے خلاف صف بستہ ہین وطن مین قبائل نئے نئے
اخلاق ہین وہ اب نہ وہ اوصاف زندگی دورِ جدید کے ہین فضائل نئے نئے
صورت بدل گئی ہر تو سیرت بدل گئی ہین آج نوجوان کے خصائل نئے نئے

گر اُن سے پوچھئے سبب اس انقلاب کا — برہان نئے نئے ہیں دلائل نئے نئے

سُن کر زبانِ پاک سے ارشاد یہ ہوا — کچھ بے سبب نہیں یہ رذائل نئے نئے

در اصل ہے یہ حکمتِ دیں سے کم آگہی — پیدا کئے ہیں جس نے مسائل نئے نئے

دولت جو اپنے گھر کی ہے اس کی نہیں خبر

دریوزہ گر ہیں غیر کی چوکھٹ پہ دربدر

عہد حاضر کے فتنے:-

عجب فتنہ ہے یا رب جہاں میں در جدید — نہ فکر روز قیامت نہ خوف یوم وعید

ہے اس کی عقل تجدد نواز کا فتویٰ — جہان کہنہ کی ہر شے ہے لائقِ تجدید

نئی اساس پہ دنیائے نو کرو تعمیر — بنائے کہنہ کو ڈھانے کی ہے ہمیں تاکید

کسی طرح سے یہ بزم جہاں بدل جائے — وہ کر رہا ہے ہر انقلاب کی تائید

جدید طرز پہ ہو اجتہاد فکر و نظر — کہ عہدِ نو میں خطا ہے قدیم کی تقلید

عبث ہیں آج روایات سیزدہ صد سال — ہے اب یہ دفتر پارینہ لائقِ تردید

قدیم عہد کے سرمایہ ہائے منقولات — جدید دور کے عقل و قیاس کو ہیں بعید

اصولِ شرع میں بھی ناگزیر ہے ترمیم — کہ انقلاب زمانہ کا اقتضا ہے شدید

اسے بھی ڈھال دو اب عہد نو کے سانچے میں — تمہارے پاس ہو موجود جو کتاب مجید

جہان نو میں نہیں اعتبار کے قابل — یہ فلسفہ یہ شریعت یہ فقہ بے تجدید

ضرورت اب ہے کہ ان کو جہاں میں پیش کرو — بہ ذوقِ دانشِ حاضر بہ آب و رنگ جدید

ہزار حیف یہ نکتہ ہے اُن سے پوشیدہ

بری ہے نسخ و تغیر سے مذہب توحید

بارگاہ مستجاب الدعوات میں دعا،

تجھے تیری قسم یا رب فغان بے نوا سن لے
خداوندا شکستہ شیشۂ دل کی صدا سن لے

دعا ہائے سحر گاہی کو اذن باریابی دے
زبان چاک دل سے نالۂ درد آشنا سن لے

مری شبہائے غم کی خلوتیں معمور ہیں جس سے
وہ فریاد حزیں سن لے وہ آہ نارسا سن لے

تو خود دانا و بینا ہے مگر میری زبانی بھی
دل مظلوم پر جو کچھ گذرتی ہے ذرا سن لے

دعا اک ربط روحانی ہے آقا اور بندہ میں
زبان سے میری یا رب میرا حرف مدعا سن لے

پریشان ہو رہا ہے ہند میں شیرازۂ ملت
پراگندہ ہے حال امت خیر الوریٰ سن لے

کہاں وہ شیوۂ صدق و صفا اب تیرے بندوں میں
مسلمانوں کے باہم شکوۂ جور و جفا سن لے

ادا ہوتا تھا کل تک کلمۂ حق جن زبانوں سے
نکلتا ہے انھیں سے آج حرف ناسزا سن لے

رہے گی آہ مظلومان ملت بے اثر کب تک
کبھی تو دردمندوں کے دلوں کی التجا سن لے

مسلمانوں کو مست بادۂ صدق و صفا کر دے
شراب کہنۂ یثرب سے پھر ذوق آشنا کر دے

سیاسی نظمیں | نوائے حیات کی سیاسی نظمیں مذہبی نظموں سے بھی زیادہ پرجوش اور رزمگاہ سیاست کا رجز ہیں، ایک نظم میں ہندوستان کے زوال پذیر مسلمانوں سے اس طرح خطاب ہے،

مسلمانوں کبھی ہنگامہ آرائے جہاں تم تھے
فروغ بزم ہستی رونق کون و مکاں تم تھے

جنھیں تھمنا نہ آتا تھا جادۂ زندگانی میں
وہ سرگرم سفر وہ جادہ پیما کارواں تم تھے

پہاڑوں کی بنائیں جس کی ٹکر سے لرزتی تھیں
وہ طوفان تلاطم خیز وہ سیل رواں تم تھے

جنھیں بزم طرب تھی رزمگہ تم وہ مجاہد تھے
جنھیں موت ایک بازیچہ تھی وہ وارفتہ جاں تم تھے

تم ہی سے دہر میں تھی ہر طرف ہنگامہ آرائی
کہ بزم فطرت بے تاب کی روح رواں تم تھے

تمہاری ہر نظر دمزآشنائے جد بہیم تھی — کہ دنیا میں حیات سرمدی کے رازداں تم تھے
تمہاری زندگی آئینہ دار دین بیضا تھی — محافظ ملک وملت کے وطن کے پاسباں تم تھے
تمہارا پرچم اسلام لہراتا تھا دنیا میں — جہاد زندگی میں کامگار وکامراں تم تھے
شہنشاہوں کی جانب بھی نگاہیں تک نہ اٹھتی تھیں — خمار بادۂ وحدت سے ایسے سرگراں تم تھے
تمہارے دم سے تھا اسلاف کا مجد وشرف باقی — ابھی کل تک وطن میں یادگار باستاں تم تھے
تمہارا ہی تمدن شرق سے تا غرب پھیلا تھا — دماغ ودل کی دنیا پر ابھی کل حکمراں تم تھے
جہاں کو جگمگاتی تھیں تمہارے فیض کی کرنیں — فروغ بزم مشرق نازش ہندوستاں تم تھے
مگر اب مسخ ہوا یسے کہ گر اسلاف جی اٹھیں — نہ مانیں یہ کہ اُن کے ہی چراغ دودماں تم تھے
تمہیں نے اپنی حالت آپ بدلی ورنہ تبلاؤ — کبھی یوں پائمال انقلاب آسماں تم تھے

میں کچھ کہتا نہیں تم ہی ذرا انصاف سے دیکھو
کبھی پہلے کبھی ایسے سرخوش خواب گراں تم تھے

شجر اسلام کی آبیاری ہمیشہ خون شہدا سے ہوئی ہے، اس لئے اسلام میں شہید اور شہادت کا رتبہ بہت بلند ہے، اور خدا کی جانب سے اُن کو حیات ابدی کی بشارت دیگئی ہے، لَا تَقُولُوا لِمَن يُقتَل فِي سَبِيلِ اللهِ اَمواتًا بَل هُم اَحيَاءٌ عِندَ رَبِّهِم جناب یحییٰ کے قلم نے بھی اس مقام محمود کی بڑی موثر اور لطیف عکاسی کی ہے،

زندہ جاوید ہیں ملت کے شہیدان کرم — نوجوانو تمہیں معلوم بھی ہے ان کا مقام
یہ وہ مرحوم ہیں جن کے لئے خود رحمت حق — لیکے آتی ہے حیات ابدی کا پیغام
اُن کی لاشوں پہ فرشتوں کی صفیں ملتی ہیں — لیکے اُترتی ہیں جو خوشنودی حق کا پیغام
یہ وہ ارباب بقا ہیں کہ لہو سے اپنے — کھینچے صفحۂ ایام پہ ہیں نقش دوام

سرخرو ملتِ بیضا ہے انہی کے دم سے خون اُن کا ہے مگر غازۂ روے سلام
چمن خلد کا اک تازہ گل خندان ہے نہین آغشتہ بخون ہے وہ جبینِ گلفام
اللہ اللہ وہ رعنائیِ رخسارِ شہید بھول سکتی ہے بھلا اُس کو نگاہِ ایام
آرزومند حیات آہ انھین کیا جانین مر کے ہوتے ہین، جو فردوس مکان خلد مقام
جب شہادت کی نوید ابدی آتی ہے ہر نفس زیست کا ان کے لئے ہوتا ہے حرام
کیا زمانہ نہین اس راز سے آگاہ ابھی تابشِ روے شہیدان ہے فروغِ سلام

دی ہے جن کے دم جان بخش نے ملت کو حیات
اُن کی روحون پہ ہو سو بار درود اور سلام

مختلف نظمون کے نمونے | مذہبی و سیاسی نظمون کے علاوہ نواے حیات مین مختلف جذبات و تأثرات اور مناظر پر نہایت دلکش نظمین ہین، مست گھٹا کا منظر ملاحظہ ہو،

وہ دیکھو میکدہ بر دوش پورب سے گھٹا اُٹھی جلو مین اپنے لے کر چشمۂ آب بقا اٹھی
مثالِ ساقیِ میخانہ مستِ بادۂ رنگین سراپا بیخود و سرشار و مستانہ ادا اٹھی
خمارِ حُسن مین کھولے ہوے گیسوے مشکین کو رداے قیر گون اوڑھے ہوے سر تا بہ پا اٹھی
خیابان کے لئے بن کر پیام رنگ و بو آئی بیابان کے لئے لیکر نوید جانفزا اُٹھی
ہوئین امرت کی بوندین کارفرما سبزہ و گل مین جہانِ خشک کی پامال کھیتی لہلہا اُٹھی
بسائے دامنون کو عطر و عنبر مین نسیم آئی نشاط و کیف مین ڈوبی ہوئی موجِ صبا اٹھی
دکھایا اس قدر ابرِ کرم نے جوشِ تردستی کہ آب و گل کی دنیا موجِ کوثر مین نہا اٹھی

چراغ لالہ و گل ہر طرف روشن ہوئے ایسے
کہ بزمِ عالمِ امکان سراپا جگمگا اُٹھی

اس دوح پرور موسم مین ساونی کی بہار دیکھئے،

بے نور تیرے سامنے ہین چاندنی کے پھول تیری بھی کیا بہار ہے اے ساونی کے پھول
شوخی تری ہے باغ کے پھولون مین انتخاب رنگت کو دیکھ کر تری شرمندہ ہے گلاب
سرسبز ڈالیون مین یہ اللہ رے جوش رنگ فرط شگفتگی سے ہے ہر شاخ شوخ و شنگ
ہر دوش نخل بار گل تر سلئے ہوئے ہر دست شاخ ساغر احمر لئے ہوئے
سر پہ ہر ایک شاخ کے پھولون کا یہ ہجوم نظارہ فرط کیف سے جاتا ہے جھوم جھوم
گرنا ترا زمین پہ وہ حسن ادا کے ساتھ اڑنا وہ دور تک کبھی موج ہوا کے ساتھ
تیری یہ سرخوشی ہے بتا کس کے جام کی نسبت عطا ہوئی ہے تجھے کس کے نام کی

ان نظمون کی لطافت و رنگینی کسی تشریح کی محتاج نہین، اصحاب ذوق خود اس کا اندازہ کرسکتے ہین۔

تغزل شاعری مین اظہار کمال کا اصل میدان غزل ہے نظمون کی وسعت مین تو اظہار خیالات کی بڑی گنجایش ہے، جو خیال ایک شعر مین ادا نہ ہوسکتا ہو، اس کو اس سے زیادہ مین ادا کیا جاسکتا ہے لیکن غزل مین جذبات و تاثرات کی پوری دنیا ایک شعر مین سمیٹنا پڑتی ہے، اور پھر حسن بیان کی پوری دلآویزی کے ساتھ ورنہ شعر غزل کے رتبہ سے گر جائے گا، پھر نظمین کسی خاص عنوان اور انہی سے متعلق خیالات تک محدود ہوتی ہین، اور غزل گوناگون جذبات و تاثرات کا پیمانہ ہین، اور یہ شراب اسی مین اپنا کیف و اثر دکھاتی ہے،

جناب یحیٰی کی فطرت رنگین اور شاعرانہ ہے، اس لئے اُن کی نظمون مین بھی تغزل کی دلکشی و رنگینی ہے جس کا اندازہ اوپر کی نظمون سے ہوا ہوگا، لیکن اُن کا گلستان شاعری تغزل کے زمزمہ سے بھی خالی نہین ہے، اور اس مین قلبی واردات و تاثرات خیالات کی رنگینی و مستی بیان کی

نزاکت و دلکشی تمام معنوی کیفیتین اور ظاہری لطافتین موجود ہین،

اعظمی صاحب کا ذوق غزل کے مقابلہ مین نظمون سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، اس کا اثر یعنی خیالات کا تسلسل اور اُس کی یکسانی اُن کی غزلون مین بھی نمایان ہے جیسے اُن کی کم غزلین خالی ہین، اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اُن کے ایک طرز کے خیالات اور ایک رنگ کے جذبات عموماً ایک ہی غزل مین مل جاتے ہیں اور انتخاب کے لئے مختلف غزلون کی ضرورت نہین پڑتی، اس لئے اس تبصرہ مین بھی متفرق اشعار کے بجائے پوری پوری غزلین نقل کی جاتی ہین،

قلبی واردات و تاثرات کی مثالین،

حیات اک مستقل غم کی کہانی ہوتی جاتی ہے — محبت ہی مآل زندگانی ہوتی جاتی ہے

دل محزون سے ہر نقش تصور مٹتا جاتا ہے — مگر اک یاد اُن کی جاودانی ہوتی جاتی ہے

نظر آنے لگا ہے اور ہی کچھ منظر فطرت — نگاہون پر یہ کس کی حکمرانی ہوتی جاتی ہے

زبانون پر کبھی یہ حرف نازک آ نہیں سکتا — حدیث شوق آنکھون کی زبانی ہوتی جاتی ہے

محبت نے چھپا رکھی تھی جو اک آگ سی دل مین — وہی آنکھون سے اب بہ بہ کے پانی ہوتی جاتی ہے

نہ اب وہ ولولے ہین اور نہ ذوق زندگی باقی
حیات شوق نذر عمر فانی ہوتی جاتی ہے

محبت مین کچھ ایسی بات پیہم ہوتی جاتی ہے — کہ ساری زندگی اک مستقل غم ہوتی جاتی ہے

لہو رونے پہ مائل چشم پرنم ہوتی جاتی ہے — مری دنیائے غم شاداب و خرم ہوتی جاتی ہے

ٹپک کر چہرۂ افسردہ کو شاداب کرتی ہے — مرے آنسو کی ہر بوند اشک شبنم ہوتی جاتی ہے

وہی ہین بزم عالم کی نشاط انگیزیان لیکن — نہ جانے کیون طبیعت مائل غم ہوتی جاتی ہے

دل ویران بھی یارب کیا کوئی معمورۂ غم ہے — یہان کی ہر خوشی تمہید ماتم ہوتی جاتی ہے

رنگینی و مستی :-

ادھر بھی بخش دے اک جرعۂ کیف آفریں ساقی
تری مخمور آنکھوں پر فدا دنیا و دیں ساقی

اٹھا تو بھی اُسی عالم میں جام ساتگیں ساقی
گھٹاؤں سے برستی ہے شراب آتشیں ساقی

ہر اک موج صبا اب مے صبا بن کے آتی ہے
فضائیں بن گئی ہیں میکدہ کی سرزمیں ساقی

برستا ہے زمیں پر آب حیواں ابر باراں سے
بہا دے تو بھی اُٹھ کر جوئے شیر و انگبیں ساقی

تخیل تیرے جلووں کا تصور تیری آنکھوں کا
یہ عالم ہے کہ اب ہے رقص میں جانِ حزیں ساقی

تجلی ہر طرف ہے بزم میں یہ جام رنگیں کی
فروغ انگیز ہے یا تیری تابندہ جبیں ساقی

ترے ساغر سے جس دم بارشِ انوار ہوتی ہے
فلک کیا جھومتا ہے کیف میں عرش بریں ساقی

خیالات کی پاکیزگی و لطافت :-

فضائے لامکاں تک ہے معطر
کسی کے در کی خاکِ عنبریں سے

جسے ملتی ہے ساقی کے لبوں سے
اسے کیا کام شیر و انگبیں سے

سلامت میری فردوس تصور
کہ رنگیں ہے جمالِ ہمنشیں سے

بہت ہے عمر بھر کی بیخودی کو
ملی ہے جو نگاہ اولیں سے

چلی آتی ہے کس کی بوئے جاں بخش
صبا کی مست موجِ عنبریں سے

ملے سجدے جو اُن کے آستاں کے
گہر نکلے مژہ کی آستیں سے

جہاں کا ذرہ ذرہ رقص میں ہے
محبت کی شرابِ آتشیں سے

حقیقت ہائے ہستی پوچھئے کاش
کسی دیوانۂ صحرا نشیں سے

اسی کو رند سمجھے جلوۂ طور
تڑپ اٹھیں جو موجیں ساتگیں کی

زبان وبیان کی سادگی وسلاست،

وہ جاکر بھی آنکھوں میں چھائے ہوئے ہیں	نگاہوں میں اب تک سمائے ہوئے ہیں
غم ماسوا کو بھلائے ہوئے ہیں	کسی سے جو اب لو لگائے ہوئے ہیں
معنبر ہیں زلفیں معطر ہیں عارض	وہ پھولوں میں گویا بسائے ہوئے ہیں
صباحت ہے وہ پیکر نازنین میں	کہ کوثر میں گویا نہائے ہوئے ہیں
وہ خود اپنی سرشار آنکھوں سے مجھکو	شراب محبت پلائے ہوئے ہیں
چمکتی ہے ہر سمت برق تجلی	کہ وہ رخ سے پردہ ہٹائے ہوئے ہیں
یہ حالت ہے اب اُن کے سودائیوں کی	بہت زیست سے تنگ آئے ہوئے ہیں

مذکورۂ بالا نمونوں سے موجودہ شعرا میں جناب یحیٰی کے کلام کے درجہ کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ہوگیا ہوگا، مگر اس کی خوبیوں کا پورا اندازہ نواے حیات کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے،

ان محاسن کے ساتھ اس خوشنما گلدستے میں اشخاص اور مسالک پر تلخ تنقیدوں کے خار البتہ کھٹکتے ہیں، کاش یہ پاکیزہ مجموعہ اس خس وخاشاک سے پاک ہوتا، اولاً یہ طریقہ وحدت قومی اور اتحاد اسلامی کے خلاف ہے، جس کے فقدان کا خود مصنف نے ماتم کیا ہے،

کہاں وہ شیوۂ صدق وصفا اب تیرے بندوں میں	مسلمانوں کے باہم شکوۂ جور وجفا ان میں
ادا ہوتا تھا کل تک کلمۂ حق جن زبانوں سے	نکلتا ہے انہی سے آج حرف ناسزا ان سے

کیا محض سیاسی مسالک کے اختلاف پر تلخ گفتاری کلمۂ ناسزا نہیں ہے،

اس سے قطع نظر خود مصنف کے بہت سے خیالات تنقید وتصحیح کے محتاج ہیں، اور جا بجا اُن میں تضاد وتناقض نظر آتا ہے، ایک طرف تو انھوں نے متعدد نظموں میں سر اقبال کے حضور میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، ان کی وفات پر بڑے پرزور مرثیے لکھے ہیں، ان نظموں میں اُنھوں نے

اقبال کو اسلام کی تعلیمات کا سب سے بڑا رمز شناس و عارف اور اس دور کا مجدد تک مانا ہے اور اُن کی شاعری کو قرآنی تعلیمات کا جوہر تسلیم کیا ہے، اور کوئی خوبی اور کمال ایسا نہیں ہے جو اُن کی ذات میں نہ دکھایا گیا ہو، دوسری طرف اُن کے سیاسی مسلک پر سخت تنقید ہے، ان دونوں میں سے ایک ہی خیال صحیح ہو سکتا ہے، درحقیقت یہ اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کہ مصنف نے اقبال کے بعض خیالات کو جزوی امور میں سطحی مشابہت کی بنا پر لیگ کی ہمنوائی تصور کر لیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، وہ کسی خاص جماعت سے کلیتہً وابستہ نہیں تھے، اور نہ کسی کے خیالات سے متاثر تھے، بلکہ خود دوسری جماعتوں نے اُن کے تصورات سے ناقص استفادہ کیا ہے، اقبال خود ایک مستقل مسلک مستقل نصب العین اور خاص پروگرام رکھتے تھے جس کی ساری عمر تبلیغ کرتے رہے، اُن کے بعض خالص فلسفیانہ تصورات کو چھوڑ کر ان کی قومی و ملی شاعری کی بنیاد اور اس کی روح اور اس کی غرض و غایت اسلام کا احیاء اور مسلمانوں کی تجدید و اصلاح تھی، اُن کا عقیدہ تھا، کہ مادیات کے اس تیرہ و تار دور میں اسلام ہی کی روشنی قندیل رہبانی کا کام دے سکتی ہے، اور اسی نسخۂ شفا پر عمل انسانیت کے جملہ امراض کا مداوا ہے، اور مسلمان ہی اقوام عالم کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے ہیں، اس لئے وہ مسلمانوں کو پھر كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے منصب جلیل پر دیکھنا چاہتے تھے،

یہ مسلم ہے کہ قوموں کا احیاء اور اُن کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوگی، اسی کے مطابق وہ بنیگی، آج ساری دنیا کا معیار ترقی خالص مادی اور معاشی ہے، اور اُس کے وسائل بھی مادی ہیں، اسی لئے جو قوم جس قدر مادی سر و سامان میں غرق ہوگی، اسی قدر وہ ترقی یافتہ کہلائیگی، خواہ اخلاقی و روحانی اعتبار سے وہ کتنے ہی تہی دامن ہو لیکن مسلمانوں کا معیار ترقی اس سے بالکل مختلف ہے، ان کی ترقی کا پیمانہ اسلام ہے، اس لئے مسلمان قوم موجودہ معیار ترقی کے لحاظ سے خواہ کتنے ہی معراج کمال پر کیوں نہ پہنچ جائے لیکن اگر وہ اسلام سے دور ہے تو ایک مسلمان کے لئے وہ ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے، اس لئے مسلمانوں کی

ترقی کے بارہ میں اقبال مرحوم کا نقطۂ نظر بھی خالص اسلامی تھا، اور وہ مذہب و سیاست تہذیب و معاشرت جملہ نظام زندگی میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے اثرات سے بچنے اور خالص اسلامی قوانین و تعلیمات پر عمل کی دعوت دیتے تھے، اور ان کو اسلام کی صراط مستقیم کے ذریعہ سے ترقی کی منزل کی جانب لیجانا چاہتے تھے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ دنیا کی کوئی قوم کبھی دوسری قوم کی حکومت یا اس کے نظام کے ماتحت اپنی قومی روایات اور امتیازی خصوصیات کے مطابق ترقی نہیں کر سکتی، خصوصاً مسلمانوں کی تجدید و اصلاح تو اسلامی حکومت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بغیر کوئی مسلمان صحیح معنوں میں کامل اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا اور بہت سے دنیاوی معاملات میں وہ غیر اسلامی قوانین کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے، اقبال کے پیش نظر صرف سیاسی غلامی سے مسلمانوں کی آزادی اور ان کی مادی ترقی نہیں تھی بلکہ ان کا مقصد ان کی حقیقی تجدید و اصلاح تھی، جو غیر اسلامی حکومت کے ذریعہ ممکن ہی نہیں ہے، اس لئے وہ اسلامی حکومت کو ضروری سمجھتے تھے، اور سب سے پہلے انہی نے یہ تخیل پیش کیا تھا، مگر اسلامی حکومت سے ان کا مقصد کسی خاص خطہ میں مسلمان نامی قوم کی سیاسی حکومت نہیں، بلکہ پورے اسلامی نظام کے ساتھ حکومت الٰہیہ کا قیام تھا، جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری دنیا کے لئے پیام رحمت ہو،

اقبال کے اس تصور سے کسی مسلمان کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، اُن کا ذکر نہیں جن کا سیاسی نقطۂ نظر اسلام سے مختلف ہے، اور ان کا مقصود مسلمانوں کی حقیقی تجدید و اصلاح نہیں، بلکہ صرف سیاسی آزادی ہے، باقی کسی سیاسی جماعت اور اقبال کے کسی خیال میں جزوی یا سطحی مشابہت سے ان کو کلیۃً اس جماعت کا ہمنوا سمجھ لینا خود اپنی غلطی ہے، سونا ملمع کی ظاہری ہمرنگی کی وجہ سے کھوٹا نہیں کہا جا سکتا، اقبال کے کسی تصور کی غلط ترجمانی میں ان کا کیا قصور، صاحب نظر کا کام متشابہات کا پہچاننا ہے نہ کہ خود اس میں مبتلا ہو جانا،

مطبوعات جدیدہ

سفرنامۂ انندرام مخلص حجم ۱۴۴ صفحے لکھائی چھپائی خوشخط ٹائپ مین، قیمت :۔ ـر

پتہ :۔ مہتمم کتب خانہ ریاست رام پور،

انندرام مخلص عہد محمد شاہی کے ممتاز ادیبون مین سے تھا، اُس نے اس سفرنامہ کو سنہ ۱۱۵۹ ہجری مین لکھا، اس مین محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حملۂ بن گڑھ کے واقعات کی تفصیل درج ہے، اس سفر مین مخلص محمد شاہ کے ہمرکاب تھا، سفرنامہ کے مرتب و مصحح جناب ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب ام اے پی ایچ ڈی ہین جنھون نے غیر معمولی محنت و جانفشانی سے قابل قدر حواشی کے ساتھ اس کو مرتب کیا ہے،

مرتب نے اپنے دیباچہ مین سفرنامہ نویسی پر سیر حاصل بحث کی ہے، افسوس ہے کہ اس سلسلہ مین مرتب کے بعض مندرجات سے ہمین اتفاق نہین ہے، مرتب کا خیال ہے کہ اہل یورپ اس صنف مین ہم سے آگے ہین کہ انھون نے اپنے سفر کے حالات لکھ کر یادگار چھوڑے، اُس کے بالمقابل مسلمانون مین سیر و سیاحت کی دلچسپی رکھنے والون کی تعداد کچھ زیادہ نہین رہی، حالانکہ ہندوستان کے متعلق یورپین سیاحون کے جو کچھ معلومات ہین، ان سے ہندوستان کی تاریخ کے سمجھنے مین کچھ زیادہ مدد نہین ملتی، بخلاف اس کے ہندوستان کے عہد قدیم سے اُس کے آخر دور تک کے مسلمان جغرافیہ نویسون اور سیاحون کی تصنیفات مین جو معلومات درج ہین، اُن کو اہم حیثیت حاصل ہے، اور ان مین سے بیشتر معلومات ہندوستان کی تاریخ کی اہم کڑی ہین، اور دوسرے ذرائع سے وہ معلومات کسی حال مین حاصل نہین ہوتے ہین، یہ مفید معلومات ہمارے لئے ہندوستان کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہین اور ہندوستان کے یورپین سیاحون کے سفرنامون کے مندرجات

سے بہت زیادہ قابلِ قدر ہیں، مرتب نے اس سفرنامہ کی اشاعت میں اس کے بعض ضروری حصے بھی حذف کر دیئے ہیں، باوجودیکہ افادی حیثیت سے اُن کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی،

دیباچہ کے بعد آنندرام مخلص کے سوانح حیات کا باب آیا ہے، اس ذیل میں اس کے مفصل حالات زندگی، اس کی تعلیمی و علمی زندگی، اُس کے ادبی عقائد، ظریفانہ بذلہ سنجی، اور اس کی تصنیفات کا جائزہ تفصیل سے لیا گیا ہے، اور اس کی ہر کتاب اور اُس کے مباحث کو پیش کیا گیا ہے، آخر میں سفرنامہ کا ذکر تفصیل سے آیا ہے، اور اس کے معلومات اور زبان پر مفید معلومات یکجا کئے گئے ہیں، پھر سفرنامہ میں جن اہم شخصیتوں کا ذکر آیا ہے، اُن کے متعلق معلومات اور دوسرے مآخذ سے فراہم کئے گئے ہیں اور اس سفرنامہ کے ضروری معلومات اس سلسلہ میں قلمبند ہوئے ہیں، آخر میں "مخصوص اصطلاحات" کے عنوان سے بعض ایسی اصطلاحوں کا مفہوم متعین کیا گیا ہے جن کا ذکر اس سفرنامہ میں آیا ہے، یہ معلومات اچھے خاصے اور قابلِ قدر، اور مرتب کے وسیع مطالعہ اور اخذ نتائج کے سلیقہ کے نشان ہیں، ۸۴ صفحوں میں یہ مقدمہ ختم ہوا ہے، اس کے بعد اصل سفرنامہ کا فارسی متن ہے، جو ۹۰ صفحوں میں آیا ہے، اور آخر میں چند صفحے اشاریہ کے منسلک ہیں،

مجموعی حیثیت سے یہ سفرنامہ ہندوستان کی تاریخ کے آخر دور کی اہم کڑی ہے، اُمید ہے کہ اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے گا،

اسلامی نظریۂ سیاست از جناب مولانا حیدر زمان صاحب صدیقی، ناشر مکتبۂ دین و دانش، کھنیان کنوان، بانکی پور، پٹنہ، حجم ۱۱۱ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت: ۱۲/-

مصنف نے اس میں اسلام کے نظام اجتماع و نظریۂ سیاست کو شرح و بسط سے پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اسلام کا نظام سیاست موجودہ طرز جمہوریت سے علحدہ امامت و خلافت کے صحیح معیار پر حریتِ عامہ و حریت فکر کے ساتھ قائم ہے، اسلام میں مفتوح اقوام سے جس سلوک سے پیش آنا

بین الاقوامی معاہدات کا احترام کرنا اس کی ہمہ گیر تعلیمات میں داخل ہے، آخر میں خلافتِ الٰہیہ کے دورِ سعادت کے عنوان سے ان مباحث پر فکر و بحث کی نظر ڈالی ہے، اور اسلام میں دین و سیاست، احیاء اسلامی آئمہ اسلام اور استقلال مرکز کے مقام کو دکھایا ہے، یہ پورا مقالہ کئی نمبروں میں ناظرینِ معارف کی نگاہ سے گذر چکا ہے، اب یہ رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا ہے، اور حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے اس پر دیباچہ لکھا ہے، جس میں سیاسیاتِ اسلام کے نظریے بیان کئے گئے ہیں، اور اسلام کے سیاسی اصولوں کو کتاب و سنت سے پیش کیا گیا ہو، اس سلسلہ میں اردو میں اسلامی سیاست اور دنیا کے دوسرے سیاسی نظام پر ابتداً جو تحریریں چھپی ہیں، انکا ذکر آیا ہے، اور یہ معلومات اس سلسلہ میں پہلی مرتبہ قلمبند ہوئے ہیں، امید ہے کہ اس رسالہ سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

حکومتِ الٰہیہ اور علماے مفکرین، مرتبہ جناب ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری، ضخامت ۲۵۸ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت للعہ پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن،

اس میں مؤلف نے تحریکِ حکومتِ الٰہیہ پر ملک کے ممتاز اربابِ علم کی تحریریں یکجا کی ہیں، ان مضامین سے اسلام کے سیاسی نظریہ، اسلامی نصب العین، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت، اور اس کے موجبات و اصول و مناہج پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ ایک پر معلومات کتاب ہے، جس میں اس موضوع پر اچھے سے اچھے اربابِ فکر علما کے خیالات قلمبند ہو گئے ہیں، اور ان کے تاثرات و جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ربع صدی میں ہمارے ہندوستان کے اربابِ فکر علما و قائدین کے شخصی رجحانات کیا رہے ہیں، اور حکومتِ الٰہیہ کی تحریک نے رفتہ رفتہ کیونکر نشو و نما پائی ہے، مضامین کے ایسے مجموعے ہمارے اندر غور و فکر کی عادت ڈالیں گے، اور ان سے ہم موجودہ اسلامی سیاست اور اس کے پسِ منظر کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، توقع ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

تصریحات از جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی اے ناشر مکتبہ نشاۃ ثانیہ چیل گوڑہ حیدرآباد دکن، حجم ۲۰۰ صفحے، قیمت ۱-عہ

تصریحات، مصنف کے متفرق مذہبی و ادبی مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے، "جمہوریت جدیدہ اور اسلام"، "ہندوستانی مسلمانوں کا تمدن"، "عربوں کا مستقبل"، "عقلیت پرستی پر ایک نظر"، "عقلیت جدیدہ اور اس کے خلاف بغاوت"، "اشتراکی مغالطے" اور "مذہب اور موجودہ مسلم سیاست" کے مضامین مسلمانوں کے لئے مستقل مطالعہ کی چیزیں ہیں جنہیں غور و فکر کی راہیں دکھائی گئی ہیں، امید ہے کہ یہ مضامین پوری دلچسپی سے پڑھے جائیں گے،

عہدِ عباسی، از جناب ڈاکٹر اس بی صمدی، لکچرر اسلامک کلچر لکھنؤ یونیورسٹی، پتہ اختر منزل، بیرروڈ لکھنؤ حجم ۱۰۸ صفحے،

مصنف نے اس میں عہد عباسی کی علمی و تمدنی زندگی کا جائزہ لیا ہے، اور عربوں کے علم، ادب، طریقۂ تعلیم، اور فنونِ لطیفہ پر تفصیلی نظر ڈالی ہے، عباسیوں کے عہد کے تمدنی مرقعے، اردو میں اس سے پہلے بھی مختلف تصنیفات میں پیش کئے جا چکے ہیں امید ہے کہ اس سلسلہ میں اس رسالہ کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

بیگمات اودھ کے خطوط از جناب مفتی انتظام الدین صاحب شہابی، ناشر مکتبۂ ادب، اردو بازار دہلی، حجم ۱۴۴ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت عہ

بیگمات اودھ کے خطوط، مخزن اسرار سلطانی کے نام سے اس سے پہلے چھپ چکے تھے، ان مرتب نے اس مجموعہ اور اپنے ذاتی کتب خانہ کے ایک نادر مجموعہ سے ان خطوط کو مرتب کیا ہے، یہ خطوط بیگمات اودھ کی طرف سے جان عالم سلطان واجد علی شاہ کے نام مٹیا برج میں ان کی نظر بندی کے زمانہ میں ان کے پاس بھیجے گئے تھے، یہ مراسلات سراپا ہجر د صال، اور اشتیاق ملاقات کی داستانیں ہیں، ان کا مجموعہ مولانا عبدالحلیم شرر کی نگاہ سے گذرا تھا، اور ان کا بیان ہے کہ میری

شاپردازی کا پہلا نصاب یہی تو دونامے تھے، جو ظاہری صورت اور باطنی رنگِ عبادت دونوں
نیتوں سے بہت ہی دلکش تھے، بعض خطوط میں ان کوششوں کا ذکر بھی آیا ہے، جو سلطان
احمد علی شاہ کی عدم موجودگی میں ان کے بعض شاہزادوں کو شاہ اودھ کے لقب سے تخت نشین کرنے کی
کی گئی تھیں، بہرحال یہ نادر مجموعہ ادبی حیثیت سے مطالعہ کے لائق ہے، اور اردو زبان کا ان سے صحیح لطف
حاصل ہوتا ہے، اس کے طرزِ ادا اور عبارت آرائی کا طریق وہی ہے، جو اس زمانہ میں مرزا رجب علی سرور
کے طرزِ تحریر میں نمایاں تھا، اُمید ہے کہ ارباب ذوق دلچسپی سے اس کا مطالعہ کریں گے،

اقبال خواتین کی نظر میں، مرتبہ جناب یکتا امروہوی حجم ۲۰۰ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ہے،
حکیم ذکی احمد صاحب، دفتر آتالیق انگریزی، کلان محل، دہلی،

ڈاکٹر سر اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور لکھا جائے گا، زیرِ نظر مجموعہ اس سلسلہ کی انوکھی
کڑی ہے، جس میں ملک کی مختلف خواتین نے اپنے زاویۂ نگاہ سے اقبال کو سمجھنے اور اپنی سمجھ کے مطابق
لکھنے کی کوشش ہے، اس طرح تقریباً ۲۴، ۲۵ خواتین کے مضامین کا یہ مجموعہ مرتب ہو گیا ہے،
جس میں اقبال کی شاعری پر دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں،

رُباعیاتِ محروم از جناب ملک چند محروم حجم ۱۴۴ صفحے، لکھائی جلی، طباعت اچھی
تقطیع چھوٹی، قیمت ۱-۲/ع پتہ مکتبۂ ادب (رجسٹرڈ) نمبر ۱۱ رام نگر لاہور۔

جناب ملک چند محروم دور متاخر کے اُن ہندو شعراے اردو میں ہیں، جن پر شاید اس دور کا خاتمہ ہو،
موصوف کی رباعیات ادبی صحیفوں میں بار ہا نظر آئی ہیں، اب وہ مجموعہ کی صورت میں شائع کی گئی ہیں، رباعیاں مختلف
عنوانوں حمد و مناجات، انسان، دنیا، فکر و نظر، جذبات نصائح میں تقسیم ہیں، پھر آخر میں چند متفرق
رباعیاں درج ہیں،

مناجات میں فرماتے ہیں،

اے خالقِ پاک اے خداوندِ کریم ... حقا کہ تو ہے قدیر و یکتا و قدیم
آلودۂ صد ملال ظلمت ہون مین ... تو نور و سرور کا ہے دریاے عظیم

اسی طرح فرماتے ہین :-

اے خالق ذو الجلال و رب غفور ... ہے تیرے کرم سے جلہ نیرنگ ظہور
ہے رحمتِ عام کارفرما تیری ... محروم ہون مین تو اس مین میرا ہی قصور

پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال نے اس مجموعہ پر اپنا دیباچہ سپرد قلم کیا ہے اور جناب محروم کے کلام کے خصوصیات دکھائے ہین، توقع ہے کہ اردو دان حلقہ مین اس کو عام قبولیت حاصل ہو گی،

جامِ نو، از جناب سید شاہ عنایت مولی تابان القادری، ناشر مکتبہ قادریہ نمبر ۴۴ خانقاہ شریف لین، کلکتہ نمبر ۱۴، حجم ۱۹۰ صفحے، قیمت :- ۱۲ / ۱ر

جام نو، کلکتہ کے جوان فکر نوجوان شعرار کے کلام کا مجموعہ ہے، اس گلدستہ کے مرتب جناب تابان قادری نے نوجوانون سے ان کے مختصر سوانح حیات اور کلام کا انتخاب مانگا، اور اس کو ان کی تصویرون کے ساتھ شائع کیا ہے، اس طرح اس مین کلکتہ کے شعرار کے خود نوشت حالات زندگی اور ان کے کلام کا انتخاب آگیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ ایک قابل قدر مجموعہ ہے،

قرآنی دعائین اور دعاے مسنونہ، مرتبہ جناب سردار احمد صاحب ناشر مکتبہ علمیہ جامع مسجد دہلی، حجم ۹۵ صفحے، قیمت عہ ر

اس مجموعہ مین قرآن مجید کی وہ دعائین جو مختلف انبیاے کرام کی زبان سے ادا ہوئی ہین نیز کتب احادیث سے مسنون دعائین یکجا کی گئی ہین، یہ دعائین مختلف عنوانون کے ساتھ مترجم درج ہین، اور مختلف دعاؤن کے طلب کرنے اور ان کے طلب کرنے کے خاص اوقات کا ذکر بھی آیا ہے؛

"ن"

اور تاریخی کتابین

تاریخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

مصنفہ: مولانا عبد السلام ندوی، ضخامت ۴۶۰ صفحے،

قیمت: عہ/۲

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسون اور تعلیم گاہون کا حال معلوم کرنا چاہین تو نہین مل سکتا، مولوی ابو الحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہون پر معارف مین ایک مقالہ لکھا تھا جس کو اہل نظر نے بے حد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت مین نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے،

ضخامت ۱۳۴ صفحے، قیمت: ۱۲/

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہین، وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائین،

اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یو پی نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ/

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،

ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ/

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے، تاکہ مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، اور ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے اور اب کیا ہین، ضخامت ۶۰ صفحے، قیمت: عہ/

مرتبہ: مولوی عبد السلام قدوائی، ندوی،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشاء کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر، خود عالمگیر کے خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

۲۹۰ صفحے، قیمت: للعہ/

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، ان سے ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، مرتبہ: سید نجیب اشرف ندوی ایم اے،

ضخامت: ۴۸۰ صفحے،

قیمت: سے/

سوانح

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل، اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنف نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیاں، اور معترضین کے جوابات، قیمت: ہے، ضخامت ۳۲۹ صفحے، طبع سوم با اضافہ حواشی، (از مولانا سید سلیمان ندویؒ)

سیر عمرؒ بن عبد العزیز

حضرت عمرؒ بن عبد العزیز خلیفہ اموی کے سوانح حیات اور اُن کے مجددانہ کارنامے، ضخامت ۲۰۲ صفحے، قیمت: عہ، از مولانا عبد السلام ندوی،

حیات امام مالکؒ

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی کتاب موطائے امام مالکؒ پر تبصرہ، قیمت: - عہ، (۱۰۶ صفحے) از مولانا سید سلیمان ندوی،

الغزالی

امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کا فلسفہ اور علم کلام، اخلاق اور تصوف مین اُن کے مجددانہ کارنامے ضخامت ۲۲۵ صفحے، قیمت: عہ، از مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرامؓ کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہو، اس مین چیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت: - ۵۰۶ صفحے، قیمت: - للعہ

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۱

اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

اردو مین اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب نہین تھی جس مین تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر حکومتون کی سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ہو، اس لئے دار المصنفین تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ خاص اہتمام سے مرتب کرا رہا ہے، جس کے بعض حصے یہ ہین، اور بعض زیر طبع ہین، اور اکثر زیر تالیف و تکمیل ہین، جو بتدریج جیسے جیسے حالات مساعد ہون گے شائع ہوتے رہین گے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ)
اس مین آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مفصل مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے (زیر طبع)
ضخامت: ۴۸۰ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصۂ دوم، (بنو امیہ) اس مین اموی حکومت کی صد سالہ سیاسی و علمی و تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے،
ضخامت ۴۳۴ صفحے، قیمت: سے ر

تاریخ اسلام حصۂ سوم، (تاریخ بنی عباس جلد اوّل)
اس مین خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے خلیفہ ابو اسحٰق متقی للہ ۳۳۳ھ تک دو صدیون کی بہت مفصل سیاسی تاریخ ہے، ضخامت ۵۰۴ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ اسلام حصۂ چہارم (تاریخ بنی عباس جلد دوم)
اس مین خلیفہ مستکفی باللہ کے عہد ۳۳۳ھ سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۶۵۶ھ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ ہے،
ضخامت ۴۳۲ صفحے، قیمت: صہ ر

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ اوّل، اس مین عثمان اوّل سے مصطفٰے رابع تک سلطنت عثمانیہ کے چھ سو برس کے کارنامون کی تفصیل ہے، ضخامت: ۵۰۰ صفحے
قیمت: سے ر

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارنامون کی تفصیل، از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء تا جنگ عظیم ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء
ضخامت: ۴۶۸ صفحے، قیمت: صہ ر

مرتبہ مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے علیگ سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈہ،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات، سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، حکومت کا قیام، اور عہد بعہد کی ترقیون اور عروج کی پوری اور مفصل داستان ہے،
۴۷۵ صفحے، قیمت: للعہ

تاریخ صقلیہ حصۂ دوم، یہ سسلی کے تمدنی و علمی ترقیون کا مرقع ہے، جس مین عہد بعہد کے مفسرین، محدثین، فقہاء، ادباء و شعراء کے مفصل حالات اور ان کی تصنیفات کا ذکر ہے،
۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ

مرتبہ: مولانا سید ریاست علی ندوی،

مسعود علی ندوی — **منیجر** — **دار المصنفین اعظم گڈہ**

جلد ۶۰ ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ہندوستان کے محبِ وطن سالہا سال سے آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے، اور اس کی قربان گاہ پر عزیز سے عزیز متاع نثار کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن اس کے ملتے ہی جن حالات سے دوچار ہونا پڑا، اس سے مستقبل کے سارے خوش آیند تصورات خوابِ پریشاں بن کر رہ گئے، ہندوستان آزادی، انصاف اور رواداری کا علم بلند کر کے ایشیا کی رہبری کا پیام لے کر اٹھا تھا، مگر آج وہ اپنے گھر میں لگی ہوئی آگ کو بھی بجھانے پر قادر نہیں، انڈین یونین اور پاکستان دونوں اپنی برادرکشی، قتل و غارتگری، اور جنون آمیز درندگی کی رسواکن حرکتوں سے اپنے عہد غلامی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہیں،

برطانوی حکومت کے ۳ جون کے اعلان کو سیاسی جماعتوں نے اس توقع سے قبول کیا تھا کہ فرقہ وارانہ نزاعیں ختم ہو جائیں گی، اور دونوں نو آبادیوں کو اپنے دائرہ میں ترقی کے مواقع ہاتھ آئیں گے، لیکن حد بندی کمیشن کے فیصلہ کے شائع ہوتے ہی گویا اس کے خرمن پر بجلی گر پڑی، اور فسادوں کی لہر جو پہلے سے موجود تھی اس تیزی سے آگے بڑھی، اور ایسے ہولناک حادثات رونما ہوئے کہ بنگال و بہار کی المیہ داستانیں بھی ماند پڑ گئیں، ہزاروں ہزار معصوم بچے اور بے زبان عورتیں نوکِ شمشیر کا نشانہ بنیں، لاکھوں لاکھ انسان بے خانماں برباد ہوئے، آبادیوں کی آبادیاں اور محلوں کے محلے جلا کر خاکستر کئے گئے، اور سیکڑوں میل کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اجاڑ دی گئیں، ـــــ ہر قتل، غارتگری، اور فتنہ انگیزی کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے لیکن یہ اتنا بڑا المیہ پیش آیا، کہ اس کے مقصد کی کوئی صحیح تعیین نہیں کی جا سکتی، سوا اس کے کہ مجنون انسانوں نے اپنے جاہلانہ جوش جنون میں اپنے وحشیانہ جذبۂ انتقام کی پیاس کو بجھایا، مگر مآل کار انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا،

انڈین یونین اور پاکستان کے ہندو اور مسلمان اپنی آبادی کے جس تناسب سے ہیں، یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی کسی دوسرے فرقہ کے افراد کو اس طرح ختم کر سکتا ہے، کہ اس مذہب کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہ جائے، بعض کوتاہ بینوں کے سامنے سسلی اور اندلس کی مثالیں ہیں، ہندوؤں کی بعض نو قائم جماعتیں قتل و غارتگری سے اس تاریخ کو دہرانا چاہتی ہیں، اور بعض نادان مسلمانوں کا ایک طبقہ شدت خوف سے انہی مثالوں کو سامنے رکھ کر لرزاں و ترساں اور سر چھپانے کے لئے کسی مامون جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہے،

مگر یہ اس راہ سے سوچنے والوں کی صریح نادانی ہے، وہ اس کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر مسلمان سسلی اور اسپین سے ایک ایک کر کے نکل آئے، تو دوسرے راستے سے انھوں نے اس برّ اعظم کی سب سے عظیم الشان سلطنت یعنی دہلی کی شہنشاہی کو ختم کر دیا، وہ اپنی ان سے بہت کم قوتوں کو سسلی اور اسپین کی بازیافت میں لگا کر کامیاب ہو سکتے تھے، مگر اس وقت کی بساط سیاست کا نقشہ کچھ اور تھا، اس کے مطابق انھوں نے عمل کیا، پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل سے سالہا سال تک جن نظریوں کی مخالفت کرتے رہے، اپنے ان مسوّدہ نے تخیل یعنی نازی اصولوں کے مطابق وحدانی ہندو قوم اور وحدانی ہندو حکومت سے انہی کو تقویت پہنچا رہے ہیں، ایسی حکومتوں کی کوششیں نہ انڈین یونین میں کامیاب ہو سکتی ہیں اور نہ پاکستان میں،

دلی کا المیہ سب سے زیادہ اندوہناک ہے، یہ غریب معلوم نہیں کتنی مرتبہ لٹی، اور آباد ہوئی، اگرچہ اس کی ہر بربادی ایک نئی آبادی کا پیش خیمہ بنی، مگر اس کی پچھلی بربادیاں سلطنت کے انقلاب کے لئے تھیں، اس مرتبہ سلطنت کے انقلاب کے بعد یہاں عوام نے عوام کو قتل کیا، اور ایسی تباہی آئی، کہ ۱۸۵۷ء کی تباہیوں کی یاد تازہ ہو گئی، دلی کے اس المیہ میں وہاں کے ممتاز علمی و ادبی اداروں کے قیمتی ذخیروں کو بھی شدید نقصان پہنچا، جامع مسجد کے اردو بازار کے مرکزی تجارتی کتب خانوں پر معلوم نہیں کیا افتاد گذری، لیکن جامعہ ملیہ کے قیمتی کتب خانہ (قرول باغ) اور اس کے ترقی یافتہ تجارتی مکتبہ کو نذرِ آتش کر دیا گیا، ندوۃ المصنفین کے ماہنامہ برہان کا مکتبہ لوٹ لیا گیا، بوڑھی انجمن ترقی اردو ہند مرکزی دفتر اور اس کے تجارتی کتب خانہ کو بھی تباہ کر دیا گیا، کیا یہ بربادیاں اسکندریہ کے کتب خانہ کی بربادی سے کم ہیں جن کا صدیوں تک ماتم کیا جا چکا ہے،

قتل و غارتگری کا یہ نا تمنا ہی سلسلہ رُک سکتا ہے، اگر گذرے ہوئے واقعات کو فراموش کیا جائے الزام دہی کے سلسلہ کو روکا جائے، ہندو مسلمانوں اور سکھوں میں سے کون فرقہ ہے جس کی بڑی تعداد کے ہاتھ اس خون سے رنگین نہیں، پھر ایک دوسرے پر الزام رکھنے سے کیا حاصل؟ ان میں سے ہر فرقہ کو عصبیت سے بلند ہو کر اپنی انسانیت سوز حرکتوں کا جائزہ لینا اور قاتلوں کے ہاتھ کے بجائے خود اپنے رنگین ہاتھوں کو دیکھنا ہے، یہ جو کچھ ہو رہا ہے نہ ہندو مت کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے اور نہ گرو نانک جی نے ایسی وحشیانہ حرکتوں کی کبھی تلقین کی ہے، مگر یہ کیا ستم ہے کہ یہ سب کچھ مذہب اور دھرم ہی کے نام اور اسی کے خاطر کیا جا رہا ہے، اور اسی کو قومی برتری اور دین اور دھرم کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اگر ہم میں واقعی مذہبی درد اور قومی ہمدردی ہے تو ہمیں اپنے دین اور دھرم کی تعلیمات پر نگاہ رکھنی چاہئے اور اسی سے وہ راہ ثواب مل سکتی ہے جو امن و امان کی منزل تک پہنچا سکیگی،

بہار کے سانحہ کے موقع پر مظلوموں کو ترکِ وطن کا مشورہ دیا گیا تھا، اور ہزاروں ہزار مسلمانوں نے اس صدا کو لبیک کہا تھا، پھر تھوڑے سے سکون کے بعد انھیں بہار میں واپس لانے کی تحریک اٹھائی گئی، اور بہت سے لوگ

شکستہ حالی کے ساتھ واپس لائے گئے، اب موجودہ خونریز حادثات سے مسلم عوام میں ترک وطن کے جذبات نئے سر سے ابھر پڑے ہیں، اور ان میں عام سراسیمگی اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے، کیا مسلمان جہاں گئے، شمشیر کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر گئے، یا جہاں رہے تلوار کے سایہ میں پناہ گزین رہے، حبشہ پر مسلمانوں نے کبھی چڑھائی نہیں کی، مگر وہاں آدھی سے زیادہ آبادی مسلمان ہے، افریقہ کے بہتیرے مقامات ہیں، جہاں مسلمان سپاہیوں کی تلوار نہیں پہنچی مگر وہاں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں قائم ہیں، چین پر مسلمانوں نے کبھی لشکرکشی نہیں کی، مگر نین چار کرور مسلمان وہاں نامسلمان چینیوں کے ساتھ امن کی زندگی گذار رہے ہیں، انڈونیشیا کبھی کسی مسلمان تاجدار کے زیرنگین نہیں آیا، مگر وہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے، خود ہندوستان میں بنگال، کشمیر اور سندھ اسلامی دارالسلطنت کی سطوت سے دور رہ کر مگر وہاں آج بھی غالب اکثریت موجود ہے، ان کے برخلاف آگرہ، دلی، اودھ مسلمان سلاطین اور ان کی تہذیب و تمدن کے مرکز تھے، مگر مسلمانوں کی آبادی دس فی صدی سے آگے نہیں بڑھی، پھر انڈین یونین کے مسلمانوں کے لیے کون سی بات ہے کہ وہ اپنی عظیم تعداد میں ہونے کے باوجود سراسیمہ اور پریشان ہیں؟

ہم نے مسلمانوں کو اس وقت بھی مشورہ دیا تھا، اور آج بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ دلجمعی سے اپنے وطن میں جمے رہیں، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ راستے پرخطر ہیں، نقل مکانی کی جرأت کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ان سال دو سال گذرنے کے بعد جب حالات میں سکون پیدا ہو جائے، منافرت کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں، بربریت کا دور ختم ہو جائے اور لوگ انسانیت کی عزت کرنا سیکھ لیں، تو پھر دل کے پورے سکون اور طمانیت کے ساتھ غور و فکر کی راہیں کھلی رہیں گی، اور جسے اپنے کسی پسندیدہ ملک میں جانا ہوگا تو وہ جا سکیگا، اور اپنے ماحول کے اعتبار سے اپنی سہولتیں حاصل کر سکے گا،

موجودہ حالات میں مستقبل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم رہنا، دشوار ہے، اس وقت انڈین یونین یا پاکستان کے صوبوں کی اسمبلیوں یا مجالس بلدیات میں کثرت رائے سے جو فیصلے ہو رہے ہیں، انھیں ہم پائدار نہیں سمجھتے، اس پرآشوب زمانہ میں ان فیصلوں اور اقداموں میں جا ہے، وہ جتنی بھی اچھی ہوئی ہوں، مگر غم و غصہ، نفرت اور انتقام کی تلخیاں موجود ہیں، حالات کے پرسکون ہونے کے بعد ہو سکتا ہے، کہ یہ فیصلے عقل و خرد کی ترازو پر نئے سرے سے تولے جائیں، اور دلائل کا وزن ان کو اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرے، لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا،

جلد ۶۰ ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۴۷ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ہندوستان کے محب وطن سالہا سال سے آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے، اور اس کی قربان گاہ پر عزیز سے عزیز متاع نثار کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن اس کے ملتے ہی جن حالات سے دوچار ہونا پڑا، اس سے مستقبل کے سارے خوش آیند تصورات خواب پریشاں بن کر رہ گئے، ہندوستان آزادی انصاف اور رواداری کا علم بلند کرکے ایشیا کی رہبری کا پیام لے کر اٹھا تھا، مگر آج وہ اپنے گھر میں لگی ہوئی آگ کو بھی بجھانے پر قادر نہیں، انڈین یونین اور پاکستان دونوں اپنی برادرکشی، قتل و غارتگری، اور جنون آمیز درندگی کی رسواکن حرکتوں سے اپنے عہد غلامی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہیں،

—————— ·○·<(○)>·○· ——————

برطانوی حکومت کے ۳ رجون کے اعلان کو سیاسی جماعتوں نے اس توقع سے قبول کیا تھا کہ فرقہ وارانہ نزاعیں ختم ہو جائیں گی، اور دونوں نوآبادیوں کو اپنے دائرہ میں ترقی کے مواقع ہاتھ آئیں گے لیکن حد بندی کمیشن کے فیصلہ کے شائع ہوتے ہی گویا اس کے خرمن پر بجلی گر پڑی، اور فسادوں کی لہر جو پہلے سے موجود تھی اس تیزی سے آگے بڑھی، اور ایسے ہولناک حادثات رونما ہوئے کہ بنگال و بہار کی المیہ داستانیں بھی ماند پڑ گئیں، ہزاروں ہزار معصوم بچے اور بے زبان عورتیں نوک شمشیر کا نشانہ بنیں، لاکھوں لاکھ انسان بے خانماں برباد ہوئے، آبادیوں کی آبادیاں اور محلوں کے محلے جلا کر خاکستر کئے گئے، اور سیکڑوں میل کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اجاڑ دی گئیں، —— ہر قتل، غارتگری، اور فتنہ انگیزی کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے لیکن یہ اتنا بڑا المیہ پیش آیا، کہ اس کے مقصد کی کوئی صحیح تعیین نہیں کی جا سکتی سوائے اس کے کہ مجنون انسانوں نے اپنے جاہلانہ جوش جنون میں اپنے وحشیانہ جذبۂ انتقام کی پیاس کو بجھایا، مگر مآل کار انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا،

—————— ·○·<※>·○· ——————

انڈین یونین اور پاکستان کے ہندو اور مسلمان اپنی آبادی کے جس تناسب سے ہیں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی کسی دوسرے فرقہ کے افراد کو اس طرح ختم کر سکتا ہے، کہ اس مذہب کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہ جائے بعض کوتاہ بینوں کے سامنے سسلی اور اندلس کی مثالیں ہیں، ہندوؤں کی بعض نو قائم جماعتیں قتل و غارتگری سے اس تاریخ کو دہرانا چاہتی ہیں، اور بعض نادان مسلمانوں کا ایک طبقہ شدت خوف سے انہی مثالوں کو سامنے رکھ کر لرزاں و ترساں اور سر چھپانے کے لئے کسی مامون جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہے،

مگر یہ اس بات پر سوچنے والوں کی عبرت کا سامان ہے، وہ اس کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر مسلمان سسلی اور اسپین سے ایک ایک کر کے نکل آئے، تو دوسرے راستے سے انھوں نے اس برّ اعظم کی سب سے عظیم الشان سلطنت یعنی مغلیہ شہنشاہی کو ختم کر دیا، وہ اپنی ان سے بہت کم قوتوں کو سسلی اور اسپین کی بازیافت میں لگا کر کامیاب ہو سکتے تھے، مگر اس وقت کی بساط سیاست کا نقشہ کچھ اور تھا، اس کے مطابق انھوں نے عمل کیا، پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے سالہا سال تک جن نظریوں کی مخالفت کرتے رہے، اپنے ان سپوتوں نے تخیل یعنی نازی اصولوں کے مطابق وحدانی ہندو قوم اور وحدانی ہندو حکومت سے انہی کو تقویت پہنچا رہے ہیں، ایسی حکومتوں کی کوششیں نہ انڈین یونین میں کامیاب ہو سکتی ہیں اور نہ پاکستان میں،

دلی کا المیہ سب سے زیادہ اندوہناک ہے، یہ غریب معلوم نہیں کتنی مرتبہ لٹی، اور آباد ہوئی، اگرچہ اس کی ہر بربادی ایک نئی آبادی کا پیش خیمہ بنی، مگر اس کی پچھلی بربادیاں سلطنت کے انقلاب کے لئے تھیں، اس مرتبہ سلطنت کے انقلاب کے بعد یہاں عوام نے عوام کو قتل کیا، اور ایسی تباہی آئی کہ ۵۷ء کی تباہیوں کی یاد تازہ ہوگئی، دلی کے اس المیہ میں وہاں کے ممتاز علمی و ادبی اداروں کے قیمتی ذخیروں کو بھی شدید نقصان پہنچا، جامع مسجد کے اردو بازار کے مرکزی تجارتی کتب خانوں پر معلوم نہیں کیا افتاد گذری، لیکن جامعہ ملیہ کے قیمتی کتب خانہ (قرول باغ) اور اس کے ترقی یافتہ تجارتی مکتبہ کو نذر آتش کر دیا گیا، ندوۃ المصنفین کے ماہنامہ برہان کا مکتبہ لوٹ لیا گیا، بوڑھی انجمن ترقی اردو ہند کا مرکزی دفتر اور اس کے تجارتی کتب خانہ کو بھی تباہ کر دیا گیا، کیا یہ بربادیاں اسکندریہ کے کتب خانہ کی بربادی سے کم ہیں جن کا صدیوں تک ماتم کیا جا چکا ہے،

قتل و غارتگری کا یہ نا تمام ہی سلسلہ رک سکتا ہے، اگر گذرے ہوئے واقعات کو فراموش کیا جائے الزام دہی کے سلسلہ کو روکا جائے، ہندو مسلمانوں اور سکھوں میں سے کون فرقہ ہے جس کی بڑی تعداد کے ہاتھ اس خون سے رنگین نہیں، پھر ایک دوسرے پر الزام رکھنے سے کیا حاصل؟ ان میں سے ہر فرقہ کو عصبیت سے بلند ہو کر اپنی انسانیت سوز حرکتوں کا جائزہ لینا اور قاتلوں کے ہاتھ کے بجائے خود اپنے رنگین ہاتھوں کو دیکھنا ہے، یہ جو کچھ ہو رہا ہے نہ ہندومت کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے اور نہ گرو نانک جی نے ایسی وحشیانہ حرکتوں کی کبھی تلقین کی ہے، مگر یہ کیا ستم ہے کہ یہ سب کچھ مذہب اور دھرم ہی کے نام اور اسی کے خاطر کیا جا رہا ہے، اور اسی کو قومی برتری اور دین اور دھرم کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اگر ہم میں واقعی مذہبی درد اور قومی ہمدردی ہے تو ہمیں اپنے دین اور دھرم کی تعلیمات پر نگاہ رکھنی چاہئے اور اسی سے وہ راہ ثواب مل سکتی ہے جو امن و امان کی منزل تک پہنچا سکیگی،

بہار کے سانحہ کے موقع پر مظلوموں کو ترکِ وطن کا مشورہ دیا گیا تھا، اور ہزاروں ہزار مسلمانوں نے اس صدا کو لبیک کہا تھا، پھر تھوڑے سے سکون کے بعد انھیں بہار میں واپس لانے کی تحریک اٹھائی گئی، اور بہت سے لوگ

شکستہ حالی کے ساتھ واپس لائے گئے، اب موجودہ خونریز حادثات سے مسلم عوام میں ترک وطن کے جذبات نئے سر سے ابھر پڑے ہیں، اور ان میں عام سراسیمگی اور پریشانی پھیلی ہوئی ہے، کیا مسلمان جہاں گئے شمشیر کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر گئے، یا جہاں رہے تلوار کے سایہ میں پناہ گزین رہے، حبشہ پر مسلمانوں نے کبھی چڑھائی نہیں کی، مگر وہاں آدھی سے زیادہ آبادی مسلمان ہے، افریقہ کے بہت سے مقامات ہیں جہاں مسلمان سپاہیوں کی تلوار نہیں پہنچی مگر وہاں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں قائم ہیں، چین پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہیں کی، مگر وہیں جا کر ور مسلمان وہاں نامسلمان چینیوں کے ساتھ امن کی زندگی گذار رہے ہیں، انڈونیشیا کبھی کسی مسلمان تاجدار کے زیرنگین نہیں آیا، مگر وہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے، خود ہندوستان میں بنگال، کشمیر اور سندھ اسلامی دارالسلطنت کی سطوت سے دور رہ کر مگر وہاں آج بھی غالب اکثریت موجود ہے، ان کے برخلاف آگرہ، دلی، اودھ مسلمان سلاطین اور ان کی تہذیب و تمدن کے مرکز تھے، مگر مسلمانوں کی آبادی دس فی صدی سے آگے نہیں بڑھی، پھر انڈین یونین کے مسلمانوں کے لئے کون سی بات ہے کہ وہ اپنی عظیم تعداد میں ہونے کے باوجود سراسیمہ اور پریشان ہیں ؟

ہم نے مسلمانوں کو اس وقت بھی مشورہ دیا تھا، اور آج بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ دلجمعی سے اپنے وطن میں جمے رہیں، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ راستے پرخطر ہیں، نقل مکانی کی جرات کرنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، ہاں سال دو سال گذرنے کے بعد جب حالات میں سکون پیدا ہو جائے، منافرت کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں، بربریت کا دور ختم ہو جائے اور لوگ انسانیت کی عزت کرنا سیکھ لیں، تو پھر دل کے پورے سکون اور طمانیت کے ساتھ غور و فکر کی راہیں کھلی رہیں گی، اور جسے اپنے کسی پسندیدہ ملک میں جانا ہوگا تو وہ جا سکیگا، اور اپنے ماحول کے اعتبار سے اپنی سہولتیں حاصل کر سکے گا،

موجودہ حالات میں مستقبل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم رہنا، دشوار ہے، اس وقت انڈین یونین یا پاکستان کے صوبوں کی اسمبلیوں یا مجالس بلدیات میں کثرت رائے سے جو فیصلے ہو رہے ہیں، انھیں ہم پائدار نہیں سمجھتے، اس پرآشوب زمانہ میں ان فیصلوں اور اقداموں میں جا ہے، وہ جتنی بھی اچھی ہوئی ہوں، مگر غم و غصہ، نفرت اور انتقام کی تلخیاں موجود ہیں، حالات کے پرسکون ہونے کے بعد ہو سکتا ہے، کہ یہ فیصلے عقل و خرد کی ترازو پر نئے سرے سے تولے جائیں، اور دلائل کا وزن ان کو اپنے فیصلوں کے بدلنے پر مجبور کرے، لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا،

مقالات

سیاسیاتِ اسلام کے نظریے

از

سید سلیمان ندوی

"حضرۃ الاستاذ مدظلہ کا یہ مقالہ رسالہ "اسلامی نظریۂ سیاست" میں جس پر پچھلے مہینہ میں معارف میں تبصرہ کیا گیا تھا، بطور مقدمہ شائع ہوا ہے، اب ذیل میں اس کو ناظرینِ معارف کے استفادہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے،" "س"

علم کلام وہ فن ہے جس میں اصول دین کی حمایت کی جائے، اور معترض ان پر جو شکوک و شبہات وارد کریں، ان کو دفع کیا جائے لیکن کسی چیز کی حمایت و حفاظت ہر زمانہ میں ایک ہی طور سے نہیں کی جا سکتی، کیونکہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے، اس تغیر آباد عالم میں کسی چیز کو قرار نہیں، ہر وقت خیالات بدلتے رہتے ہیں، حسن و قبح کا انسانی معیار بدلتا رہتا ہے، چیزوں کی قدر و قیمت کا معیار بدلتا رہتا ہے، لیکن دین جو حقِ مطلق اور صداقتِ دائمی ہے، وہ ناقابلِ تغیر ہے، توحید، انبیاء، عالمِ غیب، احکامِ الٰہی آغازِ عالم سے اُن کے حقائق یکساں ہیں، اور یکساں رہیں گے، اسی طرح معاملات کی صداقت، اخلاق کی طہارت کا معیار ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، قتل ناحق اور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر تصرف میں لانا، جس کے انواع چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ ہیں، ہمیشہ ممنوع

رہے ہیں، اور رہیں گے، جھوٹ کا برا، اور سچ کا اچھا ہونا نہ کبھی بدلا ہے، اور نہ کبھی بدلے گا،

اوپر کی سطرون کا خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اور انسانی خیالات کا سیلاب ہمیشہ چڑھتا اُترتا رہتا ہے، ایک ہی چیز جو کبھی اعتراض کا مورد تھی دوسرے وقت مین مستحسن سمجھی جانے لگتی ہے، اور جو کبھی مستحسن تھی، وہ دوسرے وقت مین قابلِ اعتراض بن جاتی ہے،

غرض ان غیر متغیر دینی حقائق اور ان تغیر پذیر انسانی خیالات مین ایک کشا کش سی قائم رہتی ہے، علمِ کلام کا کام یہ ہے کہ اس کشا کش کو دور کرے لیکن اس کشا کش کو دور کرنے کا طریقہ بھی یکسان نہین رہ سکتا، کیونکہ زمانہ کے خیالات اور ہر کوشش کرنے والے کی دماغی ساخت، ذہنی قابلیت اور طریقِ فکر یکسان نہین ہوتا' اس لئے زمانہ کے تغیر اور ہر صاحبِ فکر کے طرزِ فکر کے اختلاف سے اس کشا کش اور تصادم کے رفع کرنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کا علمِ کلام دوسرے زمانہ کے علمِ کلام سے الگ رہا کیا ہے، کیونکہ حملون کی نوعیت کے بدلنے سے اُن کی مدافعت کی نوعیت بھی بدلنی ضرور ہے

کبھی آسمان کے خرق والتیام، جزءِ لایتجزیٰ، استطاعت مع الفعل وقبل الفعل، اور الواحد لایصدر عنہ الا الواحد کے مسائل نفیاً یا اثباتاً علم کلام کے اجزاء تھے، کبھی معجزات کا صدور نبوت کے ثبوت کا معیار تھا، کبھی قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت اس کی حقانیت کا آئینہ تھی، کبھی ان صداقتون کے ثبوت کے دوسرے معیار پیدا ہوگئے، چنانچہ کبھی خرقِ عادت کی کثرت کسی دین کے ثبوت کا ذریعہ تھی، اور کبھی خرقِ عادت کی سرے سے نفی دین کی صداقت کا معیار بنی، غرض کبھی یونانی فلسفیانہ خیالات کی عینک سے دین کو دیکھا گیا، کبھی اشراقی صوفیانہ نظریہ کی کسوٹی پر اس کو کسا گیا، کبھی منافع دنیاوی اور شواہدِ عقلی کی ترازو سے اُن کو تولا گیا، اور آج یورپ کے افکار و خیالات سے اُن کو جانچا جارہا ہے،

اسی جدید عہد کے متکلمین کی کوششون پر ایک نظر ڈالئے جو سید احمد خان اور مفتی عبدہٗ کے زمانہ سے آج کے دن تک میدان عمل مین آئے، تو معلوم ہوگا، کہ ہر وقفہ کا علم کلام دوسرے وقفہ سے الگ ہوتا رہا، سید صاحب اور مفتی عبدہٗ کا عہد وہ تھا جب سائنس کی ترقیون نے مادیت کا زور پیدا کیا، اور فطرت اور نیچر اور قواعد طبعی اور نیچرل لاز صداقت کا معیار بن گئے، معجزات کی نفی کی گئی یعنی اُن کی تاویل کی گئی، جنت و دوزخ اور عقائد ما بعد الطبعی کی باطنی تشریح کی گئی، اور اسلام کا نام فطرۃ الٰہیہ ایسے معنون مین رکھا گیا جن معنون مین نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے،

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب فطرت اور نیچر کے بجائے تمدن، تہذیب، حزم سلطنت اور رفاہ عام کے طور و طریق ایک دین کی صداقت اور معیاری ہونے کے دلائل ٹھہرائے گئے، یہ وہی زمانہ ہے جب الفاروق لکھی گئی، الجزیہ لکھا گیا، حقوق الذمیین ترتیب پائے، اسلامی شفاخانے، اور اسلامی کتب خانے وغیرہ مضامین اشرفیون سے تولے گئے،

اب گذشتہ جنگ عظیم نے جب کروٹ لی تو خیالات کی دنیا مین بھی تزلزل آیا، سیاسیات کے رنگ بدلے، اور انسانی حقوق کے نئے نقشے ترتیب پائے، پھر سوشلزم کی کامیاب وحدت نے جب روس کے تخت پر قبضہ کیا، تو اقتصادیات کے نئے نئے عقائد لوگون مین پھیلے، اور دینی حقائق کے معیار مین بھی ایک نئی تبدیلی آگئی،

صرف پچھلے ساٹھ ستر برس کے سیاسی تغیرات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ متکلمین اسلام نے کیا کیا پہلو بدلے، سرسید تک کی تحریرون مین شخصیت پرستی کا زور تھا، اور شخصی سلطنت ہی خیر و برکت کا موجب رہی، سید جمال الدین افغانی نے لکھا، کہ اسلام کی خیر شخصیت عادلہ مین ہے، اسی پچھلے زمانہ کے ایک بڑے عالم باعمل کی تحریرون مین شخصی بادشاہی کو عین منشاے اسلام ہونے کی تلقین بکثرت ملتی ہین،

لیکن ان دماغون نے جو ابتداے عہد جدید مین بیدار ہوئے، دستوری حکومت کو منشاے اسلام قرار دیا، اور پھر جمہوریت کا دور آیا، جس مین اسلامی حکومت کو جمہوریہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، ابھی اسی جنگ مین جب جرمنی مین ہٹلر، اور اٹلی مین مسولینی کا عروج تھا، اور بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ فسزم اس معرکہ مین کامیاب ہوکر نکلے گا، طبائع مین یہ میلان پیدا ہوگیا، کہ حکومتِ اسلامیہ کو ڈکٹیٹرشپ اور فسزم کے رنگ مین پیش کیا جائے، اب فسزم اور ڈکٹیٹرشپ کی ناکامی کے بعد پھر سوشلزم کا زور اُبھرنے لگا ہے، اور اب موجودہ وقت وہ ہے، جس کا علم کلام اسلام اور سوشلزم کے درمیان توفیق اور تطبیق ہے، بلکہ یہ ہے کہ سوشلزم کے مقابلہ مین اسلامی اصول سیاست واقتصاد کی برتری ثابت کی جائے،

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض ہے کہ آج تو اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے اہل قلم ہین لیکن ہندوستان مین سب سے پہلے راقم الحروف کو اس کی توفیق ملی، غالباً ۱۹۱۰ء مین "اسلام اور اشتراکیت" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون الندوہ مین سپرد قلم کیا، پھر اسی مضمون کو الہلال کلکتہ کی ادارت مین شمول کے بعد ۱۹۱۲ء مین "الحریۃ فی الاسلام" کے عنوان سے ازسرنو لکھا، جو الہلال کے کئی نمبرون[1] مین شائع ہوا، اس وقت تک اشتراکیت صرف تخیل اور نظریہ تھا، اوس نے کوئی عملی صورت اختیار نہین کی تھی، اس کی عملی صورت تو ۱۹۱۸ء سے ظاہر ہوئی جب جنگِ عظیم کے خاتمہ

---

[1] الہلال مین چونکہ مضمون نگارون کے نام نہین لکھے جاتے تھے، اس لئے الہلال کے مضمونون کے مجموعون کے شائع کرنے والون نے بلاتحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہین، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر نمبر اول وغیرہ میرے مضامین ہین، اسی طرح الحرب فی الاسلام اور کئی مضمون مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے ہین، اسوہ ابراہیم وغیرہ مضامین مولانا عبداللہ عمادی کے ہیں، فَآتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَہ،

کے قریب روس نے بالشویک انقلاب کو کامیاب کیا،

روسی بالشویکون کی کامیابی نے بہت سی قومون کے افکار میں ہیجان پیدا کر دیا، اور خصوصیت کے ساتھ محکوم قومون کے نوجوانون کے دل و دماغ مین ایسی شرر انگیزی پیدا کر دی ہے، کہ سوشلزم ان کا مذہب اور مارکس اور اینجل کی تصانیف اُن کا دینی صحیفہ بن گیا ہے، اور اُن کے اندر اُس کی اشاعت اور کامیابی کے لئے وہی جد وجہد اور ایثار و قربانی کی روح پیدا کر دی ہے، جو کبھی "مذہبی مجنونون" کا خاصہ تھا،

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی و اقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی، تو مسلمانون کو خیدان اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہلِ نظر جانتے ہین، کہ اُس کی تہ مین لادینی دعوت کام کر رہی ہے، وہ "قیصر" اور "خدا" دونون کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اُتار رہا اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونون کو برباد کر ڈھانا چاہتی ہے، اور بقولِ اقبال یہ وہ دین ہے، جس کا کلمہ لا الہ اور لا ملک ہے، اور اسلام کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ اور لا ملک الا اللہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ سوشلزم ایک تخریبی تحریک اور اسلام ایک تعمیری دعوت ہے، لیکن ایک حیثیت سے یہ مسئلہ کلام کے علمی و نظری تنگناے سے نکل کر عملی زندگی کا معاملہ بن گیا ہے،

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی، بنی اُمیّہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا، اور عباسیہ نے تہذیب و تمدن وآداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا، اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین نوشیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا، وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد

بنی تھے، اس لئے ہماری یہ پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کی تو ضرور تھین، مگر اسلام کی نہ تھین یعنی اُن کے فرمانروا مسلمان تھے، مگر اُن کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا، جس طرح آج انگریزی عہد مین بھی محمڈن لا جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہین ہو سکتی تھی، تو کل صرف نکاح و طلاق و وقف وغیرہ قوانین کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہین ہوسکتی، الایہ کہ اس کے استعمال مین ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہین۔

یہ کہنا صحیح نہین کہ مسلمانون نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان لیا، جنگ جمل جنگ صفین، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرہ جس مین اہل مدینہ نے بنو امیہ کے خلاف لڑائی لڑی، واقعہ قراء جس مین علماے عراق نے بنو امیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی، واقعہ نفس زکیہ جس مین سادات و علماے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پرزور بغاوت کی، یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن مین اصلاح و انقلاب کے علمبردارون کو کامیابی نہین ہوئی، خونریزی اور فتنون کا دروازہ کھول دیا، اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہاء نے یہ اصول بنا لیا کہ ہر اصلاح طلبی مین یہ دیکھنا چاہئے کہ فتنون کے نئے دروازے تو نہین کھلتے، اور حالات بد سے بدتر تو نہین ہو جائین گے،

ان اصلاح طلبون اور انقلابیون کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی، کہ انقلاب سے پہلے انھون نے انقلاب کی دعوت کا دور اپنے اوپر نہین گذارا، اور زمین مین ہل چلانے سے پہلے زمین مین تخم ریزی شروع کردی، آخر اسی زمانہ مین ابومسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا، اور اسماعیلیون کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی، اور محمد بن تومرت کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی، کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی، اور پھلی، اور پھولی اور مدتوں قائم رہی، زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کر دیئے ہین، ہر جگہ شخصی سلطنتون کے

تخت خالی ہوگئے، دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہورہی ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی اصولِ سلطنت پر کوئی سلطنت قائم کیوں نہیں ہوسکتی، اس راہ کے جو موانع ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- مسلمان ملکوں کا بڑا حصہ نامسلمانوں کے قبضہ میں ہے، اس لئے ان مسلط قوتوں سے ٹکرائے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہوسکتی،

۲- مسلمان ملکوں میں جو آزاد بھی ہیں، وہ نامسلمانوں کی سیاست اور مادی و ذہنی برتری کے سامنے عاجز و درماندہ ہیں یعنی اُن کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں، وہ انہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، انہی کے کانوں سے سنتے ہیں، وہ اُسی کو خیر سمجھتے ہیں جس کو یورپ خیر سمجھتا ہے، اور اسی کو شر جانتے ہیں جس کو یورپ شر کہتا ہے،

۳- اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی سیاست و حکومت کے آئین، و اصول و دستور سے خود مسلمان واقف نہیں، صدیوں کی ظلمت و جہالت نے اسلام کے نور پر پردے ڈال دیئے ہیں اور قیصریکو کسرٰی و خاقانی دستور و آئین میں اسلامی آئین اس طرح مخفی ہوگیا ہے، کہ آج ہم کو اس قیصریت و کسرائیت میں جس کو مٹانے کو اسلام آیا تھا، اور اسلام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، اسلامی حکومت و سیاست کے مولفین میں بڑا نام قاضی ماوردی شافعی کا ہے، وہاں بھی اصل حقیقت مستور ہے، ایک دوسرے حنبلی عالم کی کتاب بھی چھپ گئی ہے، اس میں بھی حقیقت کا پتہ نہیں، ابن خلدون کے مقدمہ میں بہت کچھ ہے، مگر ماضی کی داستان سرائی نے حال و مستقبل پر پردہ ڈال دیا ہے

حق یہ ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مصلح اعظم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے، ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء صرف علم کلام اور مناظرہ کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اسلامی اصول سیاست و خلافت پر بڑی دقیق اور محققانہ کتاب ہے، لیکن مطالب دوسرے

مضامین کے ساتھ متفرق اور بکھرے ہوئے ہیں، مولانا اسمٰعیل شہید پہلے شخص ہیں جنھون نے منصب امامت مین اسلامی اور غیر اسلامی اصول وآئین حکومت کو خالص کرکے دکھایا، اور مسلمانون کی حکومتون اور سلطنتون کے مدارج اور مراتب مقرر کئے،

اب جب مسلمانون کی آنکھین کھلی ہین، تو نظر آتا ہے، کہ یورپ کے پیدا کردہ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ نے ایسی اہمیت پیدا کرلی ہے، اور وہ دماغون پر اس طرح مسلط ہے، کہ ان ملکون مین جہان مسلمان اقلیت مین ہین، اپنے لئے کسی اصول وآئین کا قیام اُن کو سرتاسر محال نظر آتا ہے، اور جہان وہ اکثریت مین ہین، یورپ کے پیدا کردہ مسئلۂ وطنیت نے اُن کو از خود فراموش بنا رکھا ہے، اور مسلمان کی زندگی ان دونون باطل نظریون اور عقیدون کے نذر ہو رہی ہے، اور ہندوستان کی وہ اسلامی تحریک جو ان دونون سے خودداراً نہ علحدگی چاہ رہی ہے، وہ ابھی تک ایجابی کے بجائے سلبی قوت ہے، اور دائمی اور پائیدار زندگی ایجابی وتعمیری قوت کے اندر مضمر ہے، بہرحال توقعات قائم ہین، اصلاح کی کوششین جاری رہین، تو ممکن ہے، کہ دوسرون کی نقالی کے بجائے خود اپنے اسلاف اولین کے کارنامون پر نظر پڑے، اور یونانی ورومانی قانون وطریق عدل کی جگہ کتاب وسنت اور قانون اسلام کی اتباع کا شوق پیدا ہو، لیکن اس کے لئے اصلاحی جدوجہد اور اسلامی سیاسیات پر صالح لٹریچر لکھ کر پھیلانے کی ضرورت ہے،

اس موقع پر ایک واشگاف بات کہنی ضرور ہے، بعض اہلِ قلم اس بات کی کوشش کررہے ہین، کہ موجودہ جمہوریت کے اصول وآئین کو ایک ایک کرکے لین اور اس کا سُراغ اسلام مین لگائین اور اسلامی شریعت کی دلیلون سے ثابت کرین،

دوسری طرف یہ کوشش جاری ہے، کہ خلافتِ راشدہ کے انتخابی وانتظامی طریقون کو ڈھونڈھا ڈھونڈھ نکالین، اور ان کو جامد اصول کی طرح تسلیم کرلین، جیسا کہ ہمارے متکلمین اور فقہاے سیاست نے

خلفائے اربعہ اور امیر معاویہؓ کے طریق انتخاب اور تسلط و استیلا کو ہمیشہ کے لئے دائمی اصول قرار دے لیا گیا، حالانکہ پیش آجانے والے واقعے کسی مذہب کے ایسے مقررہ اصول نہیں بن سکتے جن میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی جس طرح جہاد فرض ہے، اور اس کے آلات جو عہد خلافت میں رائج تھے، حملہ اور دفاع کے آلات اُن میں محدود نہیں، زمانہ کے حالات کے ساتھ ان میں ترقی اور تغیر ممکن ہے،

انتخاب کے نئے آئین بن سکتے ہیں، قانون سازی اور اختلاف آرار کے موقع پر فیصلہ کے طریقوں میں نئی راہیں نکالی جاسکتی ہیں، اجماع اور قیاس کے مدونہ اصولوں کے بہت سے نئے فیصلوں کی گنجائش ہے، مگر ضرورت ہے کہ یہ سب کچھ کتاب و سنت، قضایائے خلفائے راشدینؓ اور مسلمات فقہائے اسلام پر اسی طرح مبنی ہوں، جس طرح یورپ کے ہر قانون کی بنیاد رومن لا کے اصولوں پر ہے،

ہم نے جہاں تک اسلام کے سیاسی اصولوں کا جو کتاب و سُنت میں پھیلے ہیں، مطالعہ کیا ہے، یہ چیز نظر آتی ہے، کہ چند بنیادی اصول ایسے ہیں، جو اسلام میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے انحراف ممکن ہی نہیں، مثلاً یہ کہ

۱۔ خلیفہ کے انتخاب میں کہ وہ بہتر سے بہتر ہو جتنی کاوش ممکن ہو کی جائے، پھر انتخاب کے بعد اس کے احکام کی جو کتاب و سُنت اور مصالح مسلمین کے خلاف نہ ہوں اس کا حکم واجب الاتباع ہے،

۲۔ امور مہمہ میں جو منصوص نہ ہوں اہلِ حل و عقد سے شوریٰ کیا جائے،

۳۔ بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملک نہیں، وہ صرف مصالح مسلمین کے لئے ہے، اس میں ہر ناجائز تصرف خیانت ہے، اور بیت المال اور اُس کے اصول و قواعد اسلامی سیاست اقتصاد کے نہایت ہی اہم اصول ہیں،

۴۔ سلطنت کے نظم و نسق میں حد درجہ سادگی اور کم خرچی اختیار کی جائے،

۵۔ عہدہ دار اور اہلِ منصب میں ادائے فرض کے اندر پوری امانت برتی جائے اُن میں

سے ہر فرد اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھے

۶- عہدہ داران سلطنت کے لئے مقررہ وظیفہ کے علاوہ، رعایا سے کسی قسم کا تحفہ، نذرانہ، اور اخذ زر قطعاً ناجائز ہے،

۷- رعایا سے شرعی ٹیکس کے علاوہ دوسرے قسم کے غیر شرعی ٹیکس نہین لیے جاسکتے فقہ مین اس کی تفصیلات موجود ہین،

۸- حکام پر پورا پورا عدل وانصاف فرض ہے، عدل وانصاف کی راہ مین، رشوت، طرفداری، بے انصافی، ظلم گناہ کبیرہ ہے،

۹- کاشتکار اور زمیندار کے درمیان اُتنا ہی تعلق ہے، جتنا ایک مزدور یا اجارہ دار اور مالک کے درمیان ہی، اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتابون مین ہین،

۱۰- اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان جو معذور نہ ہو، اس کا سپاہی ہے،

۱۱- غیر مسلم رعایا کی حفاظت جان ومال و مذہب کے مسلمان ذمہ دار ہین، اور ان سے مصالحت کے وقت جو شرطین قرار پائی ہون اُن کو پورا کرنا حکومت پر واجب ہے،

۱۲- قانون اور حدود مین ہر ادنیٰ و اعلیٰ برابر ہے،

یہ چند سرسری دفعات ہین، تلاش سے ان مین کچھ اور اضافہ ہوسکتا ہے، ان دفعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ اسلامی اصول سیاست ظاہری ہیئت وشکل پر زیادہ زور نہین دیتا، بلکہ اس کا اصلی زور روح اور اسپرٹ پر ہے، اس اصلی روح اور اسپرٹ کی بحالی کے ساتھ اگر غیر قومون سے نظم ونسق کے کچھ قواعد لئے جائین، تو کچھ حرج نہین، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق مین کھائی کھود کر حصار بنا لینے کا طریقہ اہل فارس سے حاصل کیا، آلات جنگ مین منجنیق کا استعمال اہل یمن سے عہد نبوی ہی مین مسلمانون نے سیکھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ مین حکومت کے دفاتر کا طریق

ایرانیون اور رومیون سے اخذ کیا، زمین کی پیمایش اور بندوبست ایرانی زمینداروں کے ذریعہ سے رائج کیا گیا، ان مثالون سے ظاہر ہے کہ نظم ونسق حکومت کے وہ طریقے جو اسلامی روح سیاست کے منافی نہ ہون، وہ غیر قومون سے حاصل اور نقل کئے جاسکتے ہین، اور آج یورپ کے ان انتظامی اصولون اور طریقون کو جو اسلامی اصول کے خلاف نہ ہون، قبول کیا جاسکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان علما جن کی طبیعتون مین امنگ ہے وہ ان مسائل پر تحقیقی مضامین لکھین اور مسلمانون کی نئی سیاسی زندگی کے لئے نئی راہین کھولین ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر مولینا اسحاقؒ سندیلوی مدرس دارالعلوم ندوہ نے لکھی ہے، جو ابھی تک طبع سے محروم ہے،

زیر نظر رسالہ اسی قسم کی کوششون کی ایک مثال ہے، مؤلف نے سیاسیات حاضرہ کو سامنے رکھ کر اسلامی مسائل کی تشریحات کی ہین، اور کہین کہین اسلامی اصول سیاست کے مقابلہ مین موجودہ سیاسی اصولون کی تنقید اور خردہ گیری بھی کی ہے، ابتداءً یہ رسالہ مضمون کی صورت مین معارف کے کئی نمبرون مین چھپا تھا، اور اب ایک مرتب رسالہ کی صورت مین شائع ہو رہا ہے، مؤلف کے انداز بیان معلومات کی فراہمی اور خیالات کی ترتیب تحسین کی مستحق ہے، البتہ دو باتین مجھے کھٹکی ہین جن پر تنبیہ مناسب ہے، ایک یہ کہ آیات واحادیث اور عبارات کے ترجمہ مین اپنے دعوی کے اثبات کی خاطر کمی وبیشی نہ کی جائے یعنی قصداً ترجمہ مین ایسی ترمیم نہ کی جائے جس سے حوالہ دعوی سے زیادہ مطابق ہو جائے یہ احتیاط کے خلاف ہے، دوسری چیز یہ کہ طرز بیان مین ایسی احتیاط اختیار کیجائے، کہ شے نہ اپنے اندازہ سے زیادہ اہم ہو جائے، اور نہ اس کی اہمیت کم ہو جائے، بلکہ جتنی ہے اتنی ہی رہے،

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ سے لوگون کو مستفید کرین، اور اہل علم وقلم کو دین کی صحیح اور سچی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائین،

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبد السلام ندوی

(۷)

ان مقدمات کے پیش نظر رکھنے کے بعد اگرچہ صاف ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکمار کے نظریات سے ماخوذ ہے، جس کو ڈاکٹر صاحب نے شاعرانہ طرز ادا سے اپنا مخصوص فلسفہ بنالیا ہے، لیکن اس کی ابتدا مثنوی اسرار خودی سے ہوئی، اور جب پروفیسر نکلسن نے انگریزی زبان مین اس مثنوی کا ترجمہ کیا، تو جن انگریزون نے اوس پر تبصرے کئے، انھون نے یہ خیال ظاہر کیا، کہ یہ فلسفہ جرمنی کے مشہور فلاسفر نٹشے کے افکار و خیالات سے ماخوذ ہے، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب پروفیسر نکلسن کو ایک خط مین لکھتے ہین،

"بعض انگریز تنقید نگارون نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات مین پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے، اور غلط راہ پر پڑگئے ہین، دی ایتھنیم والے مضمون مین جو خیالات ظاہر کئے گئے ہین، وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہین، لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہین ہوتی، وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہین سمجھ سکا، یہی وجہ ہے کہ اوس نے خلط مبحث کرکے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے"

مین نے آج سے تقریباً ۱۰ سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانون تک پہونچا تھا، نہ اس کی کتابین میری نظرون سے گذری تھین[۱]"۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کو نطشے کی تقلید و تتبع سے بالکل انکار ہے، بلکہ انھون نے دوسرے موقع پر علانیہ یہ دعویٰ کیا ہے، کہ

"اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا فلسفہ بھی ہمارے صوفیون کے لئے کوئی نئی چیز نہین[۲]"۔

اس دعوی کے بعد اب ہمارے سامنے یہ سوال نہین ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کا انسان کامل اور نطشے کا فوق الانسان ایک ہی چیز ہین، یا مختلف؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ڈاکٹر صاحب نے دعوی کے مطابق اسرار خودی کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے؟ اور اس سوال کے جواب کے لئے ہم کو سب سے پہلے خود اسرار خودی کے فلسفیانہ اجزار کی تحلیل کرکے دیکھنا چاہئے، کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ کہان تک صحیح ہے؟

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسرار خودی مین فلسفۂ خودی کے اجزا و مقدمات نہایت مبہم، پراگندہ اور ناکمل طور پر بیان کئے گئے ہین، اور جب تک ڈاکٹر صاحب کے پورے مجموعۂ کلام کو پیش نظر نہ رکھا جائے، صرف اسرار خودی سے ان اجزا و مقدمات کی تکمیل نہین ہو سکتی، اسی لئے ہم نے فلسفۂ خودی کے تمام اجزا و مقدمات سے نہایت مفصل طور پر بحث کی ہے، اور اس بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ یقیناً صحیح ہے، لیکن سر دست سوال صرف اسرار خودی کے متعلق ہے جس سے اس فلسفہ کی ابتدا ہوئی، اور جس کی نسبت ڈاکٹر صاحب کا دعوی ہے، کہ "

---

[۱] اقبال نامہ ص ۵۴، ۵۵، ۲۵۰ اقبال نامہ صفحہ ۴۷۳

مسلمان صوفیہ و حکمار کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اس لئے ہم کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اسرارِ خودی کے فلسفیانہ اجزار کہان تک مسلمان صوفیہ اور حکمار کے خیالات سے ماخوذ یا متاثر ہین، اسرارِ خودی مین فلسفۂ خودی کے جو اجزار و مقدمات بیان کئے گئے ہین، ان کی ترتیب یہ ہے،۔

۱- دربیان اینکہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات و تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد -

اور اس جزو کے متعلق خلیفہ عبد الحکیم صاحب نے اس بحث پر "رومی نٹشے، اور اقبال" کے عنوان سے نہایت جامع اور مفصل مضمون لکھا ہے، لکھتے ہین کہ

"خودی کے فلسفہ کی تاسیس مین ص ۱۲ پر جو اشعار ہین، وہ نٹشے سے ماخوذ ہین، جس کا فلسفہ یہ تھا کہ عین ذات یا حقیقت وجود ایک انا ہے ساعی ہو عمل اس کی فطرت ہو اخلاقی عمل اور پیکار اور نشو و نما کے لئے اُس نے اپنا غیر یا ماسوا پیدا کیا تو تاکہ امکانی پیکار اور اسکے ذریعہ سے امکانی ارتقا ممکن ہو جائے"

اس فلسفہ کو جو ن کا تون اقبال نے اپنے بلیغ و رنگین انداز مین اس طرح بیان کر دیا ہے کہ فلسفہ کا خشک صحرا، گلزار ہو گیا ہے، مفصلہ ذیل اقتباس سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے،

پیکر ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

خویشتن را چون خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد،

صد جہان پوشیدہ اندر ذات او
غیر او پیداست از اثبات او

در جہان تخم خصومت کاشت است
خویشتن را غیر خود پنداشت است

سازد از خود پیکر اغیار را
تا فزاید لذت پیکار را

می کشد از قوت بازوے خویش
تا شود آگاہ از نیروے خویش

بہر یک گل خون صد گلشن کند
از پئے یک نغمہ صد شیون کند

غذر این اسراف و این سنگین دلی　　خلق و تکمیل جمال معنوی

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت　　تا چراغ یک محمد بر فروخت

یہ سب نطشے کا فلسفۂ انا اور فلسفۂ حیات ہے، جہاں تک افکار اقبال کی اساس کا تعلق ہے اقبال بہ نسبت نطشے کے فختے سے زیادہ متاثر ہے، فختے کی کشمکش حیات میں اخلاق اور روحانیت کی بھی چاشنی ہے جو نطشے میں اس قدر نمایاں نہیں فختے ایک خاص انداز کا موحد ہے، اور نطشے منکر خدا ہے۔[۱]

۲ - حکایت درین معنی کہ مسئلہ نفی خودی از مخترعات اقوام مغلوبہ بنی نوع انسان است کہ باین طریق مخفی اقوام غالبہ را ضعیف می سازند"

اور اس سلسلے میں ایک مستقل عنوان سے افلاطون پر جو تنقید کی گئی ہے وہ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں نطشے سے ماخوذ ہے۔[۲]

۳ - " در بیان این کہ تربیت خودی را سہ مراحل است مرحلۂ اول را اطاعت و مرحلۂ دوم را ضبط نفس و مرحلۂ سوم را نیابت الٰہی نامیدہ اند"

اور اس جزو کے متعلق خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ

ان مراحل میں مرحلۂ اول میں خودی کو شتر قرار دیا ہے، یہ خیال بعینہٖ نطشے سے ماخوذ ہے، باقی دو مراحل اقبال نے اسلامیات سے لئے ہیں، نطشے کے یہاں بھی مراحل تین ہیں، وہ کہتا ہے کہ روح حیات تین مراحل میں سے گذرتی ہے، یا یوں کہو کہ تبدیلی ہیئت میں وہ یکے بعد دیگرے تین ہیئتیں اختیار کرتی ہے پہلی ہیئت میں وہ اونٹ ہے دوسری میں شیر، اور تیسری میں بچہ ہیئت اشتری میں روح نہایت صبر اور جبر سے اپنے اوپر فرائض اوامر و نواہی کا بوجھ لاد لیتی ہے،

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۲۲ [۲] ایضاً ص ۸۲۳،

اس کے بعد جبر اور باربرداری احکام میں سے نکل کر وہ جب ہیئت اختیاری میں آتی ہے، تو شیر ہو جاتی ہے، لیکن نئی اقدار کے پیدا کرنے کے لئے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ تیسری ہیئت طفلی ہو، جس میں معصومیت اور نسیان کی ضرورت ہے، پہلے مرحلے کو بالکل بھول جائے زندگی کو ایک کھیل سمجھے نئے سرے سے اس کا آغاز کرے، اقبال نے نطشے کے تین مراحل میں سے صرف مرحلۂ اشتری کو لے لیا، حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تین مراحل میں سے دو مراحل اطاعت اور ضبط نفس دونوں اس میں پائے جاتے ہیں۔ نطشے کے یہاں جو مرحلۂ شیری ہے اس کو اقبال نے دوسری جگہ بیان کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔[۵۱]

خلیفہ عبد الحکیم نے ہم کو یہ نہیں بتایا، کہ ڈاکٹر صاحب نے مرحلۂ شیری کو دوسری جگہ کہاں بیان کیا ہے، لیکن اگر اس کے معنی جبر سے اختیار میں آنے کے ہیں، تو اسی سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اس کو بھی بیان کر دیا ہے،

تو ہم از بار فرائض سر متاب   برخوری از عندہ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار   می شود از جبر پیدا اختیار

۴۔ "حکایت طائرے کہ از تشنگی بے تاب بود،"

اور اس سلسلہ میں ریزۂ الماس اور شبنم پر جو اشعار ہیں، وہ خلیفہ عبد الحکیم کے الفاظ میں براہ راست نطشے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں،[۵۲]

۵۔ "حکایت الماس و زغال"،

اور خلیفہ عبد الحکیم کے الفاظ میں اس کا مضمون بھی نطشے سے ماخوذ ہے۔ نطشے کی اخلاقیات کا

---

[۵۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۲۴، ۸۲۵، [۵۲] ایضاً ص ۸۲۵،

[۵۳] ایضاً ص ۸۲۵،

اصول اولین جو اس کے مذہب کا کلمہ ہے یہ ہے کہ "سخت ہو جاؤ" اس اصل کی تشریح مین نطشے نے بھی اسی قسم کے استعاروں سے کام لیا ہے[۱]

۱۰۔ الوقت سیف"

اس عنوان کے تحت مین برگسان کا فلسفۂ وقت بیان کیا گیا ہے، اور امام شافعی کے ایک قول سے اس کی تائید کی گئی ہے لیکن خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ امام شافعی کے قول کے تحت مین کوئی فلسفہ نہین تھا جو فلسفہ اقبال نے برگسان سے لے کر اس قول کی تفسیر مین پیش کر دیا ہے، وہ خود امام صاحب کی سمجھ مین نہ آتا، ان کا تدین اور تورع ایسے افکار سے بہت گریزان تھا[۲]

فلسفۂ خودی کے یہ تمام اجزا فلاسفۂ مغرب بالخصوص نطشے سے ماخوذ ہین، اور اس کو ڈاکٹر صاحب کے تمام نقد نگارون نے تسلیم کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری لکھتے ہین کہ اقبال نطشے کے زیر اثر ہے، اور اس کے ماخذ حکایت "الماس و زغال" (اسرارِ خودی) سے دیکھے جا سکتے ہین، جو تصنیف مندرجۂ بالا کی حکایت "پتھر و کوئلہ" سے ماخوذ ہے[۳]

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ "اپنی شاعری کے اوس دور مین جس مین اسرارِ خودی تصنیف کی گئی اقبال نطشے سے متاثر تھے، علاوہ اوس داخلی شہادت کے جو اسرارِ خودی سے بکثرت اور بوضاحت مل سکتی ہے، مجھ کو اس بارے مین شخصی طور پر بھی کچھ معلومات حاصل ہین، یورپ کے قیام کے دوران مین اقبال کو اس مومن قلب اور کافر دماغ مجذوب کا فلسفہ بہت دلکش معلوم ہوا[۴]"

دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ پیام مشرق مین نطشے کا اثر اس قدر نمایان نہین، جتنا کہ اسرارِ خودی مین ہے[۵]

۱؎ رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۲۶ ۸ ۲؎ ایضاً ص ۲۶ ۸ ۳؎ نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۱۳۶،
۴؎ رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۴۹ ۰، ۵؎ ایضاً ص ۲۱،

اخلاقی حیثیت سے نطشے کے نزدیک اخلاق دو طرح کے ہیں، (۱) آقائی اخلاق (۲) غلامانہ اخلاق، صداقت کی تلاش جرات، زندگی کو لذت والم، اور سود و زیان کے پیمانے سے ناپنا، ہر قسم کا اثبات اور حیات افزا فعلیت آقائی اخلاق کے مظاہر ہیں، اور ہر قسم کی بزدلی، رسوم و قیود سے باہر آنے کی کوشش نہ کرنا، عجز، قناعت، توکل، خیرات، حلم، غیرت، غرضیکہ ہر قسم کی انفعالی صورتیں غلامانہ اخلاق میں داخل ہیں، خیرات کا دینے والا بھی ذلیل ہوتا ہے، اور لینے والا بھی،[۱]

نطشے کی اس اخلاقی تقسیم کے بعد ڈاکٹر صاحب کے یہ اشعار پڑھو،

تا بکے دریوزۂ منصب کنی — صورت طفلان زنے مرکب کنی
فطرتے کو بر فلک بندد نظر — پست می گردد ز احسان دگر
از سوال افلاس گردد خوار تر — از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخل سینائے خودی
عشق با دشوار ورزیدن خوش است — چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکنات قوت مردان کار — گردد از مشکل پسندی آشکار
زندگانی قوت پیدا استے — اصل او از ذوق استیلاستے
عفو بیجا سردئی خون حیات — سکتۂ در بیت موزون حیات
ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است — ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است — بطنش از خوف و دروغ آبستن است
گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار — گاہ می پوشد ردائے انکسار
گاہ او مستور در مجبوری است — گاہ پنہاں در تۂ معذوری است
چہرہ در شکل تن آسانی نمود — دل ز دست صاحب قوت ربود

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۹۰،

با توانائی صداقت توام است گر خود آگاہی ہمیں جام جم است
زندگی کشت است و حاصل قوت است شرح رمز حق و باطل قوت است
مدعی گر صاحب قوت بود دعویش مستغنی از حجت بود

تو صاف معلوم ہوگا کہ وہ بالکل نٹشے کے نظریۂ اخلاق کی تفسیر ہیں،

ڈاکٹر صاحب کے نقادوں نے اس کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا ہے کہ نٹشے اور ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہیں، کہ نٹشے کے افکار میں سے اقبال کو تعمیر خودی، استحکام خودی، اور عروج آدم کا مضمون پسند آیا، لیکن نٹشے کے یہاں تخریبی افکار بہ نسبت ترکیبی افکار کے بہت زیادہ ملتے ہیں، اس میں جلال کا پہلو جمال کے پہلو پر اس قدر غالب ہے، کہ ہستی محض ایک میدان کارزار بن جاتی ہے، اقبال خودی کے ساتھ ایک بیخودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے، ایک کو دوسرے کے بغیر ناقص سمجھتا ہے نٹشے کے یہاں انفرادی خود اختیاری کا اس قدر زور ہے کہ فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے نہایت غیر معین اور مبہم سا رہ جاتا ہے، اس کے یہاں قاہری غالب ہے، اور دلبری مغلوب، اقبال کے نصب العین انسان میں ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے، ادعا کے ساتھ تسلیم و رضا بھی ہے، نٹشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے، اور غریبوں اور کمزوروں کے لئے اس کے پاس نفرت کے احساس کے سوا کچھ نہیں، اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلوں کو دھوکا سمجھتا ہے لیکن ایک اعلیٰ سطح پر صحیح مساوات کا متلاشی ہے ...... نٹشے کے یہاں صداقت کا معیار قوت کے سوا کچھ نہیں تنازع للبقار کا انداز ظالمانہ، بیرحمانہ اور جابرانہ ہے، اقبال کے یہاں محض قوت صداقت کا معیار نہیں نٹشے خدا کا منکر ہے، اقبال اعلیٰ درجہ کا موحد ہے ... اقبال تمام نوع انسانی کو ابھارنا چاہتا ہے، نٹشے کی نظر فقط چند کامل افراد پر ہے، جو تمام پیکار حیات کا ماحصل ہیں، نٹشے نے ڈارون کے نظریۂ حیات بھی

اخلاق اور فلسفہ کی بنیاد رکھی، اس کا یہ خیال کہ اسی نظریہ کے ماتحت آنے والا انسان موجودہ انسان سے اتنا ہی مختلف ہو سکتا ہے، جتنا کہ موجودہ انسان کیڑوں مکوڑوں سے مختلف ہو گیا ہے، انسانی نصب العین میں بڑی قوت پیدا کر سکتا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ نطشے کسی وجہ سے بڑے زور شور سے یہ عقیدہ بھی رکھتا تھا کہ کائنات اپنے حوادث کو ازلی اور ابدی طور پر دہراتی رہتی ہے، جو کچھ ہوا ہے وہ پہلے بھی ہو چکا ہے، جو مخلوق اس وقت ہے، وہ پہلے بھی موجود رہ چکی ہے، اور آیندہ بھی بار بار وجود میں آتی رہے گی، تکرار ابدی کا یہ عقیدہ نطشے کے جوشِ ارتقا کے خلاف پڑتا ہے۔[۱]

پروفیسر یوسف سلیم چشتی بی اے نے اپنے مضمون "اقبال اور فلسفۂ مغرب" مندرجہ نیرنگ خیال اقبال نمبر میں جو مسٹر ممتاز حسین صاحب احسن ایم اے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، یعنی پہلے نطشے اور اقبال میں بہت مشابہت دکھائی ہے، اور پھر دونوں میں فرق و امتیاز پیدا کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "جس شخص کے فلسفہ کا اقبال کے خیالات پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے، وہ نطشے ہے، اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خواہش اقتدار اس کائنات میں ایک بنیادی حقیقت ہے، یہ خواہش زندگی کی فراوانی اور افزونی کی مظہر ہے، اور بالذات تمام حسنات کی سرتاج ہے، اور اس کے فلسفہ کا یہ سنگِ بنیاد اقبال کے فلسفہ کے سنگ بنیاد یعنی خودی کی مسلسل جدوجہد کی حالت سے عملی طور پر مطابقت رکھتا ہے۔۔۔۔ اقبال اور نطشے کے خیالات میں بڑی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے، دونوں کا مسلک یہ ہے کہ یہ مادی دنیا خودی کی جدوجہد کا ایک وسیع میدان ہے، جس میں وہ مرتبۂ اختیار پر فائز ہونے کی کوشش کرتی ہے، دونوں کا مذہب یہ ہے کہ آرٹ کے اندر جمال و اقتدار دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہئے، دونوں میں فلسفۂ اخلاق کے مخالف ہیں، دنیا میں رہ کر اور مشکلات کا مقابلہ

---

[۱] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۳۵،

کرنے ہی سے خودی میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے، بااین ہمہ فوق البشر کے تصور کے لحاظ سے اقبال اور نٹشے دونوں میں بڑا فرق نظر آتا ہے، نٹشے کا فوق البشر ایک ایسی ہستی ہے، جو رحمدلی اور محبت اور ہمدردی قبیل دیگر صفات قلبی سے جو سوسائٹی کے قیام کے لئے از بس ضروری ہیں، یکسر عاری ہے، اقبال کا فوق البشر یا انسان کامل ایک ملنسار ہستی ہے، جو سوسائٹی میں دوسرے آدمیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اور اپنی ذاتی قوتوں کی بدولت دوسروں کو اپنی سطح پر لا سکتا ہے،

اقبال کے انسان کامل کا مزاج سختی اور نرمی دونوں کا حامل ہے، اس کے علاوہ نٹشے کا فوق البشر اپنی ذات میں محدود ہے، اس کے سامنے کوئی نصب العین یا مطمح نظر نہیں، بر خلاف اس کے اقبال کے انسان کامل کے سامنے خدا کی ذات موجود ہے، اور خدا چونکہ غیر محدود ہے، اس لئے اس کی ترقی کا میدان بھی غیر محدود ہے، لیکن نٹشے کے فوق البشر کے لئے ترقی کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں، علاوہ بریں نٹشے کے فوق البشر میں ایک نقص یہ ہے کہ اس نے بنی نوع آدم کو دو طبقوں میں منقسم کر دیا ہے آقا اور غلام، اس کا خیال یہ ہے کہ غلام ہمیشہ غلام ہی رہیں گے وہ کبھی آقا کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتے، چنانچہ فوق البشر کے مستقبل قریب میں ظاہر ہونے کے لئے اس نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ طبقۂ امراء میں اعلیٰ افراد پیدا کئے جائیں لیکن اقبال کے فلسفہ کے رو سے ہر شخص غیر محدود ترقیات کا مرکز ہے، ترقی کی راہیں ہر شخص کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوئی ہیں[1]

لیکن ان جوابات میں دو نقص ہیں (۱) ایک تو یہ کہ اس اعتراض کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نٹشے یا اور کسی فلسفی کا فلسفہ اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ لے لیا ہے، بلکہ ایک مسلمان کے مذہبی اور اخلاقی مقاصد کے لئے ان کو جس فلسفی کی کوئی بات پسند آئی اس کو انھوں نے لے لیا، اور اس حیثیت سے فلاسفۂ مغرب میں اُن کی نگاہ سب سے پہلے نٹشے پر پڑی، اور اس کے

---

[1] نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶،

فلسفہ مین سے اونھوں نے صرف وہ باتین اخذ کرلین جو اسلام کے مطابق تھین، چنانچہ خود خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین، کہ اقبال کو نٹشے کی تعلیم کا وہی پہلو پسند ہے جو اسلام کی تعلیم کا ایک امتیازی عنصر ہے، اسلام کے اس پہلو سے متاثر ہونے کی وجہ سے اقبال نے نٹشے کا اثر قبول کیا اسلام نے جہاد کو ایمان کا ثبوت قرار دیا، اور کہا کہ جہاد ہی اس امت کی رُہبانیت ہے، زندگی باوجود اس کی کلفت اور کشاکش کے اسلام کے نزدیک ایک نعمت ہے جس مین قوت اور جمال پیدا کرنا ہر مومن کا فریضہ ہے، ارتقاء حیات، علوِ آدم، تسخیر فطرت، احترامِ حیات جسم اور مادی کو روحانیت کا معاون سمجھنا، حصولِ قوت کی کوشش، یہ تمام چیزین اسلام اور نٹشے کی تعلیم مین بہت حد تک مشترک ہین گو اندازِ بیان بہت مختلف ہے[له]۔

ان کے علاوہ جو باتین مذہبِ اسلام کے خلاف تھین، اُن کو چھوڑ دیا، اس لئے اس فرق و امتیاز کے دکھانے سے یہ ثابت نہین ہوتا، کہ اسرارِ خودی کا فلسفہ نٹشے سے ماخوذ و متاثر ہی نہین، بلکہ وہ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ ہے تمام تر مسلمان صوفیہ و حکماء کے مشاہدات سے ماخوذ ہے،

(۲) دوسرے یہ کہ اعتراض کی ابتدا مثنوی اسرارِ خودی سے ہوئی، اس لئے اسرار ہی کے فلسفہ کو پیشِ نظر رکھکر اس کا جواب دینا چاہیئے تھا لیکن جواب دینے والون نے ان فرق و امتیازات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ مین اسرارِ خودی کے بعد پیدا ہوئے مثلاً فلسفہ بیخودی جس کی نسبت خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ اقبال خودی کے ساتھ ایک بیخودی کا فلسفہ بھی رکھتا ہے، اسرارِ خودی کے بعد پیدا ہوا، اور ڈاکٹر صاحب نے اس کے متعلق ایک مستقل مثنوی رموزِ بیخودی کے نام سے لکھی، یا یہ کہ اُن کا فلسفہ خودی سے کوئی تعلق ہی نہین، مثلاً جمہوریت جس کی نسبت خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین، کہ نٹشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے، اور اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلون کو دھوکا سمجھتا ہے، ایک سیاسی چیز ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے اسرارِ خودی مین اس پر کچھ نہین لکھا ہے، بلکہ بعد کی نظمون مین اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہین،

(باقی)

[له] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۲۱۶

عربوں کا ملکی اقتصادی اور انسانی جغرافیہ

(نوین اور دسوین صدی عیسوی مین)

از

جناب سید محمد ضیاء الدین علوی، ایم اے، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

یہ محض اتفاقی بات نہ تھی، کہ عربون کی ملکی فتوحات اور جغرافیائی ترقی کی ابتدا ایک ہی زمانہ سے وابستہ ہین، ملکی فتوحات محض ایک مادی حیثیت ہی نہین رکھتین، بلکہ عربون کی ہمت اور ذہن کو بلند کرنے مین ان کا بہت بڑا حصہ ہے، جہان جہان عربون کی تلوار پہنچی وہان اُن کے قاصد، مسافر، سیاح اور تاجر بھی پہونچے، اونھون نے دوسرے ملکون مین جو کچھ دیکھا، اور جو کچھ سُنا اوس کو اپنی سمجھ کے مطابق قلمبند کر دیا، اسی قسم کے لوگون مین سلیمان تاجر، ابوزید، بزرگ بن شہریار اور ابن فضلان ہین جن کا عربون کے علم جغرافیہ کی ارتقا مین بہت بلند مرتبہ ہے، عربون کو ملکون کے جغرافیہ کا خیال آٹھوین صدی عیسوی مین ہوا تھا، کیونکہ حکومت کے کامون اور مذہبی مقاصد کے لئے ان بڑی بڑی سڑکون کے بارے مین جاننے کی ضرورت پیش آئی، جو اسلامی حکومت کے صوبون کو ملاتی تھین، اور اوس کا مواد کچھ تو حکومت کے دیوانات سے حاصل کیا گیا تھا، اور کچھ سیاحون اور تاجرون سے جو خاص طور پر دور دراز کے ملکون کی معاشی حالت کے بارے مین اطلاعات بہم پہنچاتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ کے بعض علماء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تو مجھے مختلف ممالک کے حالات سمجھاؤ یعنی اُن کی آب و ہوا

وہاں کا نظم ونسق اور لوگوں پر وہاں کی آب وہوا اور زمین کا اثر[۱] حقیقۃً کرۂ ارض کی پیچیدہ ساخت اور فضا کی حقیقت کے بارے میں انسانی جستجو علم جغرافیہ کی مضبوط بنیادیں ہیں، یہ علم جغرافیہ کے میدان میں پہلا عملی قدم تھا، جو بہت اہم نتائج کا موجب ہوا، اس کے بعد زیادہ زمانہ نہ گذرنے پایا تھا کہ عربی ادب میں ملکوں کی کتابوں، ملکوں اور سڑکوں کی کتابوں اور اقالیم پر کتابوں کی بھرمار ہوگئی،

سلیمان تاجر | سلیمان تاجر (سنہ ۲۳۷ھ) نے اپنی تصنیف "اخبار الصین والہند" میں چین اور ہندوستان کے بحری تجارتی تعلقات اور راستے کے جزیروں کے حالات بیان کئے ہیں،

چین کے متعلق اس کی معلومات بہت اہم اور دلچسپ ہیں، وہ کہتا ہے کہ چین میں چاول کے علاوہ سیب، لیموں، نارنگی، کیلہ، گنا، انجیر، ککڑی، اخروٹ، شفتالو، ناریل اور بادام پیدا ہوتا ہے[۲] سلیمان پہلا شخص ہے جو ایک چینی شروب کا ذکر کرتا ہے، جسے وہ "سہ" کے نام سے یاد کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ پودہ امرود کے پودے سے مشابہ ہے جس کی خوشبو عمدہ ہوتی ہے اور مزہ کڑوا ہوتا ہے چینی پانی اُبال کر اس پر ڈالتے ہیں، اس کے پینے سے ان کا خیال ہے کہ تمام امراض دور ہو جاتے ہیں[۳] حالانکہ یہ ایک نامکمل ذکر ہے مگر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس سے چائے کی پتی مراد ہے سلیمان چین کی طوفانی ہواؤں کا ذکر بھی کرتا اور کہتا ہے کہ ساحلی خطوں میں بہت طوفان آتے ہیں، جو اگست کے مہینے میں شروع ہوتے ہیں، اور جزائر ہند سے آنے والے جہازوں کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں[۴] یقیناً یہ وہی چیز ہے، جسے آج کل سائکلون کہتے ہیں،

ہندوستان کے متعلق سلیمان کہتا ہے کہ یہاں کی پیداوار ناریل، ککڑی، بانس، شہد، آم، مسالہ موتی، گندھک اور تانبا ہے، خاص شہر دیبل کھنبات، معبر، مالابار، تانا، سوبارہ اور سرندیپ ہیں، ...

---

[۱] المسعودی، مروج الذہب (پیرس ایڈیشن) جلد ۲ ص ۱۲۳ [۲] سلیمان سلسلۃ التواریخ ص ۹۳ [۳] سلیمان اخبار الصین والہند حصہ اول (انگریزی ترجمہ از فرانسیسی) ص ۲۵ [۴] اخبار الصین والہند حصہ اول ایضاً ص ۱۱

کہتا ہے کہ بعض ہندی ایسے ہیں جو ایک برتن میں کھانا بہت برا گنا وسمجھتے ہیں، جب کبھی وہ سیران آتے ہیں، اور کوئی تاجر اُن کو مدعو کرتا ہے تو خواہ سو آدمی ہی کیون نہ ہون، سب کے سامنے الگ الگ برتن رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے [۵۱] مملکت بلہرا کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہان کے لوگ آواگون کے قائل ہین، ان کا عقیدہ بہت پختہ ہے، جب ان مین عورت یا مرد بڈھے ہو جاتے ہین، تو وہ اپنے یہان لوگون سے کہتے ہین، کہ وہ اُن کو آگ مین ڈال دین، کیونکہ وہ سمجھتے ہین، کہ وہ پھر دنیا مین کسی اور صورت مین آ جائین گے [۵۲] یہان کے باشندون کے عادات و اطوار مذہب اور راجاؤن کے بارے مین وہ بہت دلچسپ باتین بتاتا ہے،

جزیرۂ ہرگند کے متعلق سلیمان کہتا ہے کہ وہان ناریل کے درخت بکثرت پائے جاتے ہین کوڑیان اُن لوگون کی دولت ہے، اور ملکہ کا خزانہ کوڑیون سے بھرا پڑا ہے، ان لوگون سے اچھے صناع ان اطراف مین کہین نہین، وہ ناریل کی چھال سے قمیص بناتے ہین، اور ایک ہی ٹکڑے مین مع آستین کے تیار کر لیتے ہین، اسی درخت کی لکڑی سے وہ جہاز اور مکان بناتے ہین، غرضیکہ ہر قسم کے کامون مین وہ ماہر ہین [۵۳] سرندیپ کے بیان مین وہ وہان کی کانون کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے، جس مین ہیرے جواہرات، مختلف قسم کے قیمتی پتھر، اور سونا قابلِ ذکر ہین [۵۴] مسعر ابن مہلہل وسطی ایشیا کی خاص قومون، ملکون اور شہرون کا ذکر کرتا ہے، تغزغز کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ لوگ کچا اور پکا دونون طرح کا گوشت کھاتے ہین، اور اونی و سوتی کپڑے پہنتے ہین، اس کے بعد وہ خرخیز کا ذکر کرتا ہے کہ یہان لوگون کے ہان عبادتگاہین ہین، وہ بہت ذہین لوگ ہین، لکھنا بھی جانتے ہین، اور سال مین تین مرتبہ دعوتین بھی کرتے ہین، ان کے جھنڈے سبز ہین، وہ جنوب کی طرف منہ کر کے

---

[۵۱] ابوزید: اخبار الصین والہند حصہ دوم انگریزی ترجمہ از فرانسیسی ص ۹۰ - ۹۹ [۵۲] ایضاً ص ۹۷ - ۱۰۲،
[۵۳] سلیمان: سلسلۃ التواریخ ص ۲، [۵۴] ایضاً صفحہ،

عبادت کرتے ہین، مریخ عطارد اور زحل کو مانتے ہین زحل سے پیشین گوئی کرتے ہین[۱]

ابن فضلان | بلغار اور روس کے متعلق ابن فضلان (۳۰۹ھ ہجری) کی معلومات بہت وسیع ہین، وہ کہتا ہے سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ قبل مطلع بالکل سُرخ ہوجاتا ہے، ہم لوگون کو باتین کرتے مشکل سے آدھا گھنٹہ گذرا ہوگا کہ اذان کی آواز آئی، اور ہم لوگ باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہین، کہ صبح ہوگئی،[۲] ابن فضلان نے خوارزم مین جاڑے گذارے وہ کہتا ہے کہ دریاے جیحون اپنے مخرج سے دہانے تک منجمد رہتا ہے، اور برف کی موٹائی انیس بالشت ہے، وہ کہتا ہے کہ گھوڑے خچر اور گدہے کی گاڑیان دریا پر اس طرح چلتی ہین جیسے سڑک پر، برف اتنا سخت ہوتا ہے کہ نہ ٹوٹتا ہے نہ پگھلتا ہے، مین اس کے اوپر تین مہینے تک ٹھہرا ہون، یہان مین نے ایک شہر دیکھا جہاں بڑی سخت ہوائین چلتی ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زمہریر کے دروازے کھُل گئے، یاقوت عبداللہ الفقیر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ یہ غلط ہے، کیونکہ برف کی زیادہ سے زیادہ موٹائی پانچ بالشت ہے، اور اکثر اوقات اتنی بھی نہین ہوتی، اس کے علاوہ دریا کا صرف منبع جمتا ہے، اور اس کے علاوہ کوئی حصہ نہین جمتا، وہ سرد ہواؤں کو بھی نہین مانتا،[۳] حالانکہ یاقوت ابن فضلان کی تردید کرتا ہے، مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانہ مین ابن فضلان وہان ٹھہرا تھا، وہ زمانہ اتفاقیہ طور پر زیادہ ٹھنڈا رہا ہوگا، اس مین شک نہین کہ علاقہ جس کا ابن فضلان نے ذکر کیا ہے، بہت ٹھنڈے علاقون مین شمار کیا جاتا ہے،

لوگون کے عادات و اطوار کا بیان اس کا دلچسپ مشغلہ ہے، روسیون کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ کھجور کی طرح لمبے ہین، اور اُن کا رنگ سُرخ ہے، وہ قراطق پہنتے ہین، اور کمبل کندھے کے ایک طرف سے ڈال کر دوسری طرف سے نکال لیتے ہین، وہ اپنے پاس پھاوڑہ چاقو اور تلوارین رکھتے ہین،

---

[۱] یول: چین اور اس کا راستہ (لندن) جلد ۱ ص ۲۵۰ [۲] یاقوت معجم البلدان (مصر) جلد ۲ ص ۴۸۲

[۳] ایضاً جلد ۳ ص ۴۰۰،

ان مین بعض اپنے جسم کو گردن سے ناخون تک گدواتے ہین، اُن کی عورتون کے پاس ایک ڈبیہ ہوتی ہے جو لوہے تانبے چاندی یا سونے کی بنی ہوتی ہے، ہر ایک ڈبیہ مین ایک چھلہ ہوتا ہے جس مین چاقو رہتا ہے گلے مین وہ سونے چاندی کے ہار پہنتی ہین، روسی لوگ لکڑی کے بُت پوجتے ہین، ابن فضلان اُن کی عبادت کے طریقے کا خاص دلچسپی سے ذکر کرتا ہے[۵۱]

ابن فضلان نے ان اطراف کی تجارت اور پیداوار کا بھی ذکر کیا ہے خزر کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہان گاؤن نہین ہوتے، کیونکہ ان کی کھیتیان بہت دور تک پھیلی ہوتی ہین، وہ گرمیون مین کھیتون کی طرف آتے ہین، اور فصل کاٹ کر دریا کی طرف لاتے ہین. خزر کا مشرقی حصہ تجارت کی منڈی ہے، وہان سے کوئی چیز باہر کے ملکون کو نہین بھیجی جاتی، البتہ موم، شہد، ریشم اور اون وغیرہ ممالک غیر سے آتا ہے[۵۲] اس مین شک نہین کہ اس قسم کے جغرافیائی بیان مین بہت سی خامیان ہین، مثلاً نہ تو ابن فضلان نے آب و ہوا اور پیداوار کا باہم تعلق دکھایا، اور نہ زمین کی ساخت کا پیداوار پر اثر تاہم ایک جغرافیہ دان کی حیثیت سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ ابن فضلان پہلا شخص ہے جس نے ان ممالک کے جغرافیائی حالات تفصیل سے لکھے ہین،

ابن خردادبہ | ابن خردادبہ (متوفی ۳۰۰ھ تقریباً) کی تصنیف ہمارے لئے ضلعون اور صوبون کو ملانے والی سڑکون اور راستون کی تفصیل کے علاوہ مختلف صوبون کی آمدنی اور پیداوار کے صحیح اعداد و شمار فراہم کرتی ہے، بغداد کے آس پاس سے شروع کرتے ہوئے پہلے چین کی سرحد تک کے مقامات کا ذکر کرتا ہے اس کے بعد بحر ازرق تک کا ساحلی راستہ پھر دریاے دجلہ سے بحر اٹلانٹک تک کا راستہ بیان کرتا ہے، اور سب سے بعد مین زمین کے شمالی اور جنوبی سرون کا حال بیان کرتا ہے،

یورپ اور ایشیا کی آمد و رفت اور تجارت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہودی تاجر عربی، فارسی،

---

[۵۱] یاقوت: معجم البلدان (مصر) جلد ۳ ص ۳۰۲ [۵۲] ایضاً جلد ۲ ص ۴۳۴،

رومن (لاطینی اور یونانی) بولتے ہیں، وہ مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا کرتے ہیں، یا تو بحری راستے سے یا بری راستے سے، وہ مغرب سے باندیاں، غلام، کھال اور تلوار یں لایا کرتے ہیں، وہ فرما کے مغرب میں فرنگیس مشرقی سمندر کے راستے سے روانہ ہوتے ہیں، پھر وہاں سے حجاز، جدہ، سندھ، ہند، اور چین کی طرف روانہ ہوتے ہیں، واپسی پر ایلوا، مشک، کافور اور دوسرے مشرقی ممالک میں پیدا ہونے والی چیزیں لاتے ہیں، اور پھر قلزم سے ہوتے ہوئے فرما جاتے ہیں، اور وہاں لنگرانداز ہوتے ہیں، کچھ تو تجارت کا مال بیچنے قسطنطنیہ چلے جاتے ہیں، اور باقی فرنگیس کے ملک کو لوٹ جاتے ہیں[۱]

اصطخری | جغرافیہ کے ابتدائی دور میں اصطخری (۳۴۰ھ ہجری) کی کتاب المسالک والممالک بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، یہ دو پہلوؤں کے اعتبار سے پرکھی جا سکتی ہے، (۱) ممالک (۲) باشندے، ملک کا مطالعہ پہلے جائے وقوع، پھر ملک کے مختلف حصوں کے اعتبار سے کیا جا سکتا ہے، جائے وقوع میں ملک کی لمبائی چوڑائی، وسعت اور حدود شامل ہیں، ملک کے مختلف حصوں کی تشریح بھی دو سرخیوں میں کی ہے، یعنی حصوں کا ایک عام مطالعہ اور علٰحدہ علٰحدہ اُن کی تشریح، وادیوں، ریگستانوں، میدانوں، پہاڑوں، اور دریاؤں کا بیان تفصیل کے ساتھ کیا ہے، وہاں کی پیداوار اور دوسری اشیاء کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے، جہاں تک باشندوں کا تعلق ہے، اصطخری نے اُن کی فطرت، مذہب، عادات واطوار، رسم ورواج، غذا اور لباس پر خاص توجہ کی ہے، اس کتاب میں انسان اور اس کے جغرافیائی ماحول کے توازن کو زیادہ اچھی طرح بتایا گیا ہے،

اصطخری[۲] نے فارس کے بیان میں آب وہوا کو تقسیم کی بنیاد قرار دیا ہے، اُس نے ملک کو دو

---

[۱] ابن خورداذبہ: کتاب المسالک الممالک (لیدن) صفحہ ۱۵۳ [۲] اصطخری: کتاب المسالک والممالک (لیدن) دیکھئے بیان فارس،

ن مین تقسیم کیا ہے، جنوبی گرم خطہ، اور شمالی سرد خطہ، سرد خطے مین بعض علاقے ایسے ہین، جہان
ت سردی پڑتی ہے، جس کی وجہ سے بعض زراعتی پیداوارون کے علاوہ پھلون مین کچھ نہین پیدا
ا، گرم خطے مین بعض علاقے ایسے گرم ہین، کہ وہان چوپایہ تک کا گذر نہین، سرد خطے کی آب وہوا
ت کے لئے مفید ہے، اور گرم خطے کی آب وہوا صحت کے لئے مضر، مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے، کہ وہ
کی طبعی حالت اور آب وہوا کو سرسری طور پر اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کا رشتہ انسانی
رگی کے ساتھ ظاہر ہوسکے، مگر وہ اس کو بہت سادہ طریقے پر بیان کرتا ہے، دوسرے الفاظ
ن یون کہہ سکتے ہین، کہ اس جغرافیہ دان کے نزدیک ایک خطہ انسانی زندگی کے لحاظ سے اس کی
جہ کا مرکز بن سکتا ہے، طبعی حالات محض ایک ضمنی حیثیت رکھتے ہیں، فارس کے باشندون کے
علق وہ کہتا ہے، کہ گرم علاقے کے لوگون کی تندرستی اچھی نہین رہتی، اور اُن کے بال ذرا کالے
تے ہین، سرد خطے کے لوگ بہت مضبوط اور تنومند ہین، وہان تین زبانین رائج ہین، بولنے
ے لئے فارسی، بادشاہون، اور نوابون کے دفتر کے لئے عربی، اور اُن کی کتابون کی عجمی زبان،
گون کے لباس کے بارے مین وہ کہتا ہے کہ میرے خیال سے عراق کا سا حال ہے، وہ عمدہ
پڑے پہنتے ہین، عام طور پر جوتے پہنتے ہین، صافہ بہت لمبا باندھتے ہین، اور ململ استعمال کرتے ہین
فارس کے بادشاہون کے بارے مین وہ کہتا ہے، کہ وہ نیچی قمیص پہنتے ہین، صافہ باندھتے ہین، اُ
س کے نیچے چوکور ٹوپی پہنتے ہین، اور کمر مین تلوار باندھتے ہین،

مندرجۂ بالا اشارون کے علاوہ اُس نے فارس کی صنعت اور تجارت کا بھی ذکر کیا ہے جور
سے ماء الورد، ماء الطلع اور ماء القیصوم باہر بھیجا جاتا ہے، سابور سے مختلف قسم کے تیل باہر بھیجے جاتے ہین
نیز، خبا با کازرون اور توج سے کتان اور نسا سے کپڑے تمام دنیا مین بھیجے جاتے ہین، سیراف سے عود،
عنبر اور کافور، آبنوس، مسالہ اور ادویہ تمام فارس مین بھیجی جاتی ہین، اس کی کتاب مین اسلامی ممالک کے

دوسرے صوبون کے بارے مین بھی بہت سی قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے، کیونکہ اُس نے ہر صوبہ کا جغرافیہ علٰحدہ علٰحدہ بیان کیا ہے، اصطخری کی تصانیف کی عمدگی کے بارے مین بہت کچھ کہا جا چکا ہے، پچھلے زمانہ کی کوئی بھی تصنیف اتنی باقاعدہ نہین، کہ اُس کی تصنیف کے مقابلہ مین رکھی جا سکے، اس کام کی مقبولیت ایک بات سے اور بھی ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کی وجہ سے دوسری کتابین بھی رائج ہوئین، جو ان ہی اصولون پر لکھی گئی تھین،

ابن حوقل | اصطخری کی کتاب پر اس کے معاصر اور دوست ابن حوقل نے تصحیح کی، جو بعد کو اسی کے نام سے شائع ہوئی، ابن حوقل ۳۳۱ھ ہجری اپنے خیالات کو اس پیش لفظ مین یون بیان کرتا ہے کہ مین ہر خطے کی حدود کو ظاہر کر دیتا ہون، شہر دریا جو اس علاقے مین بہتے ہین، پانی کے ذرائع جو زمین کو سیراب کرتے ہین، ٹیکس، اس علاقے کے راستے، وہ حدود جو اس کو ملحقہ علاقون سے علٰحدہ کرتی ہین، اور تجارت کی نوعیت، ان سب چیزون کو مین واضح کر دیتا ہون[1]، اصطخری اور ابن حوقل تمام اسلامی ممالک خصوصاً جزیرہ فارس اور سمرقند اور وہان کے باشندون کے بارے مین بہت ہی صاف اور صحیح تصور رکھتے تھے، انھون نے دریائے نیل کے جھیلون اور سیحون سے پامیر تک تقریباً ہر علاقے کے امن وامان اور خوشحالی کی تصویر کھینچی ہے، ابن حوقل کہتا ہے کہ دنیا بھر مین سمرقند کے میدانون اور دمشق کے نخلستانون سے زیادہ خوشگوار اور صحت بخش آب وہوا کہین نہین ہے، صغد کے بارے مین وہ کہتا ہے کہ آٹھ دن کی مسافت تک دونون طرف بستیون اور باغون کھیتون اور مکانون اور بہتے ہوئے پانی کے ذخیرون اور چشمون کی بہتات ہے، اور اگر کوئی بخارا کے پرانے قلعے پر کھڑا ہو جائے، تو جہان تک نظر کی پہنچ ہے، ملک مالا مال نظر آئے، افق تک جہان سرسبز زمین اور آسمان کا کنارہ ملتا ہوا معلوم ہوتا ہے، سبزی ہی سبزی ہے[2]، وہان کے لوگ کم

ملک کے لائق سپوت ہیں، وہ اپنا روپیہ بیشتر کیں، قافلوں کے لئے سرائیں، اور پل بنوانے میں خرچ کرتے ہیں، فرغنہ کے بارے میں بھی وہ کہتا ہے، کہ وہاں باغ، درختوں کے جھنڈ، آباد مقامات اور بارونق بازار ہیں، زمین جہاں کاشت ہوتی ہے، ہوائی اور پن چکیوں سے مالا مال ہے،[۵۱]

مقدسی دسویں صدی تک کے تمام نمایاں ماہرین جغرافیہ میں جن کا اقتصادی اور ملکی جغرافیہ کی توسیع میں کچھ حصہ ہے، ہمیں مقدسی سربرآوردہ اور بلند معلوم ہوتا ہے، وہ زمانہ کے سب سے بڑے جغرافیہ دانوں میں شمار کیا جاتا ہے، علم جغرافیہ میں اس کی دست رس ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے، وہ کہتا ہے ہمیں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس چیز کی طرف توجہ کروں جسے لوگوں نے نظر انداز کر دیا، اور علم کی اس شاخ کو علیحدہ کر دوں، جسے لوگوں نے مکمل طور پر نہیں سمجھا، اور وہ ہے اسلامی ممالک کا جغرافیہ، جس میں جھیلوں اور سمندروں، دریاؤں اور ریگستانوں، مشہور شہروں، سڑکوں کے کنارے سرایوں اور تجارتی راستوں، دواؤں اور دوسری اشیاء، کاشت اور پیداوار کے علاقوں باہر جانے والی چیزوں روزمرہ ضروریات کی اشیاء غرضیکہ سب کا بیان ہو، اور اس میں زبانوں کی کثرت، طرز کلام رنگ اور نسل اور مذہبی عقائد کے اعتبار سے مختلف ملکوں کے باشندوں کی تفصیل بھی شامل ہو، جس میں اُن کے روزمرہ کے پیمانے اور اوزان، چھوٹے بڑے سکے، کھانے پینے کی تفصیلات، پھل، پھلاری، ان کی اچھائیاں اور برائیاں زراعت کے لائق علاقے چٹیل بیکار علاقے، ریگستان، میدان پہاڑ، چونا اور ریت مضبوط اور پوچی زمین خوشحال اور زرخیز علاقے، صنعتی کاریگریاں اور ادبی سرگرمیاں، وہ علاقے جو آبپاشی کے محتاج نہیں، اور جنگلات کا بھی ذکر ہو،[۵۲]

اس اقتباس کی تشریح چند اہم ترین پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہے، اول تو یہ کہ

---

[۵۱] ابن حوقل، کتاب المسالک والممالک صفحہ ۳۴۶، [۵۲] المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم صفحہ ۱،

مقدسی کی موجودگی ۲۳ ۵ نے جغرافیہ کی پہلی مکمل اور جامع تعریف پیش کی ہے، دوسرے یہ کہ اوس نے جغرافیہ کی تعریف میں وہ تمام باتیں شامل کی ہیں جن کو ہم آج بھی شامل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، تیسرے یہ کہ علم جغرافیہ کی چھان بین میں اس کا خاص مقصد فائدہ مندی کے ساتھ ساتھ انسانی خصوصیات کی طرف توجہ دینا ہے، آخری خصوصیت یہ ہے کہ المقدسی کسی زیر تذکرہ ملک کے خط وخال اور آب وہوا پر خاص توجہ دیتا ہے، اور اس کے بعد دوسری خصوصیات کا ذکر کرتا ہے، مثلاً پودے، جانور، معدنیات، کارخانے، تجارت اور تجارتی راستے وغیرہ وغیرہ،

اس ترتیب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اور اس کی جدوجہد کے مطالعہ کی تمہید کے لحاظ سے نو ادر جغرافیہ کے بارے میں اس کا تصور کتنا صاف اور روشن تھا،

اپنی کتاب احسن التقاسیم میں المقدسی نے اپنے آپ کو زندگی کے ایک مشاہدہ کرنے والے کی حیثیت سے بے نقاب کیا ہے، وہ اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ دس شہر ایسے ہیں، جہاں کی بعض چیزیں مشہور ہیں، بغداد کی تہذیب، کوفہ کی فصاحت، بصرہ کی صنعت، مصر کی تجارت، رے کی دغابازی اور نیشا پور کی جفاکاری، اہل مرد کی کنجوسی، بخارا کے باشندوں کی نخوت اور سمرقند کی دستکاری،[۱] وہ کہتا ہے کہ عراق بہترین صوبہ ہے، اس کی آب وہوا دل ودماغ کے لئے بہت مفید اور خوشگوار ہے، اور دل ودماغ کو کہیں اتنا سکون اور فرحت نہ حاصل ہوگی، المشرق سب سے بڑا صوبہ ہے، جہاں بہترین قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں، جہاں سب سے زیادہ عالم فاضل لوگ موجود ہیں، اور جہاں کی آب وہوا سب سے زیادہ سرد ہے، لکڑی اور ریشم کی سب سے زیادہ مقدار دیلم سے حاصل ہوتی ہے، اور رقبے کے لحاظ سے سب سے زیادہ خراج اسی حصہ سے حاصل ہوتا ہے، الجبال میں بہترین دودھ، شہد، روئی اور زعفران پائی جاتی ہے،

---

۱ ابن حوقل، کتاب المسالک والممالک ص ۲۶۰ ۲ المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، صفحہ ۳ ایضاً صفحہ ۳۳،

الرحاب مین پھل اور جانورون کا چارہ کثرت سے پایا جاتا ہے، یہان چیزین بہت سستی ہین لیکن یہان کے لوگ بے حد کاہل ہین، خوزستان کے لوگ بدترین نسل سے ہین، اور کرمان کے لوگ سب سے زیادہ شریر، مگر یہان کی کھجورین سب سے زیادہ میٹھی ہین، دوہ صوبہ جہان شکر، چاول، مشک اور بے دینون کی کثرت ہے، سندھ ہے، وہ صوبہ جہان کے لوگ بہت ذہین اور جہان بے حد عیاشی ہے اور اس سے زیادہ گرم اور قحط زدہ علاقہ جزیرہ نمائے عرب ہے، جہان کھجورین سب سے زیادہ مقدار مین پائی جاتی ہین، جس جگہ رحمتون کا نزول ہوا ہے، اور جو مقدس لوگون، راہبون اور عبادت گاہون سے پُر ہے، وہ ملک شام ہے، ملک مصر مین زیادہ لوگ زاہد ہین، اور طالب علم ہین، یہان دولت ہے: تجارت اور خاص قسم کی پیداوارین ہین، اور کھانے کے لئے غلہ یہان کی سڑکین سب سے زیادہ خطرناک ہین، یہان کے گھوڑے بہترین اور یہان کے لوگ سب سے زیادہ عالی ظرف ہین، سب سے آخر مین المغرب ہے جس کا رقبہ بہت بڑا ہے، جہان سب سے زیادہ شہر ہین، جہان کے لوگ سب سے زیادہ غیر مہذب، تندرست، اور دھوکہ باز ہین[1]؛

المقدسی نے یہ کہکر کہ دس مقامات ہین، جہان دس خاص چیزین پائی جاتی ہین، اُس نے جغرافیائی اثر کی اصلی کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے، حکومت کے صوبون کی خاص خاص چیزون پر روشنی ڈال کر اس نے علم جغرافیہ کا فلسفہ بتایا ہے، جو زیادہ تر انسان اور معاشیات سے متعلق ہے، تاہم اس امید افزا تمہید کے باوجود بھی ان اسباب کی تشریح کی جن پر صوبون کی صنعت نشو ونما اور زوال کا دار ومدار ہے، اس کے علاوہ اُس نے بیان کئے ہوئے جغرافیائی اور تاریخی پس منظر مین ربط وضبط قائم کرنے کی تو اور بھی کم کوشش کی ہے، کچھ بھی ہو المقدسی مین بات کے سمجھنے کی، تھوڑی سی مثالون پر عام رائے قائم کرنے کی اور موازنے کی خداداد اہلیت تھی،

---

[1] المقدسی احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص ۳۳،

جغرافیائی ماحول اور اس میں انسانی جدوجہد آج کل کے جغرافیہ کے عالموں کی دلچسپی کی چیز ہے
ملک شام کی آب و ہوا پر المقدسی کا بیان دسویں صدی کے اصول اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک
عمدہ نمونہ ہے، وہ کہتا ہے کہ ملک شام کی آب و ہوا وسطی علاقے الشراۃ سے حولہ کے درمیان کے
حصے کے علاوہ معتدل ہے، اور اس گرم علاقے میں غلہ، نیل اور کھجور کے درخت اُگتے ہیں، ایک دن
جب کہ میں جریکو میں مقیم تھا، تو ایک حکیم نے کہا اس وادی کو دیکھو تو میں نے جواب دیا "اچھا" تو اس
نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ وادی یہاں سے حجاز اور پھر یمن سے ہوتی ہوئی عمان
اور ہجر اور اس کے بعد بصرہ اور عراق سے گذرتی ہوئی موصل کے بائیں طرف رقہ تک پھیلی ہوئی ہے
یہاں ہر زمانے میں گرمی پڑتی ہے، اور کھجور کے درختوں کی کثرت ہے[1]

عراق کی آب و ہوا کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس جگہ کی آب و ہوا مختلف قسموں کی ہے اس
طرح بغداد اور واسط، اور درمیانی علاقے کی آب و ہوا، صاف مگر گرم اور جلدی جلدی بدلنے والی ہے
کیونکہ موسم گرما میں سخت گرمی پڑتی ہے، اور موسم صرف اسی وقت خوش گوار ہوتا ہے، جب شمالی
ہوا چلنے لگتی ہے[2]

مذکورۂ بالا اقتباس میں ہم ایک بے بنیاد اور بے ترتیب بیان پاتے ہیں جس میں مصنف نے
آب ہوا پر عرض البلد اور مقامی طبعی حالت کے اثر کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے، بارش جیسی
ضروری چیز تک کا ذکر نہیں، لوگوں کے طور طریقوں اور رسم ورواج کے بارے میں المقدسی کا
خیال البتہ قابلِ غور ہے، اہلِ شام کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اُن کو اپنے لباس پر ناز ہے، اعلا
عوام اور ہر طرح کے لوگ عبا پہنتے ہیں، اور وہ گرمیوں میں جوتا نہیں پہنتے، بلکہ اکثر چپل پہنتے
ہیں، اہلِ شام بارش کے زمانہ میں اپنے لبادوں کا بٹن نہیں بند کرتے، بلکہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں، اور

---

[1] المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ص ۱۷۹ [2] ایضاً ص ۱۲۵،

اُن کے طیلسان کھو کھلے نہین ہوتے، الرملہ مین خاص خاص تاجر مصری خچرون پر زین کس کے سوار ہوتے ہین، صرف سردار اور امرا ہی گھوڑون پر سوار ہوتے ہین ، معمولی اور گاؤن کے لوگ نیز اسی طرح یروشلم اور نابلس کے حصون کے کسانون کا پہناوا صرف ایک چادر ہے[۱]،

المقدسی بعض وقت مختلف قومون کو چند خصوصیات سے متصف کرتا ہے، جو بار بار کے ذکر سے فرسودہ معلوم ہونے لگتے ہین، مثلاً وہ اکثر جگہ کہتا ہے کہ اہلِ مکہ کا غرور بھی ان کی بعض خصوصیات مین سے ہے، یمن کے لوگون مین کوئی نفاست نہین، عمان کے لوگ بلکے ہوتے ہین، اور بجا نیان کرتے ہین، عدن کے لوگ کم بولتے ہین، اور دھوکے دیتے ہین، اور احقاف کے لوگ ملحد ہوتے ہین[۲]،

عرب جغرافیہ دانون کا فلسفہ انسانی جغرافیہ کے اس اصول پر مبنی ہے کہ ہر خطے کے لئے مناسب اسباب ہین، جو وہان کے باشندون، طرز تمدن اور طبعی حالت پر اثر ڈالتے ہین، اور یہ اصول یونانی مصنفون، ارسطو، جالینوس اور بقراط سے لیا گیا ہے، انسان اور اس کے معاشرتی نظام پر جغرافیائی ماحول کے اثر کا مطالعہ ابتدا ہی سے کیا جا رہا ہے، ارسطو نے اپنی کتاب Poli-tics مین شہرون کی جاے وقوع اور لوگون کی خصلتوں پر آب و ہوا اور جغرافیائی محل وقوع کا اثر دکھایا ہے، اس جغرافیائی ماحول کی اہمیت کے بارے مین سب سے اہم کتاب جس مین یونانی نظریہ بتایا گیا ہے، کتاب الماء والہواء ہے، جس کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے عربی مین کیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب نے عرب جغرافیہ دانون، طب کے مصنفون اور مؤرخون کے دماغون پر گہرا اثر ڈالا ہے،

ابن رستہ اس صنف کے اہم مصنفون مین ابن رستہ (۲۹۰ھ ہجری) کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے،

[۱] المقدسی: احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ص ۱۰۳ [۲] ایضاً ص ۱۰۳

گو کہ اس کی کتاب کا زیادہ تر مواد طبعی اور تاریخی معاملات ہیں، مگر اس کتاب مین چند ایسے اشارے ہیں جو ایک حد تک جغرافیائی اثرات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہین،

جو لوگ کہ راس السرطان کے مدار سے شمال کی جانب فاصلے پر ہیں، جیسے بابل یا اس جیسے دوسرے شہر تو سورج اُن کے سمت آکر اُس سے نہ تو دور ہوتا ہے، اور نہ قریب، لیکن اس کا گذر اُن پر اعتدال کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے کہ اُن کی ہوا اچھی ہوتی ہے، مزاج کے بنانے ہین، اور اُن کی جگہ معتدل ہوتی ہے، نہ وہان سخت گرمی ہوتی ہے، اور نہ سخت سردی، اُن کے بدن اُن کے رنگ اور اُن کی طبیعتین معتدل ہوتی ہین، اور اُن کی عقلین اور اخلاق اچھے ہوتے ہین، اُن مین علم و دانائی اور چیزون کے جاننے کے لئے آگے بڑھنے کا جذبہ اور اچھے اخلاق بکثرت ہین، اور یہ زمین علما اور پیغمبرون کی ہے، جسم، درصورتین اور رنگ اور علوم اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا اور ایک دوسرے سے مناسبت مین مختلف ہین، کیونکہ اُن کی جگہین مدار شمسی سے مختلف ہین، اور اس لئے بھی کہ سال کے زمانے اُن پر مختلف ہوتے ہین، اور تغیرات بھی علحدہ علحدہ، جس طریقے پر کہ یہ جگہین جن کا ہم نے ذکر کیا، مختلف ہین، اور ہر جگہ کی ایک خاصیت ہے، جو دوسری مین نہین پائی جاتی، اسی طریقے پر جگہ اور شہر کا جس کا ہم نے ذکر کیا یہی حال ہے، کہ وہان کے لوگون کی خاصیت اور طبیعت مخصوص ہے، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کے لوگون کی صورتون مین اختلاف ہے، حیوانات، نباتات، معدنیات، سردی، گرمی، چشمے، مذہب، اخلاق اور تمام چیزین ایسی ہوتی ہین، جو دوسرے شہرون مین نہین پائی جاتین، یہ اختلاف ہر جگہ اور ہر شہر مین پایا جاتا ہے، یہان تک کہ یہ اختلاف ان جگہون مین بھی پایا جاتا ہے، جو ایک دوسرے سے بالکل قریب قریب ہین، اس کا دار و مدار آفتاب سے قربت یا بُعد پر ہے، باعتبار مدار کے ہے، اور ستارون پر جو ثابت ہوتے ہین، اُن کے سمت الراس پر[1]

[1] ابن رستہ: اعلاق النفیسہ ص ۱۰۲، ۱۰۳،

مسعودی . بنی نوع انسان پر جغرافیائی ماحول کے اثر کے بارے مین ابن رستہ کے خیالات کی صدائے بازگشت مسعودی (۳۴۶ھ ہجری) کی تصنیفات مین پائی جاتی ہے، اُس نے پُرانے زمانہ کے نجومیون کی طرح آسمانی نشانیون کے ذریعہ جو عرض البلد سے متعلق ہین جغرافیائی اثرات کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے، اور اسی سے آب و ہوا کا اخلاق پر اثر کا اصول اخذ کیا گیا ہے،

دنیا کے چار حصے ہین، ایک شرقی ہے، اور یہ وہ ہے، جو خط جنوب و شمال سے مشرق کی طرف سے پیچھے کو واقع ہے، یہ مردانہ چوتھائی حصہ ہے، اُس کی دلالت بڑی زندگیون اور بڑے بادشاہون کی مدتون پر اور مردانگی پر اور عزت نفس پر ہے، بھید کا چھپانا یہان کم ہے، معاملات کو ظاہر اور اُن پر فخر کیا جاتا ہے، اور اسی قسم کی باتین ہین جن کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب کی طبیعت اسی قسم کی ہے، کہ یہان کے لوگون کو تاریخ اور سیرت اور سیاسیات اور نجوم مین دخل ہے، دوسرا چوتھائی حصہ غربی ہے، اس حصے پر نسوانیت غالب ہے، سوائے اس حصہ کے کہ جہان مردانہ ستارون کا غلبہ ہے، جیسے کہ مردانہ کا غلبہ مشرق پر ہے، بجز اس حصے کے کہ جہان نسوانی ستارون کا غلبہ ہے، یہان کے لوگ باتون کو چھپاتے ہین، اور دیندار ہین، اور بہت سی رایون اور خیالون کو مانتے ہین، اور بہت سی اسی قسم کی باتین ہین، کیونکہ یہ باتین چاند کے قسم کی ہین، شمالی چوتھائی حصے کے باشندون سے آفتاب دور پڑ جاتا ہے، جو لوگ کہ شمال کی انتہا مین رہتے ہین جیسے صقلبی اور فرنگی قومین رہتی ہین، چونکہ سورج کا اثر دوری کی وجہ سے وہان کم ہے، اس وجہ سے وہان سردی اور رطوبت کا زور ہے، اور برف بہت پڑتی ہے،

حرارت اُن کے اندر کم ہے، اور اُن کے جسم بڑے بڑے ہین، اُن کی طبیعتین اور اخلاق سخت ہین، اُن کے ذہن کند اور زبانین موٹی ہین، ان کا رنگ سفید ہے، اور اس حد تک سفید ہے کہ نیلگونی کی حد تک پہونچ گیا ہے، اُن کی کھالین پتلی لیکن جسم پر گوشت ہے، اِن کی آنکھین نیلی ہین

ایران کا رنگ ان کی طبیعت پر رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا، اُن کے بال گھونگروالے اور سرخ ہیں
کیونکہ رطوبت غالب ہے، اُن کے مذہبوں میں پختگی نہیں، یہ نتیجہ ہے سرد طبیعت کا اور حرارت نہ ہونیکا
جو لوگ شمال کی طرف بہت اندر آباد ہیں، ان پر کند ذہنی غالب ہے، سختی اور وحشت ان کے اندر
بڑھتی جاتی ہے یہی حال اُن ترکوں کا ہے، جو شمال میں اندر کو رہتے ہیں، آفتاب کے طلوع و
غروب کے وقت آفتاب کے مدار سے دوری کی وجہ سے وہاں برف باری بہت ہوتی ہے، اور
ان کے مکانوں پر برودت و رطوبت کا زور ہے، اُن کے بدن بھاری اور ڈھیلے پڑ گئے ہیں، اُن کی
پیٹھ کی ہڈیاں نرم اور گردن کی چوڑی ہڈیاں بھی ایسی ہی ہیں، یہاں تک کہ تیراندازی کے لئے
آسانی ہو گئی ہے، اور گوشت کی زیادتی کی وجہ سے اُن کے جوڑ گڈھوں میں گھسے ہوئے ہیں، اُن کے
چہرے گول گول اور آنکھیں چھوٹی ہیں، کیونکہ حرارت اُن کے چہروں میں جمع ہو گئی ہے، اور برودت
اس وجہ سے کہ برودت اُن کے جسموں میں پختہ طریقے سے سرایت کر گئی ہے، سرد مزاج میں
خون زیادہ پیدا ہوتا ہے، اس وجہ سے اُن کے رنگ سرخ ہو گئے ہیں، کیونکہ برودت کی
کیفیت یہ ہے کہ وہ حرارت کو اکٹھا کر کے ظاہر کرتی ہے، اس عرض البلد سے کچھ ہٹ کر ساٹھ
سے زیادہ میل اوپر یاجوج ماجوج ہیں، یہ لوگ چھٹی اقلیم میں ہیں، اور ان کا شمار جانوروں میں ہے[۱]

المسعودی نے بہت وسیع پیمانے پر جغرافیائی ماحول اور انسان کے تعلق کا ذکر کیا ہے
وہ کہتا ہے کہ اولاً آدم کی ایک نسل ہندوستان کی سرحد تک پہنچی، ملک کی آب و ہوا نے آنے والوں
پر اثر دکھایا، اور یہاں کے لوگ ایک روپ میں ہندوؤں کے سے ہیں،

زنج کی جسمانی حالت کے بارے میں وہ کہتا ہے، کہ

وہ ہندوؤں سے رنگ روپ ساخت، ذہانت و ذکاوت کے لحاظ سے بہت ملتے جلتے ہیں،

---

[۱] المسعودی، کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۲۳، ۲۴،

جالینوس کہتا ہے، کہ حبشیون کی محض خصوصیات انھی کے ساتھ مخصوص ہین، اور دوسری قومون مین نہیں پائی جاتین، مثلاً گھنگھریالے بال ..... موٹے ہونٹ چوڑے نتھنے، تیز دانت ہنٹ کھال اور سیاہ رنگت، یہ ملک چونکہ بہت گرم ہے، اس لئے اجرام فلکی اس پر اپنا اثر دکھاتے ہین، اور یہان کے لوگون کے مزاج ایسی روش پیدا کر دیتے ہین، کہ جسم کا بالائی حصہ بڑھ جاتا ہے، چنانچہ اُن کی آنکھین لمبی، ہونٹ موٹے، ناک چوڑی اور لمبی اور پیشانی بلند ہوتی ہے[51]

تبت کے لوگون کے بارے مین وہ کہتا ہے کہ یہان کے لوگ بڑے جاندار، خوش مزاج اور زندہ دل ہین، یہان تک کہ بڈھے آدمی کے چہرے سے بھی سستی اور کاہلی کا اظہار نہ ہوگا، بلکہ بڈھے اور جوان سب لوگ مساوی طور پر شاد اور خوش وخرم ہوتے ہین، اس زندہ دلی اور خوشی کی وجہ سے اُن مین رقص و سرود کا رواج ہے[52]

المسعودی نے جغرافیائی اثرات کو صرف انسان تک ہی محدود نہین رکھا، بلکہ اُن کا اثر درختون پر بھی دکھایا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ناریل کا درخت دراصل کھجور کے درخت کی ہی دوسری صورت ہے، جو اس نے ہندوستان کی زمین پر پہونچ کر اختیار کر لی ہے[53]، اس مین شک نہین کہ ان مصنفین کے خیالات سے لوگ متاثر ہوئے، مگر یہ نہین کہا جا سکتا کہ اثر لوگون مین بالعموم مقبول تھا یا نہین، لیکن مسعودی کے نظریے کو ابن خلدون نے گیارہوین اور تیرہوین صدی کے ایک قابل تحقیق مسئلے کی حیثیت سے بیان کیا، اور ترقی دی، جغرافیائی اثرات کی نوعیت کے اعتبار سے ان مصنفین کے خیالات زیادہ واضح ہین، ان علماء کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہین کہ انسانی جغرافیہ کے جدید نظریون کی تکمیل کے لئے ان ہی عربون نے راستہ ہموار کر دیا تھا،

---

[51] المسعودی: مروج الذہب جلد ۱ صفحہ ۲۵۰ [52] ایضاً صفحہ ۳۶۲،

[53] ایضاً صفحہ ۳۳۶، ۳۳۷،

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری موٴلف فتاویٰ عالمگیری

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی گجرات ورناکلر سوسائٹی احمد آباد

عرصہ سے مین تین چیزون کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا، اوّل عالمگیر کے مخطوطات[1] قرآن، یعنی عالمگیر کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوے قرآن اس وقت کہان کہان ہین، دوم عالمگیر کے استادکون کون تھے، اور تیسری بات یہ ہو کہ تدوین فتاویٰ عالمگیری مین کون کون شریک تھے،

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ برادرم مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی نے موخرالذکر عنوان پر قلم اٹھایا، انھون نے سولہ اشخاص کے نام پیش کئے ہین، اور ایک نام کا اضافہ پھلواری کے ایک صاحب قلم نے کیا ہے،

راقم الحروف نے جن اشخاص کے نام جمع کئے تھے، اُن مین سے اکثر تو معارف مین آگئے، لیکن کچھ نام باقی رہ گئے ہین جن کے متعلق ابھی تحقیق باقی ہے :-

۱- امیر میران علامہ ابوالفرح معروف بہ سید معدن (حیات جلیل بلگرامی ص ۱۲) صمدن ضلع فرخ آباد مین مدفون ہین،

۲- شاہ عبدالرحیم صاحب جو مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ماجد ہین اگر وہ اس مجلس

---

[1] معارف :- اس موضوع پر ابھی حال مین ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب لاہور کا ایک مقالہ کسی رسالہ مین شائع ہوا ہے،

ین زیادہ دن شریک نہ رہے[۵۱]"

۳- ملا جمیل جون پوری[۵۲] (تذکرہ علماے جون پور، ص ۸۰)

۴- ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہوری جو ملا حبیب استاد شاہزادہ عظیم الشان بن بہادر شاہ ابن عالمگیر کے بھانجے تھے، شہر گھاٹی[۵۳] کے باشندے ہین (آثار شرف قلمی ص ۹۰ بحوالہ ندیم گیا جولائی ۱۹۳۸ء)

۵- قاضی سید عنایت اللہ مونگیری (ہندوستان کے مدارس اسلامی، ص ۵۱)

ان مین سے موخر الذکر بزرگ جناب قاضی سید عنایت اللہ صاحب مونگیری کے کچھ حالات فراہم ہوئے ہین، وہ ذیل مین پیش ہین، جناب قاضی صاحب کا نسب نامہ حسب ذیل ہے،

قاضی صاحب کا نسب نامہ قاضی سید عنایت اللہ بن قاضی سید عبد النبی بن سید عبد السلام بن سید شاہ جمال الدین بن سید شاہ احمد جاجنیری بانی خاندان بارہ گاؤن وسورج گڑھا،

سید عنایت اللہ صاحب خاص سورج گڑھا محلہ چک مسکن ضلع مونگیر مین پیدا ہوئے، تقریباً ۱۰۵۰ھ مین ان کی ولادت ہوئی، ابتدائی کتابین اسی جگہ پڑھین، اُن کے والد ماجد قصبہ سورج گڑھا، اور کجرہ کے قاضی تھے، اور گو برائے نام سہی، مگر اس وقت تک اس خاندان مین قضارت چلی آتی ہے، غرض اس عہد کے دستور کے مطابق متوسط درجہ کی تعلیم حاصل کرکے وہ دہلی پہونچے شام کا وقت تھا، ایک شخص کے مکان پر شب باشی کی اجازت مانگی، اوس نے ان کا حال سُن کر اجازت دیدی اور کھانا بھی کھلایا، رات جب زیادہ ہوئی تو مالک مکان چراغ گل کرکے اندر جانے لگا، سید صاحب نے کہا کہ مجھے کچھ قرآن پڑھنا ہے، مین سوتے وقت چراغ گل کردونگا،

---

۵۱ معارف: حسن اتفاق سے اس سلسلہ مین مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب موصوف شاہ عبد الرحیم صاحبؒ اور چند دیگر باقی ماندہ مولفین کے اسماء فراہم کرچکے ہین، امید ہے کہ جلد ہی ان کا مقالہ شائع ہو سکیگا،

۵۲ معارف: جمیل جونپوری پر تفصیل سے اس مقالہ فتاوی عالمگیری اس کے مولفین" مین لکھا جا چکا ہے،

۵۳ شہر گھاٹی گیا سے مغرب جنوب کی طرف ۳۰ میل کے فاصلہ پر ایک مردم خیز خطہ ہے،

وہ اندر چلا گیا، اور سید صاحب دیر تک قرآن پڑھتے رہے، یہاں تک کہ کوتوال شہر گشت کرتا ہوا آنکلا، چونکہ سید صاحب بہت ہی خوش الحان تھے، اس لئے وہ دیر تک کھڑا سنتا رہا، پھر سامنے آکر اُس نے تمام حالات سے آگاہی حاصل کی، صبح کو اس کو توال نے طلب کرکے مزید تحقیق کی، اور جب اُس کو اُن کے علمی ذوق کا یقین آگیا، تو اپنی سفارش سے شاہی مدرسہ مین داخل کرا دیا،

اس مدرسہ مین کب تک تعلیم پاتے رہے، یہ معلوم نہین لیکن اختتام تعلیم کے بعد ان کی علمی استعداد کی بنا پر اسی مدرسہ مین معلم کے عہدہ پر ان کو مامور کیا گیا، کچھ عرصہ کے بعد جب ان کے علم و فضل کا چرچا پھیلا تو ان کو فتاوی عالمگیری کے مولفین مین شامل کر لیا گیا، اور غالباً آخر تک (۱۰۸۷ھ) اس کام کو انجام دیتے رہے، کیونکہ اس کے بعد وہ پھر شاہی مدرسہ کے مدرس ہو گئے، اور ۱۰۹۹ھ تک اس پر مامور رہے،

اس درمیان مین اُن کے والد سید عبد النبی صاحب کا جو سورج گڑھا اور کجرا کے قاضی تھے، انتقال ہو گیا، اور کچھ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہی، پھر شرفاے سورج گڑھا کی درخواست پر سید عنایت اللہ صاحب کو اُن کے پدر بزرگوار کی جگہ پر قاضی بنا کر بھیج دیا گیا، اور محکمۂ قضارت کی سند عطا کرتے وقت شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی دو عدد حمائل (قرآن مجید) قاضی صاحب کو عنایت فرمائی جس کے اوراق ناسازگاری زمانہ سے منتشر ہو گئے،

قاضی صاحب اپنی وفات تک اسی عہدہ پر فائز رہے، اور سورج گڑھا چک مسکن ہی مین وفات پائی، جہاں ان کا پختہ مزار آج تک موجود ہے، عہدۂ قضا پر سرفراز کرتے وقت جو فرمان قاضی صاحب کو عنایت ہوا وہ آج تک محفوظ ہے[1]، فرمان کی عبارت حسب ذیل ہے،

"درین وقت فرمان والاشان صادر شد کہ خدمت قضا پرگنہ سورج گڑھ و کجھری تابع

---

[1] کتاب الحیات بعد الممات دہلی،

سرکار مونگیر متعلق صوبہ بہار از انتقال عبدالنبی بہ سید عنایت اللہ پسرش در موازی چہل بیگہ زمین
افتادہ و لائق زراعت خارج جمع از پرگنہ سنگھون تابع سرکار مذکور بشرط خدمت و عدم اخذ
مہرانہ و نکاحانہ، در وجہ معاش او حسب الضمن مقرر باشد کہ بلوازم و مراسم آن کما ینبغی پردازد، و
در نشر شرعیات، و قطع و فصل قضایا و معاملات و رفع و دفع دعاوی و خصومات، و عقود و انکحہ
بلا ولی، و قسمت ترکات و کتابت صکوک و سجلات و تحریص و ترغیب مردم بہ طاعات و عبادات
و اجرای حدود، و تعزیرات و اقامت جمعہ و جماعات و تحقیق اموال غیب و ایتام و تعین اوصیا،
و نصب قوام مقرر نمودن نائب متدین طالب علم مساعی موفورہ بتقدیم رساند، باید کہ
حکام و عمال و جاگیرداران و کروریان حال و استقبال او را قاضی آن محلات دانند و زمین
مذبور را پیمودہ و چک بستہ بہ تصرف او بازگذارند و اصلاً و مطلقاً تغیر و تبدیل بدان راہ
نہ دہند، و لعلت مال و جہات اخراجات مثل قلعہ و پیشکش و جریبانہ و ضابطانہ و محصلانہ
و مہرانہ و دار و غگانہ و بیگار و شکار و مقدمے و قانون گوئی و ضبط ہر سالہ بعد از تشخیص چک
تکمیر زراعت و کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی مزاحم نہ شوند، و درین باب ہر سال
سند مجدد نہ طلبند و اگر در محلے دیگر چیزے دانستہ باشند، آن را اعتبار نہ کنند، طریق جمہور
سکنہ و متوطنین پرگنات مسطور آنکہ خطوط و قبالات و صکوک و سجلات را بخط و مہر او معتبر
شمرند، غرہ شعبان سال سی و یکم جلوس سنہ ۳۱ شرح یادداشت واقعہ تاریخ روز چہارشنبہ
بست و ششم شہر جمادی الآخر سنہ ۳۱ جلوس والا موافق سنہ ۱۰۹۹ھ مطابق ہشتم آردی بہشت
ماہ سالہ صدارت و مشیخت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوار مرحمت و احسان
صدر منبع القدر "فاضل خان" و نوبت واقعہ نگاری کمترین بندہ درگاہ خلائق آرام گاہ "محمد ساقی"
قلمی می گردد، سید عنایت اللہ ولد سید عبدالنبی از نظر اقدس اعلیٰ گذشت و بعرض مقدس

معلی رسید، کہ پروانگی، بہ مہر و دستخط مشیخت و فضیلت پناہ فضائل خان رسیدہ کہ بموجب
التماس محمد شفیع وغیرہ سکنہ پرگنہ سورج گڑھ و پرگنہ کھرہ سرکار مونگیر صوبہ بہار بعرض
والا رسید کہ از مدتے عبد النبی قاضی پرگنات مسطور فوت شدہ، و بدون قاضی معاملات
شرعیہ فیصل نمی یابد حکم والا شرف نفاذ یافت کہ بندہ بر تقدیر وقوع قاضی دیگر، بعرض مقدس
رسانیدہ مقرر نماید، حقیقت برین منوال است کہ در پرگنہ سورج گڑھ و پرگنہ کھرہ سرکار مونگیر
مذکور قاضی از حضور پر نور تعین نہ شدہ و محضر بہ مہر مردم رسیدہ کہ سید عبد النبی خاص موروثی
پرگنات مسطور در بعین حیات سپرد و سید عنایت اللہ پسرش متوفی بحضور پر نور رسیدہ
طالب علم است ہرچہ فرمان شود،

حکم جہان مطاع عالم مطیع صادر شد کہ خدمت قضا پرگنات مرقوم مع سواد قصبات و قریات
متعلقہ آن از انتقال سید عبد النبی متوفی مشار الیہ و موازی چہل بیگہ زمین افتادہ لائق زراعت
خارج جمع از پرگنہ سنگھول سرکار مونگیر مذکور، مادامیکہ قاضی باشد، بشرط عدم اخذ مہرانہ و
نکاحانہ در وجہ مدد معاش او مرحمت فرمودیم، و نیز حکم شد، در جائیکہ خود نہ رسد نائب متدین
طالب علم تعین می کردہ باشد و اگر در محال دیگر چیزے دانستہ باشد آن را اعتبار نہ کنند،

بواقعہ ۹ رجمادی الاخرہ ۳۱ سنہ،

اس کے بعد مدار المہام جملۃ الملک اسد خان وزیر اور فاضل خان صدر الصدور کی دستخط اور تصدیق ہے، اس فرمان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے، کہ سند پاتے وقت وہ دہلی مین عالمگیر کے پیش نظر کسی محکمہ مین تھے، عام طور پر مشہور ہے، کہ مونگیر کے ایک عالم بھی فتاوی عالمگیری کی تدوین مین شریک تھے، (دیکھو ہندوستان کے مدارس اسلامی ص ۵) لیکن سورج گڑھ مین خاندانی روایات کی بنا پر بہ وثوق کہا جاتا ہے، کہ محکمہ قضاۃ مین آنے سے قبل وہ اس مجلس تدوین کے رکن تھے،

مراۃ العالم میں ہے کہ اس مجلس کے صدر ملا نظام الدین تھے اور ان کے ماتحت چار اور علماء تھے'

(۱) قاضی محمد حسین جونپوری محتسب عسکر،

(۲) سید علی اکبر سعد اللہ خانی،

(۳) ملا شیخ محمد حامد جونپوری تلمیذ میرزا ہد کابلی،

(۴) ملا محمد اکرام اللہ لاہوری معلم شاہزادہ محمد کام بخش،

ان میں سے ہر ایک کے سپرد ایک ایک ربع تھا معلوم نہیں کہ قاضی صاحب ان میں سے کس کے ماتحت کام انجام دیتے تھے، (بحوالہ تاریخ برہان پور)

مکرمی سید وجاہت حسین صاحب ساکن سورج گڑھا، چک مسکن ضلع مونگیر فرماتے تھے کہ ایک دوسری دستاویز بھی خاندان میں موجود ہے جس میں اس کی طرف اشارہ ہے، کہ قاضی صاحب مدونین فتاوی میں شریک تھے. لیکن افسوس ہے کہ تلاش کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی، اور اس کے بعد ہی موصوف کا انتقال ہو گیا، انشاء اللہ آیندہ جب سورج گڑھ جانے کا اتفاق ہوگا، تو ضرور اس کی تحقیق کروں گا،

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے ماخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات وسوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے،

قیمت :- للعہ ضخامت :- ۳۹۰ صفحے، "منیجر"

ایک نادر فارسی مخطوطہ

از

جناب ملک ابویحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی

سرزمین پنجاب مین لاہور کے بعد دوسرا مہد علم سیالکوٹ ہے، جہان عہد شاہجہان مین صاحب خیالی ملا عبدالحکیم، اور اُن کے خلف صالح عبداللہ (م ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء) پیدا ہوے، اور عہد حاضر مین ڈاکٹر محمد اقبال ہین، جن کی شہرت چاردانگ عالم پر محیط ہے،

زمانہ عالمگیری مین یہان کے ایک ممتاز صاحب علم روپ نرائن کھتری تھے، اُن کی بعض فارسی تالیفات کی حکایت "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ" میں سُنی جا چکی ہے،

روپ نرائن ممدوح کے مولفات مین لغت فارسی کی کتاب نصابِ جامع ہے، جس کا حضروری تعارف زیب قرطاس ہے،

نصابِ جامع ۵۰ صفحوں کا مجموعہ ہے، ہر صفحہ مین ۱۵ سطرین ہین، کاتب نے ذیل کی عبارت لکھی ہے،

"محمد قاسم ادہمی بتاریخ سلخ شب چہارم رجب المرجب ۱۱۰۴ھ نبوی روز سہ شنبہ بدولت خانہ لالہ لعل قلمی یافت"

مذکورۂ بالا سطرین نصابِ جامع کی بجاے شرح نصاب بدیع العجائب کے آخر مین ہین، جس کا تذکرہ آخر مین ہوگا،

نصاب جامع کا ورق اوّل غائب ہے، ورق ثانی "کز عمدۂ فکرش بدر آید" سے شروع

ہوتا ہے، اور چوتھی سطر میں ہے،

"الحمد للہ کہ امر ہذا ایں بجہدات مرضیہ و طریقۂ انیقہ در ذات ملکی ملکات حضرت خدیو زمان خداوند گیہان موجود ست،......"

اور صفحہ (۳) پر دوسری سطر میں مذکور ہے،

مثنوی	قضا شوکت آں شاہ گردوں نہیب	خدیو ملک قدر اورنگ زیب

اور اسی صفحہ کی (۹) سطر میں ہے :-

"امان بعد احقر ہیچ مدان کج مج زبان سراپا قصور روپ نرائن کھتری متوطن سیالکوٹ مضاف بصوبۂ دار السلطنت لاہور بر ضمیر منیر صاحبان دانش و شعور و ارباب فہم و حضور معروض می گرداند کہ این حقیر را اکثر اوقات مطالعہ کتب لغت بجہت تصحیح معانی الفاظ غریبہ متعلقہ در حین ملاحظہ نسخ متداولہ حاصل می بود، چوں بر نصاب صبیاں ابو نصر فراحی[۱] و نصابہائے[۲] کہ حضرت امیر خسرو و فضلائے دیگر نظم کردہ اند، عبور افتاد، بحرے دید بے پایان پُر از لآلی و عمانی مملو از درر غرر غرائب آثار، اما حیف کہ از ترتیب لغات و ضبط اعراب و حرکات خالی ہست و عجب کہ این معنی بخاطر عاطر ہیچ یکے از متقدمین بلاغت آئین نگذشتہ اگر کسے خواہد کہ لغتے ازاں جا برآرد، یا اعراب آن دریابد میسر نیست، افسوس تمام آید کہ ایں ہمہ نسخ باین نفاست و لطافت از چنین فائدہ عاری و معری باشد"

---

[۱] فراہی حاے حطی کی بجاے ہوز سے ہے [۲] حضرت امیر خسرو کے جس نصاب کی طرف مولف نے اشارہ کیا ہے، منجملہ ان کے ایک "نصاب بدیع العجائب" ہے جو اس مجموعہ میں ہے دونوں کا کاتب ایک ہی منشی محمد قاسم ادہمی ہے، مگر خسرو کے نصاب بدیع العجائب کی یہ شرح ہے اور شارح امان اللہ سنبلی ہیں، شرح نصاب بدیع العجائب کا ورق اول بھی نصاب جامع کی طرح غائب ہے،

لہذا لغات چیدہ را از کتب معتبرہ لغت بانتخاب در آوردہ و از حرف آخر ترتیب حروف تہجی نظمے جداگانہ باظہار حرکت حرف اوّل ترتیب دادہ و نصاب جامع بنام نہاد ....."

نصاب جامع کا تاریخی نام (ص ۵) میں ایک قطعہ میں درج ہے،

زہے جامع نغز از نسخۂ بے نظیر | کہ کلکم بتقیید بیاں در کشید
پئے سالِ اتمام او از خرد | مکرر شنیدم کتابٌ مفید
۱۲۷۴۱

تمہید مذکور کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے، جو (ماسوائے تمہید) تمام منظوم ہے، مگر بحر مختلف ہیں، عنوان ابواب بھی منظوم ہیں، کتابت کی صنعت میں تراجم الابواب شنگرفی ہیں، نمونہ ترجمۃ الباب یہ ہے :-

اندرین منظوم شصت و یک لغت مفتوح دال | پانزدہ بیت است یادش کن تو ای رشک غزال

اور ترجمۃ الباب کے بعد ہے،

نام اللہ است کو زینت دہ ہر نامہ را | در فشانی و شکر خائی بہ بخشد خامہ را
اتقیا پرہیزگاران و آن بود جمع تقی | ہست اکفا ہمسران و آن جمع کفو ای متقی
ل م

اور لام و میم کی توجیہ یہ کی گئی :-

"و علامت لام برائے اصل در زیر ہر لغتے و نشان میم زیر ہر ترجمہ کہ مشعر بر معنی و حروف و مشترک و مفسر و مرادف ست ثبت افتاد" (ص ۴)

اب شعر مشرح پر توجہ فرمائیے، اتقیا اصل لفظ ہے، اور پرہیزگاروں اس کا ترجمہ ہے، روپ نرائن مؤلف ہر ایک ترجمۃ الباب میں ان لغتوں کی تعداد بھی لکھتا ہے، جن کی شرح

---

[1] یہاں لفظ کتاب مفید ۱۲۷۴ شنگرفی روشنائی سے مرقوم ہے، جس طرح کہ ابواب کتاب و علامت اسی روشنائی سے مزین ہیں، اور ۱۲۷۴ھ لفظ مفید کے اوپر قدرے ترچھا رقم ہے،

فی الباب مرقوم ہے، جیسا کہ باب اول تذکرۃ الصدر کے عنوان (فنگر فی) میں اندرین منظوم شصت و یک لغت مفتوح دان ثبت ہے،

نصاب جامع کا آخری شعر یہ ہے،

مینہ و لیک بر دیمانی ست در لغت ۔۔۔ میں ست خشک یوسف نام پیمبرست

خاتمہ کے بعد تشنگر فی حروف میں صفحہ کے ہر دو اطراف میں آڑی سطر میں ذیل کے پانچ اشعار ہیں جن میں سے تین شعر حاشیہ کی سمت اور دو پوسٹ کی طرف مرقوم ہیں،

شکر کین نسخہ موزون و لطیف ۔۔۔ یافت اتمام ز فضل ایزد

سامع از وے بکند کسب کمال ۔۔۔ قارئش را رسد ز علم ازو

ضبط ابیات و لغاتش کردم ۔۔۔ تا بیفزاید از و سنے کاھد

بیت او ہفت صد و پنج ہفتاد ۔۔۔ گشت منظوم بفیض سرمد

چار صد یافتی و ہفتاد لغت ۔۔۔ دو ہزار ے و دگر آمد بعدد

یہ دو در ویہ (شنگر فی) اشعار کہ خلاصہ کتاب پر محتوی ہیں، روپ نراین مولف کے ہیں یا ناسخ محمد قاسم ادہمی کے؟ کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا!

اوران دو رویہ اشعار سے ثابت ہوا کہ

نصاب جامع میں اشعار کی تعداد (۷۷۵) ہے، اور (۲۴۷۰) الفاظ کی لغت بیان ہوئی ہے،

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ڈی لٹ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور نے اپنی کتاب "ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ" میں روپ نراین کی دو یا تین مولفات کا

۱؎ واحسرتا کہ راقم الحروف کا یہ نسخہ دہلی کے موجودہ خلفشار میں بلوائیوں کی نذر ہو گیا، ورنہ تفصیلاً لکھا

تذکرہ فرمایا ہے[1]، مگر نصاب جامع اُن میں مذکور نہیں ہے،

لیکن ڈاکٹر صاحب اسے مؤلفات روپ نراین میں غالباً محسوب فرماتے ہیں، البتہ اس مجموعہ کے دوسرے رسالہ نصاب بدیع العجائب کے امیر خسرو کی تصنیف ہونے سے شاید ڈاکٹر صاحب موصوف متفق نہیں ہیں، اس جزی میں کہ گویا کلی کی مرادف ہے، یہ عرض کرنا ہے کہ اگر نصاب جامع روپ نراین کی تالیف ہے تو نصاب بدیع العجائب کو بھی امیر خسرو کی تصنیف تسلیم کرنا بعید از قیاس نہیں، جیسا کہ ابتدائے مضمون (ہذا) میں نقل ہوا کہ

"چون بر نصاب صبیان ابو نصر فراحی و نصاب ہائے حضرت امیر خسرو و فضلائے دیگر نظم کردہ اند"،

اور اس کی صرف یہی دلیل نہیں، بلکہ قیام مطابع سے پہلے کے مولفین کی تصانیف کا کوئی حصر کیونکر آخری ہو سکتا ہے، بلکہ اس باب میں ابھی قرائن اور سبب از دیاد ایقان ہو سکتے ہیں، روپ نراین نصاب جامع کا مقدمہ لکھتے ہیں، اس میں حضرت امیر خسرو کے "نصاب ہائے" کی حکایت بیان فرماتے ہیں، آج تک ارباب نظر کو امیر خسرو کی جن تالیفات کا علم حاصل ہوا، ان میں نصاب بدیع العجائب کا نام نہیں آتا، تو اس کا بدیہی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے، کہ یہ نسخہ سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ)[2] کے منشی بے بدل لالہ اتھڑ مل چوپڑہ کے ورثائے کرام کے پاس محفوظ تھا، جو خوش نصیبی سے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹۳) جا سکتا تھا، وہی کہ یہ فساد ۳ ستمبر سے شروع ہوا جس میں دلی کے علمی خزانے بھی لٹ گئے، جامعہ ملیہ کی لائبریری اور مکتبہ دونوں نذر آتش ہوئے، اور مکتبہ برہان بھی لٹ گیا، یا جل گیا!

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

[1] معارف کتاب ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ میں روپ نراین کا کوئی مستقل تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، ان کی صرف دو کتابوں ششِ جہت (ص ۱)، اور مخزن العرفان (ص ۱۲۴) کا ذکر ضمنی طور پر آیا ہے [2] راقم السطور

نہب آذری تشدسے بچ کر سوہدرہ ہی کے ایک طالب علم کو مل گیا! اور اس کا سہرا پایوں معرفانہ بزم شبلی میں سُنایا گیا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹۴) کو یہ نسخہ عزیزہ درگا داس پسر لالہ نونہال چوپڑہ خلف لالہ اتھرمل کی عنایت سے دستیاب ہوا، سوہدرہ کا یہ خاندان راے انندرام مخلص کے قبیلہ سے ہے، جیسا کہ ان کے شجرہ میں ثبت ہے،

۵ نہب آذری کیا ہے؟ چند سال ہوئے لاہور سے ایک سیلاب اُٹھا صرف ایک ہی شخص کی صورت میں جو اپنے گرد و پیش پوشیدہ نادر رکھتا تھا، تمام پنجاب و ہزارہ و سرحد کے مخطوطات لپیٹ کر لاہور میں اپنا ذاتی مخطوطات کا میوزیم بنا لیا، ا-

استفسار و جواب

گیتا کا منظوم فارسی ترجمہ

جناب ہری پرشاد صاحب
گردانی باغ پٹنہ

"گیتا کا فیضی کا منظوم ترجمہ عام طور پر متداول ہے، پیش نظر نسخہ چھوٹی تقطیع پر لاہور کے کسی پریس سے شائع ہوا ہے،

اس مین کتابت کی بعض غلطیان ہین، علامہ شبلی نے شعر العجم مین . . . . فیضی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے تالیفات وتراجم کو بالتفصیل لکھا ہے، اگر علامہ موصوف نے یہ کہین نہین لکھا ہے کہ فیضی نے گیتا کا بھی ترجمہ کیا ہے، لہذا اوکرم وقت نکال کر معارف مین اس پر روشنی ڈالین، کہ فیضی نے گیتا کا ترجمہ کیا تھا، یا متداول ترجمہ فیضی کے نام سے لوگون نے منسوب کردیا ہے بین عنایت ہوگی"

معارف :- عنایت نامہ ملا، عنایت فرمائی کا شکریہ، افسوس ہے کہ گیتا کے منظوم فارسی ترجمہ کا ذکر میری نظر سے نہین گذرا، مراۃ عالم، بدایونی، اکبرنامہ اور مآثر الکرام وغیرہ مین فیضی کا جو تذکرہ آیا ہے، وہ گیتا کے منظوم ترجمہ کے ذکر سے خالی ہے،

لیکن نہ صرف مولانا شبلی مرحوم، بلکہ متقدم مورخین نے بھی فیضی کی تصانیف کو نام بنام نہین گنایا ہے، صاحب مراۃ عالم نے اجمالی حیثیت سے صرف یہ کہا ہے کہ

"گویند صد و یک کتاب و رسالہ تالیف نمود" (ص ۳۴۴ قلمی)

پھر چند کتابون کے نام لکھے ہین، جو وہی ہین جن کا ذکر دوسری تاریخون مین آیا ہے،

لیکن میرا خیال ہے کہ گیتا کا جو منظوم ترجمہ فیضی سے منسوب لاہور سے شائع ہوا ہے، اور جس کا آخری اڈیشن آ . ط . پیپر پرا ہتمام سے چھاپا گیا ہے فیضی کی طرف اس کا انتساب صحیح ہو

گیتا کے متعلق یہ معلوم ہے کہ در اصل یہ مہابھارت ہی کا ایک حصہ ہے، جس کو مہابھارت سے اس حیثیت سے الگ کر لیا گیا ہے، کہ اس میں سری کرشن جی کے اقوال قلمبند ہو گئے ہیں،

اگرچہ مولانا شبلی مرحوم نے مہابھارت کے فارسی ترجمہ میں اس کے منظوم ترجمہ کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف اسی قدر لکھنے پر اکتفا فرمایا ہے، کہ

"۹۹۰ھ میں اکبر نے حکم دیا کہ بڑے بڑے گنوان پنڈت جمع ہوں، اکبر خود عبارت کا مطلب نقیب خان کو سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر عبد القادر بدایونی، ملا شیری وغیرہ کو الگ الگ ٹکڑے سپرد کئے، دو فن فیضی کے حصہ میں آئے"

(ج ۳ ص ۶۹)

لیکن ملا عبد القادر نے جہاں اس کا تذکرہ کیا ہے، اس میں فیضی کے قلم سے اس کے منظوم ترجمہ کا ذکر بھی آیا ہے وہ کہتا ہے،

"بعد ازاں شیخ فیضی مامور شد کہ نظم و نثر بنویسد وآن ہم مبتیر از دو فن صورت نیافت"

(بدایونی ج ۲ ص ۳۲۱)

فیضی نے یہ فارسی ترجمہ مہابھارت کے فارسی نثر کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر کرنا شروع کیا تھا لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر سکا، الیٹ نے لکھا ہے،

پھر شیخ فیضی پاکیزہ نظم و نثر میں اس کو اجمالی ترجمہ کے ذریعہ منتقل کرنے پر مامور کئے گئے لیکن وہ دو حصوں سے زیادہ مکمل نہ کر سکے.

(ج ۵ ص ۵۳۷)

گیتا کے نثر مین فارسی ترجمہ کے نسخے ایک سے زیادہ انڈیا آفس، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی اور بانکی پور مین (فہرست مخطوطات فارسی (انڈیا آفس ج ۱ ص ۵۹، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ورک نمبر ۱۴۱۲ ص ۵۴، کتاب نمبر ۹۹ بانکی پور ج ۱۶ ص ۱۲۹) موجود ہین، ان مین سے ایک ترجمہ ابو الفضل کا بھی کیا ہوا ہے[1] اس مین آغاز کتاب کی یہ عبارت ہمارے لئے مفید مطلب ہی،

"گیتا بزبان فارسی تصنیف شیخ ابو الفضل علامی از کتاب مہابھارتھ از فن ششم کہ آنرا ابھکم پرب گوبند سری کرشن جیو وارجن سنباد"

یعنی یہ رسالہ اگرچہ گیتا کا ترجمہ ہے، لیکن اس کو فارسی مین مہابھارت کے فن ششم کو سامنے رکھکر منتقل کیا گیا ہے، اس لئے اس کو مہابھارت کے جزوی ترجمہ سے بھی موسوم کرسکتے ہین، اور چونکہ یہی حصہ گیتا کے نام سے بھی موسوم ہے، اس لئے اس کو گیتا کا فارسی ترجمہ بھی کہہ سکتے ہین، بہت ممکن ہے کہ فیضی نے اسی فارسی نثر سے اس کو نظم مین منتقل کیا ہو، انڈیا آفس ج ۱ ص ۵۹ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ورک نمبر ۱۴۱۲ ص ۵۴، کتاب نمبر ۹۹)

---

[1] بعض مستشرقین نے اس ترجمہ کے ابو الفضل کی طرف انتساب کو صحیح نہین سمجھا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ان کی یہ را ـــــے صحیح نہین ہے، مہابھارت کے مختلف حصون کا ترجمہ مختلف اہلِ علم نے کیا تھا، اگر ابو الفضل نے اس کے اس حصہ کو فارسی مین منتقل کیا ہو، جو گیتا پر مشتمل تھا، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہین، خصوصًا جب کہ دیباچہ مین ابو الفضل کی یہ عبارت بھی موجود ہے :-

"این نسخۂ گیتا کہ در اکتشاف سرایر قدرت ذو الجلال و اکتشاف حقیقت معرفت لایزال است آنرا باجازت سلطان عادل و برہان کامل ...... جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی .... بندہ شیخ ابو الفضل از زبان سنسکرت ترجمہ بعبارت لسان فرس و عربی در آوردہ"

(فہرست مخطوطاتِ فارسی انڈیا آفس ج ۱ ص ۵۹)

نیز اس منظوم فارسی ترجمہ کا نسخہ بھی جس پر اس وقت گفتگو جاری ہے، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی مین موجود ہے، اگرچہ اس مین کوئی دیباچہ نہین ہے، لیکن اس نسخہ کے سرورق پر مترجم کی حیثیت سے فیضی کا نام درج ہے، اور ہمارے نزدیک اتنی شہادت بھی فیضی کی طرف اس کے انتساب کی صحت کے لئے کافی ہے، اس نسخہ کا پہلا شعر وہی ہے، جو مطبوعہ نسخہ میں پایا جاتا ہے، یعنی

طراز ندۂ داستان کہن   بدینسان بیفگند طرح سخن

(فہرست مخطوطات بنگال ایشیاٹک سوسائٹی ورک نمبر ۴، ص ۱۶۴، کتاب نمبر ۹۱)

اس نسخہ مین دیباچہ کے موجود نہ ہونے سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، کہ فیضی نے دراصل مہابھارت کے بعض اجزاء کا ترجمہ نظم مین کیا تھا، اور ان اجزاء مین وہ حصہ بھی تھا جس پر بھاگوت گیتا مشتمل ہے، اور اسی وجہ سے بھاگوت گیتا کے منظوم ترجمہ کا ذکر فیضی کے سوانح مین نہین آیا ہے، اس قیاس کی تردید اسی صورت مین ہوسکتی ہے، کہ فیضی کے سوانح مین اس ترجمہ کے انتساب کا ذکر نظر آجائے اور اس وقت یہ سمجھا جاسکتا ہے، کہ اس نے گیتا کے علیحدہ نسخہ کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا تھا لیکن پھر اس پر کسی دیباچہ کا موجود نہ ہونا تعجب خیز ہوگا،

بہرحال خواہ کہین انفرادی طور پر ذکر مل جائے، یا نہ ملے فیضی کی طرف اس نسخہ کا انتساب صحیح ہو اور اسی وجہ سے ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخہ مین عہد قدیم ہی مین کسی نے اس کے سرورق پر فیضی کا نام لکھ دیا تھا، اور غالباً یہ منظوم ترجمہ جس قلمی نسخہ سے پہلی مرتبہ چھاپ کر شائع کیا گیا ہو، اس پر بھی فیضی کا نام درج ہوگا، فقط

" ر "

لفظِ جاوید کا تلفظ

جناب نصرت بدایونی سوتھ بدایون	جاوید میں یائے مجہول ہے، یا یائے معروف؟ اگر یائے معروف کے جواز کے سلسلہ مین کوئی شعر عید، تائید کے قوافی پر ہو

تو تحریر فرما دیجئے، براہ کرم جواب سے جلد مشرف فرمائیے،،

معارف:- گرامی نامہ ملا، علالت کی وجہ سے جواب مین تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہون،

جاوید کا صحیح تلفظ بہ یاے معروف یعنی بروزن نا ہید ہے، اسی طرح جاویدان بروزن غازیان

"جاویدانہ" بروزن "تازیانہ" ہے، "جاوید" کا مخفف جاوِد، بروزن "عابد" آتا ہے،

جامی کا مشہور شعر ہے، ؎

الٰہی غنچۂ اُمید بکشاے

گلے از روضۂ جاوید بنماے

والسلام "س"

حیاتِ شبلی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری نہین ہے، بلکہ ان مین ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس کے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانون کی مذہبی سیاسی علمی تعلیمی، ادبی اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت اُس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی و تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبۂ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش وجستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہین ضمناً ان تعلیمی ادارون کی جن سے مولانا کا تعلق رہا ہے مجمل تاریخ بھی آگئی ہو، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحے ہو جس مین دارالمصنفین، ندوۃ العلماء، مدرستہ الاصلاح، سرائے میر اور شبلی کالج کی عمارتون کے تیرہ ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہین کاغذ اور طباعت اعلیٰ قیمت غیر مجلد علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپئے مجلد لعہ "منیجر"

وفیات

آہ! مولانا عمادی

حیدرآباد دکن کے اخبار البلاغ سے یہ معلوم کرکے سخت صدمہ ہوا کہ ہمارے قدیم دوست مولانا عبداللہ العمادی نے حیدرآباد میں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کرلی تھی، ۱۱ر شوال ۱۳۶۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا، اُن کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہوگی، مرحوم اردو، فارسی اور عربی کے مستند ادیب اور مورخ تھے، اور تقریباً ہر علم و فن سے آشنا تھے،

مرحوم کا وطن ضلع جونپور میں امرتھوا نام ایک موضع تھا، اور عماد الدین نام کسی بزرگ سے خاندانی نسبی نسبت رکھتے تھے، اور اسی تعلق سے اپنے کو عمادی لکھتے تھے، اصلی نام عبداللہ تھا، اور کبھی کبھی افغانی نام کے لئے عبداللہ کا فارسی ترجمہ "خدابندہ" بھی لکھا ہے، جو سب سے پہلے نومسلم تاتاری سلطان کا نام تھا، مگر شہرت عام عبداللہ عمادی کے نام سے تھی،

غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد ہی یہ لکھنؤ آگئے تھے، اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے دامن تربیت میں پرورش پائی، مولانا عبدالعلی کا اصل وطن گو مدراس تھا، مگر جب تعلیم کے لئے لکھنؤ آئے، یہیں کے ہوکے رہ گئے، یہیں فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے تعلیم پائی، ادب، شعر اور تاریخ کی میں ملکہ رکھتے تھے، اکثر کتابوں کے آخر میں جو اُن کے مطبع میں چھپیں اُن کی تاریخیں آپ کو مل سکتی ہیں، اُن کی صحبت میں مولانا عمادی صاحب کو بھی زیادہ تر شعر و سخن اور ادب و تاریخ کا فائدہ پہنچا، مولانا عبدالعلی ایک زمانہ میں رامپور میں مدرس تھے، وہاں بھی وہ اُن کے ساتھ رہے، پھر جب وہ لکھنؤ آئے،

تو تحریر فرما دیجئے، براہ کرم جواب سے جلد مشرف فرمائیے"

معارف: گرامی نامہ ملا، علالت کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، معذرت خواہ ہوں، جاوید کا صحیح تلفظ بہ یاے معروف یعنی بروزن ناہید ہے، اسی طرح جاویدان بروزن غازیان "جاویدانہ" بروزن "تازیانہ" ہے، "جاوید" کا مخفف "جاود" بروزن "عابد" آتا ہے، جامی کا مشہور شعر ہے، ؎

الٰہی غنچۂ امید بکشاے

گلے از روضۂ جاوید بنماے

والسلام "س"

حیاتِ شبلی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ ان میں ان کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس کے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، ادبی، اصلاحی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت اس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی و تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش وجستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہیں ضمناً ان تعلیمی اداروں کی جن سے مولانا کا تعلق رہا ہے مجمل تاریخ بھی آگئی ہے، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحہ ہے جس میں دارالمصنفین، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اور شبلی کالج کی عمارتوں کے تیرہ ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہیں کاغذ اور طباعت اعلیٰ قیمت غیر مجلد علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپئے مجلد لیعہ "منیجر"

وفیات

آہ! مولانا عمادی

حیدرآباد دکن کے اخبار البلاغ سے یہ معلوم کرکے سخت صدمہ ہوا کہ ہمارے قدیم دوست مولانا عبداللہ العمادی نے حیدرآباد میں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کرلی تھی، ۱۱ر شوال ۱۳۶۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا، اُن کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہوگی، مرحوم اردو، فارسی اور عربی کے مستند ادیب اور مورخ تھے، اور تقریباً ہر علم و فن سے آشنا تھے،

مرحوم کا وطن ضلع جونپور میں امرتھوا نام ایک موضع تھا، اور عماد الدین نام کسی بزرگ کے خاندان سے نسبی نسبت رکھتے تھے، اور اسی تعلق سے اپنے کو عمادی لکھتے تھے، اصلی نام عبداللہ تھا، اور کبھی کبھی اخفائے نام کے لئے عبداللہ کا فارسی ترجمہ "خدابندہ" بھی لکھا ہے، جو سب سے پہلے نو مسلم تاتاری سلطان کا نام تھا، مگر شہرت عام عبداللہ عمادی کے نام سے تھی،

غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد ہی یہ لکھنؤ آگئے تھے، اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے دامن تربیت میں پرورش پائی، مولانا عبدالعلی کا اصل وطن گو مدراس تھا، مگر جب تعلیم کے لئے لکھنؤ آئے، یہیں کے ہوکے رہ گئے، یہیں فرنگی محل میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے تعلیم پائی، ادب، شعر اور تاریخ گوئی میں ملکہ رکھتے تھے، اکثر کتابوں کے آخر میں جو اُن کے مطبع میں چھپیں اُن کی تاریخیں آپ کو مل سکتی ہیں، اُن کی صحبت میں مولانا عمادی صاحب کو بھی زیادہ تر شعر و سخن، اور ادب و تاریخ کا فائدہ پہنچا، مولانا عبدالعلی ایک زمانہ میں رامپور میں مدرس تھے، وہاں بھی وہ اُن کے ساتھ رہے، پھر جب وہ لکھنؤ آئے،

تو وہ بھی اُن کے ساتھ یہاں آئے، اور یہین اُن کے مُرغ شہرت نے پر و بال پیدا کئے،

مولانا آسی نے لکھنؤ مین محمود نگر کے محلہ مین سکونت اختیار کی، اور اصح المطابع کے نام سے ایک مطبع قائم کیا، بعد کو اس کا نام اُن کے صاحبزادہ قاری عبد الولی مرحوم نے آسی پریس رکھ دیا تھا، اس مطبع مین عربی کی بہت سی کتابین چھپ کر شائع ہوئین، مولانا آسی کو کتابون کی تصحیح مین بڑی مہارت اور دقتِ نظر حاصل تھی، عربی متوسطات کے طالب علمون کو بھی وہ باجرت تصحیح کے کام پر رکھ لیتے تھے، اور مولانا کی صحبت مین وہ کچھ نہ کچھ بن جاتے تھے، مولانا عمادی بھی انہی خوش قسمت طالب علمون مین تھے، اور اپنی خداداد استعداد سے اس صحبت سے بہرۂ وافر حاصل کیا،

مرحوم کسی درسگاہ کے باقاعدہ طالب علم نہ تھے، اور نہ علوم مروجہ کی درس و تدریس کی حیثیت سے تکمیل کی تھی، مگر موہبتِ الٰہی رسمی طریقۂ تعلیم پر موقوف نہین، اس کا فیض عام اور بقدر استعداد تمام ہے، کتب بینی کے شائق تھے، اور خصوصیت کے ساتھ اردو، فارسی اور عربی کی نظم و نثر کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور ان تینون زبانون مین اُن کو شاعری اور انشا پردازی کی قوت حاصل تھی، اور ان زبانون کے ہزارون شعر اُن کے خزانۂ دماغ مین محفوظ تھے، اور عربی و فارسی لغات پر بھی عبور رکھتے تھے،

مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ وہ عربی کی الف لیلہ سمجھتے نہین تھے، مگر پھر بھی وہ اس کو دیکھا کرتے، اور جو کچھ سمجھ جاتے، اور اس پر خوش ہوتے، اور جو نہ سمجھتے، اس کو لغت سے حل کرتے، یا شاید مولانا آسی سے دریافت کر لیتے، اور اس طرح ان کو عربی انشا پردازی کا ذوق پیدا ہوا، اور عربی مین مضمون نویسی کی قدرت حاصل کی، جو اس زمانہ مین غیر معمولی بات تھی،

اسی سلسلہ مین بیسوین صدی عیسوی کے آغاز مین مولانا آسی کی رہبری اور ان کی اڈیٹری مین البیان نام ایک اردو و عربی ماہانہ رسالہ مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے نکلنے لگا، اس کے ہر صفحہ مین دو کالم

ہوتے تھے، ایک مین عربی اور دوسرے مین اس کا اردو ترجمہ ہوتا تھا، اور آخر مین چند صفحے عربی ممالک کی خبرون اور اردو مضمونون کے ہوتے تھے، اس رسالہ کا مبادلہ مصر و شام و ٹیونس کے عربی اخبارون سے ہوتا تھا، یہ اخبارات اُن کے ہان آتے تھے، اور وہ اس کو پڑھا کرتے تھے، اور اس کے بدولت جدید عربی کے نئے الفاظ سے اُن کو پوری واقفیت ہوتی رہتی تھی، اور وہ اُن کو اردو مین رواج دینے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ ان کے بعض الفاظ رواج بھی پا گئے،

اس زمانہ مین ہمارے استاذ مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی، مدرس اول دار العلوم ندوہ لکھنؤ مین مقیم تھے، مرحوم ان کی خدمت مین آیا جایا کرتے تھے، یہ تو معلوم نہیں کہ اُن سے پڑھا تھا یا نہین مگر وہ ان کے صحبت یافتہ ضرور تھے، مولانا چریا کوٹی ۱۹۰۵ء تک لکھنؤ رہے تھے، اس کے بعد ہی اسی سال جب اُن کے شاگرد رشید مولانا شبلی مرحوم دار العلوم مین معتمد ہو کر آئے تو مولانا عمادی اُن کی صحبتون مین آنے جانے لگے، اور یہی زمانہ مرحوم سے میرے آغاز ملاقات کا تھا، جو بحمد اللہ اس وقت سے شروع ہو کر اخیر وقت تک قائم رہا،

ندوہ کا علمی پرچہ الندوہ جو پہلے دفتر ندوہ کے شاہجہان پور ہونے کے سبب سے شاہجہان پور سے نکلتا اور آگرہ مین چھپتا تھا، مولانا شبلی کے قیام لکھنؤ کے بعد لکھنؤ سے نکلنے لگا، اور اصح المطابع مین چھپنے لگا، اور مولانا عمادی کی آمد و رفت اس تعلق سے زیادہ ہونے لگی، ۱۹۰۶ء مین مولانا شبلی نے اس کی سب اڈیٹری کا کام مولانا ابو الکلام کے سپرد کیا، چند ماہ کے بعد جب وہ وکیل امرتسر مین چلے گئے تو مولانا نے مرحوم کو اُن کی جگہ الندوہ کا سب اڈیٹر بنایا، اس زمانہ مین انھون نے جابر بن حیان مشہور عرب کیمیا دان اور ابن خلدون وغیرہ پر چند علمی مضمون لکھے، مگر مرحوم کو کتابون کے حوالے دینے کی عادت نہ تھی، اس سے مولانا شبلی کو اُن کے حوالون پر اعتماد نہیں ہوتا تھا، چنانچہ چند ہی ماہ کے بعد یہ خدمت خاکسار سے متعلق کی گئی، اس کے بعد اس بنا پر کہ ماہ بماہ پرچہ کا اہتمام مجھ سے نہ ہو سکا، پھر یہ خدمت

عمادی صاحب کے سپرد کی گئی، اوس کے بعد پھر یہ خدمت ہمارے دوست مولانا عبد السلام صاحب ندوی کو اور کبھی مجھ کو ملتی رہی، اور مجھی پر اس کا خاتمہ ہوا،

غالبًا شنہ ۱۹۰۸ء کے وسط یا شنہ ۱۹۰۹ء کے شروع مین مولانا ابو الکلام نے اپنے والد ماجد کے مرض الموت کے سبب سے اپنے والد کے اصرار سے وکیل امرتسر کی ادارت چھوڑ کر کلکتہ گئے، تو وکیل کے مالک غلام محمد صاحب مرحوم نے مولانا عمادی کو ان کی جگہ بلایا، اور وہ کئی سال اس تعلق سے امرتسر مین رہے، اور وہان انھون نے سر سید کے تہذیب الاخلاق کو پھر زندہ کیا، اور کئی نمبر اوس کے نکالے اور اس کی طرف سے بعض اپنے رسائل، اور دوسرون کی کتابون کی باجازت اشاعت کی، اور سر سید کے بعض رسالون کو دوبارہ چھاپا، مرحوم نے وہان جو رسالے لکھے ان میں سے عرب قدیم اور صنائع العرب کے نام اس وقت یاد ہین' اُن کے امرتسر چلے جانے کے بعد البیان کی ادارت میرے حصہ مین آئی، اور تقریبًا سال بھر اوس کو مین چلاتا رہا،

شنہ ۱۹۱۲ء مین مولانا ابو الکلام کی ادارت مین جب کلکتہ کے افق سے ہلال (الہلال) نمودار ہوا تو چند ماہ کے بعد مین الہلال کی ادارت مین شامل ہوا، اور میرے کچھ ہی دنون کے بعد مولانا عمادی بھی وہین آگئے، اور چند مہینون تک مین اور وہ دونون ایک ہی ساتھ ایک جگہ الہلال کے دفتر مین رہے، اور کام کیا کئے، اس زمانہ مین الہلال مین انھون نے جو مضمون لکھے، ان مین سے اسوۂ نوح، اسوۂ ابراہیمی اور کشف ساق تین عنوان یاد ہین،

چند ہی مہینون کے بعد ہم دونون الگ ہو گئے، وہ زمیندار لاہور مین چلے گئے، اور مین حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی کے حسب الحکم دکن کالج پونا چلا گیا، نومبر شنہ ۱۹۱۴ء مطابق ذیحجہ شنہ ۱۳۳۲ھ مین جب مولانا شبلی کی اور دسمبر شنہ ۱۹۱۴ء مطابق محرم شنہ ۱۳۳۳ھ مین مولانا حالی کی وفات ہوئی ہے، تو مولانا عمادی زمیندار مین تھے، اور اسی اخبار مین ان دونون مرحومین پر پُر اثر مضمون لکھے، اور

مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے سلسلہ سے انہی کے تعلق کے سلسلہ سے میرے چند مسلسل مضمون نکلے،
پھر زمانہ کا انقلاب دیکھئے، کہ حیدرآباد دکن میں جامعۂ عثمانیہ کی نصابی کتابون کے لئے دارالترجمہ
قائم ہوا، اور زمیندار کے اڈیٹر ظفر علی خان اعلیٰ حضرت حضور نظام میر عثمان علی خان کے ایام شاہزادگی
کے سابقہ معرفت کے سبب سے جب دکن آئے، تو مولانا عمادی کے حیدرآباد آنے کے وہ ذریعہ بن گئے،
ظفر علی خان تو سیاسی شورشون کے طوفان مین بہ گئے، مگر مولانا عمادی اپنے فضل وکمال اور مرنجان
مرنج طبیعت کے سبب سے اپنی جگہ جمے رہے، اور ایسے جمے کہ مر کر ہٹے،

دارالترجمہ مین وہ اپنے لغات دانی اور جدید عربی مصطلحات علمی کی واقفیت کے سبب سے بہت کارآمد
ثابت ہوئے، دارالترجمہ کی دو جماعتون مین سے اوس جماعت مین تھے، جو اردو مین عربی مصطلحات کے
رواج کے لئے کوشان تھی، مین نے سنا ہے کہ اُن کی کثرت لغات کے سبب سے اعلیٰ حضرت حضور
نظام نے اُن کو کبھی قاموس کہدیا تھا، اور خیال تھا کہ اُن کو قاموس جنگ کا خطاب نہ مل جائے۔

وہ دارالترجمہ مین وضع اصطلاحات کے علاوہ مترجم بھی رہے، اُن کے قلم سے متعدد عربی تاریخون
کے ترجمے اردو مین دارالترجمہ سے شائع ہوئے ہین، اس سلسلہ مین تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور
تاریخ یعقوبی کے ترجمے انھون نے غالبًا کئے ہین، مترجم کے علاوہ وہ دارالترجمہ کے ناظر مذہبی بھی رہے
یعنی دارالترجمہ کی مترجمہ اور مؤلفہ کتابون پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے تھے، کہ ان مین مذہبی معتقدات
اور مذہب کے خلاف کوئی بات تو نہین، اور غالبًا اسی خدمت کے بعد اُن کو پنشن ملی، مگر اس پنشن
کے بعد بھی انھون نے حیدرآباد کو نہین چھوڑا، بلکہ وہین توطن اختیار کر لیا، اور ان کے فرزند اور
اور بعض عزیز حیدرآباد کی ملازمتون پر سرفراز کئے گئے، اور اب بھی ہین،

مرحوم حیدرآباد کی علمی مجلسون اور محفلون کے جزو ہو گئے تھے، دائرۃ المعارف اور کتب خانۂ
آصفیہ جو مملکت دکن کے دو اہم اور عظیم الشان علمی مرکز ہین، وہ ان دونون کے مشیر اور رکن رکین تھے

مرحوم نہایت خلیق اور ملنسار تھے، اور اپنے سے ملنے والے کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے تھے، کہ بسا اوقات اوس بیچارہ کو یہ غلط فہمی ہو جاتی تھی، کہ وہی مخاطب سے ہر حیثیت مین بڑا ہو لیکن اس باب مین وہ اپنی سادہ فطرت کے ساتھ تکلف کو بھی کام مین لاتے تھے، اس لئے حقیقت مشتبہ ہو جاتی تھی، ان کو شواذ اور نوادر مسائل سے بھی دلچسپی تھی اور اس لئے وہ کبھی کبھی بطور بحث کسی شاذ رائے کو ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگاتے تھے، لطائف و ظرائف کا ذخیرہ بھی اُن کے پاس کم نہ تھا، کسی بات کو وہ غلط بھی جانتے ہون مگر "کیا خوب!" وہ اس طرح کہتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس کی تحسین کر رہے ہین،

عزیز پروری اُن کی خصوصیت تھی، ایک دفعہ وہ کلکتہ سے اپنے وطن جا رہے تھے، اور بہت سے روپیون کی ضرورت ظاہر کر رہے تھے، مین نے پوچھا اتنے روپیے کیا ہون گے، فرمایا جب گھر جاتا ہون تو غریب اعزہ آتے ہین، اُن کی مدد کرنے کو جی چاہتا ہو، ہر ایک کو اس کے حسب حیثیت کچھ دیتا ہون، حیدرآباد جب میرا جانا ہوتا، مرحوم باصرار مدعو کرتے، اور ماحضر پیش فرماتے، اور طعام و کلام دونون سے بہرہ اندوز کرتے،

مرحوم مشرقی تعلیم کے ان نمونون مین سے تھے جن کے اٹھنے کے بعد اُن کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی، جب وہ کلکتہ سے وطن کو جا رہے تھے، تو مین نے کلکتہ مین اپنی تنہائی محسوس کر کے ان کو ایک خط مین اپنا ہی ایک عربی شعر لکھ کر بھیجا تھا،

لَوْ انی علمت مَا تجسمتُ بعدہٗ   منعت القطار ان تمیل برکبھا

جس کا ترجمہ یہ ہے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ اُن کے بعد مجھے کیا تکلیف ہوگی، تو مین ریل کو روک دیتا، کہ وہ اپنے سوارون کو لے کر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، لیکن اب اس رفیق قدیم کو وہ سفر پیش آیا جس کو شاعرانہ طور پر بھی روکا نہین جا سکتا، اور جس سفر پر سب کو ایک دن روانہ ہونا ہے، اور جہان کی رفاقت کا حق رفیق اعلیٰ کے سوا کوئی رفیق و عزیز بھی ادا نہین کر سکتا، اور جس سفر کا زاد سفر عمل کے سوا کچھ نہین، فرحمہ اللہ تعالیٰ،

"س"

۲۶ر شوال ۱۳۶۶ھ ۔ بھوپال

ادبیات

تابشِ سہیل

"صیّاد و اسیر"

ازجناب اقبال احمد خان صاحب سہیل اعظم گڈہ

خاکِ دل رفعت مین اوجِ آسماں سے کم نہیں
صحنِ جان وسعت مین بزمِ لامکاں سے کم نہیں

ہر سحر اک درسِ نو۔ ہر شام ہے ایک انقلاب
دہر خود اک نامکمل داستاں سے کم نہیں

غم تو یہ ہے سننے والے سنتے سنتے سو گئے
یہ زمانہ ورنہ ایک افسانہ خواں سے کم نہیں

ایک دن صیاد نے مُرغِ قفس سے یہ کہا
"پرفشانی تیری سعیِ رائگاں سے کم نہیں

تیرے پر کترے ہوے اور آہنی ہو یہ قفس
توڑنا اس کا عبورِ ہفتخواں سے کم نہیں

یہ تڑپ یہ اضطراب اور ایسے مقصد کے لئے؟
جو بجائے خود عذابِ جسم و جاں سے کم نہیں

یوں تو تجھے ہی تیرے دشمن برق و باران و تگرگ
باز و شاہین بھی بلائے آسماں سے کم نہیں

اور پھر اس پر قیامت آب و دانہ کی تلاش
یہ مصیبت بھی تو خوفِ دشمناں سے کم نہیں

ایک لمحے کے لئے جس میں سکوں حاصل نہ ہو
زندگانی ایسی مرگِ ناگہاں سے کم نہیں

شکر کر میرا کہ تجھ کو دشمنوں سے دی نجات
اور کوئی راحتِ قفس میں آشیاں سے کم نہیں

آب و دانہ بھی میسر امن و اطمینان بھی
کوئی آسایش یہاں تجھکو وہاں سے کم نہیں

تیری خاطر مین نے پھولوں سے سجایا ہو اسے
یہ قفس بھی دلکشی میں گلستاں سے کم نہیں

اتنے احسانات پر بھی تو ہے ظالم ناسپاس
پر تو ابھی تری شور و فغاں سے کم نہیں

سن کے یہ تقریر بولا طائر زنداں نصیب
آپ کا ارشاد بھی سحر بیاں سے کم نہیں

جسم تو پابند تھا ہی، دل پہ بھی اب گھات ہے
گفتگو کا سلسلہ دام نہاں سے کم نہیں

ہے بظاہر طرز استدلال کتنا پُر فریب
اس کا پھندا حلقۂ زلف بتاں سے کم نہیں

اس پر انداز بیاں کی دلربائی الاماں
حسن مغرب کی ادائے دلستاں سے کم نہیں

ہین نہاں ہر لفظ مین وہ طعنہ ہائے دلخراش
جو خلش میں زخم شمشیر و سناں سے کم نہیں

کیا خبر تجھکو نہیں اے ناصح نامہرباں؟
بزم ہستی رزمگاہ امتحاں سے کم نہیں

جان روشن کے لئے لازم ہے سوز اضطراب
زندگی خود شعلۂ برق تپاں سے کم نہیں

موت سے پہلے حقیقی امن و آسایش کہاں
اور کہیں ہو بھی تو اک خواب گراں سے کم نہیں

جو نشیمن خود بنایا جائے تنکے جوڑ کر
مسند جمشید و تخت خسرواں سے کم نہیں

دانۂ خردل جو اپنی سعی بازو سے ملے
قدر و قیمت میں وہ گنج شایگاں سے کم نہیں

اپنی محنت کا گزی گاڑھا اگر ہاتھ آسکے
تو وہ احساں کے حریر و پرنیاں سے کم نہیں

ایک لمحہ بھی جو آزادی سے ہو جائے بسر
بندگی کی زندگی بے کراں سے کم نہیں

آتش دوزخ سے رسوا تر غلامی کی حیات
مرگ آزادی بہشت جاوداں سے کم نہیں

دو جہاں کی نعمتیں اس ایک لذت پر نثار
ذوق آزادی غم سود و زیاں سے کم نہیں

تیر باران حوادث کی ہمیں پروا ہو کیوں
صبر کی خو جوشن و برگستواں سے کم نہیں

میری آہیں بے اثر ہیں تو ہراساں کیوں ہو تو　　خود تری تقریر شور الاماں سے کم نہیں
یہ قفس تو کیا ہے کہساروں کو کر دیں پاش پاش　　جوشِ آزادی کی رو سیل رواں سے کم نہیں
کر دیا جاپان کو جن چند ذروں نے تباہ　　خونِ دل اُن ذرہ ہائے ناتواں سے کم نہیں

بحثِ صیاد و اسیر افسانہ ہو یا واقعہ　　قصۂ آزادی ہندوستاں سے کم نہین
تھی قفس کی زندگی تُبرد ہن ورنہ یہاں　　خوش نوا کوئی بلبل نکتہ داں سے کم نہین

اندیشۂ بیباک

از

جناب انور کرمانی

یہ چاند یہ تارے یہ زمین اور یہ افلاک　　رستے ہیں خودی کے ہیں مثال خس و خاشاک
خوں گرم ہو، دل زندہ ہو، بیدار نظر ہو　　کھل جاتے ہیں الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک
اندیشۂ تدبیر نہ کر دشتِ جنون مین!　　دامانِ محبت ہے یہاں حلقۂ فتراک
ہر دل نہیں اُس آہِ جگر دوز کا محرم　　جو چوم کے اٹھتی ہے شہیدوں کی کفِ خاک
گرماتا ہے افسردہ جوانوں کے لہو کو!
درویشِ خدامست کا اندیشۂ بیباک

بابُ التقریظ والانتقاد

باغی ہندوستان[1]

(تصنیف جناب مولوی محمد عبد الشاہد خاں صاحب شروانی)

از

سید ریاست علی ندوی

دلی کی مغلیہ سلطنت کا چراغ سحری جب ٹمٹما رہا تھا، اسی زمانہ مین یہاں علم وعرفان کے تاجدار خاندان ولی اللّٰہی کے سایہ مین اصلاح وانقلاب کی تحریک نشو ونما پا رہی تھی، اس کا آغاز رد بدعات واصلاح معاشرت سے ہوا، اور شباب پر پہنچ کر انقلاب سلطنت کی جد وجہد کی صورت مین وہ منتقل ہوئی، مولانا شاہ اسمٰعیل علیہ الرحمہ اس تحریک کے علمبردار تھے، ان کے اٹھائے ہوے مسائل دینی وعلمی رنگ مین دلی والون کی زبان پر تھے، تقلید وعدم تقلید، پھر اس سے پیدا ہونے والے مسائل رفع یدین، آمین بالجہر وامتناع امکان نظیر خاتم النبیین وغیرہ نے زیادہ زور پکڑا، علماے وقت نے اس مین موافق ومخالف حصہ لیا، مناظرہ کا میدان بار بار گرم ہوا، رقادر الکلام شعراء نے اپنی نظمون سے موافق ومخالف مسلکون کی تائید یا تردید سے فضا کو ساز گار یا مخالف بنایا، جن علماے کرام نے مخالفت مین بیش از بیش حصہ لیا، ان کے سرخیل مولانا فضل حق خیرآبادی تھے، وہ اپنے مسلک

[1] حجم ۴۰۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی بہتر قیمت مجلد صہ پتہ:- مدینہ بک ایجنسی بجنور (یوپی)

نی ماتریدی تھے، اور مقلدین کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے تھے،

مولانا فضل حق خیرآبادی دودمان خیرآباد کے چشم و چراغ تھے، انھون نے علم کے گہوارہ مین پرورش
ن، پھلے پھولے اور پروان چڑھے، اسی خانوادہ کے وجود سے ہندوستان مین حکیم فتح اللہ شیرازی
، علوم عقلیات کا ستارہ روشن تھا، مولانا کے پدر بزرگوار مولانا فضل امام اپنے وقت مین علوم
عقلیات کے امام، اور مولانا فضل حق ان کے حقیقی جانشین اور اپنے وقت کے استاذ فن مانے گئے،
دوسری طرف انھین خانوادۂ ولی اللّٰہی سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا اور اس خانوادہ سے اُن کے اخلاص
عقیدت و محبت کے دیرینہ مراسم قائم تھے، ان کا اپنے علم و فن مین یکتا ہونا، ادب، شعر اور انشا
پردازی میں کمال مہارت رکھنا، اور فہم کا رسا، نظر کا دقیق اور ذہن کا نکتہ سنج ہونا، ان کے مسلمات
مین سے تھا، وہ اپنے بے پایاں علم سے حریف کو زیر کر لینے، اور قدرت بیان سے مخالفین کو قائل کر دینے
مین شہرت رکھتے تھے، اُن کے علم و فضل کا شہرہ آج تک قائم اور اُن کی تصنیفات ہدیہ سعیدیہ
وغیرہ عربی تعلیم کے نصاب مین داخل ... متداول ہیں،

اس لئے مولانا اسمٰعیل علیہ الرحمہ کے مقابلہ مین حریف بن کر جو ہستی سامنے آئی، وہ صحیح معنون
میں اُن کی مدمقابل تھی، بلکہ اوّل الذکر سے موخر الذکر کو علوم سے مزاولت کا موقع زیادہ حاصل رہا
تھا، باین ہمہ مولانا شہید علیہ الرحمہ کی تحریک آگے بڑھتی گئی اور آگے چل کر جہاد کی تحریک مین تبدیل
ہوئی، وہ سکھون کی حکومت کا خاتمہ کرکے انگریزی سلطنت سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے، کہ امرکوٹ کا
حادثہ پیش آگیا، اور ان کی مجاہدانہ زندگی کے کارنامے زبان زد خلائق رہ گئے، امرکوٹ کے واقعۂ
شہادت کے بعد اگرچہ یہ تحریک وقتی طور پر ختم ہوئی لیکن متبعین کی خفیہ جد وجہد کا سلسلہ جاری رہا،
بالآخر آگے چل کر ہندوستان کی وہابی تحریک اٹھی، اور اسی پس منظر سے انقلاب ۱۸۵۷ء کی جد وجہد
نے بھی نشو و نما پائی،

اکابر کی باہمی مخالفتیں شخصی اختلافات سے بلند ہوتی ہیں، یہ کیسا عجیب واقعہ ہے کہ وہی مولانا فضل حق جو مولانا اسمٰعیل شہید کی زندگی میں ان کے حریف تھے، اور اُن کی زبان وقلم سے نکلے ہوئے ہر حرف کی تردید کو اپنا فرض منصبی جانتے تھے، عام صلحاء و متقین کے مسلک کے خلاف انگریزی حکومت کی ملازمت کے نہ صرف جواز کے قائل، بلکہ خود حکومت کے ایک شعبہ کے سر رشتہ دار تھے، اور انگریزوں کے زیر اثر حکومت اودھ کے صدر الصدور رہ چکے تھے، اسی جہاد کے فتوی پر اپنے دستخط ثبت فرماتے ہیں جس کا علم مولانا اسمٰعیل شہید نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں بلند کیا تھا، فتوی جہاد پر یہی دستخط اُن کی آیندہ پر محن اور پر مصائب زندگی کا پیش خیمہ بنا، وہ انقلاب ۵۷ء کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد گرفتار کئے گئے، اور حبس دوام کی سزا پاکر جزیرۂ انڈمان بھیج دیئے گئے، اور وہیں حسرت انگیز مصائب میں زندگی کے دن پورے کرکے اسی کی مٹی میں ہمیشہ کے لئے محو خواب ہو گئے،

مولانا مرحوم کی زندگی کے اس آخری دور کے کارنامے عوام کی نگاہ سے اوجھل یا کم سے کم فراموش ہو چکے تھے، نو شائع تصنیف "باغی ہندوستان" سے ان کی یاد نئے سرے سے تازہ ہوئی،

تذکرۂ علماے ہند میں مولانا مرحوم کی تصنیفات کے ضمن میں تاریخ بغاوت ہند کا نام آیا ہے، خلافت کی تحریک کے زمانہ میں غازی محی الدین صاحب اجمیری کی زبان سے اس رسالہ کا ذکر سننے میں آیا تھا، اور اس زمانہ میں اس کے مطالعہ کا سراپا اشتیاق تھا لیکن سعادت حاصل نہ ہوسکی، کیا معلوم تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی آرزو کے برآنے کے ساتھ اس کے مطالعہ کا شرف بھی حاصل ہوسکے گا،

باغی ہندوستان کی اشاعت کی تقریب دراصل مولانا علیہ الرحمہ کے اسی رسالہ کو "الثورۃ الہندیہ" سے موسوم کرکے مع ترجمہ شائع کرنے کے لئے ادا ہوئی ہے، لائق مرتب نے باغی ہندوستان کو دو حصوں میں ترتیب دیا ہے، پہلا حصہ مولانا فضل حق علیہ الرحمہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جو

۳ صفحے پر ختم ہوا ہے، اور دوسرے حصہ مین رسالہ الثورۃ الہندیہ اور دو قصائد ہمزیہ و دالیہ کے عربی متون
اُن کے بالمقابل اردو ترجمے درج ہین، یہ حصہ ۲۵۱ سے ۲، ۸ صفحوں مین آیا ہے، اور شروع مین چند صفحے
مہ اور تعارف کے ہین، رسالہ کا تعارف مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے لکھا ہے جس سے اس کتاب
رفعت و منزلت مین اضافہ ہوا ہے لیکن مولانا موصوف نے صرف رسالہ اور قصائد کے ترجمہ کے مطالعہ
کر لیا ہے، سوانح کا حصہ بھی اُن کی نگاہ سے گذرا ہوتا تو شاید مفید مشورے اس کی طباعت سے پہلے لائق مصنف کو حاصل ہوتے،

کتاب کا یہ حصہ اگرچہ غیر معمولی محنت، توجہ اور عرق ریزی سے مرتب ہوا ہے، لیکن بعض امور کی نشاندہی ضروری ہے، مصنف نے اس حصہ کا آغاز ہندوستان کے عہد قدیم کی علمی مرتبت کے ذکر سے کیا ہے، مگر یہ تذکرہ اجمالی ہے، پھر "ولادت و نسب" کا عنوان ہے، جس مین مولانا علیہ الرحمہ کی پیدایش کا ذکر کر کے ان کے اجداد کے علمی کارناموں کا ذکر آیا ہے، پھر تعلیم و تربیت کا عنوان ہے، اس مین خیرآباد کی علمی منزلت، اور اس کی قدیم تاریخ کا تذکرہ کیا گیا ہے، کتاب کے حسن ترتیب کے لحاظ سے یہ بہتر ہوتا کہ ہندوستان کی علمی شہرت پر جو پہلے گفتگو آئی تھی، اس کو مولانا فضل امام کے ذکر پر لا کر ختم کیا جاتا، اور اسی ضمن مین خیرآباد اور اس کے علمی ماحول کا تذکرہ کیا جاتا،

اس کے بعد کتاب مختلف عنوانات جو گویا مستقل ابواب ہین مثلاً فطانت و ذہانت، درس و تدریس، ملازمت، سخن فہمی، شاعری و نثر نگاری، سلسلۂ تلمذ، تصانیف، بحث و مناظرہ، بیعت، اخلاق و عادات، سیاست، اخلاف و تلامذہ مین تقسیم ہے، ان مین جو مباحث و معلومات درج ہین، اگر ان پر علٰحدہ علٰحدہ گفتگو کی جائے تو سلسلۂ کلام دراز ہوگا، لیکن مجموعی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے کہ واقعات کی ترتیب، ان کو مختلف عنوانون کے تحت لانے، اور ان سے نتائج اخذ کرنے مین مزید دقت نظر کی ضرورت تھی، پھر لائق مصنف کی اپنی زندگی جیسا کہ انھون نے تلامذہ کے ذیل مین اپنے سوانح مین درج کیا ہے، پرشور سیاسی ہنگامون سے وابستہ رہی ہے، اور پچھلی سیاسی تحریکات مین وہ اپنے

استاذ محترم مولانا معین الدین اجمیری کے فیض صحبت سے قوم پرورانہ رجحانات کے ساتھ شریک رہے ہین، مصنف کی اس زندگی کے جذبات وخیالات کے اثرات، اس تصنیف کے صفحہ صفحہ سے نمایان ہین، اور اس مین بہت سی ایسی تفصیلات آگئی ہین جن کا تعلق "حیات فضل حق" سے کچھ زیادہ نہ تھا، نیز بعض دوسرے مباحث بھی بے محل درج ہو گئے ہین، مثلاً مصنف نے ص ۹۶ مین علامہ فضل حق اور مولانا ابوالکلام آزاد مین باہمی مختلف مماثلتین دکھا کر رسالہ الثورۃ الہندیہ اور غبار خاطر کے قید فرنگ مین تصنیف پانے کی مماثلت کا تذکرہ کیا ہے، یہ بات اسی صفحہ پر ختم ہو جاتی، لیکن اس سلسلہ مین مصنف نے ص ۰، سے ،، تک مین ۴۲ء سے آج تک کے ہندوستان کی سیاسی سرگذشت لکھ ڈالی ہے، جن مین جزئیات کی تفصیل تک آگئی ہے، ظاہر ہے کہ مولانا فضل حق کے سوانح حیات سے ان امور کا تعلق دور کا بھی نہیں ہوسکتا، ان کا ذکر زیادہ سے زیادہ غبار خاطر کی جائے تصنیف کی تشریح کے ضمن مین چند سطرون مین تعلیق وحاشیہ کے طور پر لایا جاسکتا تھا، اسی قسم کے بے محل مندرجات کی مثالین صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۲۲، ۱۵۰، ۱۶۴ وغیرہ مین دیکھی جاسکتی ہین،

دوسری طرف بعض امور کی تشریح کی ضرورت تھی، وہ نظرانداز ہوگئی ہے، مثلاً جس زمانہ مین مولانا امیر علی کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، مولانا فضل حق حکومت اودھ کے ایک معزز عہدہ صدر الصدور پر فائز تھے، اس موقع پر ان کی روش کی وضاحت کی ضرورت تھی، اور اگر اسی سبب سے انھون نے حکومت اودھ سے ترک تعلق کیا، تو سند کے لئے حوالہ کی ضرورت تھی، پھر مولانا امیر علی کی شہادت کے بعد انگریزون نے حکومت اودھ پر جو معاہدہ مسلط کیا تھا، اس مین اور واقعۂ شہادت مین باہمی کوئی ربط نہین بلکہ نفس واقعۂ شہادت اور اس کی ساری تفصیلات کا صاحب سوانح سے کیا تعلق پیدا ہوتا ہے؟ یہ جذباتی معلومات ومباحث ایسی زیادتی سے کتاب مین آگئے ہین، کہ مولانا کے سوانح وحالات ان کے پردہ مین چھپ گئے یا ایسے بکھر گئے ہین، کہ بڑی توجہ سے سررشتہ کو

ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح مولانا کی تصنیفات کا بیان تشنہ ہے، ان پر تفصیل سے نقد و نظر کے ساتھ لکھنا تھا، ادب و انشاء اور شعر و شاعری کے مباحث بھی اسی ضمن میں لانے تھے، تذکرہ علمائے ہند میں ان کی ایک کتاب کا نام "رسالہ تحقیق کلی طبعی تشکیک و ماہیات" سے موسوم آیا ہے، مصنف نے رسالہ تشکیک ماہیات" اور رسالہ کلی طبعی" کے ناموں سے دو رسالوں کا ذکر کیا ہے، معلوم نہیں واقعہ کیا ہے،

مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق کے مختلف فیہ مسائل میں امتناع نظیر کا مسئلہ بھی تھا، مولانا شہید کی رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہو سکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، دوسری طرف مولانا فضل حق کی رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ خود اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کر سکتا، اس موضوع پر مرزا غالب کی بھی ایک مثنوی ہے جو کلیات میں موجود ہے، مصنف کا بیان ہے کہ

> "علامہ کا رجحان طبع دیکھ کر اس موضوع پر ایک مثنوی لکھ ڈالی ...... اپنی قابلیت سے ایک حل نکالنے کی کوشش کی ...... آخری چند اشعار میں اس خیال کو رد کرتے ہوئے علامہ کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا ہے"،

مولانا حالی نے یادگار غالب میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، افسوس ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر اس کا مراجعہ نہیں کیا، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ غالب نے یہ مثنوی "رجحان طبع دیکھ کر" نہیں لکھی تھی، بلکہ علامہ کی فرمایش سے لکھی تھی، دونوں مسلکوں کے درمیان ایک راہ اپنے ذوق سے نکالی تھی، اور طبعاً انھیں مولانا اسمٰعیل شہید سے اتفاق تھا، مگر مولانا مثنوی کے اشعار سن کر آزردہ ہوئے تو پھر بعد میں آخر کے وہ چند شعر انھوں نے بڑھا دیئے،

مصنف نے تلامذہ کی صف میں سے صرف مولانا عبد الحق، مولانا ابو البرکات اور مولانا معین الدین کو روشناس کیا ہے، اور صفحہ ۱۹۷ سے ۳۰۰ تک ان کی تذکرے ہوئے ہیں، پھر ۳۰۱ سے ۳۵۰ تک کے صفحے مصنف کی سوانحمری پر مشتمل ہیں، ان بزرگوں کے حالات میں اختصار کرکے دوسرے جلیل القدر تلامذہ کو بھی پیش کرنا تھا،

ہم نے ان خردہ گیریوں کو ظاہر کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ مولانا فضل حق جیسے صاحب فضل کے سوانح حیات زیادہ مرتب شکل میں ہمارے سامنے آسکیں، ورنہ درحقیقت مصنف اپنی سعی، تلاش و تحقیق اور غیر معمولی ارادت عقیدت اور انہماک سے ان اوراق کے مرتب کرنے پر مبارکباد کے مستحق ہیں، توقع ہے کہ طبع ثانی میں اگر لائق مصنف ان اشارات سے اتفاق کر سکیں تو نظر ثانی فرما سکیں گے،

مولانا فضل حق علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ اور قصائد کو مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی کی معرفت، کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں کے ٹکڑوں پر کچھ پنسل اور کچھ کوئلہ سے لکھ کر اپنے صاحبزادے مولانا عبد الحق کے پاس بھیجا تھا، جنھوں نے محنت سے ان کو ترتیب دیا، اور رازداری سے اس کے نسخے عقیدتمندوں میں تقسیم ہوئے، مولانا معین الدین اجمیری کا نسخہ لائق مترجم کو حاصل ہوا، یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء کے حالات میں بعض نئے رخ اس سے نمایاں ہوتے ہیں،

تمہید کے بعد علامہ علیہ الرحمہ نے بغاوت کے اسباب پر اختصار سے نظر ڈالی ہے، اس سلسلہ میں انگریزوں کے مذہبی تعصب، ہندوستانی اکابر و اعیان سے ان کی بدسلوکی، عیسائیت کی جبریہ تبلیغ، اور بعض مذہبی شعائر کو روکنے اور نشان درس و تدریس کو مٹانے اپنی زبان اور دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کرنے اور پچھلے زمانہ کے علوم و معارف کے برباد کرنے کا ذکر کیا ہے پھر دکھایا ہے کہ انگریز لوگوں کو تباہ کرنے کے لئے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کرنے لگے،

رعیتوں کے لئے خرید فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا، اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ذمہ دار بن بیٹھے، تاکہ خوراک ملنے پر ان نصاریٰ اور اُن کے اعوان و انصار سے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل ہو،، (ص ۳۵۸)

پھر اسی طرح کے چند اقدامات کے تذکرہ کے بعد انقلاب کی جدوجہد کی مختصر و جامع تاریخ بعض جزئی تفصیلات کے ساتھ درج کی ہے، ان میں چند چیزیں خاص طور پر نگاہ میں آتی ہیں، مثلاً اس زمانہ میں بھی ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم کے دو فرقوں سے تعبیر کئے جاتے تھے، ان بزرگوں کے ذہن میں علیحدہ قومیت کا کوئی تصور موجود نہ تھا، ایک سلسلہ میں فرماتے ہیں:-

"یہ خطرناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا، اور اپنے اپنے مذاہب و اعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا، (ص ۳۶۰)

۵۷ء کی آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں کے حصہ کے متعلق آج کل افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے، ایک طرف رانی جھانسی اور کنور سنگھ کو اس حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے کہ قریب ہے کہ وہی اس تحریک کے اصل ہیرو قرار پا جائیں، اور دوسری طرف ایک طبقہ اس تحریک کی ناکامی کو ہندوؤں کے سر تھوپنا چاہتا ہے، یعنی صرف مسلمانوں نے استخلاص وطن کی کوشش کی، ہندوؤں نے معاندانہ رویہ اختیار کیا، اور تحریک کو ناکام کیا، حالانکہ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا حصہ اس میں زیادہ نمایاں رہا ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ اس تحریک کی تمام تر رہبری انہی کے ہاتھوں میں تھی، لیکن یہ بھی صحیح نہیں کہ ہندو اپنی جماعت اور فرقہ کی حیثیت سے اس سے علیحدہ رہے، واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاست کی باگ مسلمان سیاست دانوں کے ہاتھوں میں تھی، اس لئے ان کا پیش پیش رہنا ایک قدرتی امر تھا، لیکن ہندوؤں نے عملی حیثیت سے اس میں پوری شرکت کی، اگر مسلمان ہندو ساہوکاروں، بنیوں، اور زمینداروں نے کیں تو مسلمان وزراء، حکام، زمیندار، اور ساہوکار بھی

اس سے بری نہین تھے، ان دونون قسم کے شواہد اس رسالہ مین بھی کثرت سے مثلاً ص ۲، ۳، ۴ ، ۲۰
وغیرہ مین موجود ہین، جن مین ایسے لوگون کو ذلیل واجرہندو" اور "بدبخت بدکیش اور مرتد مسلمان" سے خطاب کیا گیا ہے،
معلوم ہوا غدارون کی صف مین ذلیل ہندو اور بدکیش و مرتد مسلمان دونون تھے، بلکہ جن جن ہندوؤن
نے انگریزون کی مدد کی، ان کا ذکر کسی خاص صفت سے موسوم کرکے کیا ہے، مثلاً لکھتے ہین،

"اور ہر عیسائی دوست ہندو ان کی مدد مین پیش پیش تھا" (ص ۲، ۳)

پھر لکھتے ہین :-

"اب بنیون اور دوسرے ہندوؤن نے جو نصاریٰ کے دوست تھے، اور بادشاہ کے ان کارپردازون (مرزا الٰہی بخش وغیرہ) نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے،....." (ص ۳)

پھر اس قسم کی مثالین بھی ہین، کہ کسی غدار مسلمان عامل (مثلاً نواب احمد علی عرف مموخان) نے غداری کی، اور ہندوؤں کی جماعت نے مقابلہ کیا، فرماتے ہین :-

"بہادر ہندوؤن کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤن کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ کے لئے ڈٹ گئی، یہ سو سے زیادہ نہ تھے، دشمنون کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے"، (ص ۵، ۴)

رسالہ کے آخر مین ملکہ وکٹوریہ کے معافی کے عام اعلان کا ذکر آیا ہے، جس پر اعتماد کرکے علامہ علیہ الرحمہ بھی روپوشی چھوڑ کر باہر نکل آئے تھے، اور گرفتار کرکے انڈمان بھیج دیئے گئے تھے،

عربی کے دونون قصائد بھی ان ہی معلومات خصوصاً انڈمان کے مصائب ومحن کی داستان سے لبریز ہین، امید ہے کہ نئے ہند مین اس "باغی ہندوستان" کا خیر مقدم اس کے شایان شان کیا جائے گا،

مطبوعات جدیدہ

اسلام کا نظام حیات

از جناب مولانا عبدالوہاب صاحب ظہوری،

حجم ۴۴۴ صفحے، تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر، قیمت مجلد للعہ، پتہ: نفیس اکیڈیمی عابد روڈ، حیدرآباد، دکن،

اس تصنیف میں اسلام کے عقائد، عبادات، اخلاق کی تعلیمات اور نظام عدالت وسیاست کو اس طرز میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک طرف ایسے بہت سے اعتراضات آپ سے آپ دور ہو جائیں جن کو مغرب کے مستشرقین اسلام پر کرتے آئے ہیں، اور اسلامی اوامر و نواہی، اور دیگر تعلیمات کے مصالح و حکم کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کو مصر وغیرہ کے نئے مفکرین اسلام نے اختیار کیا ہے، کتاب چند بابوں میں تقسیم ہے، پہلا باب "افراد کی اصلاح کے عنوان سے ہے جس میں عقائد صحیحہ کی تلقین، اور عبادات کے ذریعہ افراد کی ظاہری و باطنی اصلاح اور ان کے مصالح کو دکھایا گیا ہے، اس ضمن میں وضو، نماز، روزہ کے مباحث ہیں، پھر افراد میں جماعت کی صلاحیت پیدا کرنے کا عنوان قائم کیا ہے اور اس ضمن میں زکوٰۃ و حج کے مصالح تحتانی عنوانوں کے ساتھ دکھائے ہیں، پھر جماعت کی اصلاح کا عنوان ہے، جس میں تعدد ازدواج، طلاق، پردہ اور غلامی کے انسداد کے موضوع پر گفتگو آئی ہے، مختلف بابوں میں معیشت، اخلاق، عدالت و سیاسیات، اخوت و مساوات، حکومت الٰہیہ کی تشکیل اور اقوام عالم کی اصلاح کے عنوان قائم کیے گئے ہیں، امید ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا،

معین العقائد و معین الحکمہ مرتبہ مولانا مفتی محمود حسن صاحب اجمیری، صدر مدرس مدرسہ حسینیہ، راندیر، ضلع سورت۔ حجم بہ ترتیب ۹۷ و ۱۰۴ صفحے۔ تقطیع چھوٹی، کاغذ بہتر، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت بہ ترتیب ۴؍ و ۶؍۔ موصوف سے مذکورۂ بالا پتہ پر طلب کریں۔

عربی مدارس کے اہم علوم میں علم کلام، فلسفہ، منطق اور فرائض وغیرہ ایسے فنون ہیں جن میں طالبعلموں کو فن کی دقتیں پیش آتی ہیں۔ لائق مصنف نے ان علموں پر اردو میں نئے انداز سے رسالے شائع کرنا شروع کیا ہے، اور مختلف علوم کے مبادی پر وہ کتابیں شائع کر چکے ہیں، اس سلسلہ میں دو رسالے معین العقائد اور معین الحکمہ اس وقت پیش نظر ہیں۔

معین العقائد میں مصنف نے مختلف درجوں کے لیے الگ الگ حصے قائم کیے ہیں، پہلے درجہ کے لیے عقائد نسفی کا ترجمہ سہل زبان اور طریقہ ادا میں پیش کیا ہے، دوسرے حصہ میں عقائد کی اوپر کے درجوں کی کتابوں کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

معین الحکمہ میں تمام فلسفہ و حکمت کے مسائل اس انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ طلبہ کے لیے ان کا سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو، عربی مدرسوں میں فلسفہ و حکمت کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس فن کے پس منظر اور عام مبادیات سے عموماً طلبہ کو روشناس کیے بغیر فن کی کتابیں شروع کرا دی جاتی ہیں، اور وہ غریب ایک نئی وادی میں پہنچ کر قیل و قال اور اعتراض و جواب کی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں، معین الحکمہ اگرچہ ایک مختصر رسالہ ہے، لیکن کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تمہیدی بیانات اور ادبیات کو اگر پہلے طلبہ کے ذہن نشین کرا دیا جائے تو اس فن کی تحصیل ان کیلئے آسان ہو جائے، فن کے ضروری مسائل اس رسالہ میں آ گئے ہیں، اچھا ہوتا کہ یہ رسالے عربی مدرسوں کے ابتدائی درجوں کے نصاب میں داخل کر دیے جاتے، اور ان کے پڑھانے کے بعد ان فنون کی عربی کتابوں کو پڑھایا جاتا، امید ہے کہ ان رسالوں سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

"س"

اور تاریخی کتابین

تاریخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

مصنفہ: مولانا عبدالسلام ندوی، ضخامت ۲۷۶ صفحے،

قیمت: ۲ع/

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسون اور تعلیم گاہون کا حال معلوم کرنا چاہین تو نہین مل سکتا، مولوی ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہون پر معارف مین ایک مقالہ لکھا تھا جس کو اہل نظر نے بے حد پسند کیا، اب دارالمصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت مین نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے،

ضخامت ۱۳۴ صفحے، قیمت: ۱۲/

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہین، وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائین،

اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یوپی نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ/

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ عہدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،

ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ/

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے، تاکہ مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے اور اب کیا ہین، ضخامت ۷۶ صفحے، قیمت: عہ/

مرتبہ: مولوی عبدالسلام قدوائی، ندوی،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشار اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر، خود عالمگیر کے خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

۳۹۷ صفحے، قیمت: للعہ/

رقعات عالمگیر اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس حصہ مین جمع کئے گئے ہین، ان سے ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، مرتبہ: سید نجیب اشرف ندوی ایم اے،

ضخامت: ۴۸۷ صفحے،

قیمت: سے/

سوانح

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل، اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیاں، اور معترضین کے جوابات، قیمت: ہے، ضخامت ۳۲۹ صفحے، طبع سوم با اضافہ حواشی، (از مولنا سید سلیمان ندوی)

سیر عمرؓ بن عبد العزیز

حضرت عمرؒ بن عبد العزیز خلیفۂ اموی کے سوانح حیات اور اُن کے مجددانہ کارنامے، ضخامت ۲۰۲ صفحے، قیمت: عہ/ ر از مولنا عبد السلام ندوی،

حیات امام مالکؒ

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی کتاب موطاے امام مالکؒ پر تبصرہ، قیمت: عہ/ (۱۰۶ صفحے) از مولانا سید سلیمان ندوی،

الغزالی

امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کا فلسفہ اور علم کلام، اخلاق اور تصوف مین اُن کے مجددانہ کارنامے ضخامت ۲۳۵ صفحے، قیمت: عہ/ ر از مولنا شبلی رحمۃ اللہ علیہ،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرامؓ کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس مین چیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت: ۵۲۰ صفحے، قیمت: للعہ/

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۱ نومبر ۱۹۳۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

اردو میں اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر حکومتوں کی سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ہو اس لئے دار المصنفین نے تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ خاص اہتمام سے مرتب کرایا ہے جس کے بعض حصّے یہ ہیں اور بعض زیر طبع ہیں، اور اکثر زیر تالیف و تکمیل ہیں، جو بتدریج جیسے جیسے حالات مساعد ہوں گے شائع ہوتے رہیں گے،

تاریخ اسلام حصّۂ اوّل (عہد رسالت و خلافت راشدہ) اس میں آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مفصل مذہبی، سیاسی و تمدنی اور علمی تاریخ ہے (زیر طبع)

ضخامت: ۴۰۰ صفحے، قیمت: سے ٓ ر

تاریخ اسلام حصّۂ دوم، (بنو امیہ) اس میں اموی حکومت کی صد سالہ سیاسی و علمی و تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے،

ضخامت ۴۳۰ صفحے، قیمت: سے ٓ ر

تاریخ اسلام حصّۂ سوم، (تاریخ بنی عباس جلد اوّل) اس میں خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے خلیفہ ابو اسحٰق متقی للہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی بہت مفصل سیاسی تاریخ ہے، ضخامت ۵۴۰ صفحے، قیمت: للعہ ر

تاریخ اسلام حصّۂ چہارم (تاریخ بنی عباس جلد دوم) اس میں خلیفہ المستکفی باللہ کے عہد ۳۳۳ھ سے آخری خلیفہ متعصم باللہ ۶۵۶ھ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ ہے،

ضخامت ۴۳۲ صفحے، قیمت: صہ ر

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

تاریخ دولت عثمانیہ حصّۂ اوّل، اس میں عثمان اوّل سے مصطفیٰ رابع تک سلطنت عثمانیہ کے چھ سو برس کے کارناموں کی تفصیل ہے، ضخامت: ۵۰۰ صفحے

قیمت: ے ر

تاریخ دولت عثمانیہ حصّۂ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارناموں کی تفصیل، از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) تا جنگ عظیم ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء)

ضخامت: ۴۶۸ صفحے، قیمت: صہ ر

مرتبہ مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے علیگ سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈہ،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، اس میں صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی، اٹلی و جزائر سسلی پر اسلامی حملوں کی ابتدا، حکومت کا قیام، اور عہد بعہد کی ترقیوں اور عروج کی پوری اور مفصل داستان ہے،

۴۶۵ صفحے، قیمت: للعہ ر

تاریخ صقلیہ حصّۂ دوم، یہ سسلی کے تمدنی و علمی ترقیوں کا مرقع ہے، جس میں عہد بعہد کے مفسرین، محدثین، فقہاء، ادباء و شعراء کے مفصل حالات اور ان کی تصنیفات کا ذکر ہے،

۵۰۰ صفحے، قیمت: للعہ ر

مرتبہ: مولانا سید ریاست علی ندوی،

مسعود علی ندوی

منیجر

دار المصنفین اعظم گڈہ

جلد ۶۰ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۴۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

استفسار وجواب

جائزہ بھی لیا ہے، امید ہے کہ اہلِ علم اس تصنیف سے فائدہ اٹھائیں گے،

نفسیاتِ جمال از مولانا ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی، ناشر اعلیٰ کتب خانہ، قرول باغ، دہلی، حجم ۱۵۰ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت مجلد عہ

مولانا ابوالنظر صاحب رضوی، دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، مولانا کی یہ تصنیف اگرچہ نفسیاتِ جمال سے منسوب کی گئی ہے، مگر دراصل اس کو اس کے موضوع کے اعتبار سے نفسیاتِ محبت کہنا چاہیے، اس میں محبت کی واردات کو اس کے مختلف زاویوں سے دیکھ کر قلمبند کیا گیا ہے، ہمارے لائق دوست پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی کے بقول جنھوں نے اس کتاب کا "تعارف" لکھا ہے، لائق مصنف "دیدور مسافر کی طرح ہیں، جو راستہ کی دلفریب وادیوں اور نظر نواز چمنستانوں کی ایک ایک دلفریبی کو بنظر ستائش دیکھتا اور ان کی حسن کاریوں سے محظوظ و لذت اندوز ہوتا ہے"، ہمیں اس کتاب پر اندلس کے مشہور عالم دین علامہ ابن حزم ظاہری کی جو مذہب ظاہریہ کے بانی بھی ہیں، کتاب طوق الحمامہ فی الالفۃ والالاف یاد آئی، موضوع کی یگانگی سے دونوں کے عنوانات و ابواب میں مشابہت موجود ہے، لیکن عرب اور ہندوستانی "دیدہ وروں" کی نگاہوں میں جو فرق ہو سکتا ہے، وہ ان دونوں کتابوں میں موجود ہے، لائق مصنف نے "محبت اور زندگی" "محبت اور شباب" اسی طرح ...... اور عزم و ارادہ شیرینی ناکامی، خودکشی، راہ عمل، شکایت، شکست غرور، خودستائی، رسوائی، وفاداری، بدگمانی، شکوہ رقیب، رعب حسن، بوسہ، شاعری، اور وصل کے عنوانوں سے محبت کے واردات، جذبات، اور کیفیات کی ترجمانی کی ہے، ترجمانی کا حق ادا ہوا ہے کہ نہیں، اس کا صحیح فیصلہ اس کوچہ کے راہرو ہی کر سکتے ہیں۔

عشقِ جہانگیر از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی حجم ۲۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت عہ پتہ :- مکتبہ ادب لال کنوان دہلی،

خواجہ محمد شفیع دہلوی کا قلم دلی کی ستھری اور پاکیزہ زبان اور دلآویز طرز ادا میں گلکاریاں

کرنے مین روشناس ہے، ان کی نئی کتاب عشق جہانگیر کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس مین جہانگیر اور نورجہان کی داستان کو عاشقانہ رنگ مین آغازِ عشق سے اس کے انجام تک قلمبند کیا گیا ہے اور اس تیموری شاہزادے کے جان نثاروں کی آبدار تلواروں کے جوہر شاہزادے کی عشق بازی کو کامیاب بنانے اور ابوالفضل کو راہ سے ہٹانے مین دکھائے گئے ہین، کاش خواجہ صاحب نے اپنا موضوع اس تیموری شاہزادے کے عشق کی داستان کو نہ بنایا ہوتا، کہ افسانہ نویسی مین وہ یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ اس مسلمان تاجدار کا دامن اخلاق کہان کہان آلودہ ہوتا ہے، اور کیسے کیسے سنگین جرائم کا وہ مرتکب دکھائی دیتا ہے، بہت سی ایسی داستانین جن کی تردید کے لئے مورخین نے زورِ قلم صرف کیا تھا، وہ اس فسانہ مین اس انداز سے قبول کی گئی ہین، کہ وہ فطری واقعات معلوم ہوتے ہین، اس لئے اگر ہم جناب خواجہ صاحب کو اس تصنیف کی تمام تصنیفی خوبیون اور مرتب داستان سرائی کے باوجود اس داستان کے تصنیف کرنے پر مبارکباد نہ دے سکین، تو امید ہے کہ وہ ہمین معذور تصور فرمائین گے،

افکارِ آتشین از جناب حافظ فضل الرحمٰن صاحب بزمی ناشر علمی بک ڈپو، مقیم گنج بنارس، جیبی تقطیع، حجم ۱۲ صفحے، قیمت :- ۶ر

افکار آتشین جناب بزمی بنارسی کی ایسی نظمون کا مختصر مجموعہ ہے، جس مین صحیح اسلامی عقائد و تعلیمات کو حسن و خوبی سے پیش کیا گیا ہے، اور مغرب زدہ ذہنیت اور جدید تہذیب کے مخرب اخلاق لوازم کا مضحکہ اڑایا گیا ہے، جناب بزمی نے اپنی شاعری سے عقائد کی اصلاح اور دین کی تبلیغ کی خدمت انجام دی ہے، اُن کی یہ روش دوسرے نوجوان شعراء کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا،

شیطان مترجم جناب حبیب اشعر صاحب دہلوی، حجم ۱۴۴ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت ۱۲ر

کے مسلمانون کا جو حصہ رہا ہی جزاے احسان کے طور پر پاکستان کو اپنے فیصلون کے وقت انڈین یونین کے مسلمانون کی اس یونین میں سیاسی پوزیشن کو نظرانداز نکرنا چاہئے، بااین ہمہ یونین کی ذمہ دارون سے یہ بھی دریافت کیا جاسکتا ہے کہ کیا پاکستان کو انھون نے اسی نقطہ نظر سے قبول کیا تھا کہ یونین کے مسلمانون کے ساتھ یرغمال کا برتاؤ کیا جائے گا، جو لوگ اس ملک کو اپنا آبائی وطن تصور کرین، اُن کے متعلق یہ کیسے فیصلہ کیا جاسکتا ہو کہ اُن کے ساتھ جو برتاؤ کیا جائے، اس مین غیر ملکی حکومت کے اپنی اقلیت کے ساتھ برتاؤ سے موازنہ کر لیا جائے، دوسری بات ہے کہ انسانیت شرافت اور عدل وانصاف کے نام پر دوسری حکومتون کو صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کی جائے، اور اس مین کامیابی نہ ہو، تو ایک حکومت دوسری حکومت کے ساتھ جو کچھ کر سکتی ہو اور جو وسائل اختیار کر سکتی ہے اس کو عمل مین لایا جائے، یہ تو کسی طرح مناسب نہین کہ یہان کی اقلیتون اور پاکستان کی اقلیتون کو ایک ترازو پر رکھا جائے، اور اسی معیار سے ایک دوسرے کے حقوق کو تول کر ان کی تعیین کیجائے،

صوبہ متحدہ مین ہندی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جاچکا ہو، اور اس پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہو، افسوس کی بات ہو کہ اردو کے مرکز مین اردو کو اس طرح نظرانداز کیا گیا، ہندی اور اردو کو مساوی درجہ کے ساتھ سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کوئی ایسا نہین ہے جس کی نظیر موجود نہ ہو، کناڈا، اسوئزرلینڈ اور جنوبی افریقہ مین دو زبانون مین وہان کا کاروبار جاری ہے، اگر امریکہ اور دوسرے ملکون کے کانسٹی ٹیوشن کو سامنے رکھکر یہان قانون سازی کیجا سکتی ہو تو کیا زبان کے معاملہ مین دوسرے ملکوں کی مثال کو سامنے نہین رکھا جا سکتا، اور اب تو خود ہمارے یہان مشرقی پنجاب مین ہندی اور گورمکھی دو زبانون اور رسم خط کو سرکاری درجہ دیا جاچکا ہو،

لیکن معلوم ہو کہ یہ زمانہ دلائل کا نہین جذبات کا ہے یوپی حکومت کے وزراء آپ دلائل بھی دینے کی زحمت اٹھا رہے ہین، پالیوال جی فرماتے ہین کہ اردو صرف شہری حلقہ کی زبان ہے، جس مین سرمایہ و ملت کے لوگ رہتے ہین، دیہی آبادی کی زبان نہین، دوسری طرف اردو کے قدیم محسن شمپورنانند جی کا ارشاد ہو کہ اردو اس صوبہ مین صرف ۲ فی صدی آبادی کی زبان ہے، اس کو سرکاری زبان کا درجہ نہین دیا جاسکتا، پہلے یہ وزراء اپنے بیانون مین کسی ایک بات پر اتفاق کر لین، پھر جب موجودہ فساد انگیز ذہنیت کے دور کا خاتمہ ہوگا اور مسائل کو دلائل سے پرکھنے کا دور آئے گا اس وقت ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر گفتگو کی جاسکے گی، اور شاید اس وقت اردو کو وہ مرتبہ حاصل ہوسکے گا جو اس کو اپنے مرکز مین حاصل رہنا چاہئے،

مقالات

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبد السلام ندوی

(۸)

بہرحال اسرارِ خودی کے اکثر فلسفیانہ اجزار تو فلاسفۂ مغرب سے ماخوذ ہیں، اس مین حکماے اسلام کے خیالات کا پرتو بہت کم پایا جاتا ہے، البتہ اسلامی تصوف مین سے انھون نے صرف عشق کا نظریہ مولانا روم سے لیا ہے، اور نہایت بلند آہنگی سے اس کا اعتراف کیا ہے چنانچہ فرماتے ہین:۔

روے خود بنمود پیرِ حق سرشت — کو بحرفِ پہلوی قرآن نوشت

گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق — جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق

ایک حکایت سید مخدوم علی ہجویری کی لکھی ہے، جن کی خدمت مین ایک نوجوان مرد سے آیا اور کہا کہ

گفت محصورِ صفِ اعدا ہستم — درمیانِ سنگہا میناستم

با من آموز اے شہِ گردون مکان — زندگی کردن میانِ دشمنان

اور اس کے جواب مین انھون نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اوس سے خودی اور مظاہر خودی کا اثبات ہوتا

فارغ از اندیشۂ اغیار شو — قوتِ خوابیدہ بیدار شو

سنگ چون بر خود گمانِ شیشہ کرد شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد
ناتوان خود را اگر رہرو شمرد نقد جانِ خویش با رہزن سپرد
تا کجا خود را شماری ما و طین از گلِ خود شعلۂ طور آفرین
با عزیزان سرگران بودن چرا شکوہ سنجِ دشمنان بودن چرا
راست می گویم عدو ہم یار تست ہستیٔ او رونقِ بازار تست
ہر کہ دانائے مقامات خودی است فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است
کشت انسان را عدو باشد سحاب ممکناتش را برانگیزد ز خواب
سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است سیل را پست و بلند جادہ چیست
مثل حیوان خوردن آسودن چہ سود گر بخود محکم نۂ بودن چہ سود
خویش را چون از خودی محکم کنی تو اگر خواہی جہان برہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو گر بقا خواہی بخود آباد شو
چیست مردن از خودی غافل شدن تو چہ پنداری فراقِ جان و تن
در خودی کن صورتِ یوسف مقام از اسیری تا شہنشاہی خرام

ان اشعار کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حکایت سے محض داستان سرائی مقصود نہین، بلکہ خودی کی حقیقت کا اظہار مقصود ہے،

شرحِ راز از داستانہا می کنم غنچہ از زورِ نفس وا می کنم
"خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران گفتہ آید در حدیثِ دیگران"

میر نجات نقشبند المعروف بہ بابائے صحرائی کی ایک نصیحت بھی لکھی ہے، اور اس مین مختلف طریقون سے خودی کی تعلیم دی گئی ہے،

ای کہ مثل گل ز گِل بالیدۂ | تو ہم از بطن خودی زائیدۂ
از خودی مگذر بقا انجام باش | قطرۂ می باش و بحر آشام باش
تو کہ از نور خودی تابندۂ | گر خودی محکم کنی پایندۂ
ہستی و از نیستی ترسیدۂ | اے سرت گردم غلط فہمیدۂ
چون خبر دارم ز ساز زندگی | با تو گویم چیست راز زندگی
غوطہ در خود صورت گوہر زدن | پس ز خلوت گاہ خود سر بر زدن
زندگی از طوف دیگر رستن است | خویش را بیت الحرم دانستن است

لیکن تمام صوفیہ مین ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم کے فیوض و برکات کا نہایت بلند آہنگی کے ساتھ خاص طور پر اعتراف کیا ہے، اور اپنی تمام تصنیفات مین ان کا نام پیر و مرشد کی حیثیت سے لیا ہے، چنانچہ پیام مشرق مین فرماتے ہین،

مطرب غزلے، بیتے از مرشد روم آور | تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے
بیا کہ من ز خم پیر روم آوردم | مئے سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی

زبور عجم مین کہتے ہین :-

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی | برہمن زادۂ رمز آشنای روم و تبریز است

بال جبریل میں لکھتے ہین :-

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا | تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسون
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن | اسی کے فیض سے میرے سبو مین ہے جیحون

اس بنا پر شاعرانہ، فلسفیانہ اور متکلمانہ غرض ہر حیثیت سے ہم کو یہ پتہ لگانا چاہئے، کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم سے کیا کیا فیوض و برکات حاصل کئے ہین،

کے مسلمانون کا جو حصہ رہا ہو جزاے احسان کے طور پر پاکستان کو اپنے فیصلون کے وقت انڈین یونین کے مسلمانون کی اس یونین میں سیاسی منزلت کو نظر انداز نکرنا چاہئے، باین ہمہ یونین کی ذمہ دارون سے یہ بھی دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کیا پاکستان کو انھون نے اسی نقطۂ نظر سے قبول کیا تھا، کہ یونین کے مسلمانون کے ساتھ یرغمال کا برتاؤ کیا جائے گا، جو لوگ اس ملک کو اپنا آبائی وطن تصور کرین، اُن کے متعلق یہ کیسے فیصلہ کیا جا سکتا ہو کہ اُن کے ساتھ جو برتاؤ کیا جائے، اس مین غیر ملکی حکومت کے اپنی اقلیت کے ساتھ برتاؤ سے موازنہ کر لیا جائے یہ دوسری بات ہے کہ انسانیت شرافت اور عدل وانصاف کے نام پر دوسری حکومتون کو صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کی جائے، اور اس مین کامیابی نہ ہو، تو ایک حکومت دوسری حکومت کے ساتھ جو کچھ کر سکتی ہو اور جو وسائل اختیار کر سکتی ہے اس کو عمل مین لایا جائے، یہ تو کسی طرح مناسب نہین، کہ یہان کی اقلیتون اور پاکستان کی اقلیتون کو ایک ترازو پر رکھا جائے، اور اسی معیار سے ایک دوسرے کے حقوق کو تول کر ان کی تعین کیجائے،

صوبہ متحدہ مین ہندی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جا چکا ہو، اور اس پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہو افسوس کی بات ہو کہ اردو کے مرکز مین اردو کو اس طرح نظر انداز کیا گیا، ہندی اور اردو کو مساوی درجہ کے ساتھ سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کوئی ایسا نہین ہے جس کی نظیر موجود نہ ہو، کناڈا، سوئزرلینڈ اور جنوبی افریقہ مین دو زبانون مین وہان کا کاروبار جاری ہے، اگر امریکہ اور دوسرے ملکون کے کانسٹی ٹیوشن کو سامنے رکھکر یہان قانون سازی کیجا سکتی ہو تو کیا زبان کے معاملہ مین دوسرے ملکون کی مثال کو سامنے نہین رکھا جا سکتا؛ اور اب تو خود ہمارے یہان مشرقی پنجاب مین ہندی اور گورمکھی دو زبانون اور رسم خط کو سرکاری درجہ دیا جا چکا ہو،

لیکن معلوم ہو کہ یہ زمانہ دلائل کا نہین جذبات کا ہے، یوپی حکومت کے وزراء اب دلائل بھی دینے کی زحمت اٹھا رہے ہین، پالیوال جی فرماتے ہین کہ اردو صرف شہری حلقہ کی زبان ہے جس مین سر بلند و ملت کے لوگ رہتے ہین، دیہی آبادی کی زبان نہین، دوسری طرف اردو کے قدیم محسن شمپورنانند جی کا ارشاد ہو کہ اردو اس صوبہ مین صرف ۱۴ فی صدی آبادی کی زبان ہے، اس کو سرکاری زبان کا درجہ نہین دیا جا سکتا، پہلے یہ وزراء اپنے بیانون مین کسی ایک بات پر اتفاق کر لین، پھر جب موجودہ فساد انگیز ذہنیت کے دور کا خاتمہ ہو گا اور مسائل کو دلائل سے پرکھنے کا دور آئے گا اس وقت ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر گفتگو کی جا سکے گی، اور شاید اس وقت اردو کو وہ مرتبہ حاصل ہو سکے گا جو اس کو اپنے مرکز مین حاصل رہنا چاہئے۔

مقالات

اقبال کا فلسفۂ خودی

از

مولانا عبدالسلام ندوی

(۸)

بہرحال اسرارِ خودی کے اکثر فلسفیانہ اجزاء تو فلاسفۂ مغرب سے ماخوذ ہیں، اس مین حکماے اسلام کے خیالات کا پرتو بہت کم پایا جاتا ہے، البتہ اسلامی تصوف مین سے انھون نے صرف عشق کا نظریہ مولانا روم سے لیا ہے، اور نہایت بلند آہنگی سے اس کا اعتراف کیا ہے چنانچہ فرماتے ہین :-

روے خود بنمود پیرِ حق سرشت — کو بحرفِ پہلوی قرآن نوشت
گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق — جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق

ایک حکایت سید مخدوم علی ہجویری کی لکھی ہے، جن کی خدمت مین ایک نوجوان مرو سے آیا اور کہا کہ

گفت محصورِ صفِ اعدا ہستم — درمیانِ سنگہا میناستم
با من آموز اے شہ گردون مکان — زندگی کردن میانِ دشمنان

اور اس کے جواب مین انھون نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اوس سے خودی اور مظاہر خودی کا اثبات ہوتا

فارغ از اندیشۂ اغیار شو — قوتِ خوابیدۂ بیدار شو

سنگ چون بر خود گمان شیشه کرد   شیشه گردید و شکستن پیشه کرد
ناتوان خود را اگر رهرو شمرد   نقد جان خویش با رهزن سپرد
تا کجا خود را شماری ماء و طین   از گل خود شعلهٔ طور آفرین
با عزیزان سرگران بودن چرا   شکوه سنج دشمنان بودن چرا
راست می گویم عدو هم یار تست   هستی او رونق بازار تست
هر که دانای مقامات خودی است   فضل حق داند اگر دشمن قوی است
کشت انسان را عدو باشد سحاب   ممکناتش را بر انگیزد ز خواب
سنگ ره آب است اگر همت قوی است   سیل را پست و بلند جاده چیست
مثل حیوان خوردن آسودن چه سود   گر بخود محکم نه بودن چه سود
خویش را چون از خودی محکم کنی   تو اگر خواهی جهان برهم کنی
گر فنا خواهی ز خود آزاد شو   گر بقا خواهی بخود آباد شو
چیست مردن از خودی غافل شدن   تو چه پنداری فراق جان و تن
در خودی کن صورت یوسف مقام   از اسیری تا شهنشاهی خرام

ان اشعار کے بعد لکھتے ہین کہ اس حکایت سے محض داستان سرائی مقصود نہین، بلکہ خودی کی حقیقت کا اظہار مقصود ہے،

شرح راز از داستانها می کنم   غنچه از زور نفس وا می کنم
"خوش تر آن باشد که سر دلبران   گفته آید در حدیث دیگران"

میر نجات نقشبند المعروف بہ بابائے صحرائی کی ایک نصیحت بھی لکھی ہے، اور اس مین مختلف طریقون سے خودی کی تعلیم دی گئی ہے،

ایکہ مثلِ گل ز گل بالیدۂ — تو ہم از بطنِ خودی زائیدۂ
از خودی مگذر بقا انجام باش — قطرہ ٔ می باش و بحر آشام باش
تو کہ از نورِ خودی تابندۂ — گر خودی محکم کنی پایندۂ
ہستی و از نیستی ترسیدۂ — اے سرت گردم غلط فہمیدۂ
چون خبر دارم ز سازِ زندگی — با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورتِ گوہر زدن — پس ز خلوت گاہِ خود سر بر زدن
زندگی از طوفِ دیگر رستن است — خویش را بیت الحرم دانستن است

لیکن تمام صوفیہ مین ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم کے فیوض و برکات کا نہایت بلند آہنگی کے ساتھ خاص طور پر اعتراف کیا ہے، اور اپنی تمام تصنیفات مین ان کا نام پیر و مرشد کی حیثیت سے لیا ہے چنانچہ پیامِ مشرق مین فرماتے ہین،

مطرب غزلے، بیتے از مرشدِ روم آور — تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے
بیا کہ من ز خمِ پیرِ روم آوردم — مئے سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی

زبورِ عجم مین کہتے ہین :-

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

بالِ جبریل مین لکھتے ہین :-

علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا — تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسون
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن — اسی کے فیض سے میرے سبو مین ہے جیحون

اس بنا پر شاعرانہ، فلسفیانہ اور متکلمانہ غرض ہر حیثیت سے ہم کو یہ پتہ لگانا چاہئے، کہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم سے کیا کیا فیوض و برکات حاصل کئے ہین،

(۱) شاعرانہ حیثیت سے ہندوستان بلکہ ایران میں ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں جس شاعری کا عام طور پر رواج تھا، وہ عاشقانہ شاعری تھی، اور خود ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی، اس کے بعد زمانہ کی ضروریات اور مغربی شاعری کی تقلید میں قومی، سیاسی اور نیچرل نظموں کا رواج ہوا، اور ڈاکٹر صاحب نے بھی ان اصنافِ سخن میں ایک حد تک طبع آزمائی کی، لیکن اب تک ہندوستان اور ایران میں فلسفیانہ اور متکلمانہ شاعری کا آغاز نہیں ہوا تھا، ایران میں بھی مولانا روم کے زمانہ تک زیادہ تر غزل، قصیدہ اور رزمیہ مثنویوں کا رواج تھا، فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث شاعری میں بہت کم آئے تھے مولانا روم پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی مثنوی کو اس قسم کے مباحث و مسائل سے لبریز کر دیا، اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی ہدایت کی، کہ عشق و ہوس اور مداحی اور تناگستری کا زمانہ نہیں رہا، بلکہ شاعری کو علوم و فنون کے دقیق مسائل سے آشنا کرنا چاہئے، جیسا کہ مثنوی معنوی میں اس قسم کے مسائل مذکور ہیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اس ہدایت کے مطابق ایک علمی اور فلسفیانہ شاعری کی ابتدا کی،

باز برخوانم ز فیض پیرِ روم

دفترِ سربستہ اسرارِ علوم

لیکن اس کے ساتھ مولانا روم نے ڈاکٹر صاحب کو یہ ہدایت بھی کی کہ اس شاعری سے خالص فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث کا بیان کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ قوم میں عملی طور پر انقلاب اور بیداری پیدا کرنا مقصود ہو، اور اس کی حیثیت محض شاعری کی نہ ہو، بلکہ ایک انقلاب انگیز پیغام کی ہو،

از نیستان ہمچو نے پیغام دہ — قیس را از قومِ حے پیغام دہ

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن — بزم را از ہاے و ہو آباد کن

روحِ نو مے جو یداجسامِ کہن — کمتر از قم نیست اعجازِ سخن

خیز و جان نو بدہ ہر زندہ را — از قمِ خود زندہ تر کن زندہ را

خیزد پا بجادۂ دیگر بنہ جوش سودائے کہن از سر بنہ

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب نے اس انقلاب انگیز پیغام اور حیات بخش شاعری کے لئے اگرچہ چند اجزاء فلاسفۂ مغرب سے بھی لئے تاہم اصل پیغام مولانا روم ہی کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہے،

(۲) اس پیغام کے قبول کرنے کے لئے خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب اور مولانا روم میں طبعی مناسبت بھی موجود تھی، مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں کہ تصوف کے مقامات میں دو مقام آپس میں متقابل ہیں، فنا و بقا، مقام فنا میں سالک پر خضوع، مسکینی اور انکسار کی کیفیت غالب ہوتی ہے، بخلاف اس کے بقا میں سالک کی حالت جلال اور عظمت سے لبریز ہوتی ہے، مولانا پر یہ نسبت زیادہ غالب رہتی تھی، اس لئے اُن کے کلام میں جو جلال اور ادعا، بیباکی، اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے، صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی[۱]،

اور ڈاکٹر صاحب بھی فطرۃً اسی قسم کی پرجوش اور غلغلہ انگیز طبیعت رکھتے تھے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں،

شرارے جستہ گیر از درونم
کہ من مانند رومی گرم خونم

اس لئے انھوں نے تمام صوفیہ میں مولانا روم کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا، خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہیں کہ عارف رومی اور علامہ اقبال میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں، دونوں اسلامی شاعر ہیں، دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے، دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر مرجح سمجھتے ہیں، دونوں خودی کی نفی کے بجائے خودی کی تقویت چاہتے ہیں، دونوں کے نزدیک حقیقی خودی اور حقیقی بے خودی میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ ایک کے بغیر دوسری مہمل اور بے نتیجہ ہے، دونوں کا تخیل تقدیر کے متعلق عام مسئلہ تخیل سے الگ ہے، دونوں کا خیال ہے، کہ تقدیر میں جزئی طور پر اعمال افراد پہلے ہی سے خدا کی طرف سے معین اور مقدر نہیں، بلکہ

---

[۱] سوانح مولانا روم ص ۵۵، ۵۶

تقدیر آئین حیات کا نام ہے، دونوں ارتقائی مفکر ہیں، نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنی سے اعلیٰ منازل کی طرف عروج کر رہے ہیں، انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں، قوتِ آرزو اور جدو جہد صالح سے کیسی نئی کائنات ہیں انسان پر نہ صرف منکشف ہو سکتی ہیں، بلکہ خلق ہو سکتی ہیں، دونوں قرآن کریم کے آدم کو نوعِ انسان کی معراج کا ایک نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں، دونوں جدو جہد کو زندگی، اور خفتگی کو موت سمجھتے ہیں، دونوں کے یہاں بقا مشروط ہے سعی بقا پر، دونوں اپنے سے پیشتر پیدا کردہ افکار سے کماحقہٗ واقف ہیں، اور متضاد عناصر کو ایک بلند تر وحدتِ فکر کی سطح پر لانا چاہتے ہیں، اس ازلی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے اقبال اپنے آپ کو عارف رومی کا مرید سمجھتا ہے، یہ مرید معمولی تقلیدی مرید نہیں کمال عقیدتِ کے ساتھ پیر کے رنگ میں رنگا ہوا مرید ہے[1]،

افسوس ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم نے اس موقع پر اجمال سے کام لیا ہے، ورنہ ضرورت یہ تھی کہ مولانا روم اور ڈاکٹر صاحب دونوں کے کلام سے بالمقابلہ شواہد پیش کئے جاتے، تاہم خود ڈاکٹر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے، کہ انھوں نے کون کون سی خاص باتیں مولانا روم سے اخذ کی ہیں،

۱۔ ان میں پہلی چیز تو خودی کا تصور ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ کی اساس ہے، اور اس پر اُن کے تمام فلسفیانہ خیالات کی بنیاد ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ تصور یورپین فلاسفہ بالخصوص نٹشے سے ماخوذ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس تخیل کو مولانا روم سے اخذ کیا ہے، چنانچہ جاوید نامہ میں اس فلسفہ کو انھوں نے مولانا روم کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

روحِ رومی پردہا را بر درید	از پسِ کہپارۂ آمد پدید،
گفتمش موجود و ناموجود چیست؟	معنی محمود و نا محمود چیست؟
گفت موجود آنکہ می خواہد نمود	آشکارائی تقاضائے وجود

---

[1] رسالۂ اردو اقبال نمبر ص ۸۸، ۸۹،

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجود خود شہادت خواستن

انجمن روز الست آراستند — بر وجود خود شہادت خواستند

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب — از سہ شاہد کن شہادت را طلب

۲۔ لیکن اس خودی کو اگر بالکل مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک شیطانی قوت بن جاتی ہے، جس کا کام تخریب و فساد لوٹ مار، گمراہی وضلالت اور قتل و غارت گری کے سوا کچھ نہیں ہوتا، تاتاریوں نے دنیاے اسلام کو جو تباہ و برباد کیا، وہ اسی مطلق العنان خودی کا نتیجہ تھا، اور آج یورپین قوموں میں اسی قسم کی خودی پائی جاتی ہے، اس لئے اس میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے اس کو کسی آئین کا پابند بنانا ضروری ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب خود ایک خط میں لکھتے ہیں،

"دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ اُن کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے، خودی خواہ مسولینی کی ہو، خواہ ہٹلر کی، قانونِ الٰہی کی پابند ہو جائے، تو مسلمان ہو جاتی ہے، مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا، مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا، فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں، دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے، بہر حال حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت ہے، اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے، جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیوٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں، اور صرف رضاے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے، تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیاے اسلام

نے فنا کی ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے[۱]

خودی کو شریعت یا قانونِ الٰہی کے پابند بنانے کے لئے دو باتوں کی سخت ضرورت ہے،

۱۔ ایک تو یہ کہ بنی نوع انسان کے دوسرے افراد کا بھی لحاظ رکھا جائے، اور اُن کے ساتھ اتحاد پیدا کیا جائے، نطشے نے دنیا کو آقا اور غلام کے دو طبقوں میں تقسیم کر کے بنی نوع انسان کے کمزور افراد کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، اس لئے اس کے فلسفہ کے رو سے اخلاق کا جمال آمیز پہلو یعنی لطف و محبت، تواضع و انکسار، رحم و ہمدردی وغیرہ کا خاتمہ ہو گیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اسی بنا پر اسرارِ خودی کے بعد رموزِ بے خودی لکھ کر اس کی تکمیل کی، اور فرد کا رشتہ ملت کے ساتھ قائم کیا، لیکن تکمیل خودی کا یہ اخلاقی نظریہ انھوں نے مولانا روم ہی سے اخذ کیا ہے، چنانچہ مولانا روم نے جاوید نامہ میں خودی کے جو دو مراتب بتائے ہیں، ان میں پہلا مرتبہ یہ ہے،

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن

خویش را دیدن بنورِ خویشتن

اسی کا دوسرا نام خودی ہے لیکن انسان کو صرف اپنے ہی نور کے مشاہدے میں محو و مستغرق نہیں ہو جانا چاہئے، بلکہ اپنے ساتھ بنی نوع انسان کے دوسرے افراد کے نور کا بھی مشاہدہ کرنا چاہئے،

شاھدِ ثانی شعورِ دیگرے

خویش را دیدن بنورِ دیگرے

اور اسی مرتبہ کا نام فلسفہ بیخودی ہے، اب اپنی خودی کے ساتھ اگر دوسروں کی خودی کو بھی شامل کر لیا جائے، تو اخلاقی حیثیت سے جلال و جمال کے دونوں پہلو باہم متحد ہو جاتے ہیں، اور جمال و جلال کا جو اتحاد ڈاکٹر صاحب کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ مولانا روم ہی کے اسی چشم و ابرو کا اشارہ ہے،

---

[۱] اقبال نامہ ص ۲۰۲، ۲۰۳،

۲۔ دوسرے یہ کہ انسانی خودی کا رشتہ خداوند تعالیٰ کی ذات سے منقطع نہ ہونے پائے، نٹشے خدا کا منکر ہے، اس لئے اوس نے خودی کا جو نظریہ قائم کیا ہے وہ بالکل مطلق العنان اور بے راہ رو ہے، لیکن مولانا روم نے ڈاکٹر صاحب کو تکمیل خودی کے لئے بتایا،

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق   خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیش این نور ار بمانی استوار   حی و قائم چون خدا خود را شمار

۳۔ خالق و مخلوق اور عبد و معبود میں یہ تعلق صرف عشق و محبت سے پیدا ہو سکتا ہے، مولانا روم کے زمانہ میں چونکہ مسلمانوں کی عقلی ترقی درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی، اس لئے لوگ خدا کو عشق کے بجائے عقل سے دیکھتے تھے، با این ہمہ اس زمانہ میں خدا بالکل گم نہیں ہوا تھا، بلکہ موجود تھا، البتہ اس سے تعلق پیدا کرنے کا طریقہ عشق کے بجائے عقل کو قرار دیا گیا تھا، صرف صوفیوں کا گروہ ایسا تھا، جو خدا کو عقل کے بجائے عشق کی عینک سے دیکھتا تھا، اور ان میں مولانا روم سب کے پیشرو تھے، ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں عقلی ترقی اس زمانے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی، اس زمانہ میں تو خدا کم از کم موجود تھا، لیکن اس زمانہ میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اور زمانہ میں عقل کے ساتھ عشق کا وجود بھی تھا، لیکن اس زمانہ میں صرف عقل ہی عقل ہے، عشق کا وجود نہیں، اس لئے مولانا روم اور ڈاکٹر صاحب کا زمانہ اس حیثیت سے باہم مشابہت رکھتا ہے، اور دونوں ایک ہی قسم کے فتنہ انگیز زمانے میں موجود تھے، اور دونوں نے ایک ہی قسم کی بلند آہنگی کے ساتھ اپنے اپنے زمانہ کے عقلی رجحان کی مخالفت کی، اور لوگوں کو عشق و محبت کی طرف مائل کیا، اس بنا پر خودی کی تکمیل کے لئے عشق و محبت کا نظریہ اونھوں نے ابتدا ہی سے مولانا روم سے لیا، اور آخر تک اس نظریہ پر قائم رہے، چنانچہ ارمغانِ حجاز میں جو تعلیمات مولانا روم پر لکھے ہیں، ان میں صاف صاف تصریح کی ہے کہ

نئے آن نے نوازے پاکبازے   مرا با عشق و مستی آشنا کرد
مئے روشن ز تاکِ من فرو ریخت   خوشا مردے کہ در دامانم آویخت

نصیب از آتشے دارم کہ اول سنائی از دل رومی برانگیخت

اگرچہ تمام صوفیہ نے خدا سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ عشق کو قرار دیا تھا، لیکن اُن کے نزدیک اس عشق کا آخری درجہ یہ تھا کہ انسان اپنی خودی کو خدا کی ذات مین بالکل فنا کر دے، اور خود اوس کا کوئی وجود باقی نہ رہے، لیکن مولانا روم کے نزدیک انسان اپنی خودی کو خدا کی ذات مین فنا کرنے کے بعد بھی قائم رکھ سکتا ہے، خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہین کہ رومی انفرادی بقا کا قائل ہے، اور کہتا ہے کہ خدا مین انسان اس طرح محو نہین ہو جاتا، جس طرح کہ قطرہ سمندر مین محو ہو جاتا ہے، بلکہ ایسا ہوتا ہے جیسے کہ سورج کی روشنی مین چراغ جل رہا ہے، یا جیسے لوہا آگ مین پڑ کر آگ ہو جاتا ہے لیکن با وجود اس کے اس کی انفرادیت باقی رہتی ہے[1] ڈاکٹر صاحب کے فلسفۂ خودی کے لئے یہی نظریہ مناسب تھا، اس لئے انھون نے اوس کو مولانا روم سے اخذ کیا، لیکن خلیفہ عبدالحکیم نے مولانا روم اور ڈاکٹر صاحب کے اشعار سے اس کی تائید نہین کی، اور اسرار خودی مین اس قسم کے دقیق خیالات موجود بھی نہین ہین، لیکن ارمغان حجاز کا یہ قطعہ جو انھون نے مولانا روم کی شان مین لکھا ہے، غالبًا اسی نظریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے،

سراپا درد و سوز آشنائی   وصال او زبان دان جدائی

جمال عشق گیرد از نئے او   نصیبے از جلال کبریائی

اور صوفیہ نے ذات خداوندی میں انفرادی خودی کی محویت کا جو نظریہ قائم کیا تھا، اوس نے انسان کے تمام ایجابی اخلاق مثلاً جرات، شجاعت، عزم و استقلال وغیرہ کو فنا کر کے اس مین سلبی اخلاق مثلاً زہد و قناعت، توکل، گوشہ گیری اور عجز و انکسار پیدا کر دیئے تھے، لیکن مولانا روم کے نظریۂ عشق کے رو سے انسان کے ایجابی اخلاق، اور بھی زیادہ مستحکم اور ترقی یافتہ ہو جاتے ہین، اس لئے خدا کی ذات مین محو ہو کر ایک بزدل انتہا درجہ کا بہادر ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام صوفیہ مین ڈاکٹر صاحب نے مولانا روم

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۴۳۳، ۴۳۴،

کے نظریۂ عشق کو اختیار کیا، اور لوگوں کو ہدایت کی،

بگیر از ساغرش آں لالہ رنگے کہ تاثیرش دہد لعلے بہ سنگے
غزالے را دلِ شیرے بہ بخشد بشوید داغ از پشتِ پلنگے

اس قطعہ میں یہ لطیف اشارہ موجود ہے، کہ مولانا روم کا نظریۂ عشق انسان کو اخلاقی حیثیت سے جلال و جمال دونوں کا بہترین مجموعہ بنا سکتا ہے، فقر کا مضمون بھی جو بالواسطہ فلسفۂ خودی ہی سے تعلق رکھتا ہے، اور اس پر ڈاکٹر صاحب نے بہترین اشعار لکھے ہیں، مولانا روم سے ماخوذ ہے، چنانچہ ارمغانِ حجاز کے قطعات میں صاف صاف اس کی تصریح کی ہے،

نہ رومی گیر اسرارِ فقیری کہ آن فقر است محسود امیری
حذر زان فقر و درویشی کہ از وے رسیدی بر مقام سربزیری
خودی تا گشت مہجورِ خدائی بہ فقر آموخت آدابِ گدائی
زچشمِ مست رومی وام کردم سرورے از مقامِ کبریائی

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ڈاکٹر صاحب کا فلسفہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ انھوں نے دوسروں کی خوشہ چینی کر کے ان ہی کے فلسفہ کو شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے، اُن کے فلسفۂ خودی کے تمام اساسی مضامین درحقیقت قرآن مجید سے ماخوذ ہیں، اور قرآن مجید میں فضیلت انسان، تسخیر فطرت، عزم و استقلال، جرأت و شجاعت، فتح و نصرت، حمیت و غیرت اور قدرت و اختیار پر بہ کثرت آیتیں موجود ہیں، اور انہی آیتوں نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو خودی یعنی جلال و جمال دونوں کا بہترین مجموعہ بنا دیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام مضامین قرآن مجید ہی سے لئے، اس کے بعد انھوں نے فلسفہ و تصوف پر نگاہ ڈالی، تو اُن کو دو متضاد فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریے نظر آئے، ایک تو شوپنہار کا قنوطی فلسفہ تھا، جو سراپا قرآن مجید کی تعلیمات کے خلاف اور خودی کے تمام

عناصر کا بیخ کن تھا، اس کے برخلاف نٹشے کا فلسفہ تھا، جو اگرچہ تمامتر تقویم خودی پر مبنی تھا، لیکن یہ خودی ایک محدود اور شیطانی خودی تھی، جس کا تعلق خدا اور عام بنی نوع انسان سے نہ تھا، اسی طرح صوفیانہ تعلیمات بھی مختلف تھیں، تصوف کی عام کتابیں اکثر صوفیہ اور فارسی شاعری کا تمامتر ذخیرہ اشراقی اور افلاطونی فلسفہ سے متاثر تھا، جو زندگی کو ہیچ قرار دیتا تھا، اور صرف سلبی اخلاق کی تعلیم دیتا تھا، لیکن مثنوی مولانا روم میں ان کو جا بجا ایسے اشعار، ایسے خیالات، اور ایسے نظریات ملے، جو قرآن مجید کی تعلیمات کے موافق اور فلسفۂ خودی کے مؤید ہیں، ڈاکٹر صاحب نے ان تمام فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریات میں سے نہ صرف صوفیانہ تعلیمات اور فارسی شاعری کے تمام ذخیرہ کو قرآن مجید کی تعلیمات کے مخالف پایا، اس لئے اُن کو بالکل نظرانداز کر دیا، اسی طرح نٹشے کے فلسفہ میں اُن کو خودی کے جو شیطانی عناصر نظر آئے، اُن کو تو انھوں نے بالکل چھوڑ دیا، البتہ اصل مسئلہ کو لے کر اس شیطانی خودی کو یزدانی خودی بنا دیا، اور اس میں اُن کو قرآن مجید کے بعد مولانا روم کی مثنوی سے مدد ملی، لیکن اس معاملہ میں انھوں نے درجہ بدرجہ ترقی کی، پہلے تو انھوں نے اسرارِ خودی میں خودی کا ایک سادہ اور نامکمل خاکہ قائم کیا، جو زیادہ تر حکمائے یورپ بالخصوص نٹشے کے خیالات و نظریات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، اور اسی خاکہ کو پیش نظر رکھ کر یورپین تنقید نگاروں نے یہ رائے قائم کی کہ اُن کا فلسفہ تمامتر نٹشے کے فلسفہ سے ماخوذ ہے، لیکن اس کے بعد انھوں نے اس فلسفہ کے اجزاء و مقدمات میں جو تصرفات اور اضافے کئے، اور اس کو جس شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا، اس نے اُن کے فلسفہ کو نٹشے کے فلسفہ اور مولانا روم کے صوفیانہ نظریوں سے بالکل مختلف کر دیا، ان کو منتشر طور پر صرف چند ذرے ملے تھے، لیکن انہی ذروں کو چمکا کر انھوں نے آفتاب بنا دیا، انھوں نے صرف چند موتی پائے تھے، لیکن انھوں نے ان کو پرو کر ایک خوشنما ہار تیار کر دیا، ان کو صرف چند دائرے اور خطوط ہاتھ آئے تھے، لیکن انہی کی مدد سے انھوں نے ایک مکمل مرقع تیار کر لیا، جس میں خودی کی تصویر نمایاں طور پر نظر آگئی،

مون نے بے شبہ نطشے بلکہ اور بھی بہت سے فلسفیوں کا اثر قبول کیا لیکن اثر پذیری اور نقالی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شیکسپیر کے متعلق آج یہ طے ہو چکا ہے، کہ اوس کے تمام ڈراموں کا ماخذ پرانی کہانیاں ہیں لیکن اس کے باوجود اوس نے ان میں جو آب و رنگ اور روغن بھرا، اور جو دیدہ زیب قالب انھیں بخشا وہ اوسے ہمیشہ ایک اوریجنل شاعر کی حیثیت سے مشہور رکھے گا، یہی صورت ڈاکٹر صاحب کی ہے، دنیا کا کوئی بڑا سے بڑا شخص بھی نیستی سے ہستی یا عدم سے وجود کو پیدا کرنے کا مدعی نہیں ہو سکتا، ڈاکٹر صاحب بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے، البتہ انھوں نے رائج الوقت افکار و خیالات کو اپنی قوتِ متخیلہ کے قالب میں ڈھال کر مسلمان قوم کے سامنے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ بالکل ایک نئی چیز ہے، ہر مصور خطوں اور دائروں ہی سے کام لیتا ہے، لیکن اگر محض اس بنا پر کسی مصور کو نقال نہیں کہا جا سکتا تو ڈاکٹر صاحب جیسے مصورِ افکار کو بھی نقال کہنا صحیح نہ ہوگا"[1] غرض شعر میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت کے جو موتی پروئے ہیں، ان کے متعلق محض یہ کہدینا ناانصافی ہوگی کہ وہ موتی انھوں نے دوسرے جوہریوں سے لئے ہیں، ہیرا جب تک تراشا نہ جائے، اور موتی جب تک مالا میں پرویا نہ جائے، اور جواہرات جب تک زیور میں جڑے نہ جائیں، ان کا جمال معمولی سنگریزوں اور خزف پاروں سے زیادہ نہیں ہوتا، ڈاکٹر صاحب نے شاعری پر جو احسان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب اور ماضی و حال کے وہ جواہر پارے جو نفسِ انسانی کے آسمان کے تارے ہیں کمالِ شاعری سے اس طرح تراشے اور پروئے اور جڑے ہیں، کہ نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ کیلئے بصیرت افروز ہو گئے ہیں"[2]

ڈاکٹر صاحب نے ان جواہر پاروں پر بھی اندھا دھند ہاتھ نہیں مارا ہے، بلکہ اُن میں تصرفات اور اضافے کئے ہیں، اس لئے جہاں تک افکار کا تعلق ہے، انھوں نے رومی کا کامل تتبع کیا ہے

---

[1] پیغام حق اقبال نمبر ص ۲۶۰، ۲۶۱ [2] رسالہ اردو، اقبال نمبر ص ۵۳۰، ۵۳۱،

نہ نطشے کا، نہ برگساں کا، اور نہ کارل مارکس کا، نہ لینن کا، اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے اونھوں نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں لیکن اُن کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشے کی ہو بہو نقل نہیں ہے، اپنی تعمیر کے لئے انھوں نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے، ڈاکٹر صاحب ان مفکر شاعروں میں ہیں جن کے پاس اپنا ایک خاص زاویۂ نگاہ اور نظریۂ حیات بھی ہوتا ہے، محض افکار کے ادھر ادھر کے اخذ کردہ عناصر سے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی؛[1]

عشق اور عقل کا باہمی تعلق جس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا بہت سا حصہ وقف کیا ہے پیر رومی کا خاص مضمون ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں فقط مرشد کے الفاظ کو دہرایا نہیں، بلکہ جدّت افکار سے اوس میں بہت دلکش رنگ اپنی طرف سے بھرے ہیں،[2]

---

[1] رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۸۳۱ [2] ایضاً ص ۸۳۳،

تاریخ سندھ

ہندوستان میں مسلمانوں کا پہلا قافلہ سندھ میں اترا تھا، اور ان کی پہلی حکومت یہیں قائم ہوئی تھی، اور وہ ایک ہزار سال سے اوپر یہاں کے حکمران رہے، آج بھی سندھ کے در و دیوار سے اُن کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس کے باوجود اردو میں اسلامی سندھ کی کوئی مفصل و محققانہ تاریخ نہیں تھی، دار المصنفین نے تاریخ ہندوستان کے سلسلہ میں یہ جامع و محققانہ تاریخ مرتب کرائی ہے، اس میں سندھ کی ایک ہزار سال کی سیاسی و علمی تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے، مسلمان اس قدیم اسلامی خطہ کی تاریخ فراموش کر چکے تھے، اب پھر اس کو یاد کرنے کی ضرورت ہے، ضخامت ۔۔۴ صفحے، قیمت ستے روپے،

مرتبہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ "منیجر"

فتاویٰ عالمگیری

اور

اس کے چند اور مولفین

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

دسمبر ۴۶ئہ کے معارف مین فتاوی عالمگیری پر جو مضمون لکھا گیا تھا، اس مین اس وقت جو معلومات تلاش سے مل سکے انہین پیش کر دیا گیا تھا، اس نو دس مہینہ مین بعض نئے معلومات حاصل ہوگئے ہین جنھین پیش کیا جاتا ہے،

فتاوی کی تالیف کا طریقہ فتاوی عالمگیری کے جمع و ترتیب کا طریقہ یہ تھا، کہ فقہی ابواب کے لحاظ سے اس کو کئی حصّون مین تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر حصّہ کے لئے ایک الگ صدر اور صدر کے لئے چند معاونین کی ایک جماعت مقرر تھی، ہر صدر اپنے اپنے حصّہ کا ذمہ دار تھا، اخذ و استنباط مین اگر کوئی غلطی ہو جاتی تھی، تو ملا نظام جو اس مجلس کے صدر اعلیٰ تھے، اس شعبہ کے صدر سے باز پرس کرتے تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، ذیل مین اُن لوگون کے نام درج کئے جاتے ہین، جن پر اس کے کسی حصّہ کی تکمیل کی ذمہ داری تھی،

ا۔ حصّہ اول کے جمع و ترتیب کا کام شیخ جلال الدین محمد جونپوری[1] کے سپرد تھا، مشاہیر

---

[1] دسمبر ۴۶ئہ کے معارف مین ان کا مفصل تذکرہ آچکا ہے،

جونپور مین ہے :-

"از تصنیفات و تالیفاتش فتاوی عالمگیریہ حصہ اول است کہ حسب الامر سلطانی جمع نمودہ (ص ۱۲۲)

یہ نہین معلوم ہو سکا کہ کتنے علما رمعاون کی حیثیت سے اُن کے شریک کار تھے،

۳ - ایک حصہ کی تکمیل شیخ وجیہ الدین گوپاموی کے ذمہ تھی، اور ان کی امداد و اعانت کے لئے دس عالم اور مقرر تھے، لیکن اُن کے نامون کی تصریح نہین مل سکی، مراۃ العالم مین صرف اتنا ہے کہ

"(شیخ وجیہ الدین) در ترتیب و تالیف ربعے فتاوی عالمگیری شاہی مامور شد و دہ کس دیگر از فضلا بمدد و اعانت او مامور شدند"[۱]

اگر اسی پر دوسرے حصون کو بھی قیاس کیا جائے تو مولفین فتاوی کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ جائے گی،

۴ - ایک حصہ کی تالیف شیخ محمد حسن جونپوری کے زیر اہتمام تھی، مراۃ العالم مین ہے،

"و ربعے از فتاوی عالمگیر شاہی باہتمام او (محمد حسین) زینت اتمام یافت (ص ۳۰)"

اُن کے معاونین کی تعداد اور ان کے نام کا علم نہین ہو سکا،

۴ - انفاس العارفین کی اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کسی حصہ کی تکمیل ملا حامد جونپوری کے زیر صدارت بھی ہوئی تھی،

"(ملا نظام) ملا حامد را عتاب کرد کہ این جلد با عتماد شما گذاشتہ بودم و تو پیش بادشاہ مرا خفیف کردید. (ص ۲۲)"[۲]

شاہ عبدالرحیم صاحب آپکے معاونین مین تھے، اور شرکار کی تعداد اور نام کی تفصیل نہین

---

[۱] قلمی نسخہ دار المصنفین ص ۳۰۰ [۲] شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کے حالات مین یہ کتاب لکھی ہے،

معلوم ہو سکی،

تلاش و تفحص سے انھی چار آدمیوں کے متعلق یہ تصریح مل سکی ہے، کہ کسی نہ کسی حصہ کے جمع و ترتیب کی ذمہ داری اُن کے سپرد تھی، لیکن یقینی طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کام چار ہی حصوں میں منقسم تھا، اور یہی چار اس کے ذمہ دار تھے. یا اس سے زیادہ،

اکتوبر ۱۹۴۸ء کے معارف میں برادر مکرم مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے تاریخ برہان پور بحوالہ مرآۃ العالم کے جن ناموں کی فہرست دی ہے، ان میں سے دو ناموں یعنی علی اکبر سعد اللہ خانی اور محمد اکرم لاہوری کے متعلق مرآۃ العالم یا کسی دوسری کتاب میں کوئی تصریح نہیں مل سکی کہ وہ کس حصہ کے صدر بنائے گئے تھے، بلکہ محمد اکرم لاہوری تو جامعین فتاوی میں بھی نہیں ہیں، محمد اکرم نام کے ایک دوسرے عالم جو بہار کے رہنے والے تھے، البتہ اس میں شریک تھے. لیکن انھیں بھی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہیں تھی،

فتاوی کی تدوین میں عالمگیر کی علمی شرکت

عالمگیر نے فتاوی کی تدوین کے لئے خزانہ شاہی سے صرف ایک کثیر رقم کی منظوری اور علماء کی ایک جماعت کے تقرر ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ذاتی طور سے بھی وہ اس سے کافی دلچسپی لیتا تھا، اور روزانہ اس کے دو چار صفحے خود علمی و تنقیدی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور اس کی فرو گذاشتوں اور خامیوں پر ملا نظام کو متوجہ کرتا رہتا تھا،

شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب جو جامعین فتاوی میں تھے اُن کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ

"والد صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میں فتاوی عالمگیری پر نظر ثانی کر رہا تھا، ایک جگہ عبارت پیچیدہ تھی، سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اصل ماخذ کی طرف رجوع کیا، تو معلوم ہوا کہ اس باب کے جامع نے دو عباراتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، جس کی وجہ سے

مسئلہ پیچیدہ ہوگیا ہے، مین نے (غصہ مین) اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ

من لمر یتفقہ فی الدین قد حمق — جس نے دین مین تفقہ حاصل نہین کیا اُس

فیہ هذا غلط وصوابہ هکذا — نے دین مین کجروی کی یہ غلط ہے اور صحیح یون ہے

خود ملا نظام دو چار صفحات روزانہ بادشاہ کو لیجا کر سناتے تھے، ایک دن جب معمول انھون نے ان صفحات کو عالمگیر کے سامنے پڑھا، تو جلدی مین اس حاشیہ کی عبارت کو متن سے ملا دیا جس سے مطلب بالکل خبط ہوگیا، بادشاہ نے ٹوکا اور پوچھا کہ یہ عبارت کیسی ہے ؟ ملا نظام اس وقت کوئی جواب نہین دیسکے، اور یہ کہکر ٹال دیا کہ مین نے اس عبارت کا مطالعہ نہین کیا تھا جواب کل دونگا،"

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ پر عالمگیر کی گہری نظر تھی، اور فتاوی کی تدوین وتصحیح مین علمی حیثیت سے بھی وہ شریک تھا،

فتاوی عالمگیری کا مترجم | گذشتہ مضمون مین فتاوی کے مترجم کے متعلق مراۃ العالم کے اس بیان کی کہ اس کے مترجم ملا عبداللہ ابن عبدالحکیم سیالکوٹی ہین، تردید کی گئی تھی، اور قیاس و قرائن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اس کے مترجم ملا عبداللہ سیالکوٹی نہین بلکہ عبداللہ چلپی ترکی ہین اب خود مراۃ العالم ہی مین ایک عبارت مل گئی ہے، جس سے ہمارے اُس قیاس کی تائید اور اس کے اپنے بیان کی تردید ہوتی ہے، عبارت یہ ہے :-

" چلپی عبداللہ رومی...... درزمان فردوس آشیانی از روم بہندوستان درزی فقراء بسر می برد،.......... و درین عصر (عالگیری) بہ روزیانہ سرفرازی یافتہ از تکالیف نوکری معاف و بنوشتن ترجمہ فتاوی عالمگیری شاہی مامور است

(ص ۳۰۰ قلمی نسخہ)

بظاہر نام کے اشتراک کے علاوہ اس غلطی کی دوسری کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی،

فتاوی کا دوسرا فارسی ترجمہ

فتاوی عالمگیری کے پہلے فارسی ترجمہ کے وجود کا جو عالمگیر کے زمانہ مین کیا گیا تھا، ہمین تو کوئی علم نہین ہے، البتہ اس کے ایک حصہ کتاب الجنایات کا ایک دوسرا فارسی ترجمہ مع مختصر شرح موجود ہے، جسے مولانا نجم الدین ثاقب قاضی القضاۃ (متوفی ۱۲۲۹ھ) نے لارڈ سر جان شور (۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۸ء) کے مشورہ سے کیا تھا، ترجمہ کلکتہ اور لکھنو کے مطبعون مین کئی بار چھپ بھی چکا ہے، لیکن اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ نظر سے نہین گذرا، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ مین "ترجمہ فتاوی عالمگیری" اور خدا بخش خان لائبریری پٹنہ مین "کتاب الحدود والسرقہ" کے نام سے موجود ہین، پٹنہ مین جو نسخہ ہے، اس کے متعلق فہرست کے مرتب نے لکھا ہے، کہ اس پر کتاب اور مصنف کا نام درج نہین ہے، البتہ اس کی پشت پر کسی نے "کتاب الحدود" لکھ دیا ہے، لیکن مقابلہ سے یہ ترجمہ مولانا نجم الدین کے ترجمہ سے حرف بحرف مل جاتا ہے، اس لئے گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے :-

کتاب الحدود حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے :-

۱- باب اول در بیان تفسیر حد موافق شرع و بیان رکن حد و بیان شرط حد و بیان حکم حد،

۲- باب دوم در بیان زنا فصل در بیان چگونگی حدہا و اقامت حدہا،

۳- باب سوم، در بیان وطی کہ موجب حد است،

۴- باب چہارم در شہادت زنا و رجوع ازان شہادت،

۵- باب پنجم در حد شراب،

۶- باب ششم در بیان قذف، فصل در بیان تعزیر،

کتاب السرقہ کے ابواب کی تفصیل ہے،

۱- باب اوّل دربیان سرقہ،

۲- باب دوم، دربیان آن دزدیہا کہ دست بریدہ می شود، دریں، دربیان آن دزدیہا کہ دست بریدہ نمی شود، درآن فصل دربیان حرز فصل دربیان چگونگی دست بریدن وثابت گردانیدن آن،

۳- باب سوم، دربیان چیزے کہ پیدا کند دزد آن چیز را وسال دزدی،

۴- باب چہارم دربیان حکم قطاع الطریق،

اب ان مولفین کے حالات لکھے جاتے ہیں، جن کا ذکر گذشتہ مضمون میں نہیں ہو سکا تھا،

شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی

نام ونسب شاہ عبدالرحیم صاحب ۱۰۵۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد شیخ وجیہ الدین نے اُن کا نام عبدالرحیم رکھا، لیکن خواص میں ابو الفیض[۱] کے نام سے بھی مشہور تھے،

شاہ صاحب دادھیال کی جانب سے فاروقی اور ننھیال کی طرف سے سید ہیں، جدی سلسلۂ نسب یہ ہے:-

"عبدالرحیم ابن الشہید وجیہ الدین ابن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قادن[۲] بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک[۳] بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح

---

[۱] بعض تذکرہ نویسوں نے ابو الفیض ان کی کنیت لکھی ہے، لیکن اس کی حقیقت شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے، کہ میں نے اپنے بعض دوستوں کو سنا کہ عالم بالا میں حضرت کا نام ابو الفیض ہے، چنانچہ میں نے والد صاحب سے اس کے متعلق دریافت کیا، تو وہ مسکرائے اور فرمایا، کہ ہمچنین است ونام تو ابوالفیاض است (انفاس العارفین ص ۳)

[۲] ان بزرگوں کے نام میں قاضی اور کہیں مفتی کی نسبت اُن کے علم وفضل کو ظاہر کرتی ہے [۳] ملک کا لفظ کسی امتیازی ہی شان کا شارح ہو، شاہ ولی اللہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ ملک درزمانِ قدیم لفظ تعظیم است مثل خان درزمانِ ما (انفاس ص ۱۵۰)

ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان

ابن ہامان بن ہمایون[1] بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب

رضی اللہ تعالیٰ عنہم،

مشہور ہے کہ نانہالی سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک منتہی ہوتا ہے، لیکن بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی مکمل شجرہ نہ مل سکا، نامکمل شجرہ یہ ہے،

"والدہ شاہ عبدالرحیم صاحب بنت شیخ رفیع الدین محمد بن قطب عالم بن عبدالعزیز

ابن حسن بن طاہر[2] (انفاس العارفین ص ۱۶۸)

شاہ صاحب کی والدہ کے سلسلۂ نسب مین عام تذکرہ نویسون نے غالباً ذیل کی روایت کو اپنا ماخذ بنایا ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین مین لکھا ہے، کہ ایک روز والد مکرم شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے ایک خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوے فرمایا، کہ

"بحضرت عمر شجرہ ما می رسد و بحضرت علی از جہۃ امہات[3] نسل و اصل میشود (انفاس ص ۳۱)

لیکن از جہۃ امہات[3] کی مزید تشریح کی ضرورت ہے،

---

[1] ہمایون جرجیس وغیرہ سے عجمیت کا اظہار ہوتا ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے، کہ حضرت عمرؓ کی تین ہی چار پشت کے بعد یہ خاندان عرب سے عجم مین آگیا تھا [2] شیخ طاہر، شیخ حسن، شیخ عبدالعزیز اور شیخ قطب عالم کا تذکرہ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار مین بھی کیا ہے، لیکن شیخ طاہر کے اوپر کے سلسلۂ نسب کا کوئی تذکرہ نہین کیا ہے (اخبار الاخیار ص ۱۸۳ و ص ۲۶۶) [3] امہات کا لفظ جمع ہے، اور اس کو جمع ہی پر محمول کرنا چاہئے، معلوم ہوتا ہو کہ شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی والدہ کے ساتھ اپنی دادی زوجۂ شیخ معظم اور زوجۂ شیخ محمود کو بھی شامل کر لیا ہو کیونکہ یہ دونوں خواتین سونی پت کے سادات گھرانے سے تھین (واللہ اعلم بالصواب)

شاہ صاحب کے اجداد کی ہندوستان میں آمد اور ان کے تقرر کا زمانہ

شاہ صاحب کے ننہالی خانوادہ کے متعلق تو غالباً کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ کب ہندوستان آیا، لیکن دادھیال کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس خانوادہ کے سب سے پہلے شخص جو ہندوستان آئے، وہ شیخ شمس الدین مفتی ہیں، وہ یہاں آکر پہلے دہلی کے قریب رہتک میں مقیم ہوئے، پھر وہیں متوطن ہوگئے، اس زمانہ میں حکومت کا دستور تھا کہ شہر میں جو صاحب کمال اور ذی وجاہت آدمی ہوتا، بغیر کسی انتخاب اور تقرر کے وہاں کا عہدۂ قضا و احتساب اس کے سپرد ہوجاتا تھا، گو وہ قاضی اور محتسب کے نام سے موسوم نہیں ہوتا تھا، شیخ شمس الدین چونکہ باوجاہت اور صاحب علم و فضل تھے، اس لئے عام قاعدہ کے مطابق وہاں کے قاضی اور محتسب ہوئے؛[۱]

شیخ شمس الدین کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ کمال الدین اور شیخ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ قطب الدین، اور شیخ قطب الدین کے صاحبزادے شیخ عبد الملک یکے بعد دیگرے عہدۂ قضاء و احتساب سنبھالتے رہے، شیخ عبد الملک کے زمانہ میں عہدۂ قضا نے قانونی شکل اختیار کرلی، اور حکومت کی طرف سے قضاۃ کا تقرر ہونے لگا، اور چونکہ یہ خاندان پہلے سے اس عہدہ پر سرفراز تھا

۱؎ شاہ ولی اللہ صاحب اُن کے متعلق لکھتے ہیں :-

"واین بزرگ مردی عالم و عابد بود و اول کسے که از نژاد قریش دران بلده (رہتک) آمد
و بسبب وی شعائر اسلام ظهور نمود و طغیان کفر منطفی شد" اول کسیکه از نژاد قریش"

سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں پہلے سے مسلمان موجود تھے لیکن ابھی تک کوئی ممتاز خاندان یہاں آباد نہیں ہوا تھا، اُن کے دوسرے بھائی شیخ بہاء الدین تھے جن سے مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ کا خاندان ہے ۲؎ شیخ شمس الدین کی آمد کا ماننہ کے اعتبار سے صحیح طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر علماء انساب کے قیاسی اصولوں کو مشعل راہ بنایا جائے تو کچھ تقریب پیدا کیجا سکتی ہے، شاہ عبد الرحیم صاحب کے اوپر بارھویں پشت میں شیخ شمس الدین پڑتے ہیں اہل انساب کے اس حساب کے مطابق کہ تین پشت پر ایک سو برس گذر جاتے ہیں، بارہ پشتوں کا زمانہ چار سو برس قرار دیا جائیگا شاہ عبد الرحیم صاحب کی پیدائش گیارھویں صدی کے وسط میں ہوئی ہے اگر اُن کی پیدائش کے زمانہ سے چار سو برس نکال دئیے جائیں تو شیخ شمس الدین کی آمد کا زمانہ ساتویں صدی کے اوائل یا وسط کو قرار دیا جاسکتا ہے،

...لئے اسی خاندان سے قاضی عبدالملک کا انتخاب عمل مین آیا، اور انھون نے اپنے اجداد کی وراثت سمجھکر اُسے قبول کرلیا، قاضی عبدالملک کے بعد اُن کے صاحبزادے قاضی کبیرالدین عرف قاضی بڈھ[1] اُن کے بعد قاضی قاسم اور قاضی قوام الدین عرف قاضی قادن وغیرہ اس عہدہ پر مامور ہوئے[2]،

عہدۂ قضا کے بجائے پیشۂ سپہ گری

قاضی قادن کے فرزند شیخ محمود نے اپنے لئے اس عہدہ کو پسند نہین کیا اور اس کے بجائے حکومت کے دوسرے کامون غالبًا سپہ گری وغیرہ کو اختیار کیا، لیکن اس تبدیلی سے خاندان کی عزت و وجاہت مین کوئی فرق نہین آنے پایا،

شیخ محمود سے پہلے یہ خاندان علم اور تصوف مین ممتاز تھا، اونھون نے تصوف کے ساتھ علم کے بجائے عمل کو جگہ دی، اور اس سے عمل کے مظاہر جرأت، ہمت اور شجاعت و دلیری کا صدور ہونے لگا[3]،

قاضی محمود کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ احمد[4] بھی باپ ہی کے نقشِ قدم پر چلے، اُن کے بعد شیخ منصور[5] بھی شجاعت و بہادری مین ضرب المثل تھے، اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ معظم یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب کے دادا نے بھی فوجی خدمات کے سلسلہ مین بڑا نام پیدا کیا، شاہ ولی اللہ صاحب اُن کی شجاعت و بہادری کے متعلق لکھتے ہین،

---

[1] اُن کے بعد سے قاضی کا لفظ اُن کے اہلِ خاندان کے نام کا جزء بن گیا [2] انفاس العارفین ص ۱۵۹ [3] قاضی محمود کی شادی سونی پت کے سادات گھرانے مین ہوئی تھی، اس سیدہ کے بطن سے دو صاحبزادے احمد اور اعظم تھے [4] شیخ احمد کے دو لڑکے شیخ منصور اور شیخ حسین تھے، شیخ احمد کی شادی شیخ عبدالغنی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، شیخ عبدالغنی اپنے وقت کے بڑے برگزیدہ لوگون مین تھے، اکبری دربار سے ان کا تعلق تھا، لیکن جب اکبر نے کفر و الحاد کا اظہار کیا، تو وہ دربار سے منقطع ہوگئے [5] شیخ منصور کی دو شادی ہوئی تھی، ایک شادی سے شیخ معظم اور شیخ اعظم تھے، اور دوسری سے شیخ عبدالغفور و شیخ اسمٰعیل تھے،

"شیخ معظم[1] بدرجۂ قصوی از شجاعت وغیرہ متصف بود، و وقائع عجیبہ وی درین باب بیش از حد احصا است" (انفاس ص ۱۶۱)

شیخ معظم کی شادی بھی سونی پت کے ایک ممتاز گھرانے میں سید نور الجبار[2] کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اس نیک بخت خاتون کے بطن سے تین صاحبزادے شیخ جمال، شیخ فیروز، اور شیخ وجیہ الدین شاہ عبد الرحیم کے والد پیدا ہوئے[3]۔

شیخ وجیہ الدین شیخ وجیہ الدین بھی اپنی خاندانی خصوصیات کے مالک تھے، اُن کی شجاعت و بہادری کے قصے بھی عام طور پر مشہور ہیں، اور زیادہ تر لوگ اُن سے اسی حیثیت سے واقف ہیں، لیکن وہ اس کے علاوہ صلاح و تقویٰ میں بھی سر آمد روزگار تھے، تواضع و خاکساری جو شجاعت و بہادری کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے، وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی،

تلاوتِ قرآن تلاوت قرآن خاص معمول تھا، سفر میں ہوں خواہ حضر میں، روزانہ دو پارے بڑے ہی اہتمام اور سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے تھے،

ورع و تقویٰ ورع و تقویٰ کا دامن بھی کسی حالت میں نہیں چھوٹا، عام طور پر جب کسی مہم پر فوجیں جاتی ہیں، تو راستہ میں ہر قسم کی بے عنوانیاں شروع کر دیتی ہیں، یہ بھی عالمگیر کی فوج میں ملازم تھے اور بارہا محاذ جنگ پر بھی بھیجے گئے، لیکن اُن سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا حتی کہ کسی کے کھیت میں گھوڑے کو منہ تک مارنے نہیں دیا، بعض اوقات جب کسی فوجی کو کسی کا نقصان کرتے ہوئے دیکھتے، اور نہ رہا جاتا، تو فوج کی عام شاہ راہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر لیتے،

---

[1] انفاس العارفین میں ہے "موضع تنکوہ پور کہ تعلقہ شیخ معظم بود، (ص ۱۶۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صاحب جائداد بھی تھے [2] انفاس میں ہے "کہ سید نور الجبار کہ سیدے عالی نسب بود گرامیش (الجد) بحلیۂ فضل و علم متصف بودند، (ص ۱۶۲) [3] انفاس ۱۶۲،

ایک دفعہ فوج کو رسد نہیں پہنچ سکی، اس لئے عام فوجیوں نے لوٹ مار شروع کر دی، شیخ وجیہ الدین پر دو تین فاقے گذر گئے، لیکن انھوں نے کسی غیر مشروع چیز کو اپنے لئے جائز نہیں رکھا، دو روز کے بعد اتفاق سے تھوڑا سا چنا کہیں پڑا ہوا مل گیا، آپ نے اسی کو بھگا کر سدرمق کا کام لیا،

معاملات میں صفائی | لین دین اور خرید و فروخت کے علاوہ عام معاملات میں بھی شیخ وجیہ الدین بہت محتاط اور امیر و غریب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے، شاہ عبد الرحیم صاحب فرماتے ہیں :-

"معاملہ کہ والد من علیہ الرحمہ (شیخ وجیہ الدین) با خدم و حشم و علف فروش وغیر آن می کردند بوجہے از رفق و انصاف بود کہ از متقیان روزگار کم دیدہ میشود، (انفاس ص ۱۶۳)

استغنا و قناعت | قناعت و استغنا آپ کی خاص خصوصیت تھی، چنانچہ شاہ شجاع کے مقابلہ کے لئے عالمگیر نے جو فوج بنگال بھیجی تھی، اس میں شاہ وجیہ الدین بھی تھے، انھوں نے اس جنگ میں بڑا کارنامہ دکھایا، اور ان کی وجہ سے بڑی کامیابی ہوئی، عالمگیر نے اس کے صلہ میں ان کے منصب اور مرتبہ میں اضافہ کرنا چاہا، مگر آپ کی قناعت پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا،[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی فوجی ملازمت صرف دنیا طلبی کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس میں دینی خدمت اور جہاد کی روح بھی موجود تھی، اس جذبۂ جہاد کا پتہ آپ کے واقعۂ شہادت سے بھی چلتا ہے۔

واقعۂ شہادت | شاہ عبد الرحیم صاحب بیان فرماتے ہیں کہ والد صاحب حسب معمول ایک روز تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، سجدہ میں معمول سے زیادہ دیر ہوئی اس سے مجھے خیال ہونے لگا کہ کہیں آپ کی روح تو نہیں پرواز کر گئی، لیکن دیر کے بعد جب آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا، تو میں نے پوچھا آج آپ نے سجدہ میں اتنی دیر کیوں کی ؟ فرمایا، آج میں اللہ تعالیٰ سے بڑی آہ و زاری کے ساتھ یہ دعا کر رہا تھا، کہ مجھے شہادت نصیب فرما، چنانچہ مجھ پر دعا کی مقبولیت کا انکشاف ہو گیا ہے، اور یہ بھی

---

[۱] انفاس ص ۱۶۵،

اشارہ مل گیا ہے کہ میری جائے شہادت دکن میں ہے"

شاہ ولی اللہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے ہی آپ شاہی ملازمت سے دستبردار ہو چکے تھے، اور فوجی کاموں سے نفرت پیدا ہو چکی تھی، دکن جانے کے لئے سامانِ سفر موجود نہ تھا، مگر آپ نے فوراً تمام سامان درست کیا، سواری کے لئے ایک عمدہ گھوڑا خریدا، اور اس ارادہ کے ساتھ دکن روانہ ہوئے، کہ سیواجی کا جو دکن میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کر رہا ہے..... قلع قمع کر دینگا، لیکن جب برہانپور (گجرات) پہنچے تو اشارۂ غیبی ہوا کہ اپنی جائے شہادت پیچھے چھوڑ آئے، اس لئے آپ وہاں سے پلٹ پڑے، قصبہ ہنڈیا میں کچھ تاجر بھی جو دلی جا رہے تھے، آپکے ساتھ ہو گئے، اثنائے سفر میں ایک دن ایک سو سالہ بڑھیا جو ڈاکوؤں کی جاسوس تھی، افتاں و خیزاں آپکے پاس آئی، آپ نے پوچھا، کہاں کا ارادہ ہے، اُس نے کہا دلی جانا چاہتی ہوں، آپنے اُسے بھی قافلہ میں شامل کر لیا، اور وہ چھٹے روز تک قافلہ کے ساتھ رہی، آپ کے ملازم سے کچھ پیسے روزانہ لے کر خرچ کرتی رہی، جب یہ قافلہ سرائے بزیا پہنچا، تو اس پیرزالہ نے اپنے ڈاکو ساتھیوں کو اطلاع کر دی، تھوڑی دیر کے بعد ڈاکوؤں کی جماعت سرائے میں پہنچی، آپ اُس وقت تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے، دو تین ڈاکوؤں نے آپ کے سامنے آکر پوچھا، وجیہ الدین کس کا نام ہے، جب معلوم ہوا کہ آپ کا نام ہے تو یہ کہکر آگے بڑھ گئے کہ ہمیں تم سے کوئی کام نہیں ہے، کیونکہ تمہارے پاس مال و متاع بھی نہیں ہے، اور پھر ہماری ایک جماعت نے تمہارا نمک بھی کھایا ہے (غالباً یہ بڑھیا کے پیسہ لینے کی طرف اشارہ ہے) ہمیں اس قافلہ میں فلاں فلاں تجار سے کام ہے، اور اُنہی کا مال و اسباب ہمیں لوٹنا ہے، ڈاکوؤں نے اگرچہ آپسے کوئی تعرض نہیں کیا، لیکن آپنے رفقائے سفر کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کیا، اور اُن کی مدافعت کے لئے تیار ہو گئے، اور دونوں طرف سے جنگ شروع ہو گئی، آپ نے بڑی پامردی سے ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا، لیکن گروہ کا مقابلہ آسان نہ تھا، آپ کے بدن پر بیس بائیس گہرے

زخم آئے تھے، جن سے آپ کا جسم بالکل چور چور ہو چکا تھا، کہ اسی حالت مین ایک شقی نے گردن پر ایک کاری ضرب لگائی، اور آپ کا سر تن سے جدا ہو گیا، اس طرح آپ کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی، (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، شہادت کے سنہ و تاریخ کی کوئی تصریح نہین مل سکی،

اولاد آپ کی شادی شیخ رفیع الدین[1] محمد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اُن کے بطن سے تین صاحبزادے شیخ عبد الحکیم، شیخ ابو الرضا محمد، اور شاہ عبد الرحیم پیدا ہوئے، اور تینون صاحب علم و فضل اور صاحب رشد و ہدایت ہوئے، ان مین شاہ عبد الرحیم صاحب کے حالات پیش کئے جاتے ہین،

شاہ عبد الرحیم صاحب کا اجمالی تعارف شاہ عبد الرحیم صاحب نے علم و فضل، ہمت و جرأت اور استغنا و قناعت اپنے اسلاف سے بطور وراثت پائی تھی، شاہ صاحب کا دادیہالی، اور نانہالی دونون خاندان جیسا کہ

---

[1] شیخ رفیع الدین کا خاندان ملتان کا رہنے والا تھا، اُن کے اجداد مین شیخ طاہر تعلیم کے لئے بہار گئے، تکمیل تعلیم کے بعد قاضی بدہ حقانی (بہار کے قاضی) نے اپنی صاحبزادی سے اُن کی شادی کر دی، اس سلسلہ سے وہ کچھ روز بہار ہی مین رہے، پھر اپنے اہل و عیال کے ساتھ جونپور آئے، اور وہین متوطن ہو گئے، اُن کے بعد اُن کے صاحبزادے شیخ حسن بھی کچھ روز جونپور ہی مین رہے لیکن ۸۹۹ھ یا ۹۰۰ھ مین دہلی چلے آئے، تصوف مین ایک کتاب مفتاح الفیض آپ کی یادگار ہے (ملفوظات شاہ عبد العزیز ص ۴۳) اُن کے صاحبزادے شیخ عبد العزیز صاحب شکر بار اپنے وقت کے بڑے مرتاض بزرگون مین تھے ۸۹۸ھ مین پیدا ہوئے، ۹۷۵ھ مین وفات پائی، محدث دہلوی لکھتے ہین، "او ساد و تواضع و حلم و صبر و رضا و تسلیم و شفقت بر خلق و اعانت فقرا نظیر نبود، در زمان خود یادگار مشائخ چشت بود، در دہلی بوجود او سلسلۂ ارشاد و مشیخت بر پا بود (اخبار الاخیار ص ۲۲۶) شیخ عبد العزیز وحدۃ وجود کے قائل تھے، کئی کتابین بھی اُن کی یادگار ہین، وحدۃ وجود مین رسالہ عینیہ اور تصوف مین رسالہ عزیزیہ اور آداب السلوک شیخ عبد العزیز کے صاحبزادے شیخ قطب عالم یعنی شاہ عبد الرحیم کے پرنانا بھی اپنے وقت کے اتقیا مین تھے، محدث دہلوی لکھتے ہین، "قطب عالم عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ قدم صدق و استقامت بر سجادۂ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت معمور داشت (اخبار الاخیار ص ۲۲۶)

لکھا جا چکا ہے، ہمیشہ صاحب عزت و وجاہت رہا، اور اس کے اکثر و بیشتر افراد فضل و کمال، صلاح و تقویٰ کا نمونہ تھے، اور غالباً یہ فیض تھا، دودمان فاروقی اور فقر نبوی سے نسبت و تعلق ہوگا،

شاہ صاحب نے اپنے اسلاف سے علم و فضل، رشد و ہدایت اور صلاح و تقویٰ کا جو خزانہ بطور وراثت پایا تھا، اس کی انھوں نے پوری نگہداشت کی، اور اسے ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا بلکہ اس اصل سرمایہ مین کچھ بیش بہا اضافہ بھی کیا، آیندہ صفحات مین ان کے اسی کارنامے کی تفصیل بیان کیجائے گی،

تعلیم و تربیت اور ماحول | شاہ صاحب نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گھر کو علم اور دین کے چرچے سے معمور پایا، مدتون تک اللہ و رسول کے ذکر کے علاوہ کان مین اور کوئی آواز نہین پڑی، خاندان کے بزرگون کی موجودگی کی وجہ سے خاندان کا ماحول بھی جادۂ اسلاف سے ہٹا نہین تھا، آپکے والدین خود شب زندہ دار

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۱) شیخ قطب عالم کے صاحبزادے شیخ رفیع الدین محمد شاہ عبدالرحیم کے نانا ہین، یہ خواجہ باقی باللہ کے ارشد خلفار مین سے تھے، خواجہ باقی باللہ کو شیخ رفیع الدین سے اتنا شدید تعلق تھا، کہ لوگ اُن کو خواجہ کا محبوب کہتے تھے، اُن پر بھی وحدت وجود کا بڑا غلبہ تھا، آپ کی دو شادیان ہوئی تھین، پہلی شادی کا کوئی علم نہین، دوسری شیخ محمد اعظم پوربی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، انھی کے بطن سے شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ پیدا ہوئین، آپ کی اس شادی مین خود حضرت خواجہ باقی باللہ اور بہت سے صوفیہ شریک تھے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہین "خواجہ (باقی باللہ) لاچار شدند و اعظم پور رفتند، صوفیہ آن ناحیہ چون مقدم خواجہ شنیدند، ہمہ جمع آمدند و در نواحی صد کروہ کم کسی باشد از صوفیہ کہ دران صحبت حاضر نشد، مجلس عجیب کہ ہرگز مثل آن مسموع نشدہ" (انفاس ص ۱۷۳) شیخ رفیع الدین نے ایک دن گھر کا تمام سامان جمع کرکے اپنی تمام اولاد مین تقسیم کر دیا، جب چھوٹی صاحبزادی یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ کی باری آئی، تو انھون نے اُن کو چند اوراق جن مین کچھ اوراد و وظائف اور اپنے پیرون کا شجرہ تھا دیا، صاحبزادی کی والدہ نے کہا کہ ابھی لڑکی کی شادی نہین ہوئی، سامان شادی دینا چاہیے، یہ اوراق دینے سے کیا فائدہ؟ آپ نے فرمایا، کہ یہ ہمارے بزرگون کی اصلی میراث ہے، جسے مین اس کو دے رہا ہون، انشاء اللہ اس کے بطن سے ایک لڑکا ہوگا جو ہماری معنوی میراث کا مالک ہوگا، جب شاہ عبدالرحیم صاحب بڑے ہوے تو اُن کی نانی نے وہ اوراق اُن کے حوالہ کر دیئے، اور وہ واقعی اس معنوی میراث کے مالک ہوئے (انفاس ص ۱۷۳)

ر تہجد گذار تھے، اس لئے آپ بچپن ہی سے اُن کی عبادت اور تہجد اذکار و اشغال کو دیکھتے، اور
ن مین شریک ہوتے تھے، اسی احول مین آپ کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی اسی گہوارۂ احسان و تصوف
ن آپ کی روحانیت پروان چڑھی،

ابتدائی مکتبی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، جب سن شعور کا آغاز ہوا تو عربی شروع کرائی گئی، عربی کی
بتدائی کتابین اپنے بڑے بھائی شیخ ابو الرضا محمد[۱] سے پڑھین، دس سال کی عمر مین متوسطات کی تکمیل
کرلی خود فرماتے ہین :-

رسائل صغار تا شرح عقائد و حاشیہ خیالی بخدمت مخدومی اخوی شیخ
ابو الرضا گذرانیدم

اس کے بعد میرزاہد ہروی کی خدمت مین جو اکبر آباد مین عالمگیر کی طرف سے محتسب تھے، پہنچے، اور بقیہ
کتابین اُن سے پڑھیں،

استاد کی شفقت | شاہ عبدالرحیم صاحب میرزاہد کے عزیز ترین تلامذہ مین تھے، میرزا اُن کی ذہانت
اور طباعی کی وجہ سے ان سے اس قدر محبت کرتے تھے، کہ جس روز یہ مطالعہ کرکے نہین آتے تھے اُس
روز بھی ایک دو سطرین پڑھا دیتے، کہ ناغہ نہ ہونے پائے، خود فرماتے ہین،

"وایشان بامن التفات بسیاری کردند، بحدی کہ می گفتم کہ امروز مطالعہ نہ کردہ ام

---

[۱] انفاس ص ۱۵، نیز القول الجمیل، شیخ ابو الرضا اپنے زمانہ کے بڑے صاحب حال اور صاحب کرامت
بزرگ ہوئے ہین، شاہ عبدالرحیم صاحب اور اُن کے خانوادہ کی روحانی تربیت مین اُن کا بڑا ہاتھ تھا،
اسی کے ساتھ ساتھ علمی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین
مین ان کا حال بہت مفصل لکھا ہے، اس وقت کے مشہور اساتذہ مین تھے، اور یونانی فلسفہ و منطق مین
ان کی حیثیت امام کی سمجھی جاتی تھی، مآثر الکرام مین ان کا تذکرہ موجود ہے،

می گفتند ایک دو سطر خوانید کہ ناغہ نشود، (انفاس ص ۳۲)

استاذ اور شاگرد میں غایت تعلق کی وجہ سے ایک طرح کی مساوات اور بے تکلفی ہو گئی تھی، میرزاہد کے اس مساویانہ برتاؤ سے جو اپنے وقت کے ارسطو اور افلاطون سمجھے جاتے تھے، لوگون کو سخت تعجب ہوتا تھا،[۱]

ایک روز عالمگیر نے میرزاہد کو کسی ضرورت سے بلا بھیجا، وہ جانے کا قصد کر ہی رہے تھے، کہ شاہ عبدالرحیم صاحب پہنچ گئے، اونھون نے مکان کا دروازہ بند کر دیا، اور کہا کہ جب تک میرا فلان کام نہ ہو جائے گا، آپ کو نہ جانے دون گا، انھیں صاحب نے کہا اسوقت پراگندہ خاطر ہون، بادشاہ کے پاس سے واپس ہو کر اس کام کو انجام دون گا، لیکن شاگرد نے پھر اصرار کیا، آخر کار وہ ٹھہر گئے، اور اس کام کو انجام دینے کے بعد دربار میں گئے،[۲]

جودت طبع اور قوت مطالعہ شاہ صاحب لڑکپن ہی سے نہایت ذہین اور ذکی تھے، جودت طبع اور قوت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ اُن کے اساتذہ اور ہم سبق اُن کے نئے نئے سوالات اور اعتراضات سے گھبرا جاتے تھے، ایک مرتبہ اپنے بڑے بھائی شیخ ابو رضا سے خیالی پڑھ رہے تھے، اثنائے درس میں کوئی اعتراض کیا، شیخ نے جواب دیا لیکن انھیں تسکین نہین ہوئی، اونھون نے دوبارہ اعتراض کیا، اور استاد و شاگرد میں بحث و مباحثہ اتنا طول کھینچا کہ استاد ناخوش ہو گئے، اور انھون نے اُن سے پڑھنا چھوڑ دیا،[۳]

شرح مُلّا میں عطف کے بیان میں ایک عبارت دقیق ہے جس کے حل کرنے میں اکثر فضلا اٹک جاتے ہیں، مطالعہ کے دوران میں اُن کے دل میں ایک اعتراض پیدا ہوا، صبح کو انھون نے اسے اپنے ہم سبق شیخ حامد سے بیان کیا، انھون نے کہا کہ میرے ذہن میں بھی یہی اعتراض آیا تھا، شاید توارد ہو گیا ہے دوسرے

---

۱ انفاس ص ۳۳ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ص ۱۵،

روز اعتراض کو حل کیا، اور عبارت پر ایک دوسرا اعتراض پیدا کیا، اسی طرح کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا،[۱]

اگرچہ تعلیم کی تکمیل میر زاہد کی خدمت میں کی تھی، لیکن یہ تحصیل تحصیل حاصل تھی، اس لئے کہ اکثر کتاب کے شروع کا حصہ میر زاہد سے پڑھتے تھے، اور آخر کے حصہ کا خود درس دیتے تھے، اُن کے الفاظ یہ ہیں،

"اگرچہ اتمام تحصیل بخدمت میرزا زاہد کردم، اما گویا تحصیل حاصل می شد، بسا می بود کہ
ازاول کتاب می خواندم واز آخر درس می گفتم" (انفاس ۱۶)

یہ تو صاف پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے حدیث و فقہ اور تفسیر کس سے پڑھی، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالرضا ہی سے پڑھی ہوگی، اس لئے کہ اُن کے دوسرے استاذ میرزا زاہد ہروی ہیں، جو اس کوچہ سے بالکل نابلد تھے، اور تیسرے کسی کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، اور حقیقۃً اُن علوم کی تکمیل میں تعلیم و تلمذ سے زیادہ اُن کی فطری مناسبت اور بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا،

درس و تدریس شاہ صاحب نے تکمیل تعلیم کے بعد ایک مدرسہ[۲] قائم کیا، جس میں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا، اُن کے درس میں فقہ و تصوف، کلام و فلسفہ کے علاوہ قال اللہ و قال الرسول کی آواز بھی، جو ہندوستان میں ابھی بہت عام نہیں ہوئی تھی، سنائی دیتی تھی، شاہ ولی اللہ صاحب کو قرآن و حدیث کی وہ روشنی جس کو انھوں نے اتنا پھیلایا کہ سارا ہندوستان منور ہوگیا، سب سے پہلے اپنے والد شاہ عبدالرحیم ہی کے درس سے ملی تھی،

آپ کی دی ہوئی کئی سندیں آپ کے مجموعۂ مکتوبات[۳] میں موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ تین

۱؎ انفاس ص ۱۵ ۲؎ یہ اس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں، جو اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا اور مسلم معقولی تھا ۳؎ اس مدرسہ کا نام آپ کے بعد مدرسہ رحیمیہ پڑا ۴؎ انفاس رحیمیہ کے نام سے آپ کے چھوٹے صاحبزادے شاہ اہل اللہ صاحب نے آپ کے مکاتیب کو جمع کیا تھا، جو مطبع مجتبائی میں ۱۳۱۴ھ؁ میں چھپ گیا ہے، اس مجموعہ میں آپ کی دی ہوئی کئی سندیں بھی نقل ہیں،

چیزون کی اجازت آپ خاص طور سے دیتے تھے، تفسیر، حدیث اور تصوف، ایک سند مین فرماتے ہین

اجزته لدٰ ہین التفسیر والحدیث،

دوسری سند مین فرماتے ہین :-

وتعلّم منّی علم التفسیر والحدیث والتصوّف،

آپ کے علم و فضل کے بیان مین ہم اس کی اور تفصیل کرین گے، آپکے تلامذہ اور متوسلین کی فہرست بہت ملی جلی ہے، اس لئے ہم دونون کی فہرست آگے چل کر ایک ہی جگہ دین گے،

روحانی تربیت | علم ظاہر کے ساتھ ہی ساتھ گھر کے ماحول مین ان کی باطنی تربیت بھی شروع ہو چکی تھی، اور غیر محسوس طور پر اُن کی روحانیت فروغ پا رہی تھی، شاہ صاحب کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ احسان اور تصوف سے ان کو فطری لگاؤ تھا، جس کے آثار بچپن ہی سے نمایان ہونے لگے تھے، خود بیان فرماتے ہین، کہ میرے ماموں شیخ عبدالحیٔ اپنے لڑکون کی حالت دیکھکر فرمایا کرتے تھے کہ

"ترسیدم کہ سر اسلافِ ما از عقبِ ما منقطع گردد"،

لیکن ایک روز مجھے بڑے اہتمام سے وضو کرتے ہوئے دیکھا تو بیحد مسرور ہوئے، اور فرمایا کہ

"حالا معلوم شد کہ حامل آن سر در خاندان ما بودہ است اگر در اولاد پسر نیست چہ باک

در اعقاب دختری ہست (انفاس ص۴۰)

اُن کے علاوہ دوسرے بزرگون نے بھی اُن کے صلاح و رشد کو دیکھکر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بچہ اس راہ مین کسی ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا، شاہ صاحب کے مرشد حافظ سید عبداللہ صاحب نے ایک مرتبہ ان سے فرمایا، کہ جب تم چھوٹے تھے، اور لڑکون کے ساتھ لہو و لعب مین مشغول رہتے تھے، اس وقت

میری طبیعت فطری طور سے مائل تھی، اور میں تمہارے لئے یہ دعا کیا کرتا تھا کہ

بارے خدایا این طفل را از اولیا گردان (انفاس ص ۱۱)

بارہ برس کی عمر میں آپ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو خواب میں دیکھا، اس کے بعد سے آپکے روحانی ذوق میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا، اور ذکر و اذکار میں پہلے سے زیادہ وابستگی پیدا ہوگئی،

بیعت کا قصد | یوں تو اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر آپنے احسان و تصوف کی بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں، لیکن اس میں پختگی اور دوام کے لئے کسی ہاتھ میں ہاتھ دینے کی ضرورت تھی، اس خواب کے بعد آپنے بیعت کا قصد کیا، لیکن ابھی اس کی نوبت نہیں آنے پائی تھی کہ ایک روز حضرت خواجہ نقشبند یا شیخ عبدالعزیز شکر بار کو خواب میں دیکھا، کہ وہ فرما رہے ہیں،

"اے فرزند ارادت بکسے مدہ تا آنکہ حضرت خواجہ ترا قبول نہ فرمایند"

شاہ صاحب صبح کو حضرت خواجہ خرد (حضرت باقی باللہ کے صاحبزادے) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خواب کی تعبیر پوچھی، اور تعبیر ملنے سے پہلے ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ شہر میں اس لقب (خواجہ) سے آپکے علاوہ کوئی مشہور نہیں ہے، غالباً یہ اشارہ آپ ہی کی طرف ہے، اس لئے اپنی خدمت میں قبول فرمالیجئے حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اس خواب میں اشارہ میری طرف نہیں ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، انشاء اللہ تم کو زیارت نصیب ہوگی، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد یہ سعادت بھی نصیب ہوئی،

کچھ روز کے بعد پھر خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر ہو کر دوبارہ بیعت کی درخواست کی، انھوں نے از راہ تواضع یہ عذر کیا کہ میں اتباع سنت میں متساہل ہوں، اور یہ نہیں چاہتا کہ تمہارا قدم جادۂ شریعت سے ذرا بھی الگ ہو،

بیعت کا مشورہ | شاہ صاحب نے کہا کہ پھر آپ ہی مشورہ دیجئے، کہ میں کس سے بیعت ہو جاؤں، خواجہ خرد نے فرمایا کہ اگر سید آدم بنوری کے خلفاء میں کوئی مل جائے تو اس سے بہتر کوئی نہیں ہے، شاہ صاحب نے

حافظ سید عبد اللہ کا نام لیا، خواجہ صاحب نے تائید فرمائی، چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے بیعت ہوئے، فرماتے ہیں :۔

"باوجود آنکہ طریق اخفاء وخمول برایشان غالب بود، دراوّل مرّۃ بیعت قبول نمودند" (انفاس ص ۷)

حافظ صاحب اُن کو بیحد عزیز رکھتے تھے، کبھی کوئی خدمت نہیں لیتے تھے، اگر وہ کبھی ارادہ بھی کرتے تو حافظ صاحب ٹال دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ شاہ صاحب خدمت کی غرض سے حاضر ہوئے مرشد نے تھوڑی سی خدمت لے کر فرمایا کہ

"این خطرہ (خدمت)، رابخاطر خود راہ ندہید، کہ جمیع حقوق صحبت چہ ظاہری وچہ باطنی ہمہ عفو کردم (انفاس ص ۱۲)

اس درمیان میں آپ کی آمدورفت خواجہ خرد کے پاس بھی ہوتی رہی، اور ان سے بھی استفادہ اور صحبت کا سلسلہ جاری رہا، اگرچہ شاہ صاحب ان سے باقاعدہ بیعت نہیں تھے، لیکن اُن کی صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا، خواجہ صاحب کی حیثیت گویا مرشد کی تھی، مگر انھوں نے شاہ صاحب سے ہمیشہ عزیزانہ برتاؤ رکھا، ایک مرتبہ شاہ عبد الرحیم سے خواجہ صاحب کی مجلس میں کسی میخوار سے بحث ہوگئی، شاہ صاحب ناخوش ہو کر چلے آئے، اور ارادہ کیا، کہ اب خواجہ کی مجلس میں نہ جاؤں گا، دو تین روز کے بعد خواجہ خرد خود اُن کے مکان پر آئے، اور بہت ہی لطف ومحبت سے ناخوشی دور کی[1]

خلیفہ ابوالقاسم حافظ صاحب کی وفات کے بعد آپ کو کسی دوسرے مرشد کی تلاش ہوئی، کسی نے خلیفہ ابو القاسم اکبرآبادی کا ذکر کیا، شاہ صاحب اکبرآباد اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے، شیخ نے اُن کی بڑی پذیرائی کی، اور بہت شفقت اور عنایت سے پیش آئے، اُن کی تربیت میں خاص توجہ کی

---

[1] انفاس ص ۱۰ [2] انفاس

شاہ صاحب فرماتے ہین کہ

"تا آن کہ بعض قدیمان بر من حسد می بردند" (انفاس ص ۲۰۰)

حضرت خلیفہ کو اس قدر تعلق خاطر تھا، کہ جب شاہ صاحب کو بیعت وارشاد کی اجازت دی تو ایک بڑی دعوت کی جس مین بہت سے خواص وعوام شریک ہوئے اور اس مجمع کے سامنے حضرت خلیفہ نے شاہ صاحب کے سر پر دستار ارشاد و خلافت باندھی،

شاہ عبدالرحیم کو بھی مرشد سے بڑی محبت تھی، خود فرماتے ہین، کہ حضرت خلیفہ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ درویشان شہر را زیارت کنید لیکن مین اس سے اس لئے پس وپیش کرتا تھا کہ مرشد سے تعلق کی یکسوئی مین فرق نہ آجائے،

ایک دن حضرت خلیفہ نے شاہ صاحب سے فرمایا کہ سید غلمت اللہ (جو چشتیہ سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے) کی خدمت مین جاؤ، ان کو حسب معمول اس مین تامل ہوا، تو آپ نے خادم سے کہا کہ اُن کو سید صاحب کی خدمت مین لے جاؤ، چنانچہ آپ خادم کے ہمراہ سید صاحب کی خدمت مین گئے، وہ زنانخانہ مین صاحب فراش تھے، اس لئے پہلے تو انھون نے معذرت کر دی، لیکن جب حضرت خلیفہ کی نسبت کا خیال آیا تو خادم سے چارپائی اٹھوا کر باہر تشریف لائے، اور شاہ صاحب سے نام ونسب پوچھا، انھون نے بتایا، مگر شیخ عبدالعزیز شکر بار کی نسبت کا اظہار نہین کیا، مگر باتون باتون مین جب سید صاحب کو اس نسبت کا علم ہو گیا تو وہ فوراً چارپائی سے نیچے اُتر آئے بیحد تواضع وشفقت فرمائی، اُن کے سر پر عمامہ باندھا، اور کچھ نقد اور کچھ تبرکات پیش کرکے فرمایا، یہ تبرکات شیخ عبدالعزیز شکر بار نے میرے دادا کے حوالہ کئے تھے، جسے آج مین تمھارے سپرد کرتا ہون،

شاہ صاحب یہ تبرکات لے کر حضرت خلیفہ کی خدمت مین آئے، اور اُن کے سامنے رکھدیے

انھون نے فرمایا کہ

نعمت بشارت است جمعیت ظاہر و عامہ اشارت بہ اجازت و جمعیت باطن مدین

ہر دو امر شریک توان شد (انفاس ص ۲۸)

اس جمعیت ظاہر کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے کہ معاشی پراگندگی کا سوال اُن کی زندگی مین سرے سے پیدا ہی نہین ہوا، اور نہ جمعیت باطن کی اس خوشخبری کے بعد انھین معاش حیات کے لئے کبھی کوئی دشواری اٹھانی پڑی، (ولی اللہ نمبر ص ۱۸۶)

تلامذہ اور متوسلین شاہ صاحب کے تلامذہ اور متوسلین کی کوئی تفصیل تذکرون مین موجود نہین ہے، اس لئے صحیح تعداد تو نہین بتائی جا سکتی، لیکن اُن کے مکتوبات اور حالات کے ضمن مین جن لوگون کے نام مل گئے ہین، وہ درج ذیل ہین،

(۱) شاہ ولی اللہ، (۲) شاہ اہل اللہ شاہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے جنھون نے اُن کے مکتوبات کو انفاس رحیمیہ کے نام سے جمع کیا ہے،

(۳) شیخ محمد[1] (۴) شیخ معظم، (۵) دلدار بیگ، (۶) شیخ زین العابدین[2]، (۷) شیخ عبداللہ جیو شیخ ابوالقاسم کے صاحبزادے (۸) شیخ عبدالوہاب (۹) خواجہ احمد (۱۰) شیخ عبید اللہ، (۱۱) حسیب الدین (۱۲) فیض اللہ، (۱۳) حسام الحق یا حسام الدین یہ اسمار انفاس رحیمیہ سے لئے گئے ہین (۱۴) مولوی نذر محمد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مین مشہور تھے، (۱۵) شاہ گل، یہ نام شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات سے لئے گئے ہین (۱۶) شیخ محمد فاضل، (۱۷) شیخ عبداللہ چلپی[3] مترجم فتاوی عالمگیری (۱۸) مرزا علی خوافی

---

[1] ان کے نام کئی خطوط ہین۔ [2] اُن کے نام بھی متعدد خطوط ہین [3] شاہ صاحب کا بڑا شہرہ سنا تھا ایک دن اُن سے ملنے گئے، مگر مل کر کچھ خوش نہین ہوئے، ایک روز کسی مجلس مین شاہ صاحب سے اُن سے پھر ملاقات ہوگئی، عبداللہ چلپی نے کوئی دعا پڑھی اور اعراب مین کچھ غلطی کی، شاہ صاحب نے انھیں ٹوکا اس طرح

(۲۰) شیخ محمد فاضل چلپی، بنام انفاس سعادت بھی صفحے گئے ہیں، اُن کے علاوہ آپ کے متوسلین میں خانقاہ کا نام بھی ملتا ہے (ص ۲۰۰)، امر بیا شہ انفاس محمدیہ میں اُن کے نام ایک خط موجود ہے (۲۱) بی بی فخر النساء شیخ عبدالعزیز رحمۃ نے اُن کے بارے میں کہا ہے کہ از معتقدان بہ شریف بود صاحب توجہ وکشف (ص ۱۱۹)

طبابت اور ذریعۂ معاش | شاہ صاحب کے خاندان میں امراض روحانی کے علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی امراض کے معالجہ کا بھی سلسلہ قدیم سے چلا آرہا تھا، خود شاہ صاحب نے اس کی تکمیل کی تھی، اور اس میں مہارت بہم پہنچائی تھی، اُن کی مہارتِ فن کے بہت سے واقعات مشہور ہیں،

ایک مرتبہ بارہہ کے کسی دیہات میں گئے ہوئے تھے، وہاں اُن کے سامنے کسی مریض کا قارورہ لایا گیا، اُنھوں نے دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیا، اس وقت ایک ہندو طبیب موجود تھا، اُس نے کہا کہ آپ نے مرض کی تشخیص اچھی طرح کر لی ہے یا نہیں؟ شاہ صاحب مسکرائے، اور فرمایا، یہ عورت کا قارورہ ہے، اسے فلاں فلاں بیماری ہے، اور اس کے یہ اسباب ہیں، اس طبیب نے پھر آپ سے پوچھا کہ یہ کس کتاب میں ہے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ

"این طب نیست فراستِ صادقۂ محمدیان است (انفاس ص ۵۹)

اُن کی مہارت فن کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں،

"در طب درس ایشان بغایت رسا وسلیم بود (انفاس ۸۲)

شاہ صاحب کے بعد بھی یہ فن اُن کے خاندان میں علمی حیثیت سے باقی رہا، مگر عملی حیثیت سے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا سلسلہ ختم کر دیا، شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹۰) سے دونوں میں کچھ مناظرانہ شکل پیدا ہوگئی، لیکن آخر میں عبداللہ چلپی نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور شاہ صاحب سے بیعت ہوگئے (انفاس العارفین ص ۵۲)

"حکمت ہم درخاندان ما معمول بود، چنانچہ جد بزرگوار وعم فقیر (غالباً شاہ اہل اللہ صاحب) ودوائی کردند، ووالد ماجد بندہ موقوف ساختہ، (ص ۲۲)

لیکن یہ تصریح نہین مل سکی کہ شاہ عبدالرحیم صاحب یا اُن کے اجداد نے طبابت کا پیشہ ذریعۂ معاش کے لئے اختیار کیا تھا، یا صرف خدمتِ خلق کے لئے یا دونون شکلین تھین، "دوائی کردند اور موقوف ساختہ" وغیرہ الفاظ سے دونون صورتین نکل سکتی ہین، مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے، کہ اس پیشہ کو شاہ صاحب یا اُن کے اجداد نے ذریعۂ معاش نہین بنایا تھا،

وفات | فرخ سیر کے عہد مین بروز چہارشنبہ ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ ۷۷ برس کی عمر مین وفات پائی، اور مقام مہندیون جہان اس خانوادہ کے دوسرے گوہر شب چراغ پوشیدہ ہین، آپ بھی مدفون ہوئے، (باقی)

سلہ ان کے اجداد مین مفتی شمس الدین سے قاضی محمود تک غالباً عہدۂ قضا ہی ذریعۂ معاش رہا، اس کے بعد فوجی ملازمت شروع ہوئی، اور غالباً عہدۂ قضا کی جگہ اس نے لے لی، شاہ صاحب کے دادا شیخ معظم شاہی ملازمت کے ساتھ ساتھ ایک بڑی جائداد کے بھی مالک تھے، شیخ وجیہ الدین یعنی شاہ صاحب کے والد بھی عالمگیر کی فوج مین ملازم تھے، اس لئے ان مین کسی کو طبابت کو ذریعۂ معاش بنانے کی ضرورت پیش نہین آئی، شاہ عبدالرحیم صاحب نے البتہ نہ کوئی ملازمت کی، اور نہ شاہی دربار اور امرا سے کوئی مدد لی، اس لئے وہ طبابت کو ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے، مگر اُن کے حالات کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے، کہ صلحا کے طریقے کے مطابق انھون نے بھی قناعت و توکل ہی کی زندگی بسر کی، اور مستقل طور سے کوئی ذریعۂ معاش اختیار نہین کیا لیکن مرشد کی دعا کے مطابق انھین جمعیت ظاہر کی دولت ہمیشہ نصیب رہی،

شاہ صاحب کے محلہ مین ایک بزرگ خواجہ ہاشم رہتے تھے، انھون نے ایک دن شاہ صاحب سے بطور امتحان کہا کہ مین ایک درود جانتا ہون جس کے پڑھنے سے آدمی متمول ہو جاتا ہے آپ نے اُن کے جواب مین فرمایا،

"خدائے تعالیٰ مرا بواسطۂ والد من قدر ضروری می رساند، دیگر احتیاج ندارم (انفاس ص ۴۸)

جابر بن حیّان

(دنیاے اسلام کا نامور کیمیادان)

از

از مولوی سید وحید احمد صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

مسلمانون نے اپنے دورِ عروج مین دوسرے علوم کی طرح کیمیا (کیمسٹری) کی طرف بھی توجہ کی، اُن سے پہلے اس کی حیثیت شعبدہ بازی سے زیادہ نہ تھی، انھون نے اس کو ایک حقیقی اور کارآمد فن بنا دیا، اور اس مین قابلِ قدر تحقیقات و اکتشافات کئے، اور بہت سی قلمی یادگارین چھوڑین ابوبکر محمد بن زکریا رازی، ذوالنون مصری، ابن دمشقیہ خمیمی، خالد بن یزید اور جابر بن حیّان وغیرہ بہت سے علما رنے کیمیا کی طرف توجہ کی، ان مین جابر بن حیان زیادہ ممتاز ہین، انھون نے اس فن مین بہت سے اکتشافات کئے، اور کتابین لکھین، اور ان کی تصانیف کے مختلف زبانون مین تراجم ہوئے، جن کے ذریعہ یورپ مین اس فن کی اشاعت ہوئی،

جابر کو کیمیا مین وہی مرتبہ حاصل ہے، جو منطق مین ارسطو کو، جابر وہ پہلا شخص ہے جس نے علم کیمیا کے قواعد و قانون مرتب کئے، اس سے پہلے بھی بعض مسلمانون مثلاً خالد بن یزید[1]، اور امام

---

[1] خالد بن یزید بن معاویہ بن ابوسفیان، بڑا فصیح و بلیغ مقرر، بلند پایہ شاعر اور ادیب تھا، سب سے اول اسی نے طب نے اور نجوم وغیرہ کی کتابون کو دوسری زبانون سے عربی مین

جعفر صادق وغیرہ کو اس علم سے شغف تھا، انھوں نے اس علم کی خدمت کی، مگر جو ہستی کہ جابر ہی تھا نے اس کو اس علم کا صدر نشین بنا دیا، جابر بن حیان سے پہلے یہ علم نا مکمل اور غیر مرتب تھا، جابر پہلا شخص ہے جس نے اس علم کو مرتب شکل میں پیش کیا، دنیا جابر کو سب سے پرانا اور سب سے مشہور کیمیائی سمجھتا ہے[۵۳]۔

فرانس کا مشہور مستشرق پروفیسر برتھیلو (Prof. M. Berthelot) جس نے جابر کی بہت سی کتابوں کو ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اپنی کتاب تاریخ الکیمیا فی القرون الوسطی میں لکھتا ہے :-

"جابر بن حیان کو کیمیا میں وہی مرتبہ حاصل ہے، جو ارسطو کو منطق میں"

اسی طرح ایک دوسرے مستشرق راجر بیکن (Roger Bacon) جابر کو فن کیمیا میں استاذ الاساتذہ گردانتے ہیں[۵۴]۔

حاجی خلیفہ چلپی کشف الظنون میں لکھتے ہیں :-

اوّل مَن اشتھر ھٰذا العلم	اس علم کیمیا میں جابر بن حیان صوفی
عند جابر بن حیان الصوفی	خالد کا شاگرد سب سے پہلا شخص ہے جس نے

(بقیہ حاشیہ ص) ترجمہ کیا تھا، ابن ندیم نے اس کی بہت سی کتابوں کا نام گنایا ہے (ابن ندیم ص ۴۹۷) ۵۲ امام جعفر صادق بن محمد الباقر بن علی زین العابدین بن الحسین بن علی ابن ابی طالب، یہ جابر بن حیان کے استاذ تھے، امام کو کیمیا سے بڑا لگاؤ تھا، (ابن ندیم ص ۴۹۹) ۵۲ تمدن عرب ص ۴۳۶ (مترجمہ سید علی بلگرامی) طبع اول در مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۸ء

۵۳ شرح حال و مقام زکریائی رازی ص ۵۵

میں تلامذ ۃ خالد[۱] شہرت حاصل کی،"

ابن خلدون جابر کو "امام المدونین" مانتے ہیں، جیسا کہ ان کا قول ہے،

وامام المدونین فیہا جابر	یعنی اس علم کو مرتب کرنے میں جابر کو
حیان حتی انہم یخصونہا بہ	امام کا درجہ حاصل ہے، یہان تک کہ
فیسمونہا علم جابر	لوگ علم کیمیا کو علم جابر کے نام سے پکارتے ہیں

(مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۵)

یہان یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ چلپی اور بعض دوسرے تذکرہ نویسون نے جابر کو خالد کا شاگرد بتایا ہے، جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہین ہے، صاحب کشف الظنون نے خود ایک دوسری جگہ جابر کا سنہ وفات ۱۶۱ھ بتایا ہے جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہین لیکن اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے، تو بھی خالد اور جابر سے کوئی تعلق نہین پیدا کیا جا سکتا، کیونکہ خالد نے ۸۵ھ مین انتقال کیا، جو بقول صاحب کشف الظنون جابر کی پیدائش کا سال ہے، یا جابر اس وقت مشکل سے پانچ برس کا رہا ہوگا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس عمر مین کیمیا جیسے علم کو حاصل کیا جا سکے، اس لئے خالد سے جابر کے تلمذ کی روایت صحیح نہین ہے، درحقیقت جابر حضرت امام جعفر صادق کا شاگرد تھا، جیسا کہ دوسرے تمام تذکرہ نویسون ابن ندیم[۲] اور ابن خلکان[۳] وغیرہ نے تذکرہ کیا ہے،

جابر بن حیان کی شخصیت کی تعیین جابر کی شخصیت نہایت معروف ہے اور یورپ کے اہل علم نے اس کی بہت سی کتابین ایڈٹ کرکے شائع کی ہین، اور ان کے ترجمے کئے ہین لیکن اس کے باوجود جابر کے بارہ مین اُن سے نہایت فاش غلطیان ہوگئی ہین، مثلاً جابر کے متعلق ان مین سے بعض کا

---

۱ کشف الظنون جلد دوم ص ۳۴۴ (مطبوعہ در مطبع سعادت ترکی ۱۳۱۱ھ) ۲ ابن ندیم ص ۴۹۹ ۳ ابن خلکان ص ۱۰۵ جلد اول،

خیال ہے کہ وہ "اشہر امراء العرب و فلاسفتھم" یعنی عرب کا مشہور و معروف امیر الامرا اور فلسفی تھا،[۵۱]

بعض اس کو اندلس کے شہر اشبیلیہ کی طرف منسوب کرتے ہین[۵۲] ایک دوسرے انگریز مستشرق نے اس کو خالص عربی النسل بتایا ہے، اس کا خیال ہے کہ جابر مین خالص عربی خون تھا، عجمیت سے اس کا کوئی تعلق نہین ہے،[۵۳]

ایک صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ کر جابر کو عرب کا بادشاہ بنا دیتے ہین، اور اس کو "ملک العرب" کا خطاب عنایت فرماتے ہین[۵۴] بعضون نے اس کو عجم اور بعضون نے ہندوستان کی بادشاہی بخشی ہے،

لاطینی زبان کے علما جابر بن حیان کو (Geber) کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہین، چنانچہ لاطینی زبان کی ایک کتاب جو جابر یا جبیر (Geber) کی طرف منسوب ہے، لاطینی زبان کے علما، و فضلا مین بڑی عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، اس کتاب کا نام (Summa perefection.) ہے، مشہور محقق اور ناقد پروفیسر ہولمیارڈ (Holmyard) کے خیال مین مذکورۂ بالا کتاب یعنی (Summa perefection)

---

۵۱ ملاحظہ ہو رسل (Russell) کا انگریزی مضمون بہ سلسلۂ تالیفات جابر، مسٹر رسل کی اصل انگریزی عبارت یہ ہے: 'The most famous Araleian prince and phalaspher'

۵۲ اس غلطی کی وجہ غالباً یہ ہو کہ وہ اشبیلیہ کے مشہور فلکی جابر بن افلح (پانچوین صدی ہجری) اور جابر بن حیان مین فرق نہین کر سکے اور ان کو دونون مین تشابہ ہو گیا ۵۳ ملاحظہ ہو تالیفات جابر مطبوعہ نورم برگ (Nurem Zug-) ۱۵۴۱ء ۵۴ ملاحظہ ہو تصنیفات جابر مطبوعہ ڈینزگ (Danzig) ۱۶۸۲ء ۵۵ رسالہ المقتطف ۶۸ نمبر ۲ مئی ۱۹۲۶ء مطابق شوال ۱۳۴۴ء)

جابر بن حیان کی مشہور کتاب "الخالص" کا ترجمہ ہے، یا اس سے ماخوذ ہے، پروفیسر ہولیارڈ کا یہ بھی کہنا ہے کہ "Suma perefection" کے علاوہ اور بھی بہت سی کیمیائی کتابیں جو لاطینی زبان میں شائع ہوئی ہیں جابر ہی کی تصانیف ہیں،

(Summa ferefiction) لاطینی زبان کے جاننے والوں کے نزدیک بہت محبوب اور مقبول ہے[۱]؛

جابر (jabir) اور جبیر (Geber) کے معمولی فرق کی وجہ سے بعض متاخرین کو یہ اشتباہ ہوگیا ہے، کہ جابر اور جبیر دو الگ الگ شخصیتیں ہیں، حالانکہ دونوں ایک ہی شخص کے دو نام ہیں،

پروفیسر ہولیارڈ نے سائنس کے ایک مشہور رسالہ سائنس پروگرس (Science-progress.) کے جنوری ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں جابر بن حیان کے حالات اور اس کے کارناموں پر ایک مفصل اور پرمغز مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے اس غلط خیال کی پوری تردید کی ہے انھوں نے یہ دلائل ثابت کیا ہے، کہ جابر بن حیان وہی شخص ہے، جسے لاطینی زبان کے علما جبیر (Geber) کے نام سے پکارتے ہیں، اور جتنی بھی کتابیں جبیر کی طرف منسوب ہیں، وہ سب کی سب ترجمے اور اقتباسات ہیں اس نامور قابلِ فخر، یگانۂ روزگار فارسی الاصل اور عربی النسل مصنف کی کتابوں کے جسے دنیا جابر بن حیان کے نام سے جانتی ہے[۲]؛

جاے پیدایش اور وطن | جابر کی جائے پیدایش اور وطن میں بھی تذکرہ نویسوں کا بڑا اختلاف ہے

---

[۱] رسالہ سائنس پروگرس (Science progress) جنوری ۱۹۲۵ء ص ۲۳ ملاحظہ ہو

[۲] پروفیسر ہولیارڈ (Holmyard) کا مضمون مندرجۂ رسالہ سائنس پروگرس (Science progress) شمارہ جنوری ۱۹۲۵ء،

کوئی اسے کوفہ کا بتاتا ہے، کوئی طوس کا، کوئی خراسان کا، کوئی حران کا، ذیل میں بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات لکھے جاتے ہیں،

ابن ندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں،

ھو ابو عبد اللہ جابر بن حیان	ابو عبد اللہ جابر بن حیان
بن عبد اللہ الکوفی، وکان	ابن عبد اللہ کوفی کوفہ کا رہنے
من اھل کوفہ،	والا تھا،[1]

حاجی خلیفہ چلپی کشف الظنون میں رقمطراز ہیں،

ھو الشیخ ابو موسیٰ جابر بن حیان	شیخ ابو موسیٰ جابر بن حیان المتوفی ۱۶۰ھ
الطوسی المتوفی سنہ ۱۶۰ھ	طوس کا رہنے والا ہے،[2]

وزیر جمال الدین قفطی تاریخ الحکماء میں اس کو کوفہ کا رہنے والا بتاتے ہیں،[3]

ڈاکٹر محمود نجم آبادی اپنی کتاب "شرح حال ومقام زکریائی رازی" میں کہتے ہیں کہ

"مردے ایرانی الاصل می باشد مولدش درحران بین النہر ودر این شہر تحصیلات ابتدائی را انجام دادہ در بغداد بہ تکمیل معلومات خود پرداختہ[4]"

اسی طرح سے اور بعض دوسرے مصنفین خیر الدین[5] زرکلی اور یوسف الیاس سرکیس وغیرہ بھی کوفہ ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں،

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۴۹۸ [2] کشف الظنون ص ۲۹۵ ج دوم طبع اول در مطبع سعادت ترکی ۱۳۱۱ھ [3] اخبار الحکماء فی تاریخ الحکماء مطبوعہ مصر ص ۱۱۱ [4] شرح حال ومقام زکریائے رازی از ڈاکٹر محمود نجم آبادی مطبوعہ ایران ص ۵۴ و ۵۵ [5] الاعلام (قاموس التراجم) ص ۴، ۱ [6] معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ مؤلفہ یوسف الیان سرکیس مطبوعہ مصر جلد اول،

مذکورۂ بالا بیانات میں بظاہر بڑا تضاد ہے، لیکن اگر ذرا سا بھی غور کر لیا جائے، تو یہ تضاد رفع ہو جاتا ہے، اس کی جانب یاقوت حموی[1] کی ایک عبارت سے رہنمائی ہوتی ہے، جس سے سارا تضاد دور ہو جاتا ہے، اکثر مصنفین نے جابر کو عراق کے مشہور شہر کوفہ کی طرف منسوب کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، وہ اس کوفہ کا نہیں بلکہ دراصل طوس کے ایک گاؤن کوفیانام کا رہنے والا تھا، اور اس کی نسبت سے لوگون نے اس کو کوفی لکھنا شروع کیا، بعد مین آنے والی نسلون نے غلطی سے اس کو مشہور و معروف شہر کوفہ کا رہنے والا سمجھ لیا، یاقوت حموی کی اصل عبارت یہ ہے:-

"کوفیا" باذقان من قری طوس،	یعنی کوفیا باذقان طوس کے ایک گاؤن کا نام ہے[2]،

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جابر بن حیان شہر کوفہ کا نہین بلکہ طوس کے ایک گاؤن "کوفیا" کا رہنے والا تھا، اس لئے جو لوگ اسے کوفی لکھتے ہین، یا طوسی کہتے ہین، دونون کا بیان صحیح ہے، رہا حرّان اور نہرین کا سوال تو یہ طوس سے زیادہ فاصلہ پر نہین ہے، متاخرین مین اکثر نے اس کا اصل وطن طوس ہی کو قرار دیا ہے، اور یہی صحیح ہے،

طوس بڑا مردم خیز خطہ ہے، اس کی خاک سے بڑے بڑے علماء اور فضلاء پیدا ہوئے، شاہنامہ کا مصنف فردوسی اس کا فرزند تھا،

پروفیسر ہولمیارڈ نے خاص طور سے اس کے وطن کی تحقیق کی ہے، اور اسے طوس کا رہنے والا ثابت کیا ہے[3]،

---

[1] شہاب الدین ابو عبداللہ المعروف یاقوت حموی مصنف معجم البلدان و معجم الادباء (۵۷۴ھ - ۶۲۶ھ)

[2] معجم البلدان یاقوت حموی مطبوعہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۷، ص ۳۰۰ [3] رسالہ سائنس پروگرس (Science Progress) - جنوری ۱۹۲۵ء

چونکہ شہر کوفہ مین اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزارا تھا[۱] اس لئے بعض لوگون نے اوس کو کوفی لکھا،

ابھی حال مین جب کوفہ کے کھنڈرات کی کھدائی ہوئی تھی تو جابر بن حیان کے معمل laboratory کی بہت سی یادگارین ملین جن سے جابر کے کوفہ مین طویل قیام پر روشنی پڑتی ہے[۲] ابن ندیم نے بھی لکھا ہے کہ جابر کوفہ کی عمدہ آب و ہوا کی وجہ سے وہین کیمیاوی عملیات اور تجربات کیا کرتا تھا، چنانچہ برامکہ کی تباہی کے بعد ہارون الرشید کو جابر بن حیان کے معمل مین تقریبًا دو سو رطل سونا ملا تھا[۳]،

نام و نسب | جابر نام ابو عبد اللہ کنیت، باپ کا نام حیان اور دادا کا عبد اللہ تھا[۴]، حاجی خلیفہ چلپی نے اُس کی کنیت ابو عبد اللہ کے بجائے ابو موسیٰ لکھی ہے[۵]، ابن ندیم نے بھی ایک جگہ ابو موسیٰ کنیت بتائی ہے[۶]، گویا کہ جابر کے دو لڑکے تھے، عبد اللہ اور موسیٰ،

ابتدائی حالات | زندگی کے ابتدائی حالات پردۂ خفا مین ہین، باوجود تلاش و تحقیق اس کے متعلق کچھ نہ معلوم ہو سکا، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ ابتدائی تعلیم وطن ہی مین حاصل کی، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ اس کے بچپن کا زمانہ بھی وطن ہی مین گذرا ہوگا، اس کے بعد بغداد گیا[۷]،

جابر کے اساتذہ | تاریخ اور تذکرہ کی کتابون مین جابر کے صرف دو استادون کے نام ملتے ہین (۱) امام جعفر صادق (۲) خالد بن یزید بن معاویہ، موخر الذکر کے متعلق ہم اوپر بیان کر آئے ہین، کہ جابر بن کی وفات کے وقت پیدا ہی نہین ہوا تھا، اس لئے اس سے تلمذ کی روایت صحیح نہین،

۱؎ ابن ندیم ص ۴۹۹، ۲؎ Science progress جنوری ۱۹۲۵ء ۳؎ فہرست ابن ندیم ص ۴۹۹ ۴؎ ابن ندیم ص ۴۹۰ ۵؎ کشف الظنون ص ۲۹۵ ۶؎ ابن ندیم ص ۵۰۰ ۷؎ شرح حال و مقام زکریائے رازی ص ۱۵۵،

جابر کیمیا کے علاوہ دوسرے علوم مین بھی دست گاہ رکھتا تھا، جس پر اس کی تصانیف شاہد ہین ان علوم مین بھی اس کے اساتذہ کی تعیین نہین کی جا سکی،

جابر اور برامکہ دوسری صدی ہجری مین جابر ہارون رشید کے پائیتخت بغداد مین قیام پذیر تھا، جہان اوس کے تعلقات برمکی خاندان سے بہت گہرے تھے، خلیفہ سے بھی اس کے تعلقات خوشگوار تھے، لیکن برامکہ سے اس کو خاص لگاؤ تھا جس کا ثبوت ان کتابون سے ملتا ہے، جو اس نے اُن کی (برامکہ) فرمایش پر لکھین، یا خود بطور ہدیہ پیش کین، یا اُن کی طرف منسوب کین،

دوسرے علوم کی طرح برامکہ کو علم کیمیا سے بھی دل چسپی تھی، اس لئے انھون نے اس علم کی بھی پوری سرپرستی کی، جابر نے اپنی کتاب الخواص مین بہت سے ان اختلافات کا تذکرہ کیا ہے جو اس سے اور برامکہ سے اس علم کے بارے مین ہوئے[۱]،

جابر بن حیان کی کتاب "نہایۃ الطلب[۲]" کے شارح جلدکی[۳] نے لکھا ہی کہ اُس نے کیمیا کے بہت سے راز یحییٰ برمکی اور اس کے دونون لڑکے فضل و جعفر کو بتا دیئے تھے[۴]،

ابن ندیم کے بیان کے مطابق یہ خود بھی آل برمک کا ایک فرد تھا[۵]، اور اس سے اور جعفر بن یحییٰ سے بڑے گہرے تعلقات تھے[۶]،

جب آل برمک پر خلیفہ ہارون رشید کا عتاب نازل ہوا، اور اُن کے ساتھ اُن کے متوسلین

---

[۱] رسالہ المقتطف مئی ۱۹۲۶ء [۲] یہ کتاب جلدکی کے فارسی شرح کے ساتھ ۱۳۰۷ھ مین آقا محمد شیرازی نے بمبئی سے چتر پربھا پریس مین چھپوا کر شائع کی ہے [۳] عرب کیمیا دانون کے متعلق اس کی معلومات کا دائرہ بڑا وسیع تھا، یہ خود بھی کیمیا دان تھا، ۱۲۶۰ھ مین انتقال کیا،

[۴] شرح نہایۃ الطلب (فارسی) مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۷ھ

[۵] ابن ندیم ص ۴۹۹ [۶] ابن ندیم ص ۴۹۹،

قتل کئے جانے لگے تو جابر نے بغداد سے راہ فرار اختیار کی، اس کے بعد جابر کو کہین جم کر بیٹھنا نصیب نہین ہوا، کیونکہ خلیفۂ وقت ہارون الرشید کا ڈر اس کے دل پر کچھ ایسا طاری تھا کہ اس کو کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہین دیتا تھا[1]،

ابن ندیم لکھتے ہین، "کان ینتقل فی البلد ان لا یستقر بہ بلد خوفاً من السلطان علی نفسہ[2]"

یعنی یہ ایک جگہ جم کر نہین رہتا تھا، بلکہ سلطان کے ڈر سے ادھر ادھر اپنی جان لئے پھرتا تھا"

جابر کے دعویدار | شیعون کا خیال ہے کہ جابر شیعہ تھا، دلیل یہ ہے کہ وہ چھٹے امام حضرت جعفر صادق کا شاگرد اور تربیت یافتہ تھا[3]،

فلسفیون کا کہنا ہے کہ جابر ان مین سے ایک تھا جس کا ثبوت اس کی منطق اور فلسفہ کی تصانیف ہین[4]:-

صوفیون کا خیال ہے کہ وہ ایک بڑا صوفی اور راہ سلوک کا عارف تھا، چنانچہ اکثر تذکرہ نویسون نے اس کو صوفی کے لقب سے یاد کیا ہے[5]،

بہرحال اس کی تصانیف کو دیکھنے سے کوئی شخص اس کا صحیح مسلک متعین نہین کر سکتا،

آخر عمر مین غالباً تصوف سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے صوفی کے نام سے مشہور ہوا[6]،

وفات | کشف الظنون کے مصنف حاجی خلیفہ چلپی نے سنہ وفات ۱۶۰ھ قرار دیا ہے جو تاریخی

---

[1] ابن ندیم ص ۴۹۹ [2] ایضاً ص [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۴۹۹ [5] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۸۵ و اخبار الحکما ص ۱۱۱ و ابن ندیم وغیرہ وغیرہ،

[6] اخبار الحکما، ابن ندیم شذرات الذہب وغیرہ،

اعتبار سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ جابر اور برامکہ کے تعلقات مستند تاریخون سے ثابت ہین، بقول ابو الفدا ابن اثیر اور طبری وغیرہ برامکہ کا قتل عام ہارون الرشید کے ہاتھون ۱۸۷ھ یا ۱۸۸ھ مین ہوا ہے، اس لئے جابر یقیناً ۱۸۶ھ کے بعد بھی زندہ رہا، ورنہ ابن ندیم کے بیان کے مطابق اس کو خلیفہ وقت کے ڈر سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟

نہایۃ الطلب کے شارح جلاقی نے لکھا ہے، کہ جابر بن حیان ہارون الرشید کے انتقال تک چھپا رہا، اور خلیفہ مامون کی تخت نشینی کے بعد دوبارہ ظاہر ہوا،[۱]

اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے مین کوئی قباحت نہین معلوم ہوتی،

تلامذہ مشہور تلامذہ مین خرقی ابن عیاض مصری اور اخمیمی ہین،[۲]

خرقی مدینہ منورہ کا رہنے والا تھا، مدینہ منورہ مین ابن ندیم کے زمانہ تک ایک گلی "سکۃ الخرقی" ان کے نام سے منسوب تھی،[۳]

ابن عیاض مصری یہ مصر کا رہنے والا تھا، اس نے بھی جابر بن حیان سے بہت فیض اٹھایا،[۴]

اخمیمی اس کا پورا نام عثمان بن سوید ابو حری الاخمیمی ہے، مصر کے ایک گاؤن اخمیم کا رہنے والا تھا، فن کیمیا کا بڑا امام سمجھا جاتا تھا اس سے اور ابن وحشیہ سے بڑے معرکہ کے مناظرے ہوتے تھے اس کی مشہور کتابین کتاب الکبریت الاحمر، کتاب الابانۃ اور کتاب الکل والعقد وغیرہ ہین،[۵]

اولاد صرف دو بیٹون کا پتہ چلتا ہے جن کے نام عبداللہ اور موسیٰ ہین، خاندانی حالات نامعلوم ہین، اوپر ابن ندیم کی روایت گذر چکی کہ یہ خاندان برمک سے تعلق رکھتا تھا،

تصانیف تصانیف کے اعتبار سے جابر ان چند علما رمین سے ہے جس کی تصنیفین بے شمار ہین ابن ندیم

---

[۱] رسالۃ المقتطف بابت مئی ۱۹۲۶ء ص ۲۸۴ [۲] ابن ندیم ص ۵۰۰ [۳] ابن ندیم ص ۵۰۰ [۴] ایضاً ص ۵۰۵ [۵] ابن ندیم ص ۵۰۵،

نے اُن کی تعداد چار ہزار سے زیادہ لکھی ہے، کتابوں کی یہ تعداد بظاہر مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے جس کا یقین مشکل سے آتا ہے لیکن اُس کی حقیقت یہ ہو کہ اُن چار ہزار کتابوں میں اکثر و بیشتر صرف مختصر مضمون کی حیثیت رکھتے تھے، ان مضامین اور چھوٹے چھوٹے رسالوں کو کتاب کے نام سے تعبیر کر دیا گیا ہے جس سے تعداد زیادہ ہو گئی ہے، ابن ندیم نے جن کتابوں، رسالوں اور مضامین کا ذکر کیا ہے، اُن میں سے اکثر حوادث زمانہ کی نذر ہو گئی ہیں تاہم بہت سی کتابیں اب بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جن سے اکثر اشخاص ابھی تک نا واقف تھے لیکن تحقیق و تفتیش کا سلسلہ برابر جاری ہے، اور رفتہ رفتہ اُن کا پتہ چلتا رہا ہے، اور وہ منظر عام پر آتی جا رہی ہیں،

ابن ندیم نے اس کی پوری کوشش کی ہے کہ جابر بن حیان کی اہم تصانیف کے نام گنا دیے جائیں، مگر ان کی صحت کا زیادہ خیال نہیں کیا ہے، جس سے بہت سے لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں[۱]

جرمنی کے مشہور مستشرق فلوگل (Flügel) نے ابن ندیم کی کتاب "الفہرست" کو بنیاد و اساس قرار دے کر جابر کے حالات لکھے ہیں، اور اُن کی تصانیف پر ریویو کیا ہے لیکن اُن سے اور ان کے متبعین سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں[۲]

اس طرح سے پروفیسر برتھیلو نے فہرست ابن ندیم سے جابر بن حیان کی بہت سی کتابوں کے نام ان کے توں بغیر چھان بین کے نقل کر دئے ہیں[۳]   (باقی)

---

[۱] رسالہ المقتطف بابت مئی ۱۹۲۶ء ص ۴۸۵ [۲] ملاحظہ ہو پروفیسر ہولمیارڈ، صدر جمعیۃ ملکیہ انگلستان

[۲] ملاحظہ ہو پروفیسر ہولمیارڈ صدر جمعیۃ ملکیہ انگلستان کا مقالہ مندرجہ سائنس پروگرس بابت جنوری ۱۹۲۵ء

[۳] رسالہ سائنس پروگرس جنوری ۱۹۲۵ء

ہندوستان مین علم حدیث

بطریق تالیف علوم حدیث

از

مولوی ابویحییٰ امام خان صاحب نوشہروی

"معارف" نے عرفانِ علوم کے جو ظروف تیار کئے، من جملہ اُن کے ہندوستان مین علمِ حدیث بھی ہے جس پر اب تک جو کچھ لکھا گیا، بطریقِ تدریس و تحدیث لکھا گیا، اور وہ بھی اس سے بھی بہت کم جتنا کہ لکھا جا سکتا تھا، مگر دوسرا رُخ بصورتِ تالیفِ علومِ حدیث ابھی تک حجابات مین ہے،

مضمون ہٰذا مشارق الانوار النبویہ (امام حسن صغانی اللاہوری ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء) کی نورانی شعاعون کی قدرے نورپاشی ہے، جسے راقم الحروف نے اپنی زیرِ تالیف (ہندوستان مین علومِ حدیث کی تالیفات) مین مبیض کیا ہے، اور معارف مین بربنائے اظہارِ تشکر (قبل از اشاعت) پیش ہے کہ یہ عنوان اسی کے صدقے سے ملا[۱]،

شراب نوش کن و جام از بصوفی دہ!
کہ بادشاہ زکرم جرم صوفیان بخشید!

امام حسن صغانی (۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء) کا ظہور و لادت ۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء (۱۰ ماہ صفر) مین عروس البلاد

---

[۱] بصورت مضمون جناب ڈاکٹر زبید احمد صاحب (پی ایچ ڈی)، الہ آباد یونیورسٹی شائع شدہ معارف، دسمبر ۱۹۴۲ء)

پنجاب لاہور مین ہوا، تکمیل علوم کی پوری داستان کہین منضبط نہین، مگر یہ ذکر حسن ممدوح کے ہر ایک سراپا مین مرقوم ہے، کہ وہ صرف حدیث ہی مین بالغ نظر نہ تھے، بلکہ عالم اسلام مین انکی روشناسی امام لغت سے بھی ہوئی ہے:

رنگینیوں کی جان ہے وہ پاے نازنین
میری نگاہ شوق جہان سر کے بل گئی

اس فن مین امام (حسن) کی متعدد تالیفات بھی ہین، کہ من جملہ اُن کے **التکملہ** (شاید) فن لغت مین حد تکمیل تک ہو، جو دس بارہ سال ہوے علی گڑھ آتے آتے مراکش پہنچ گئی[۱]!

حُرّ مَنۡ حَلّت بِنَفیدِ وَجاوزت
اَهۡلَ الحِجازِ فاینَ مِنکَ مَرامھا

درالسحابہ فی وفیات الصحابہ | سیر و رجال کی وفیات پر تھے، اور وہ بھی منطوقین (آیۂ پاک) :- وَالسّابِقُونَ الاَوَّلُونَ مِنَ المُہاجِرِینَ وَالاَنصارِ وَالَّذِینَ اتَّبَعُوہُم بِاِحسانٍ رَضِیَ اللہُ عَنہُم وَرَضُوا عَنہُ وَاَعَدَّ لَہُم جَنّاتٍ تَجرِی مِن تَحتِہَا الاَنہارُ خالِدِینَ فِیہا اَبَداً ذٰلِکَ ھُوَ الفَوزُ العَظِیمُ

توبہ) :- مگر اب جس کا صرف نشان منزل تذکرۃ النوادر طبع دکن مین رہ گیا ہے،

وفیات کا باب کس قدر ضروری اور کتنا دلچسپ ہے کہ مدار روایت ہی تعیین وفات راوی پر ہے، حتی کہ اگر رواۃ حدیث مین سے کسی راوی کے سنہ وفات کی اطلاع نہ ہو سکی، تو اس کا تذکرہ درخور اعتنا

---

[۱] یہ اُس زمانہ کا ماجرا ہے، جب مولانا میمن عبد العزیز صاحب راجکوٹی پروفیسر مسلم یونیورسٹی اپنی مشہور کتاب طبع کرانے کے لئے خود مصر تشریف لے گئے، شاید ممدوح ہی کبھی یہ واقعہ ضبط فرمائین، کہ کس طرح اُن کو التکملہ کی اطلاع ملی، مگر جب خریدنے کے لئے گئے تو ذرا ہی پہلے مراکش کے ایک ادب جوہری اُسے حاصل کر چکے تھے،

رہا اور روایات میں تو ایسے راوی سے حدیث بیان کرنا ہی زیر بحث نہ آسکا یہ میں فن حدیث کی لطافتیں
ان سے خالی الذہن جا بذۂ ہند نے نفس حدیث ہی کی دینی حیثیت سے انکار کر دیا :

پیدا ہوئے ہیں جان کے خواہاں نئے نئے

صاحب مقدمۂ تحفۃ الاحوذی نے صحابہ کرام کے تذکرہ میں جن حضرات نے کتابیں لکھی ہیں ان کے
اسمائے گرامی کا یہ ذکر فرمایا ہے،

۱۔ امام بخاری (صاحب الجامع الصحیح) م ۲۵۶ھ / ۸۶۹ء،

۲۔ ابن الخیاط[1] (خلیفہ بن خیاط الحافظ الامام ابو عمرو محدث نساب اخبار علامہ صنف التاریخ
(تذکرۂ ذہبی ج ۲ ص ۲۱)، م ۲۴۰ھ / ۸۵۴ء

۳۔ ابن سعد (محمد بن سعد صاحب طبقات ابن سعد) م ۲۳۰ھ / ۸۴۴ء،

۴۔ ابو یوسف یعقوب بن سفیان الفارسی الفسوی م ۲۷۷ھ / ۸۹۰ء

۵۔ ابو بکر احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب، م ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء

۶۔ البغوی عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز البغدادی مصنف معجم الصحابہ (تذکرہ ج ۲ / ۲۴۳)
م ۳۱۰ھ / ۹۲۲ء، ابو داؤد صاحب سنن ابی داؤد، م ۲۷۵ھ / ۸۸۸ء،

۷۔ ابن السکن الحافظ ابو علی سعید بن عثمان بن سعید السکن البغدادی،
(تذکرہ ج ۳، ۱۴۰) م ۳۵۳ھ / ۹۶۴ء

۸۔ ابن شاہین ابو بکر عمر بن احمد (و فی التذکرہ ابو حفص م ۳۸۵ھ / ۹۵۵

۹۔ طبرانی سلیمان بن احمد، م ۳۶۰ھ / ۹۷۰ء

۱۰۔ ابن حبان ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ (صاحب صحیح ابن حبان) ۳۵۴ھ / ۹۶۵ء

---

[1] امام بخاری کے استاد روایت ہیں (تذکرہ)

۱۱- ابن مندہ ابو عبداللہ محمد بن اسحاق الاصبہانی، م ۳۹۵ھ / ۱۰۰۴ء

۱۲- المدینی ابو موسیٰ محمد بن عمر المدینی الاصبہانی، م ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء

۱۳- ابو نعیم اصبہانی (احمد بن عبداللہ) م ۵۸۶ھ / ۱۱۹۰ء

۱۴- الباوری (!) ابو منصور،

۱۵- العسکری الحافظ الامام ابو الحسن علی بن سید عبداللہ نزیل الرے (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۸۳) م ۳۰۵ھ / ۹۱۷ء

۱۶- ابن فتحون ....

۱۷- حسن صغانی اللاہوری ..... م ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء

ان مصنفین کی کتابوں میں سے کتنی ہیں، جن کا وجود دنیا میں اس وقت ہے، البتہ صحابۂ کرام کے حالات پر یہ تین کتابیں عام طور پر متداول ہیں

استیعاب لابن عبدالبر ۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء

اسد الغابہ لابن اثیر جزری ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء

اصابہ لابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء

امام حسن صغانی (۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء) صاحب اسد الغابہ (جزری ۶۳۰ھ / ۱۲۳۲ء) کے ہم عصر اور امام ابن حجر عسقلانی، جامع اصابہ فی تمیز الصحابہ (م ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء) کے مقدم ہیں، مگر استیعاب وفیات صحابہ سے قاصر ہے اسد الغابہ میں یہ التزام نہیں، اور صاحب اصابہ بھی اس میں غیر مصیب ہیں، یہ فخر صرف امام حسن لاہوری کو نصیب ہوا، مگر افسوس کہ ہماری سہل انگاری نے اسے تلف کر دیا،

ازان زمان کہ زدستم برفت یار عزیز

کنار دیدۂ من ہمچو رود جیحون ست

اب ہندوستان میں امام حسن کی صرف ۲ کتابیں رہ گئی ہیں :-

۱۔ مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ،

۲۔ موضوعات حسن صغانی،

اور اس مضمون میں صرف اول الذکر مشارق الانوار کی اُن ضیا پاش شعاعوں کا انعکاس مقصود ہے، کہ براہ راست مشکوٰۃ نبوت (صلوٰۃ اللہ علیہ) سے مقتبس ہیں، یہ شعاعیں ہی ہیں، مگر کس قدر نور ریز! اللہ! اللہ! پورے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا، بلکہ

نسبتِ رویت اگر باماہ و پروین کردہ اند
صورتِ نادیدہ تشبیہ تخمیں کردہ اند

تذکرہ شیخ (امام حسن) | سبحۃ المرجان میں ہے:۔

" مولانا حسن صغانی لاہوری رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے فرشتہ خصال بشر تھے، کہ گویا ان کی طینت عناصر فلکی سے ممزوج ہے، عالم تھے ربانی، اور صاحب کمالات تھے نورانی ان کا مولد لاہور ہے، یہاں ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ صاغان سے تشریف لائے، اور صاغان ماوراء النہر میں ایک بستی ہے، بروایت صاحب مبارق الازہار مولانا محمود بن سلیمان بغوی اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار[1] میں فرماتے ہیں، کہ امام حسن بن محمد بن حسن بن حیدر صغانی اخلاف عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہیں،

فقہ و حدیث کے علاوہ بھی ان کی کئی علوم میں نظر تھی، اصلاً لاہوری تھے، جو ہندوستان کا ایک شہر ہے، جہاں ۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء (۱۵ ماہ صفر) میں پیدا ہوئے، تمام علوم

[1] الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مولانا عبدالحی لکھنوی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء اسی کتاب کی تلخیص و تہذیب ہے (الفوائد ص ۳)

اپنے والد سے پڑھے، (داخذ ہ عن والدہ وحصل ووصل وکمل وثم رحل الی بغداد) تکمیل کے بعد ۶۲۲ھ میں عراق کا قصد فرمایا اور بغداد میں اقامت فرمائی
انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، ازان جملہ حسب ذیل ہیں،

کتاب الشوارد فی اللغۃ وشرح القلادۃ السمطیہ فی توشیح الدریۃ وکتاب الانتقال وکتاب العروض ومشارق الانوار، والایضاح[51] فی الحدیث مصباح الدجیٰ والشمس المنیرۃ وشرح البخاری ودر السحابۃ وشرحہا، وکتاب الفرائض کتاب العباب فی اللغۃ،

موخر الذکر کتاب العباب میں قلم تیسرے حرف تک پہنچا تھا، کہ پیک اجل آپہنچا، یہ بغداد کا واقعہ ہے، اور اپنی میت کے لئے مکہ معظمہ میں دفن کی وصیت فرمائی، اور اس نقل مکانی میں حصہ لینے والوں میں سے ہر ایک کے لئے پچاس دینار معاوضہ کی وصیت لکھی، کچھ مدت اپنے دولت کدہ (بغداد) ہی میں مدفون رہے، آخر اسی سال میں تکمیل وصیت ہوگئی،

اپنی زندگی میں برسوں مکہ معظمہ مقیم رہے، وہاں سے عراق اور یہاں سے سفارت پر ہندوستان تشریف لائے، (از ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء تا ۶۲۴ھ / ۱۲۲۶ء) ۶۳۷ھ / ۱۲۳۹ء میں بغداد پہونچے، اور اس کے بعد پھر کہیں نہ گئے،

"حدیث انھوں نے مکہ معظمہ میں، عدن میں اور ہند میں بھی پڑھی،"[52]

مگر نہیں کہا جا سکتا کہ امام حسن کے عہد میں ہندوستان میں حدیث کا درس عام یا خاص

---

[51] مصباح الدجی نسخۃ منہ فی الخزانۃ المصریۃ بخط عبد اللہ الموقت بالقلعۃ فرغ من کتابتہا، سنۃ ۱۱۰۴ھ / ۱۶۹۲ء اور رقہا ۲۱۱، نسخۃ اخری فی مکتبۃ شیخ الاسلام، نسخۃ اخری فی خزانۃ برلن تحت رقم ۱۱۰۵ (تذکرۃ النوادر ۵۲)

[52] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص (۲۸، ۲۹)

کہاں تھا، اور یہ محدث کون بزرگ تھے،

امام حسن کے تذکرہ کے بیان میں اولیت کا تاج امام ذہبی صاحب تذکرۃ الحفاظ (م ۷۴۸ھ/۱۳۴۸ء) کے سر پر ہے، فرماتے ہیں :-

"امام حسن صنعانی ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں شہر لاہور میں پیدا ہوئے، غزنہ میں سن رشد کو پہنچے، ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں بغداد آئے، اور خلیفہ کی طرف سے سفارت کے لئے ہندوستان بھیجے گئے، جہاں کچھ مدت قیام پذیر رہے،

اب حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اور یمن ہوتے ہوئے بغداد تشریف لائے

یہاں سے پھر ہندوستان اور بالآخر بغداد آگئے"[۵۱]

ہندوستانی سیر نگاروں میں سے آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء) نے امام کا ذکر خیر سبحۃ المرجان میں جیسا کہ اوپر گذر گیا ہے، ان کے علاوہ اخبار الاخیار میں شاہ عبد الحق دہلوی (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نے ارباب خیر و صلاح میں صغانی کا سراپا لکھا ہے،

انکے مولفات میں نواب صدیق الحسن خان نے ان کتابوں کا اضافہ فرمایا ہے، عقطۃ العجلان زبدۃ المناسک، درجات العلم والعلماء، التکملہ، مجمع البحرین (حامل جمع لغت عرب ....) کشف الحجاب عن احادیث الشہاب[۵۲] جیسا کہ فرماتے ہیں : وراے این او را تصانیف دیگر یعنی کشف الحجاب عن احادیث الشہاب

کشف الحجاب تہذیب و تبویب ہے، شہاب الاخبار لابن سلامہ[۵۳] (م ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء) کی جس میں ابن سلامہ نے احادیث کے ایک ہزار جملے ایسے جمع کئے ہیں جن میں سے ہر ایک جملہ کسی غیر منضبط (غیر مذکور) فقرہ (حدیث) سے مربوط تھا،

---

[۵۱] مقدمہ تحفۃ الاحوذی (۱۳۶) ترجمہ [۵۲] اتحاف النبلاء، للنواب (۱۰۲) [۵۳] قاضی ابو عبداللہ محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون القضاعی الشافعی (م ۴۵۴ھ/۱۰۶۲ء) اتحاف النبلاء (۱۰۲)

شہاب الاخبار کی تلخیص شیخ نجم الدین محمد ابن احمد الغیطی الاسکندری (سنہ ۹۸۴ھ) نے کی،

" واصلاحش امام حسن محمد صغانی کردہ و کشف الحجاب عن احادیث الشہاب نام نہادہ وبرائے صحیح وضعیف علامتے مقرر کردہ مثل المشارق[۱]"

اسی کشف الحجاب کا دوسرا نام تخریج[۲] الاحادیث للقضاعی ہے۔ ان سابقین (بالخیرات) کے مساعی کس قدر حیرت انگیز ہیں، ایک ہی کتاب کے کیسے کیسے ظروف تیار فرماتے ہیں، ایک صاحب (ابن سلامہ) نے کسی حدیث کا صرف ایک جملہ لے لیا، وہ بھی شروع کا نہیں، بلکہ پہلے نقرہ سے بعد کا کوئی ٹکڑا، اور اس طرح ایک ہزار جملے چن دئے،

دوسرے صاحب (قضاعی) کی نوبت آئی، اس ایک ایک جملہ کا ماقبل فقرہ تلاش کرکے ٹکڑا کو پہلے سے مربوط کردیا، اور یہ ہندوستانی اہل الحدیث امام حسن ہیں، انھوں نے دونوں (ابن سلامہ اور قضاعی) کی فروگذاشتوں پر تنبیہ فرمایا، پھر ان احادیث کی تخریج جیسا اہم درا ہم راز واشگاف کیا، "دردو سے موضوعات کتاب الشہاب والنجم جمع نمودہ[۳]" اور اس تخریج کا نام الدر الملتقط فی تبیین الغلط و اللغط ثبت فرمایا،

(باقی)

---

[۱] اتحاف النبلاء (۱۰۲) [۲] ایضاً (صنا) [۳] فہرس الکتب العربیہ فی الدار الخاصۃ سنہ ۱۹۲۱ء عیسوی ص ۹۲ رقم ۱۰۰۵ [۴] اتحاف النبلاء، ص۸، اور النجم بھی امام قضاعی شافعی کی کتاب ہے،

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے سنہ ۱۹۲۶ء میں مدراس میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے اور مسلمانوں نے اُن کو بے حد پسند کیا،

چوتھا اڈیشن قیمت عہ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ "منیجر"

تلخیص و تبصرہ

اندلس کا اسلامی تمدن

دار المصنفین میں تاریخ اسلام کے سلسلہ کی جو تدوین جاری ہے، اس میں اسپین کی حکومتوں کی تاریخ کی ترتیب راقم سطور کے سپرد ہے، اس سلسلہ میں ہمارے لائق دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور نے اپنے مکتوب میں کیمبرج میڈیول ہسٹری کے ایک مقالہ کا تذکرہ کیا، اتفاق سے اس کی جلدیں ہمارے کتب خانہ میں موجود نہ تھیں، موصوف نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے اس کا نسخہ ارسال فرمایا، اور وہ مقالہ دیکھنے میں آیا، کتاب کو جلد ہی واپس کرنا تھا، اس لیے اس مقالہ کی ضروری تلخیص کرلی، یہ مقالہ اس کتاب کی تیسری جلد میں صفحہ ۴۰۹ سے ۴۴۲ میں آیا ہے، مقالہ نگار ڈاکٹر رفیل التمیرا (Rafeel Altamira) میڈرڈ یونیورسٹی کے پروفیسر، اور پبلک انسٹرکشن کے ڈائرکٹر جنرل تھے، انھوں نے اس کو عربی اور یورپی زبانوں کے بہت سے قابل قدر ماخذ سے مرتب کیا ہے، اور پورا مقالہ مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر جامع ہے، خصوصاً اس کے آخری حصہ میں "اندلس کے اسلامی تمدن" پر اختصار سے جو گفتگو کی گئی ہے، اس میں اس موضوع کے خاصے معلومات سمٹ گئے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ تلخیص کے طور پر معارف کے ناظرین کے مطالعہ کے لیے اس کو پیش کیا جائے، مقالہ کا یہ حصہ کتاب کے صفحہ ۴۲۹ سے ۴۴۲ میں آیا ہے:-

اسلامی قبیلے اور فرقے | اسپین کے اسلامی تمدن کی ترقی میں یہاں کے اسلامی قبیلوں اور جماعتوں کی گوناگوں

تقسیموں سے غیر معمولی رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ عبدالرحمٰن الناصر کے دور حکومت کی یکجائی اور قبائلی اتحاد کو نظر انداز کر کے اسپین کے پورے اسلامی دور حکومت میں اسلامی فرقوں اور قبیلوں کی تقسیم قائم رہی، عربوں نے ایرانیوں، بربروں، اور دوسری قوموں کو فاتح ملکیوں کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، پھر خود عربوں میں بھی یمنی، شامی اور دوسرے گروہوں کی باہمی قبائلی تقسیم تھی، پھر ہر قبیلہ میں اس کے سرداروں عام لوگوں اور اس قبیلہ سے متعلق غلاموں کی سہ گونہ تقسیم قائم تھی، عبدالرحمٰن الناصر کے دور حکومت میں اشراف عرب کی تقسیم کو مٹا دیا گیا تھا، ان کی جگہ متوسط طبقہ کے لوگوں نے لے لی تھی اور تجارت، صنعت اور حرفت وغیرہ کے ذرائع سے غیر معمولی دولتوں کے مالک بن گئے تھے، اس کے ساتھ فوج کے مشترکہ سواروں کی قیادت کا سلسلہ جاری ہوا، مزدوروں کی جماعت متوسط طبقہ کے ماتحت آگئی، اور اس میں مالی ابتری کا احساس پیدا ہو گیا، اور زمینوں اور غلاموں کی کثرت سے اور لوگوں میں آزاد حکومت قائم کرنے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی، عربوں اور بربروں نے اس طرح شہروں کو آباد کرنے اور ترقی دینے میں بیش از بیش حصہ لیا،

غلاموں کی جماعتیں گاؤں اور قصبوں میں تقسیم کر دی گئی تھیں، ان کی حیثیت وزیگا تھ کے دیہاتوں سے زیادہ بہتر تھی، نیز ان میں بہت سے ایسے تھے جو خود ذاتی غلام کی حیثیت رکھتے تھے، ان میں سے بہت سے غلام فوجی خدمت میں داخل ہو گئے، اور رفتہ رفتہ وہ بڑے اہم اہم عہدوں کے مالک ہوتے گئے، پھر با اقتدار غلاموں کے متبعین کی جماعتیں بنتی گئیں، اور وہ بڑی بڑی دولتوں کے مالک بن گئے، اور غیر معمولی سیاسی اہمیت حاصل کر لی، یہ غلام صرف سپاہی نہ تھے، بلکہ خلفاء کے غلام فوجی عہدوں کے علاوہ کشوری عہدوں پر بھی بڑی تعداد میں مقرر ہونے لگے، خصوصاً المنصور عامری کی وفات کے بعد ان کے اثرات نہایت فیصلہ کن ثابت ہونے لگے،

موالی (آزاد کردہ غلام) اپنی حیثیت کے اعتبار سے درمیانی شخصیت رکھتے تھے، ان میں

بیشتر وزیگاتھ کے اخلاق باختہ دہقانی تھے، جنھوں نے اسلام قبول کرکے آزادی حاصل کرلی تھی، اور جیسا کہ ہم نے دیکھا وہ قدیم العہد مسلمانوں کی طرف سے مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے[1]، اور اس کی وجہ سے روز بروز بغاوتیں رونما ہوتی رہتی تھیں، عبد الرحمن ثانی کے زمانہ سے ان کی تعداد حکومت کے نظم و نسق میں بڑھتی گئی، اور ان کے تمدنی اثرات طاری ہوتے گئے،

یہودی | یہودیوں کی قانونی حیثیت عربوں کے زیر حکومت ترقی کرتی گئی، خصوصاً قرطبہ کی تجارتی و صنعتی ترقیوں میں ان کا اہم حصہ تھا، خلفاء کے زمانہ میں انھوں نے زیادہ ترقی کی، مشہور یہودی حصدی جو عبد الرحمن الناصر کا خزانچی اور وزیر تھا، اور جس نے بعض اہم کتابوں کے ترجمے بھی کئے تھے، اپنے سیاسی تدبر اور دور اندیشی میں مشہور تھا، اس کے بہت سے ہم مذہب اس کی سرپرستی میں مشرق سے اندلس میں آئے اور انھوں نے تالمودی اسکول قائم کئے، جو عراق کے اسکول کا نقش ثانی تھا، قرطبہ کے یہود نے عربوں کے لباس، زبان اور معاشرت کو قبول کرلیا تھا، اور خلفاء کی طرف سے ان کی ہر موقع پر پشت پناہی کی جاتی تھی،

اسپینی عیسائی | معارب یعنی محکوم اسپینی عیسائیوں نے ابھی تک اپنی حکومت اور اپنے نظام کو برقرار رکھا تھا، ان کے شہروں میں انہی میں سے گورنر مقرر کیے جاتے تھے، جن کو خلیفہ منتخب کرتا تھا، انھوں نے اسلامی حکومت کے شباب کے زمانہ میں بھی اپنا سفیر یا قانونی وکیل رکھا، جو خلیفہ کے حضور میں ان کے حقوق و واجبات کی وکالت کرتا تھا، اکثر انہی میں کا محصل (کلکٹر) اور قاضی (جج) بھی ہوتا تھا، یہ لوگ اسلامی قوانین کی پابندی کرتے اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھکر علیحدہ ضلعوں میں رہتے تھے، لیکن معاشرتی حیثیت سے ان میں اور اسلامی آبادیوں میں کوئی زیادہ مغایرت نہ تھی، اگرچہ یہ لوگ وزیگاتھ سے ملتے جلتے تھے، اس کے ساتھ اسلامی سیادت و حکمرانی کو بڑا اداری

---

[1] یہ پورا بیان مقالہ نگار کی عصبیت پر مبنی ہے،

سے انگیز کرتے تھے، یہی ان وزیگا تھوں اور اسپین کے محکوم عیسائیوں میں ایک فرق قائم تھا،

انتظام حکومت اور عدالت | اسپین ابتداءً خلافت دمشق کا ایک صوبہ تھا، جس کا ایک امیر ہوتا تھا، عبد الرحمن اول نے اس نظام کو اپنی آزاد سلطنت قائم کرکے توڑا، اگرچہ ۹۲۹ء تک خلیفہ کا لقب اسپین میں اختیار نہیں کیا گیا، لیکن عبد الرحمن ثالث نے اس رسم کو بھی پورا کر دیا، خلیفہ سب سے بلند سیاسی و روحانی آمر و حاکم سمجھا جاتا تھا، وہ بسا اوقات اشراف کے انتخاب سے منتخب ہوتا تھا، لیکن عملی طور پر یہ موروثی عہدہ تھا، خلیفہ کے بعد "حاجب" یا وزیر اعظم ہوتا تھا، اور اس کے متعدد وزراء ہوا کرتے تھے، جو مختلف شعبوں کے نظام کے ذمہ دار تھے، جیسے خزانہ، محکمہ جنگ وغیرہ، ان کا تعلق حاجب کے واسطہ سے خلیفہ سے ہوتا تھا، پھر "کاتب" یا سکریٹری ہوتے تھے، انتظامی دفاتر "دیوان" میں جمع ہوتے تھے، اور اسی میں مختلف دوسرے دفاتر بھی ہوا کرتے تھے، صوبے جو تعداد میں چھ تھے ماتحت تھے، یہ قرطبہ کے علاوہ تھے، یہ صوبے سول اور ملٹری گورنر کے ماتحت ہوتے تھے، جس کو "والی" کہا جاتا تھا، چند اہم شہروں کے والی علیٰحدہ بھی ہوتے تھے، اور صوبہ سرحد میں ایک فوجی سپہ سالار عہدہ دار ہوتا تھا،

خلیفہ، محکمۂ عدالت کو براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا، لیکن قوانین کے مطابق اس کی یہ ذمہ داریاں "قاضی" انجام دیتے تھے، اور چھوٹے ضلعوں میں ان کو حاکم کہا جاتا تھا، ان میں سب سے اونچا عہدہ "قاضی القضاۃ" (چیف جسٹس) کا تھا، جو قرطبہ میں رہتا تھا، ایک خاص جج "صاحب الشرطہ" تھا، یا "صاحب المدینہ" کہا جاتا تھا، یہ فوجداری اور پولیس کے مقدمات کی سماعت کرتا تھا، قرطبہ میں ایک اسپشل جج "صاحب المظالم" تھا جو سرکاری عہدہ داروں کے خلاف مقدمات سنتا تھا، عموماً سزائیں جرمانے، قید اور موت کی دی جاتی تھیں، عام ٹیکسوں کے علاوہ ذاتی اور حقیقی جائیدادوں سے "خمس" کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا،

فوج | قبائل ملٹری نظام کے ساتھ منسلک تھے، ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا، اس کے ماتحت ہوتے تھے،

سپاہی تنخواہیں، مہم کے خاتمہ پر پانچ سے دس اشرفیوں تک پاتے تھے، "بلدی" جو موسیٰ (فاتح اندلس) کے ساتھ آئے ہوئے عرب تھے، وہ بغیر کسی اہم موقع کے فوجی خدمت کے لیے نہیں طلب کیے جاتے تھے، یہ سپہ سالار اعظم اور قائد کہے جاتے تھے، ان میں کے عوام اکثر سوار ہوتے تھے، اپنی فوج تلواریں، تیر کمان اور نیزے استعمال کرتی تھی، اسی طرح وہ مدافعتی اسلحہ تھے، جو اس زمانہ میں رائج تھے، ان کے اسلحہ چکیلے اور روشن اور اسی طرح کے تھے جیسے بیزنطاین کے،

فوج کے ہاتھوں ملکی سیاست میں انقلابات بھی برپا ہوتے تھے، منظم عرب قبائل کے علاوہ ان میں خارجی عناصر بھی تھے، ان میں اولاً غلاموں کو درجہ حاصل تھا، پھر وہ کرایہ کے سپاہی تھے جو لیوک نوار اور قسطیلہ سے حاصل ہوتے تھے،

بحری بیڑے کی ترقی عبد الرحمٰن ثالث کے زمانہ میں ہوئی، المریہ اہم بندرگاہ تھا، بحر روم میں اس کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، ان کے حملے سپہ سالار کے ماتحت ہوتے تھے، جو "قائد" اور "امیر البحر" کہے جاتے تھے، یہ حملے گلیشیا اسٹریاس اور کبھی افریقہ پر ہوتے تھے، اس زمانہ میں بحر روم پر عربوں کو قیادت حاصل تھی، دسویں صدی کے بعد عربوں کی بحری طاقت کو زوال آیا، جب کہ فاطمیوں کا اقتدار زائل ہو گیا،

مذہب | مسلمانوں کے مذہب کی بنیاد خدا کی توحید اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کے اقرار اور خلیفہ کے اعلیٰ روحانی پیشوا ہونے پر تھی،[۱] لیکن عربوں اور بربروں میں مختلف آزاد خیال جماعتیں بھی تھیں، مقلد جماعتوں (یعنی فقہی مذاہب) میں مالکیوں کو اقتدار حاصل تھا، نیز ان میں کچھ زہاد تھے جو "الزاہد" کہے جاتے تھے، کچھ لوگ فلسفہ اور دوسرے علوم کے مطالعہ میں مصروف تھے،

مسلمانوں کے قانون کی بنیاد قرآن مجید تھا، اور وہ حدیثیں تھیں، جن میں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول و عمل بیان کیا گیا ہے، یہ حدیثیں "سنت" کہی جاتی تھیں، ان کا خاص مجموعہ جو اسپین میں پہنچا وہ

---

[۱] خلیفہ کی اعلیٰ روحانی پیشوائی کے اقرار کو جزو دین بنانا مقالہ نگار کی نادانی ہے،

موطا تھا، جو مالک بن انسؓ کا ترتیب دیا ہوا تھا، اور جس میں ایک ہزار سات سو حدیثیں درج ہیں،

اس زمانہ تک کوئی خاص مجموعہ قانون تیار نہیں ہوا تھا، لیکن فقہ کی خاص تالیفات مرتب تھیں، فقہ کے ان مجموعوں میں مذہبی امور عبادت (نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نکاح اور طلاق وغیرہ کے قوانین منضبط تھے، مالکیوں کے زیر اثر یہ مجموعے اسپین میں داخل ہو چکے تھے،

دولت اور صنعت وحرفت | خلفاء کے زمانہ میں مسلمانان اندلس، یورپ کے ممالک میں غیر معمولی دولتمند اور آباد شہروں والے ہو گئے تھے، قرطبہ میں مکانوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی، اور ان میں زیادہ اضافہ عبدالرحمٰن ثالث کے دور حکومت میں ہوا، اسی زمانہ میں قصر الزہرا تعمیر ہوا، اور المنصور نے قصر الزاہرہ بنوایا، دوسری تعجب خیز عمارت مسجد جامع تھی، جس کی تعمیر کی ابتدا عبدالرحمٰن اول کے زمانہ میں ہوئی تھی، قرطبہ اس زمانہ میں دنیا کے تمام حصوں کے سیاحوں اور مسافروں کے لیے نقطۂ اتصال تھا،

صنعت وحرفت اور تجارت کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل تھا، زراعت میں بھی چھوٹے چھوٹے قطعہ آراضی کے مالکوں کے ہاتھوں سے نمایاں ترقی ہوئی، اسپین کے باشندے وزیگاتھ کی بہ نسبت عربوں کے دور میں معاشرتی حیثیت سے زیادہ بلند تھے، عربوں نے اپنے زرعی تجربات سے فائدہ اٹھایا، اور ایشیا کے مختلف زرعی پودوں، اور خصوصیتوں کو یورپ کے ان شہروں میں رائج کیا، کاشتکاروں میں زیادہ حصہ محکوم اسپینی عیسائیوں کا تھا، عربوں نے جلد ان کو اپنے تجربے سکھا دیئے، مسلمانوں نے انار، گنے اور دوسری مشرقی پیداوار کو یہاں رواج دیا، انھوں نے نہروں کے کھودنے اور ان کو دور تک لے جانے کا طریقہ جاری کیا، یا اس میں ترقی دی، جن سے باغوں اور کھیتوں کی آبپاشی ہوتی تھی، خصوصاً صوبہ مرسیہ اور غرناطہ وغیرہ میں نہروں کے جال کو پھیلایا، مویشیوں کو نسلی تربیت دی، یہ قابل ذکر بات ہے کہ ان دوروں میں عربی سنہ وتاریخ کے بجائے رومی سنہ رائج تھا،

سونے چاندی اور دوسرے دھاتوں کی کانیں تھیں، جن میں کان کنی کی گئی، جیان (Jaen)

الغرب (پرتگال) (Algarve) باجہ (Beja) اور مالقہ (Malaga)
میں کھودی جاتی تھیں ان میں سے موخر الذکر دو مقاموں کے لعل اور یاقوت شہرت رکھتے تھے، سوتی اور
ریشمی کپڑوں کی بنائی قرطبہ، مالقہ اور المریہ میں جاری تھی خاص قرطبہ میں ۱۳ ہزار بننے والے موجود تھے جطرنہ
(Paterna) میں کوزہ گری اور کمہاری کے فن کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی، اور المریہ میں
شیشہ گری کی صنعت جاری تھی، اسی طرح کانسے اور لوہے کے مختلف ظروف بنائے جاتے تھے،
اسی طرح شاطبہ میں عربوں نے فن کاغذ سازی کو سب سے پہلی مرتبہ روشناس کیا، جارحانہ و مدافعانہ حملوں
کے لئے ہتھیار اور اسلحہ قرطبہ اور دوسرے مقاموں میں بنائے جاتے تھے، طلیطلہ تلواروں اور ذرع کے
مشہور تھا قرطبہ چمڑے کی ہر قسم کی صنعت کا مرکز تھا، اور یہیں سے جنت سازی کے طریقے اخذ کیے گئے،
مقری کے بیان کے مطابق قرطبہ کے ابن فرناس نے پارہ چڑھا کر آئینہ سازی کا طریقہ دریافت کیا، اور
مختلف قسم کے وقت پیما آلات بنائے، نیز ایک اڑنے والی مشین تیار کی،

ان صنعتی ترقیوں سے تجارت کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی، تجارت عموماً سمندر کی راہ سے ہوتی
تھی، عبدالرحمن ثالث کے زمانہ میں بڑی اہم آمدنی درآمد و برآمد کے ٹیکس کے ذریعہ سے وصول ہوتی
تھی، اشبیلیہ جو اسپین کے عظیم ترین بندرگاہوں میں سے تھا، جو چیزیں باہر بھیجی جاتی تھیں، وہ روئی
تیل، زیتون، اور یہاں کی دوسری مقامی پیداواریں تھیں، یہاں کی آبادی گنجان تھی، جن میں زیادہ تر
نو مسلم تھے، اور تجارت میں پیش پیش رہتے تھے، عبداللہ کی امارت کے زمانہ میں جب کہ ابن الحجاج
یہاں اقتدار اعلیٰ کا مالک بن بیٹھا تھا، یہاں کی بندرگاہ جہازوں سے بھری رہتی تھی، جن میں مصری
کپڑے، غلام، اور گانے والی لڑکیاں یورپ اور ایشیا کے ہر حصہ سے آتی تھیں، جیان اور مالقہ
سے اہم ترین برآمد زعفران، انجیر، شراب، سنگ مرمر، اور شکر کی ہوتی تھی، اسپین کا برآمد مال افریقہ
مصر اور قسطنطیہ جاتا تھا، اور پھر وہاں سے وہ ہندوستان اور وسطی ایشیا میں بھیجا جاتا تھا، اسپین کے

تجارتی تعلقات صرف قسطنطنیہ سے قائم نہ تھے، بلکہ مشرقی ممالک کے اکثر مقامات سے بھی استوار تھے، خصوصاً مکہ، بغداد اور دمشق کو مال جاتا تھا، خلفا نے ڈاک کا نہ منقطع ہونے والا سلسلہ قائم کر رکھا تھا، حکومت اور تجارت کی ضروریات سے عربوں کو اپنے سکے بھی جاری کرنے پڑے، جو سمجھے جاتے ہیں کہ اولاً مشرقی طریق سے اخذ کیے گئے تھے، سونے کا سکہ دینار تھا، اور وہ لوگ نصف دینار اور تہائی دینار کے سکے بھی استعمال کرتے تھے، چاندی کا سکہ درہم تھا، اور تانبے کا فلس، جس کو لاطینی میں (Folles.) کہتے ہیں، بعض اوقات یہ سکے اپنے وزن اور قیمت میں گر بھی جاتے تھے،

زبان | حکومت کے ملازمین کے لیے سرکاری زبان معیاری عربی تھی، جو قرآن مجید کی زبان ہے، لیکن بول چال کی عام زبان ایسی تھی جس میں لاطینی یا رومانی زبانوں کے وہ الفاظ مل گئے تھے جو مفتوح قوموں کی بولیوں سے آئے تھے، یہ زبان مشرق میں مشکل سے سمجھی جا سکتی تھی، ربیرا (Ribera) نے ابن قزمان کی صوتی کتاب (Songbook of Ibn Quzman.) کے مطالعہ سے اس کا اندازہ لگایا ہے کہ قرطبہ کی عدالتوں میں بھی یہ دوغلی زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی، قاضی اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اور دوسرے عہدہ دار بھی، اس زبان کے رواج پانے کی خاص وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ عرب سپاہیوں نے اسپینی عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں، ابن بشکوال، ابن الابار وغیرہ ایسے مصنفین تھے جو عربی جاننے کی وجہ سے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، اس لیے اسپین کے مسلمانوں میں بھی یورپ کے دوسرے خطوں کے باشندوں کی طرح دو قسم کی زبانیں رائج تھیں، ایک تو معیاری ادبی زبان تھی، دوسری عام بول چال کی زبان، جیسے کہ اسپینی عیسائی لاطینی اور عربی استعمال کرتے تھے، اسی طرح شمالی اسپین (عیسائی ممالک) کے باشندے لاطینی اور رومانی دستاویزیں لکھتے تھے،

تعلیم ادبیات اور سائنس | تعلیم کا عمدہ انتظام جاری تھا، یہ ۱۰۲۵ء کا واقعہ ہے جبکہ بغداد

میں پہلی یونیورسٹی قائم کی گئی، حکم کے زمانۂ حکومت میں یہاں تعلیم سے دلچسپی لی گئی، خصوصاً اس لیے کہ فقہ مالکی مذہب کو فروغ دیا جائے، لوگ اس مذہب میں کمال حاصل کرنے کے لیے مشرق کا سفر کرتے تھے، حکم ثانی کے لیے مشرق کا سفر ممکن نہ تھا، اس لیے وہاں کے ماہرین تعلیم قرطبہ بلائے گئے، جنہوں نے یہاں لکچر دیئے، لیکن اس دلچسپی کو بھی سرکاری حیثیت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک تعلیم کی اشاعت کا خیال رکھا، اس نے اپنی وصیت کے مطابق اساتذہ کی تنخواہوں اور نادار طلبہ کے وظائف کے لیے اپنی دولت کا وافر حصہ نامزد کر دیا، لیکن اس کا تعلق صرف مذہبی تعلیمات سے تھا، اگرچہ ماہرین نے آزاد علوم سے بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی، اور ان علوم کو ترقی دیتے رہے، لیکن مالکی فقہ سے عام دلچسپی کی وجہ سے اس کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، اور اسی میں فن کا کمال حاصل کیا جاتا رہا،

ابتدائی تعلیم جیسے کہ تمام اسلامی ملکوں میں رائج تھی، یہاں بھی قرآن مجید سے شروع ہوتی تھی، کتابت کا فن بھی اسی زمانہ میں سیکھا جاتا تھا، پڑھنا اور لکھنا دونوں لازمی تھا، اگرچہ تعلیم حکومت کے اثر سے پورے طور پر آزاد تھی، لیکن اس قدر رائج تھی کہ اکثر اسپینی جانتے تھے کہ کس طرح لکھنا پڑھنا چاہیے، اعلیٰ تعلیم میں قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اور دوسرے مذہبی علوم کے بلند پایہ مضامین تھے، ان علوم کے اساتذہ عربی فلسفہ، صرف و نحو، ادبیات، تاریخ، نظم، اعلیٰ منثورات، حکایات، طب، فلسفہ یونان اور موسیقی وغیرہ کی تعلیم دینے میں ماہر ہوتے تھے،

شاعری کو نمایاں اہمیت اور بڑی مقبولیت حاصل تھی، اور زندگی اور معاشرہ پر اس کے خاص اثرات تھے، قبائل میں مختلف شعراء ہوتے تھے، ان میں سے ایک کو شاعر قبیلہ کی حیثیت حاصل ہوتی تھی، لڑائیوں میں ان کی شاعری سے نمایاں خدمات انجام پاتے تھے، ان کی شاعری رجز کا کام کرتی تھی، مجمع عوام میں بھی شاعری کو عام مقبولیت حاصل تھی، عہدہ داروں اور امراء کی مجلسوں اور خلفاء کے محلوں میں اس کو رسائی حاصل تھی، شعراء بڑی بڑی تنخواہیں پاتے تھے اور مختلف مواقع

پر گراں قدر انعامات حاصل کرتے تھے،

شاعری کے علاوہ اندلسی عربوں نے تاریخ اور جغرافیہ سے بھی اپنی دلچسپی قائم رکھی، لیکن مختصر افسانے اور ڈرامے ان کے لیے نامعلوم تھے، اگرچہ فلسفہ کی مخالفت کی گئی، تاہم اس کا مطالعہ پرائیویٹ طور پر جاری رہا، فلسفہ کے چند اسکول درا صل وہاں کی چند خفیہ مجلسیں تھیں، یہ یقینی طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کے اثر سے فلسفہ نے یورپ میں رواج پذیر ہونے کا راستہ پایا، اسپینی ماہرین جنھوں نے مشرق کی سیاحت کی انھوں نے فلسفہ کے مصنفین کی کتابیں اور یونانی فلسفہ کے ترجمہ کو پڑھا، اس طرح اندلسیوں نے فلسفہ کو یورپ میں روشناس کیا، خصوصاً تعلیمی فلسفہ یہیں سے پھیلا،

علم ہیئت اور فلکیات کو بھی فلسفہ کی طرح عوام کے لیے مضر سمجھا گیا، اور اس کے مطالعہ کو ممنوع قرار دیا گیا، بایں ہمہ مسلمانان اندلس میں ممتاز ماہرین فلکیات پیدا ہوئے، حساب اور فن طب کی تحصیل کی عام آزادی حاصل تھی، طب میں اندلس والوں نے مشرقی فن کو آگے بڑھایا، اور اس کی تحصیل میں کمال حاصل کیا، اس طرح عہد وسطیٰ کے فن طب میں انھیں نمایاں امتیاز حاصل تھا، نیچرل سائنس بھی یہاں کے ڈاکٹروں کا محبوب موضوع تھا، یہودیوں نے بھی عربوں کا اتباع کیا، اور ان میں طبعیات اور نیچرل سائنس کے ممتاز ماہرین پیدا ہوئے، اسپین کے ان کے علوم کے اثرات مغربی یورپ میں پہنچے، (باقی) "س"

ندوۃ المصنفین دہلی قرولباغ

ندوۃ المصنفین اور اس کے رسالہ برہان کا جو دفتر قرولباغ دہلی میں قائم تھا موجودہ ہنگامے میں تباہ ہو جانے کی وجہ سے وہاں سے اٹھ چکا ہے اور عارضی طور پر "برہان" کی اشاعت ملتوی کر دی گئی ہے۔ اب دہلی میں کسی مناسب جگہ دفتر قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کے لیے مکان کی تلاش جاری ہے اور حالات کے اور زیادہ بہتر ہونے کا انتظار ہے، اس کے بعد رسالہ کی اشاعت پھر شروع کر دی جائے گی، جو صاحب اس وقت تک ندوۃ المصنفین یا برہان اور مکتبہ برہان سے متعلق مکاتبت کریں وہ مندرجہ ذیل پتہ پر کریں۔

(مفتی) عتیق الرحمن عثمانی: ناظم ندوۃ المصنفین معرفت کتبخانہ علم و ادب، اردو بازار، جامع مسجد دہلی

استفسار و جواب

"اسلامی" یا "مسلمانوں" کا ملک

جناب عبدالعزیز صاحب کورپوری
گوہدپور ضلع سیالکوٹ (مغربی پنجاب)

"سیر افغانستان" زیر مطالعہ ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افغانستان کی سیر کو "تین ہم سفر" نہیں نکلے بلکہ ان کے عین عقب میں مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کے فرشتۂ رحمت کے ہمراہ ایک اور کالبد بھی محو پرواز ہے، جو اول تو سید سلیمان ندوی صاحب کے موٹر کی رہنمائی میں سفر کرتا ہے، اور خیبر کی بلندیوں پر سے ہوتا ہوا عمیق اور بھیانک کھڈوں کو پار کرتا ہوا کابل پہنچتا ہے اور پھر وہ اور بزرگوں کی جلوت و خلوت کی محفلوں میں بھی برابر شریک ہونے لگتا ہے، لطف یہ کہ وہ سب کو دیکھتا ہے لیکن اُسے کوئی نہیں دیکھتا،

جب جناب سید صاحب کی ملاقات شاہ نادر خاں مرحوم کے ساتھ ایک بند کمرہ میں ہوتی ہے تو گو "کمرہ میں جناب سید صاحب اور شاہ مغفور کے سوا کوئی دوسرا متنفس موجود نہیں ہوتا" تاہم ایک آنکھ ضرور ایسی ہے جو طرفین کے جملہ حرکات و سکنات کو کمال ہوشیاری کے ساتھ دیکھتی ہے اور ایک کان ضرور ایسا ہے جو طرفین کے اظہار مطالب کو پوری ہوش مندی کے ساتھ سنتا ہے،

جناب سرور خاں گویا کا جب ذکر آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے ایک سرخ و سپید وجیہ او قوی الجثہ افغان آجاتا ہے جسے میں نے ابھی مشکل سے دو مہینے ہوتے ہیں، یونیورسٹی

اورینٹل کالج (لاہور) کے ایک عام اجلاس میں تقریر کرتے سنا تھا، صاحب موصوف کے پروفیسر شستری صاحب جو یونیورسٹی میں جدید فارسی ادب کے استاد ہیں، کی صدارت میں حضرت داتا گنج لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر ایک پرچہ فارسی زبان میں پڑھا تھا، اور بعدازاں حاضرین کے اصرار پر اپنی ایک غزل بھی سنائی تھی نستعلیق، شکستہ خوش وغیرہ۔ وہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کابل کی انجمن ادبی کے صدر ہیں،

اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے کی کوشش کرتے کرتے ذہن کی تربیت کچھ اس ڈھب پر ہو گئی ہے کہ اب کسی کتاب یا رسالے میں کوئی بات اگر اس خاص طرز خیال سے ذرا بھی ہٹی ہوئی نظر آتی ہے تو دماغ میں الجھن پیدا ہوتی ہے، اور تشویش ہوتی ہے کہ یا تو یہ بات اصلیت سے دور ہے یا اپنا انداز فکر ناقص ہے،

اپنے ذہن میں "اسلامی حکومت" اور "مسلمانوں کی حکومت"، "اسلامی ملک"، اور "مسلمانوں کا ملک"۔ "جنگ" اور "جہاد" وغیرہ ایک چیز کے دو نام نہیں ہیں، بلکہ ان میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ادھر حالت یہ ہے کہ جب مجھ ایسے کم علم لوگ آپ ایسے بزرگوں (جن پر قوم کو بجا طور پر ناز ہونا چاہیے (ورہے) کی گراں قدر تصانیف میں مذکورہ الفاظ کو متبادل اور مترادف طور پر استعمال ہوتا دیکھتے ہیں تو ذہن خواہ مخواہ الجھتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں جب اکثر مقاموں پر افغانستان کو "آزاد اسلامی ملک" اور مسلمانوں کی جنگ" کو اسلامی "جہاد" لکھا دیکھتا ہوں تو طبیعت میں انقباض اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ کیا آپ میری اس الجھن کو دور فرمانے کی زحمت گوارا کریں گے؟"

معارف: "سیر افغانستان" میری مرتبہ کتاب نہیں، بلکہ میرے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو افغانستان کے سفر سے واپسی کے بعد معارف میں بطور سفرنامہ لکھے گئے اور بعد کو میرے ایک ندوی

عزیزیہ نے حیدرآباد دکن سے ایک کتاب کی صورت میں ان کو شائع کیا ہے،

بہرحال آپ نے اس کتاب کی دلچسپی اور دلپذیری کی جو مدح فرمائی ہے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، تاخیر جواب ناگزیر اسباب کا نتیجہ ہے،

کتاب کے مطالعہ کے دوران میں "آزاد اسلامی ملک" اور "اسلامی جہاد" اور "مسلمانوں کے ملک" اور "مسلمانوں کی جنگ" کے درمیان اختلاط والتباس سے بے شبہہ آپ کے احساس دینی اور اسلامی ذوق سیاسی کو صدمہ پہنچا ہوگا، اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تک دونوں تصورات میں وہ فرق نمایاں نہ تھا جو اب نظر آتا ہے، زمانہ کے اختلاف کے ساتھ ساتھ زبان کے استعمالوں محاوروں اور اصطلاحوں میں بھی غیر محسوس فرق ہوتا چلا جاتا ہے، اور بہت دنوں کے بعد وہ فرق محسوس ہوتا ہے، چنانچہ یہ فرق خود میری پہلی اور پچھلی تحریروں میں بھی نظر آسکتا ہے، خدا کرے کہ یہ فرق صرف زبان ہی کا ہو کر نہ رہ جائے بلکہ دلوں میں بھی فرق پیدا ہو جائے، کہ واقعاً ہماری زندگی اسلام کی زندگی اور ہماری حکومتیں اسلام کی حکومتیں بن جائیں،

لیکن اس باب میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ ہم کو ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی غلو اور مبالغہ سے بچنا چاہیے، اور تصوریت ہم پر اس قدر غالب نہ آجائے کہ ہم واقعیت کو نظر انداز کردیں، آخر مسلمانوں سے بسے ہوئے ملکوں کو خواہ وہ جیسے مسلمان بھی ہوں، اسلامی ملک کہیں تو اعتراض کیوں پیدا ہو، آج آئیڈیل اسلام اور ائیڈیل اسلامی مملکت کا وجود کہاں ہے، کیا کھلے ہوؤں کو آپ آم نہیں کہیں گے، اور اگر نہیں کہیں گے تو کیا آپ اس کو املی بتائینگے یا یہی کہیں گے کہ ہیں تو آم ہی مگر کھٹے

"س"

مولانا فضل حق خیرآبادی کے دو رسالے

مولوی سید نجم الحسن صاحب رضوی
محلہ میاں سرائے قصبہ خیرآباد ضلع سیتاپور

"معارف" اکتوبر ۱۹۴۸ء میں "باغی ہندوستان" پر جناب کی تنقید نظر سے گذری، خاتم الحکماء

مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کی تصانیف کے سلسلے میں "علمائے ہند" کی عبارت سے

آنجناب کو رسالہ تشکیک اور کلی طبعی کی یگانگت کا جو شبہ پیدا ہوگیا ہے وہ صحیح نہیں ہے، یہ دونوں

الگ الگ رسالے ہیں، کلی طبعی اور تشکیک دونوں معقولات کے اہم مسئلے ہیں جن کا اہم

مسائل میں شمار ہے، خطبہ ہدیہ سعیدیہ (جو ہدیہ کے ساتھ طبع ہوا ہے) میں علامہ کے شاگرد مولانا

عبداللہ بلگرامی نے تصانیف کا شمار حسب ذیل عبارت میں کرایا ہے؛

ورسالۃ فی تحقیق الکلی الطبعی ورسالۃ فارسیۃ فی تحقیق التشکیک

دونوں کی زبانیں بھی جدا ہیں رسالہ تحقیق کلی طبعی میرے پاس موجود ہے، ان میں سے کوئی بھی

رسالہ طبع نہیں ہوا ہے؛

معارف:۔ علامہ مرحوم کے ان رسالوں کے متعلق "تذکرہ علمائے ہند" اور "باغی ہندوستان" کے بیانوں میں جو تضاد تھا، اس تبصرہ میں اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا، راقم سطور کی نظر سے ان میں سے کوئی رسالہ نہیں گذرا تھا اس لیے لکھا گیا کہ "معلوم نہیں واقعہ کیا ہے"۔

آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اپنے اس مکتوب گرامی کے ذریعہ اس مسئلہ کو صاف کر دیا، اور دونوں غیر مطبوع رسالوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی، انشاء اللہ اس مکتوب کو شائع کر دیا جائے گا، تاکہ معارف کے ناظرین کے لیے بھی تصحیح کی خدمت انجام پا جائے۔

کلیات شبلی
(اردو)

مطبوعاتِ جدیدہ

فرہنگِ غالب مرتبہ جناب امتیاز علی خان صاحب عرشی، ناظم کتب خانہ رامپور،

حجم ۲۹۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، قیمت عہ، پتہ:- منیجر اشاعت خانہ، رام پور،

جناب امتیاز علی خان صاحب عرشی کی سنجیدہ تالیفات اہلِ علم کے حلقہ میں وقعت سے دیکھی جاتی ہیں، "فرہنگِ غالب" اُن کی نئی تالیف ہے، جو اسی دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، اور تلاش و تحقیق سے مرتب ہوئی ہے، جو اُن کی تصنیفات کی خصوصیات میں سے ہے، مرزا غالب ادب کے ساتھ فنِ لغت سے خاص دلچسپی رکھتے تھے، برہانِ قاطع پر نقد کے سلسلہ میں قاطع برہان وغیرہ اُن کے معروف رسالے ہیں، نیز وہ ایسے قدیم فارسی الفاظ کا استعمال فخر سے کیا کرتے تھے، جو فارسی جاننے والوں کے لئے عام طور پر اجنبی ہوتے تھے، اسی لئے حاشیہ اور ضمیمہ میں وہ خود ان لفظوں کی تشریح بھی کر دیتے تھے، اسی طرح شاگردوں اور ارادتمندوں کے سوالوں کے جواب میں اُن کے خطوط میں مختلف زبان کے لفظوں کی تشریح مندرج ہے، لائق مرتب نے ان بکھرے ہوئے جواہر ریزوں کو ان مآخذ سے یکجا کیا، اور حروفِ تہجی سے "فرہنگِ غالب" کے نام سے مرتب کیا ہے، اس طرح غالب کے استعمال کئے ہوئے بہت سے لفظوں کی تشریح خود ان کے قلم سے قلمبند ہو گئی ہے، اُن میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی اور اردو وغیرہ کے بہت سے الفاظ ہیں، اور اُن کو جن مآخذ سے لیا گیا ہے، ان کا حوالہ دیدیا گیا ہے، اس طرح فنِ لغت میں گویا خود غالب کی ایک نئی کتاب مرتب ہو گئی ہے، لائق مرتب نے مقدمہ میں فارسی قواعد و لغت پر ہندوستانی اہلِ علم کی تصنیفات کا ایک سرسری

جائزہ بھی لیا ہے، امید ہے کہ اہلِ علم اس تصنیف سے فائدہ اٹھائیں گے،

نفسیاتِ جمال از مولانا ابوالنظر صاحب رضوی امروہوی ناشر اعلیٰ کتب خانہ، قرول باغ، دہلی، حجم ۱۵۱ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت مجلد عہ

مولانا ابوالنظر صاحب رضوی، دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، مولانا کی یہ تصنیف اگرچہ نفسیاتِ جمال سے منسوب کی گئی ہے، مگر دراصل اس کو اس کے موضوع کے اعتبار سے نفسیاتِ محبت کہنا چاہئے، اس میں محبت کی واردات کو اُس کے مختلف زاویوں سے دیکھ کر قلمبند کیا گیا ہے، ہمارے لائق دوست پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی کے بقول جنھوں نے اس کتاب کا "تعارف" لکھا ہے، لائق مصنف "دیدہ ور مسافر کی طرح ہیں، جو راستہ کی دلفریب وادیوں اور نظر نواز چمنستانوں کی ایک ایک دلفریبی کو بنظرِ ستایش دیکھتا اوران کی حسن کاریوں سے محظوظ و لذت اندوز ہوتا ہے" ہمیں اس کتاب پر اندلس کے مشہور عالم دین علامہ ابن حزم ظاہری کی جو مذہب ظاہریہ کے بانی بھی ہیں، کتاب طوق الحمامہ فی الالفۃ والالاف یاد آئی، موضوع کی یگانگی سے دونوں کے عنوانات وابواب میں مشابہت موجود ہے، لیکن عرب اور ہندوستانی "دیدہ وروں" کی نگاہوں میں جو فرق ہو سکتا ہے، وہ ان دونوں کتابوں میں موجود ہے، لائق مصنف نے "محبت اور زندگی" "محبت اور شباب" اسی طرح ...... اور عزم وارادہ شیرینی ناکامی، خودکشی، راہ عمل، شکایت، شکست غرور، خودستائی، رسوائی، وفاداری، بدگمانی، شکوۂ رقیب، رعب حسن، بوسہ، شاعری، اور وصل کے عنوانوں سے محبت کے واردات، جذبات، اور کیفیات کی ترجمانی کی ہے، ترجمانی کا حق ادا ہوا ہے کہ نہیں، اس کا صحیح فیصلہ اس کوچہ کے راہرو ہی کر سکتے ہیں،

عشقِ جہانگیر از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی حجم ۲۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی، لکھائی چھپائی اچھی، قیمت سے ر پتہ :- مکتبہ ادب لال کنواں دہلی،

خواجہ محمد شفیع دہلوی کا قلم دلی کی ستھری اور پاکیزہ زبان اور دلآویز طرزِ ادا میں گلکاریاں

کرنے میں روشناس ہے، ان کی نئی کتاب "عشق جہانگیر" کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس میں جہانگیر اور نورجہاں کی داستان کو عاشقانہ رنگ میں آغاز عشق سے اس کے انجام تک قلمبند کیا گیا ہے اور اس تیموری شاہزادے کے جان نثاروں کی آبدار تلواروں کے جوہر شاہزادے کی عشق بازی کو کامیاب بنانے اور ابوالفضل کو راہ سے ہٹانے میں دکھائے گئے ہیں، کاش خواجہ صاحب نے اپنا موضوع اس تیموری شاہزادے کے عشق کی داستان کو نہ بنایا ہوتا کہ افسانہ نویسی میں وہ یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ اس مسلمان تاجدار کا دامن اخلاق کہاں کہاں آلودہ ہوتا ہے، اور کیسے کیسے سنگین جرائم کا وہ مرتکب دکھائی دیتا ہے، بہت سی ایسی داستانیں جن کی تردید کے لئے مورخین نے زور قلم صرف کیا تھا، وہ اس فسانہ میں اس انداز سے قبول کی گئی ہیں، کہ وہ فطری واقعات معلوم ہوتے ہیں، اس لئے اگر ہم جناب خواجہ صاحب کو اس تصنیف کی تمام تصنیفی خوبیوں اور مرتب داستان سرائی کے باوجود اس داستان کے تصنیف کرنے پر مبارکباد نہ دے سکیں، تو امید ہے کہ وہ ہمیں معذور تصور فرمائیں گے۔

افکار آتشین از جناب حافظ فضل الرحمٰن صاحب بزمی ناشر علمی بک ڈپو، مقیم گنج بنارس، جیبی تقطیع حجم ۱۲۱ صفحے قیمت :- عہ ر

افکار آتشین جناب بزمی بنارسی کی ایسی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے، جس میں صحیح اسلامی عقائد و تعلیمات کو حسن و خوبی سے پیش کیا گیا ہے، اور مغرب زدہ ذہنیت اور جدید تہذیب کے مخرب اخلاق لوازم کا مضحکہ اڑایا گیا ہے، جناب بزمی نے اپنی شاعری سے عقائد کی اصلاح اور دین کی تبلیغ کی خدمت انجام دی ہے، اُن کی یہ روش دوسرے نوجوان شعراء کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا،

شیطان مترجم جناب حبیب اشعر صاحب دہلوی حجم ۱۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی قیمت ۸؍

پتہ:۔ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو، دہلی،

یہ جبران خلیل جبران کے دس مختصر افسانون کے مجموعہ کا اردو ترجمہ ہے۔ افسانون مین مغربی ماحول روایات اور طرز ادا کا رنگ غالب ہے، ترجمہ کو زیادہ سلیس اور رواں ہونے کی ضرورت تھی،

جمال الدین افغانی از جناب سجاد علی صاحب حجم ۶۰ صفحے قیمت: ۲ر

مولانا روم از مولوی عبدالحفیظ صاحب قدوائی ندوائی حجم ۴۲ صفحے قیمت ۳ر

حضرت اسامہؓ از مولوی صلاح الدین صاحب ندوی حجم ۳۲ صفحے، قیمت ۴ر،

حضرت طلحہؓ از مولوی مشیر الحق صاحب بحر آبادی ،، ۳۲ ،، ،، ۴ر

ناشر مکتبہ تعلیمات اسلامی نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ

ان رسالون مین ان بزرگون کے مختصر سوانح حیات آسان زبان مین بچون کے لئے لکھے گئے ہین، ادارہ تعلیمات اسلام اپنے محدود دائرہ مین بچون کی تعلیم و تربیت اور دماغی نشو و نما کے لئے قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی کوششون کو بار آور فرمائے،

ایک ویران وادی مین پہلا قافلہ، عورت کا خزینہ، اذانِ دعوتِ حق، } از جناب نعیم صدیقی حجم بہ ترتیب: ۳۱، ۲۲، اور ۱۲ صفحے، قیمت بہ ترتیب ۵ر، ۴ر، ۴ر، تقطیع چھوٹی، لکھائی جلی، ناشر، مکتبہ نشاۃ ثانیہ چنچل گوڑہ، حیدرآباد دکن،

یہ نظمین تحریک اقامت دین کے سلسلہ مین لکھی گئی ہین۔ پہلے رسالہ مین ایک ویران وادی مین دین کے احیار کی تحریک چلانے والے قافلہ کو اترتے دکھایا گیا ہے "عورت کا خزینہ" مین عورت کو مغرب نے جہان لاکر کھڑا کیا ہے اس کو اس کا مقام دکھا کر صحیح راستہ پر آنے کی دعوت دی گئی ہے "اذان دعوتِ حق" مین حق کی طرف بلایا گیا ہے،

"س"

اور تاریخی کتابین

یخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی
لاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے
لاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف
یثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،
صنفہ: مولانا عبد السلام ندوی، ضخامت ۲۷۶ صفحے،
قیمت: ۱۲؍ عم

ندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان
قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی
سلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسون اور
علیم گاہون کا حال معلوم کرنا چاہین تو نہین مل سکتا،
ولوی ابوالحسنات مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے
بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہون پر معارف
ین ایک مقالہ لکھا تھا جس کو اہل نظر نے بے حد پسند کیا،
ب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت مین نہایت
ہتمام سے شائع کیا ہے،
ضخامت ۱۳۴ صفحے، قیمت: ۱۲؍

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے
یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے
لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان
کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات
انجام دی ہین، وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و
ملت معلوم ہو جائین،
اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری
مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یوپی
نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے
خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ؍

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب
مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی
تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر
لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور
آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے
دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،
ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ؍

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا
رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے، تاکہ
مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے
پڑھ اور سمجھ سکین، اور ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے
اور اب کیا ہین، ضخامت ۶۰ صفحے، قیمت: عہ؍
مرتبہ: مولوی عبد السلام قدوائی، ندوی،

مقدمۂ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشار
اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشار
کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ
تک کے تمام واقعات و سوانح پر، خود عالمگیر کے خطوط و
رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،
۳۹۰ صفحے، قیمت: للعہ؍

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و
رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ
کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، ان سے
ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف
ہوتا ہے، مرتبہ: سید نجیب اشرف ندوی ایم اے،
ضخامت: ۴۸۷ صفحے،
قیمت: سے؍

سوانح

سیرت عائشہؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالاتِ زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیان، اور معترضین کے جوابات، قیمت: ؎ ضخامت ۳۲۹ صفحے، طبع سوم باضافہ حواشی، (ازمولانا سلیمان ندوی)

سیرِ عمرؓ بن عبد العزیز

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز خلیفہ اموی کے سوانح حیات اور اُن کے مجددانہ کارنامے، ضخامت ۳۰۲ صفحے، قیمت: عـ۸ر ازمولانا عبد السلام ندوی،

حیات امام مالکؒ

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی کتاب موطائے امام مالکؒ پر تبصرہ، قیمت:- عـہ ر (۱۰۶ صفحے) ازمولانا سید سلیمان ندوی،

الغزالی

امام غزالیؒ کی سوانح عمری اور ان کا فلسفہ اور علم کلام، اخلاق اور تصوف مین اُن کے مجددانہ کارنامے ضخامت ۲۳۵ صفحے، قیمت: عـہ ر ازمولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ،

تابعین

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرامؓ کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونہ عمل ہے اس مین چیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت:- ۶۰۰ صفحے، قیمت:- للعہ ر

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۱

دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

اردو مین اسلامی تاریخ پر کوئی ایسی جامع کتاب نہین تھی جس مین تیرہ سو سال کی تمام اہم اور قابل ذکر حکومتون کی سیاسی علمی اور تمدنی تاریخ ہو اس لئے دار المصنفین تاریخ اسلام کا ایک پورا سلسلہ خاص اہتمام سے مرتب کرا رہا ہے جس کے بعض حصے چھپ چکے ہین اور بعض زیر طبع ہین، اور اکثر زیر تالیف و تکمیل ہین، جو بتدریج جیسے جیسے حالات مساعد ہون گے شائع ہوتے رہین گے ،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل (عہد رسالت وخلافت راشدہ) اس مین آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک کی مفصل مذہبی، سیاسی وتمدنی اور علمی تاریخ ہے (زیر طبع)

ضخامت: ۴۸۰ صفحے ، قیمت : سے

تاریخ اسلام حصۂ دوم (بنو امیہ) اس مین اموی حکومت کی صدسالہ سیاسی وعلمی و تمدنی تاریخ کی تفصیل ہے ،

ضخامت ۴۷۰ صفحے ، قیمت : سے

تاریخ اسلام حصۂ سوم (تاریخ بنی عباس جلد اوّل) اس مین خلیفہ ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے خلیفہ ابو اسحٰق متقی للہ ۳۳۳ھ تک دو صدیون کی بہت مفصل سیاسی تاریخ ہے، ضخامت ۵۰۴ صفحے ، قیمت : للعہ

تاریخ اسلام حصۂ چہارم (تاریخ بنی عباس جلد دوم) اس مین خلیفہ مستکفی باللہ کے عہد ۳۳۳ھ سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۶۵۶ھ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ ہے ،

ضخامت ۴۱۰ صفحے ، قیمت : صہ

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی)

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ اوّل، اس مین عثمان اوّل سے مصطفےٰ رابع تک سلطنت عثمانیہ کے چھ سو برس کے کارنامون کی تفصیل ہے، ضخامت : ۵۰۰ صفحے

قیمت : سے

تاریخ دولت عثمانیہ حصۂ دوم، سلطنت عثمانیہ کے عروج زوال کی تاریخ اور اس کے نظامی اور تمدنی کارنامون کی تفصیل از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۸ء تا جنگ عظیم ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء

ضخامت : ۶۸۰ صفحے ، قیمت : صہ

مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے علیگ سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ ،

تاریخ صقلیہ جلد اوّل، اس مین صقلیہ کے جغرافی حالات سسلی، اٹلی وجزائر سسلی پر اسلامی حملون کی ابتدا، حکومت کا قیام، اور عہد بعہد کی ترقیون اور عروج کی پوری اور مفصل داستان ہے ،

۴۶۵ صفحے ، قیمت : للعہ

تاریخ صقلیہ حصۂ دوم، یہ سسلی کے تمدنی وعلمی ترقیون کا مرقع ہے، اس مین عہد بعہد کے مفسرین، محدثین، فقہاء اور ادباء وشعراء کے مفصل حالات اور ان کی تصنیفات کا ذکر ہے ،

۵۰۰ صفحے ، قیمت : للعہ

مرتبہ : مولانا سید ریاست علی ندوی ،

مسعود علی ندوی   منیجر   دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۶۰ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۴۷ء عدد ۶

مضامین

معذرت

سب اڈیٹر صاحب معارف عرصہ سے وطن گئے ہوئے ہیں، ابھی تک ان کی واپسی کی کوئی اطلاع نہیں ہے، اس لیے آخر وقت تک انتظار کرنے کے بعد مجبوراً دسمبر کا پرچہ بغیر شذرات و مطبوعات وغیرہ کے ایک جز کم شائع کیا جا رہا ہے، انشاء اللہ آیندہ مہینہ سے پورا پرچہ حاضر خدمت ہوگا۔

منیجر

مقالات

قرآن اور فلسفہ[1]

از
جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود!
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (غالب)

سقراط نے جب فلسفی کو "مشاہدہ حق کا شیدائی" قرار دیا تھا، تو دراصل اس کے ذہن میں "عالم مابعد الطبیعیات" کا تصور نہ تھا، بلکہ ان الفاظ سے اس کا مقصود ذہنی کا وصف بیان کرنا تھا! کیونکہ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ فلسفہ کو اپنے اصطلاحی معنی کے لحاظ سے محض "حکمت کی محبت" قرار نہیں دیا جا سکتا اصطلاحی معنی کی رو سے فلسفہ، "مدلل علم ہے نہ کہ خالص بصیرت"! اور مدلل علم ہی کے معنی میں افلاطون اور ارسطو نے فلسفہ کو استعمال کیا ہے، اور یہی مفہوم عام طور پر فلسفہ کا لیا بھی جانے لگا ہے،

لیکن فلسفہ کو "مدلل علم" کہنے سے اس کا سارا مفہوم ادا نہیں ہو جاتا، اس میں شک نہیں کہ اس وصف کی وجہ سے ہم اس کا امتیاز عام تجربہ سے کرنے لگتے ہیں، کیونکہ عام تجربہ کسی شے کو رد یا قبول کر لیتا ہے، اس پر غور و فکر نہیں کرتا، یہی وصف فلسفہ کو آرٹ یا فن سے بھی ممیز کرتا ہے، کیونکہ فن کا کام

---

[1] یہ مقالہ حیدرآباد اکاڈمی کے جلسہ میں پڑھا گیا،

ایجاد یا تخلیق ہے، غور و فکر نہیں! اسی وصف کی وجہ سے ہم فلسفہ اور علم فطرت مین تشابہ پاتے ہین، کیونکہ ثانی الذکر کا کام بھی فکر و استدلال ہے، وہ بھی مدلل علم" قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر فلسفہ کو علوم نظریہ سے کس طرح ممیز کیا جائے

فلسفہ اور سائنس (علوم فطریہ) مین فرق و امتیاز کی دو بنیادی وجوہ ہین،

(۱) فلسفہ کا موضوع حقیقت کی ناقابلِ تحویل ماہیت ہوتا ہے،

(۲) فلسفہ کا موضوع صرف ایک واقعہ یا واقعات کے ایک مجموعہ کی انتہائی حقیقت نہین ہوتا، بلکہ جو کچھ کہ موجود ہے، کل وجود کی انتہائی اور ناقابلِ تحویل ماہیت یا حقیقت کا جاننا فلسفہ کا کام ہے، یہ وہ انتہائی حقیقت ہے، جس مین پروفیسر ہالڈین کے الفاظ مین "باقی تمام چیزین تو تحویل ہو سکتی ہین لیکن وہ خود اپنے سوا کسی چیز مین تحویل نہین ہو سکتی، اور اس کے حدود مین باقی تمام چیزین تو ادا کی جا سکتی ہین لیکن وہ خود اپنے سوا کسی اور شے کی حدود مین ادا نہین ہو سکتی"،

یہی وہ خصوصیت ممیزہ ہے جو فلسفہ کو سائنس سے جدا کرتی ہے، فلسفہ کل حقیقت سے بحث کرتا ہے، اس کے برخلاف سائنس مظاہر کے ایک محدود مجموعہ کا مطالعہ کرتی ہے، علاوہ ازین فلسفہ حقیقت کی ناقابلِ تحویل یا انتہائی ماہیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے، اس کے برخلاف سائنس یہ سوال ہی نہین اٹھاتی کہ ان مظاہر کی تحویل کسی اور قسم کے مظاہر مین ہو سکتی ہے یا نہین؟

مثالون سے ہمارے اس اجمالی دعوی کی توضیح ہو سکتی ہے، عالم خلیات زندہ خلیہ کی تحقیق کر رہا ہے، اس کا کام یہ دریافت کرنا نہین کہ آیا اس کی حقیقت مادی ہے یا روحانی، یا بالفاظ دیگر وہ یہ جاننا نہین چاہتا کہ بحز مایکی تحویل مادی توانائی مین ہو سکتی ہے، یا شعور مین، وہ ان سوالات کو فلسفی کیلئے چھوڑ دیتا ہے، کہ ان روحانی اور طبعی اعمال کی حقیقی ماہیت کیا ہے؟ کیا حقیقت کی تقسیم بالآخر روحانی و مادی حقائق مین کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ تقسیم انتہائی اور قطعی ہے، یا پھر روحانی حقیقت کی مادی حقیقت مین تحویل کر دی جا سکتی ہے، کیا فکر دماغ کی فعلیت کا ایک وظیفہ ہے؟ کیا خود مادی حقیقت

کی تحویل روحانی حقیقت میں ہو سکتی ہے، یا بالفاظ دیگر مادہ، روح ہی کی ایک تجلی یا ظہور ہے؟ وہ ان عمیق سوالات کو فلسفی کے لئے چھوڑ کر خود واقعات کی تحلیل کرنے لگتا ہے، ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط کرتا ہے مثلاً بڑھتی ہوئی تپش کو بڑھتی ہوئی رگڑ سے، شرارے کو برقی حالت سے، اس کے برخلاف فلسفی ہر واقعہ یا واقعات کے ہر مجموعہ (یا حقیقت کے محدود جزو) کو کل حقیقت سے مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے پیش نظر محض یہ سوال نہیں ہوتا، کہ ایک واقعہ کی توجیہ دوسرے واقعہ سے کیسے ہو سکتی ہے، بلکہ وہ جاننا یہ چاہتا ہے، کہ ہر واقعہ کا کلی نظام سے کیا تعلق ہے؟ اسی سوال کی تحقیق کی کوشش میں بعض دفعہ اس کو حقیقت کی یافت ہو جاتی ہے تو چیخ اٹھتا ہے،

حق فاعل و ہر چہ جز حق آلات بود تاثیر ز آلات از محالات بود

ہستی کہ موثر حقیقی ست یکیست باقی ہمہ اوہام و خیالات بود (جامی)

بیانِ بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ فلسفہ کا موضوع بحث انتہائی و ناقابلِ تحویل حقیقت ہے اور وہ کل حقیقت ہے، وجود من حیث کل ہے، اس کو ہم انتہائی "آخر" اس لئے قرار دے رہے ہیں کہ وہ ناقابلِ تحویل ہے، یعنی اس کی تحویل کسی اور آخری یا انتہائی حقیقت میں نہیں کی جا سکتی، کیونکہ وہ کسی اور آخری یا انتہائی حقیقت کا ظہور یا تجلی یا تعین نہیں، اور اس لئے بھی کہ اس کے ماورا کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ وہ ہمہ محیط ہے، کل ہے، جو کچھ بھی موجود ہے، اسی میں شامل و داخل ہے،

ع ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست!

جب فلسفہ کا معروض کل مطلق قرار پاتا ہے، جو قطعاً آخر و ناقابلِ تحویل حقیقت ہے، تو فلسفہ تکمیل مراد کا نام نہیں ہو سکتا، بلکہ تلاش و جستجو، سعی و کوشش، طلب و اجتہاد کا نام ہے، اسی حقیقت کی یافت کے بعد شیخ سینا کی زبان سے نکلا تھا

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت یک موے نہ دانست ولی موئے شگافت

اندرو لِ من ہزار خورشید بتافت و آخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

جرمنی کے مشہور فلسفی اشٹمپف (Stumpf) نے اسی لئے فلسفہ کو استفہامی علم (Question Science) قرار دیا ہے، اور ولیم جیمس نے مابعد الطبیعیات کی تعریف ہی اس طرح کی ہے کہ وہ سوالات کرنے کی ایک غیر معمولی اور پیہم کوشش کا نام ہے، اور جاوسن کہتا ہے کہ فلسفہ کوئی "سربستہ نظریہ" نہیں، بلکہ ایک "حل طلب مسئلہ" ہے،!

فلسفہ کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے "فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعہ کسی شئ کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے،" "فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کا نام ہے[1]،" یہ ہے یورپ کے مایۂ ناز فلسفیوں کی تحقیق جو فلسفہ کی تعریف و ماہیت کے متعلق زمانہ حال میں کی گئی ہے!

اس تحقیق کی رو سے سائنس کا سارا تعلق عالم مظاہر سے ہے، جس کو قرآن کی زبان میں عالم شہادت کہا جاسکتا ہے اور فلسفہ عالم شہادت کی انتہائی حقیقت یا ماہیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے، جو غیب کا دائرہ ہے، اور جس کو قرآن کی زبان میں عالم غیب قرار دیا جاسکتا ہے،

سائنس کا کام عالم شہادت کے واقعات کا بیان کرنا ہے، جے آرتھامسن نے دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ یہ واقعات تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"، عالم سائنس مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہے، جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے پھر

---

[1] دیکھو Persistent Problems of Philosophy کی کتاب Calkins (باب اول ص ۳ تا ۶)

ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کی تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، اُن کی یکسانیت عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی اُن کے قوانین عمل کو دریافت کرتا ہے، اور آخر مین اُن کو ایک مربوط و مرتب مقالکی صورت مین پیش کر دیتا ہے، اُور یہان پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس نے واقعات تجربیہ کا سادہ الفاظ مین کامل و منضبط بیان پیش کر دیا، اُن کے طرز وقوع اور طریقۂ عمل کو سمجھا دیا، غرض عالم سائنس کا کام اس عالم شہادت سے ہے، اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے، اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، اُن کے بیان کرنے مین وہ حزم و احتیاط سے کام لیتا ہے، اور اس طرح وہ ان قوانین وعلل کو معلوم کر لیتا ہے، جن کے تحت عالم شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہین، اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے، کائنات کی تسخیر مین وہ کامیاب ہوتا ہے، اور سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے بیان کی عملی تصدیق کرتا ہے،

عالم سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالم غیب کی تلاش ہوتی ہے، وہ عالم مظاہر کے ماورا پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے، اس حقیقت الحقائق کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتا ہے، جو انتہائی اور آخری حقیقت ہے، جو اشیاء کا باطن ہی، جو باوجود اشیاء مین شدت ظہور کے غیب الغیب ہے، جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لئے مستور ہے!

اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت مین داخل ہے، اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کیا ہے، اس کے تمام علوم و فنون حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہین! اسی غیب کی یافت کی تڑپ مین وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہی اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا رہا ہے،

یک دم غم جان بجز غم نان تا کے / در پرورش این تن نادان تا کے
اندر و طبل شکم و نامے گلو / این رقص ز نخ بضرب دندان تا کے (رومی)

لیکن جن غیبون تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے، وہ صحیح معنی مین غیب نہین، بلکہ ہمارے عالم شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہین جن کو محض اضافی و اعتباری غیوب کہا جا سکتا ہے، غالب نے اس حقیقت کو خوب ادا کیا ہے،

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہین ہم شہود / ہین خواب مین ہنوز جو جاگے ہین خواب مین!

باقی اصلی اور حقیقی غیب یا غیب الغیب تک انسانی عقل اور ذرائع علم کی رسائی کبھی بھی نہین ہو سکتی

قل لا یعلم من فی السمٰوات والارض الغیب الا اللّٰہ، (نمل-۵) کہدو (اے محمد) کہ زمین اور آسمانون مین سوائے اللہ کے کوئی غیب کو نہین جانتا،

سے قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے! اور

قل انما الغیب للّٰہ، (یونس ۲ع) غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے،

پر زور دے کر انسان سے اس کے علم کی قطعی نفی کر رہا ہے!

تاریخ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ فلسفہ مین ادعائی نظامات کے پیش ہونے کے بعد ہی جب غیب سے کلی و یقینی علم کا فلسفیون نے دعوی کیا ہے، ارتیابیت اور لا دریت نے اُن کے بلند بانگ دعوون کی شدت سے تردید شروع کر دی، اور انسانی علم کو عالم شہادت ہی تک محدود کر دیا! ہیوم نے فلسفہ جدید مین نہایت قوت کے ساتھ یہ واضح کر دیا ہے، کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دارو مدار ارتسامات یا اُن کی نقل تصورات پر ہے، لہذا محسوس ہی کو ہم موجود کہہ سکتے ہین، اور غائب کا ہمین کوئی علم نہین ہو سکتا، ہیوم کی ارتیابیت نے کانٹ کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا، اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حقائق اشیا کا

علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا، بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لئے ناممکن الحصول ہو، حقائق اشیاء کو کانٹ کی اصطلاح میں نوامن (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور انسانی علم کے اس مقابلہ میں ظواہر یا Phenomena "یا قرآن کی اصطلاح میں "عالم شہادت" تک محدود ہے،

قدیم زمانہ میں اشراقیہ اور جدید زمانہ میں سریہ (Mystics) اور برگساں جیسے فلاسفہ نے غیب کے علم کے لئے حواس و عقل کو تو قطعاً ناقابلِ علم قرار دیا، لیکن کشف یا وجدان، یا سری ذرائع علم کے نام سے جس علم کے دامن میں پناہ پکڑی، وہ محض ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہے، جو ڈوبنے سے بہر حال نہیں بچا سکتا، کیونکہ لاادریہ اور ارتیابیہ نے جن دلائل سے انسانی عقل کو حقائق اشیا یا غیب کے علم کے ناقابل قرار دیا، وہی دلائل کشف و وجدان کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں، اور بتلایا جا سکتا ہے کہ عقل کی طرح کشف و وجدان بھی انسانی علم ہی کی کوئی قوت ہے، اور عقل و استدلال کی طرح اضافی اور اعتباری ہے، اور اس کو بھی ناقابلِ خطا اور یقینی اسی طرح نہیں قرار دیا جا سکتا، جس طرح کہ انسانی عقل و استدلال کو نہیں قرار دیا جا سکتا، دونوں بہر حال انسان کے محدود، ناقص، اضافی و اعتباری ذرائع علم ہیں،

قرآن نے اس حقیقت کو مختلف طرح سے تعبیر کیا ہے، نہایت قطعیت اور وضاحت کے ساتھ یہ بتلا دیا گیا ہے، کہ غیب کا علم انسان کو بذاتِ خود حاصل نہیں ہو سکتا، صرف حق تعالیٰ ہی کے دینے سے حاصل ہو سکتا ہے، اسے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لو،

یہ امر کہ علم غیب خاصۂ حق تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرآن مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ایجابی طور پر اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ   آسمانوں اور زمین میں جتنی غیب کی باتیں

(پ ۱۳-ع ۱۰) ان کا علم خدا ہی کو ہے،

اور نفیاً اسی مفہوم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے، قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ اور غیر اللہ سے علم غیب کی مطلق نفی اس طرح کی گئی ہے،

وَعِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھَا اِلَّا ھُوَ (پ، ع ۱۳) اور اللہ ہی کے پاس کنجیان ہین تمام مخفی اشیا کی نہین جانتا ہے انھین لیکن وہی،

تاریخ فلسفۂ جدید مین لاادریۂ ایجابیہ اور تاجیہ نے انسانی علم کو مظاہر ہی کی حد تک محدود کر دیا، اور مطلق اور غیب کے علم کی اس سے نفی کر دی، اور اس طرح انسان کو غیب کے علم سے ہر طرح محروم کر دیا، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے غیب کے علم کی طلب و خواہش انسان کی فطرت مین داخل ہے، اس کے قلب مین غیب کے حصول و یافت کی تڑپ پائی جاتی ہے، اور اسی تڑپ اور طلب و جستجو نے اس کو حیوانون سے ممتاز کر رکھا ہے، اس کی تشفی کا انتظام ضروری ہے، بات یہ ہو کہ گو غیب کا علم انسان کو نہین، اس کے حواس اور عقل اور تمام ذرائع علم اس کے حصول کے براہ راست قابل نہین لیکن اگر اللہ چاہے تو کسی ذریعہ سے اپنے غیب کا علم انسان کو دیسکتا ہے، اور اسی ذریعہ کا نام قرآن کی اصطلاح مین رسول ہوتا ہے، صاف الفاظ مین اس حقیقت کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے،

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (پ ۲۹ ع ۱۲) غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہین کرتا، ہان مگر برگزیدہ پیغمبر کو،

جب انسان غیب کے علم کو بذاتِ خود حاصل نہین کر سکتا، اور یہ علم صرف حق تعالیٰ ہی رسولون کے ذریعہ عطا کر سکتے ہین، تو اب حقائق عالم یا جن کو فلسفہ کی اصطلاح مین انتہائی حقیقت کا علم یا انتہائی

Pragmatists or Positivists or Agnostic or

علوم حقائق کہا جاتا ہے، ان پر مطلع ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں، کہ انسان اللہ اور رسولوں پر ایمان لائے، اسی حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے،

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ	اللہ تعالیٰ تم کو غیب کی خبر دینے والا نہیں ہے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ	البتہ وہ جس کو چاہتا ہے، اپنے رسولوں
فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	میں سے اس غیب کی اطلاع کے لئے انتخاب
(پ ۴ - ع ۹)	کرتا ہے، لہذا اگر تم غیب پر مطلع ہونا چاہتے ہو
	تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ،

غرض اس طرح انسان کے لئے انتہائی حقائق یا غیوب کے جاننے کا ذریعہ صرف اللہ اور رسول پر ایمان ہے، جس کے بغیر قرآن کی رو سے انسان روشنی سے قطعاً محروم رہتا ہے، اسی لئے فرمایا گیا ہے :-

مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ	جس کو اللہ روشنی نہ عطا کرے اس کے لئے
مِنْ نُّوْرٍ (پ ۱۸ - ع ۱۱)	روشنی نہیں،

غیب کے علم کو جاننے کے ذریعہ سے محروم ہونے کے باوجود، تجربہ جو اس کے ماوراء جاننے اور حقیقت انتہائی کے حضور میں پہنچنے کی قابلیت سے قطعاً عاری ہونے کے باوجود جو لوگ اس کے متعلق لال بجھکڑوں کی سی اٹکل پچو غیر مقرر باتیں بناتے ہیں، اُن کو قرآن نے خراصون کے لقب سے یاد کیا ہے، جس کے معنی بے سند باتیں بنانے والوں کے ہیں، اُن کی باتوں کو ظن وخرص سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اُن کی بات سننے اور ماننے سے روکا گیا ہے، کیونکہ اس کا نتیجہ سوائے گمراہی اور ضلالت کے کچھ نہیں،

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ	دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ
يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ	ان کا کہنا مانیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ
يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ	سے بے راہ کر دیں، وہ محض بے اصل خیالات

الا یخرصون ۝ (پ ۸- ع ۱) پر چلتے ہیں، اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں،

اور قرآن کا کام ہی یہ قرار دیا گیا ہے، کہ وہ انسان کو جہل کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لاتا ہے

کتاب انزلنٰہ الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور باذن ربھم الی صراط العزیز الحمید ۝ (پ ۱۳- ع ۱۳)

یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے، کہ آپ تمام لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف یعنی خدائے غالب ستودہ صفات کی راہ کی (طرف نکال لائیں)

جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی بات کی طرف سے اپنا منہ پھیر کر انتہائی حقیقت کو اپنے علم، عقل، کشف یا وجدان سے جاننے کی کوشش کی، وہ ابتدائے فکر انسانی سے اب تک بھی اپنی غیر معمولی اور پیہم کوششوں کے باوجود صرف سوالات کے اٹھانے میں معروف ہیں جن کا اب تک بھی انھیں کوئی تشفی بخش جواب مل نہ سکا، اُن کے نزدیک یہ علم محض ایک استفہامی علم بن کر رہ گیا ہے، کوئی سربستہ نظریہ نہیں، بلکہ ایک "حل طلب مسئلہ" ہے! عقل انسانی کی اسی حرمان نصیبی کو پیش نظر رکھ کر رومی نے فلسفی کے متعلق کہا تھا،

فلسفی گوید از معقولاتِ دون عقل از دہلیز می ناید برون!

فلسفی منکر شود در فکر و ظن گو برو سر را بدان دیوار زن!

فلسفی انتہائی حقیقت کو عقل کے ذریعہ جاننا چاہتا ہے اور فکر و اندیشہ کے ذریعہ جاننا چاہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس کا منہ خزانہ کی طرف ہے، اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن حقیقت میں اس کا منہ خزانے کی طرف نہیں، بلکہ اس کی پیٹھ خزانے کی طرف ہے، اور وہ جتنا آگے بڑھنا چاہتا ہے، اتنا ہی خزانے سے دور ہوتا جاتا ہے،

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت گو بدو کو را سوئے گنج است پشت

گو بدو چنداں کہ افزوں می دود　　از مرادِ دل جدا تر می شود !　(رومی)

فکرو استدلال سے جو کچھ فلسفی نے پایا ہے، اس کو یہ دانائے راز مشک نہیں پشک قرار دیتا ہے،
کیونکہ گو بظاہر بات مدلل اور قوی معلوم ہوتی ہے لیکن صداقت سے عاری ہوتی ہے :

مشک آلودہ است اما مشک نے　　بوئے مشکستش دلے جز پشک نے

انتہائی حقیقت کا علم اگر حاصل ہو سکتا ہے، تو صرف اسی طرح کہ ہم ظن تخمین "سے بیگانہ ہو کر" خوض و خرص کو چھوڑ کر
(ذرھم فی خوضہم یلعبون) قرآن کریم اور ارشاداتِ نبوی کی طرف توجہ کریں جو مبدء ہیں علم حقیقی
کا اور جو شک وریب، قیاس و وہم ظن و تخمین سے منزہ ہیں یہیں ہیں وہ نور ہدایت حاصل ہو سکتا ہے جس کو
عقل نظری ہمیں عطا نہیں کر سکتی، اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی ! یہیں ہمارے لئے یقین و اذعان
کا ذخیرہ ہے، یہیں بداہت وہدایت کا جلوہ ہے، یہیں علم حقائق ہے، اور یہیں طمانیت و تسکین !
اسی کی ہمیں تاکید کی گئی ہے،

وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ　　یہ میری سیدھی راہ ہے، تم اس کا اتباع
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ　　کرو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ
سَبِیْلِہٖ، ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ　　راہیں تمھیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی،
لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ،　　اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے،
تاکہ تم احتیاط رکھو،

شاہ ولی اللہؒ نے اسی مفہوم کو خوب ادا کیا ہے،

علمی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است　　واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست
جائیکہ بود جلوۂ حق حاکم وقت　　تابع شدن حکم خرد بو لہبی ست

سطور بالا میں ہم نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ عالم سائنس نے اپنا موضوع تحقیق عالم مظاہر

یا عالم شہادت کو بنایا، عقل وحواس کے ذریعہ اس نے فطرت کی یکسانیت عمل اور قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی، اس کی نگاہ واقعات ومظاہر ہی کی جانب لگی رہی، مشاہدے اور تجربہ کے ذریعہ اس نے ان قوانین کو دریافت کر لیا، اور تسخیر قوائے کائنات میں کامیابی حاصل کر لی، اس کے برخلاف فلسفہ نے کوشش کی، کہ مظاہر کے عالم کے ماورا پہنچ کر غیب یا حقائق اشیاء کو معلوم کرے اور چونکہ یہ کام عقلِ انسانی کی قدرت سے باہر ہے، اس لئے فلسفہ محض ایک استفہامی علم بن کر رہ گیا، جس کا کام صرف سوال کرنا ہی قرار پایا، اور عقل کو تنقید سے کبھی فرصت مل نہ سکی،

ع رُست از یک بندتا افتاد در بندے دگر (اقبال)

ادھر قرآن نے صاف طور پر جتلا دیا، کہ غیوب کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، اور وہ اپنے رسولوں کے ذریعہ انسان کو اتنا ہی علم عطا کرتے ہیں، جتنا کہ وہ انسان کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، اور قرآن کے بالاستیعاب مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ اسی غیبی علم کو رسولوں کے ذریعہ ہم پر منکشف کرتے ہیں، جس کا جاننا ہماری عملی زندگی کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے، مفید اور نافع ہوتا ہے، اور وہ مافوق الفہم اسرار جن کے سمجھنے کی حیات انسانی کو حاجت نہیں اور اس کی عملی زندگی کی فلاح کے لئے ان کا علم ضروری نہیں جن کا عمل سے کوئی تعلق نہیں، ان کو

لَا يَعْلَمُ تَاوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا،

کہہ کر چھوڑ جاتے ہیں اور ان پر محض ایمان لانے کی تاکید کرتے ہیں!

جب غیب کا علم انسان کی عقل کے دست رس سے باہر ہے، اور جب غیب کے متعلق حق تعالیٰ نے انبیاء ہی کے ذریعہ انسان کو عطا کیا ہے، اور وہی علم عطا کیا ہے، جس کے تحت میں کوئی عمل ہوتا ہے، جس کا تعلق عمل سے ہوتا ہے، تو پھر اہلِ حق کے یہ دو اصول منطقی طور پر لازم آتے ہیں، اور جن کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں،

(۱) پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام عقائد و اعمال کے متعلق اپنی اُمت کو جو کچھ تعلیم و تلقین فرما گئے اس پر ایک ذرہ کا اضافہ یا اس سے ایک ذرہ کی کمی نہین ہو سکتی،

(۲) خدا کی ذات و صفات و دیگر عقائد کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے، یا پیغمبر سے بتواتر جو کچھ ثابت ہے، اس کی نسبت اجمالاً یا تفصیلاً جو کچھ اور جس حد تک انھون نے تفسیر و تشریح کی ہے، اسی پر ایمان لانا واجب ہے، اور اپنی عقل و قیاس و استنباط سے تفسیر و تشریح کرنی صحیح نہین، اور نہ اس پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا جزو ہے[۱]"،

ان عقائد و اعمال کے متعلق جو تعلیم ہمین دی گئی ہے، ان مین اضافہ یا کمی کرنا یا اُن کی عقل و قیاس سے توجیہ و تعبیر کرنا اس امر کا دعوی کرنا ہوگا، کہ ہم براہِ راست اپنی عقل یا وجدان کے ذریعہ ان غیبی علوم کو حاصل کر سکتے ہین، ہمین کسی پیغمبر کی ضرورت نہین، ہم سارے پیغمبرون کی آمد و بعثت سے مستغنی ہو سکتے ہین!

اہلِ حق نے ایسا نہین کیا، بلکہ اونھون نے ہمیشہ اپنی عقل کو پیغمبر اسلام کی عقل پر قربان کر دیا، اور حسبی اللہ کہکر حق تعالیٰ کی بات پر ایمان لائے، اور اپنی زبان روک لی، اور کہا تو صرف یہ کہا کہ

عقل قربان کن بہ پیشِ مصطفیٰ   حسبی اللہ گو کہ اللہ ام کفیٰ
زین خرد جاہل ہمین باید شدن   دست در دیوانگی باید زدن
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد   این عسس را دید و در خانہ نشد (رومی)

اسلام مین یہ اہل سنت والجماعۃ ہی کا طبقہ ہے جنھون نے عقائد مین گفتگو کو ہمیشہ ناپسند کیا، اور آمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا کہہ کر ایمان لائے اور جادۂ مستقیم پر قائم رہے، اُن کے عقائد وہی رہے، جو پیغمبر اسلام اور اُن کے صحابۂ کبار کے تھے، اسی لئے انھین اہل السنۃ والجماعۃ کے نام سے

---

[۱] دیکھو رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس، اعظم گڈہ، ص ۳۷،

پکارا جاتا ہے یہ علم اللہ کے تابع ہیں تھوڑی کہ یہ وہ نہیں یہ مست خدا ہیں بالغ ہیں اطفال نہیں

خلق اطفال اند جز مست خدا

نیست بالغ جز رہیدہ از ہوی (رومی)

امام مالک بن انس اہل السنۃ کا عقیدہ ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں،

الکلام فی الدین اکرہہ ولا یزال	میں عقائد میں گفتگو کرنا ناپسند کرتا ہوں،
اَھلُ بَلَدِنا یکرَھُونَہٗ وَینھَون	اور ہمیشہ ہمارے شہر (مدینہ) کے علماء اس کو
عَنہُ نحو الکلام فی رای جھم	ناپسند کرتے رہے ہیں، اور اس سے روکتے
والقدر وما اشبھہ ذلک و	رہے ہیں، مثلاً جہم کی رائے اور قدر میں
مَا احبّ الکلام الّا فیما تحتہ	گفتگو کرنا، میں بحث و مباحثہ ان امور
عمل، فامّا الکلام فی دین اللہ	میں ناپسند کرتا ہوں جن کے تحت میں
وفی اللہ عزّ وجل فالسّکوت	کوئی عمل نہ ہو، لیکن خدا کے عقائد اور
احبّ الیّ لانی رَایتُ اَھلَ بَلدِنا	خود خدا کی ذات میں سکوت میرے نزدیک
ینھون عَنِ الکلام فی الدّین	پسندیدہ ہے، کیونکہ ہم نے اپنے شہر کے
الّا فیما تحتہ عَمَل[1]،	علماء کو دیکھا ہے کہ عقائد میں گفتگو
	کرنے سے روکتے تھے، اور ان امور میں [illegible]

امام مالک کے ان الفاظ سے نہ صرف اُن کے اصول کی صراحت ہوتی ہے، بلکہ اُن سلف کا طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ان امور میں گفتگو کرتے تھے، جن پر عملاً بھی ہم کو کاربند ہونا ہے، عمل نہ کہ تخیل اُن کا مطلوب و مقصود تھا،

---

[1] جامع بیان العلم ابن عبد البر منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ ص ۴۴،

"بدہ عاقلی رہا کن کہ با و توان رسیدن

بدلِ نیاز مندے بہ نگاہ پاکبازے" (اقبال)

امام ترمذی ائمہ سنت کا اصول بتلاتے ہیں،

والمذهب فی هذا عند اهل	ائمہ اہل علم جیسے سفیان ثوری، مالک
العلم من الائمة مثل سفیان	ابن انس، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن
الثوری ومالك بن انس وسفیان	مبارک وغیرہ کا اس بارہ میں مذہب
ابن عیینة وابن المبارك ووكیع	یہ تھا، کہ انھوں نے ان چیزوں کی روایت
وغیرهم انهم رووا هذه	کی، اور کہا ہم حدیثوں کی روایت کرتے
الاشیاء وقالوا نروی هذه	ہیں، اور ان پر ایمان رکھتے ہیں، اور یہ
الاحادیث ونؤمن بها ولا یقال	نہیں کہا جائے کہ یہ کیوں کر رہے ہیں،
كیف وهذا الذی اختاره اهل	اور اسی مذہب کو اہل حدیث نے اختیار
الحدیث ان یروو اهذه الاشیاء	کیا ہے، ان باتوں کی روایت کردیں
كما جاءت ویؤمن بها ولا تفسر	جس طرح یہ وہ آئی ہیں، اور ان پر
ولا یتوهم ولا یقال كیف وهذا	ایمان رکھا جائے، اور ان کی تفسیر نہ
امر اهل العلم الذی اختاره	کی جائے، اور نہ وہم کیا جائے، اور نہ
وذهبوا الیه[1]	کیسے کہا جائے، اہل علم کا یہی مذہب ہے
	اور اسی کو انھوں نے پسند کیا ہے،

عارف روم نے اس مسلک کو یوں ادا کیا ہے، اور اس کی دلیل بھی پیش کی ہے ؎

[1] جامع بیان العلم ابن عبد البر منقول از رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ ص ۴۱

عقل را قرباں کن اندر عشق دوست　　　عقل ہا باری ازاں سویست کو

اے ببردہ عقل ہدیہ تا الٰہ　　　عقل آنجا کمتر است از خاک راہ

عقل چوں سایہ بود حق آفتاب　　　سایہ را با آفتاب او چہ تاب

عقل چوں شحنہ است چوں سلطاں رسید　　　شحنہ بیچارہ در کنجے خزید　(رومی)

اس بیان سے یہ نتیجہ نہین نکالا جاسکتا، کہ اہلِ سنت کا رویہ "خلافِ عقل" ہے، اور اس لئے وہ مذہب مین عقل کی مطلق دخل اندازی جائز نہین رکھتے، بات صرف اتنی ہے، اور اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے کہ جب عقل ماوراے حواس جا نہین سکتی، اور حقائق اشیاء کا علم حاصل نہین کرسکتی، جو غیب کا دائرہ ہے، اور عقل کی دسترس سے باہر، تو پھر عقلی طور پر یہی لازم آتا ہے کہ عقل کو بےکار محض نہین بلکہ محدود قرار دیا جائے، اس کی تحقیر نہ کی جائے، بلکہ اس کی قابلیت اور قدرت کی تحدید کر دی جائے اور اس کا اصلی دائرہ عالم مظاہر یا شہادت قرار دیا جائے، نہ کہ عالم غیب جس طرح بصارت ایک خاص فاصلہ کے آگے نہین دیکھ سکتی، اور سماعت اپنے عمل کے لئے ایک مخصوص دائرہ چاہتی ہے جس کے بعد وہ بیکار ہے، اسی طرح عقلِ انسانی کا بھی ایک محدود دائرہ ہوتا ہے جس مین وہ عمل کرتی ہے، اور اس سے باہر وہ قطعًا بیکار ثابت ہوتی ہے، یہ دائرہ واقعات تجربیہ کا دائرہ ہے، اس سے ماوراء عقل جا نہین سکتی، قرآن نے جن غیبی حقائق کو پیش کیا ہے، وہ قطعًا خلافِ عقل (Contra-rational) نہین وہ ماوراے طورِ عقل ہین" (Supra-rational) جس دائرہ مین عقل قدم زن نہ ہو سکتی ہو، جس دائرہ کا علم حق تعالیٰ انبیاء کے ذریعہ ہی عطا کرتے ہون، اس دائرہ مین ہم کو اپنی عقل کی روشنی سے نہین، بلکہ خدا کی دی ہوئی روشنی کے سہارے ہی سے چلنا چاہئے، اپنی عقل کو علم الٰہی کے تابع کرنے کے معنی بےعقل یا پاگل ہونے کے نہین، خلافِ عقل راہ چلنے کے نہین، بلکہ بقول عارف رومی "ہمہ تن" سرِ عقل ہونے کے ہین،

زین سر از حیرت گر این غفلت رود

بر سیر مویت سر و عقلے بود

کیونکہ ہماری عقل جزئی ہے، اور حق تعالیٰ کی عقل کلی، ہماری عقل جزئی ہونے کی وجہ سے کل کا علم حاصل نہین کر سکتی، اپنی تقیید و تحدید کی وجہ سے وہ کل حقیقت کی گرفت سے قاصر ہوتی ہے، اس کا علم جزئی، اضافی یا اعتباری ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ ہی کا علم مطلق ہوتا ہے، ہم اپنی عقل کو عقل کلی کے تابع کر دینے سے اس علم کے بھی سہیم دار ہو جاتے ہین جس کو ہماری عقل بذاتِ خود حاصل نہین کر سکتی تھی، عقل جزئی تابع وحیِ الٰہی ہو کر عقل خود بین نہین رہتی، عقل جہان بین ہو جاتی ہے، ان دونون عقلون کے فرق و تفاوت کو اقبال نے نہایت فصیح الفاظ مین بیان کیا ہے:

عقل خود بین دگر و عقل جہان بین دگر است   بالِ بلبل دگر و بازوے شاہین دگر است

دگر است آن کہ برد دانہ افتادہ زخاک   آنکہ گیرد خورش از دانہ پروین دگر است

دگر است آن کہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم   آنکہ در شد بہ ضمیر گل و نسرین دگر است

دگر ست آنسوے نہ پردہ کشادن نظری   این سوے پردہ گمان و ظن و تخمین دگر است

اے خوش آن عقل کہ پہناے دو عالم با اوست   نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست!

(پیام مشرق)

فتاویٰ عالمگیری

اور

اس کے چند اور مولفین

از جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دارالمصنفین

(۲)

علم و فضل اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی علیہ الرحمہ کے اجداد میں قاضی محمود نے عہدۂ قضا چھوڑ کر حکومت کے دوسرے کام سنبھال لیے تھے، جس سے ان کے خاندان میں علم کا چرچا بالکل ختم تو نہیں ہوا مگر اس میں کمی ضرور آگئی، قاضی محمود کے بعد بھی بہت دنوں تک اس خاندان میں علمی زندگی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب کی ذات سے دوبارہ چرچا شروع ہوا اور انھوں نے خاندان کی قدیم علمی روایات کو زندہ کیا اور پھر سے ان علمی مشاغل کو رواج دیا جو ایک ایک کرکے خاندان سے مٹ رہے تھے، شاہ صاحب کی علمی استعداد اور ذہانت کا کچھ تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے، چند واقعات یہاں بھی درج کیے جاتے ہیں،

شاہ صاحب کے استاذ میرزاہد ہروی نے معقولات اور علم کلام کی کتابوں پر جو اہم حواشی (زواہد ثلاثہ) لکھے ہیں وہ آجتک عربی درسگاہ اور خصوصاً درس نظامی کا ضروری جز ہیں، ان اہم اور دقیق حواشی کی تحریر و ترتیب میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی بھی شرکت تھی، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

ظاہراً تسوید حاشیۂ شرح مواقف بتقریب قرأۃ حضرت ایشان بود، (انفاس ص ۳۴)

شاہ عبدالعزیزؒ اس کو اور واضح طور سے لکھتے ہیں:

وشریک مسودہ حواشی بودند، (ملفوظات ص۳)

فقہ پر شاہ صاحب کی بڑی گہری نظر تھی، خود ان کے استاد میر زاہد کو بھی اس کا اعتراف تھا، ایک مرتبہ کسی رئیس نے میر زاہد سے شرح وقایہ پڑھنے کی خواہش کی، میر زاہد نے منظور تو کر لیا، مگر جب تک شاہ صاحب موجود نہیں ہوتے تھے سبق نہیں پڑھاتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں،

امیرے شرح وقایہ میخواند بے جد بزرگوار سبق نمی فرمود، (ملفوظات ص۳)

علمی مجلسیں اور مباحثے | سید علم اللہ (شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ) نے تنباکو کی تحریم[1] میں ایک رسالہ لکھا تھا اور قرآن کی اس آیت

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۤءُ — اس روز کا انتظار کیجئے جب آسمان پر ایک
بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ — صاف اور ظاہر دھواں دکھائی دے،

سے تحریم پر استدلال کیا تھا، انھوں نے اس رسالہ کو اپنے دو شاگردوں کے ذریعہ علمائے دہلی کے پاس تصویب کے لیے بھیجا، اتفاق سے وہ طالب علم سب سے پہلے رسالہ شاہ عبدالرحیمؒ کے پاس لائے، انھوں نے دیکھکر فرمایا کہ یہ استدلال غلط ہے، اور اس آیت کے شان نزول[2]، علمائے تفسیر کی آرا، اور فقہ و حدیث کی روشنی میں اس آیت کا مطلب واضح کیا، وہ لوگ تائید کے متوقع تھے، اس لیے شاہ صاحب کی بات پسند نہیں آئی، اور وہ ناخوش ہو کر چلے گئے،

ملا یعقوب تمباکو کی اباحت کے قائل تھے، اور اس کے جواز کے ثبوت کے لیے وہ اس کے اوقات میں بھی حقہ پیتے تھے، سید علم اللہ کے شاگرد شاہ صاحب کے یہاں سے ملا یعقوب کے پاس پہنچے، اور ان کے

---

[1] دلی میں اس وقت تنباکو کے جواز اور عدم جواز اور تحریم و اباحت پر بڑے زور شور کی مناظرانہ بحثیں اور رسالہ بازی ہو رہی تھی [2] اس آیت میں قحط زدوں کی حالت اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے،

سامنے رسالہ پیش کیا، انھوں نے اباحت کے دلائل کو ان کے سامنے بیان کیا، وہ دونوں طالب علم پھر شاہ صاحب کے پاس آئے، انھوں نے فرمایا کہ تم نے تحریم کا جو دعویٰ پیش کیا تھا، وہ تو بہرحال غلط ہے، اس کے بعد آپ نے ملا یعقوب کے استدلالات کے متعلق فرمایا کہ ان سے جاکر پوچھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد اسی لیے تو حرام کرلیا تھا کہ حضرت زینبؓ نے کہا تھا کہ آپ کے منہ سے مغافیر (بدبودار پھول) کی بو آتی ہے، شہد سے آپ کی کراہت کی وجہ کیا تھی؟ حدیث میں لہسن اور پیاز کے کھانے کے بعد فلا یقربن مسجدنا (ہماری مسجد کے قریب نہ جائیں) کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرتؐ خوشبو کو پسند اور بدبو کو ناپسند فرماتے تھے۔ ان آیات اور احادیث سے کیا یہ پتہ نہیں چلتا کہ رسول خدا کو ہر بدبودار چیز ناپسند اور بار خاطر ہوتی تھی، اس لیے اتباع سنت اور تقویٰ کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس قسم کی تمام چیزوں کو ترک کر دیا جائے، یہ دونوں طالب علم پھر ملا یعقوب کے پاس آئے، اور شاہ صاحب کی پوری تقریر نقل کی۔ ملا یعقوب نے اپنی لغزش کا اعتراف کیا اور حقہ پینا چھوڑ دیا۔ (انفاس ص) مسائل میں شاہ ولی اللہ صاحب کی اعتدال پسندی شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھی،

ایک مرتبہ شاہ صاحب کے مکان پر شہر کے علماء وصلحاء کا مجمع تھا، اس مجمع میں ایک شخص نے سوال کیا کہ خواجہ حافظ تو کہتے ہیں کہ

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است

درحیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست؟

اور عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوسکتا، ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، وجہ تطبیق کیا ہے؟ اس سوال پر سب نے اظہار خیال کیا مگر کوئی بات طے نہ پا سکی، آخر میں لوگوں نے شاہ صاحب سے رجوع کیا، انھوں نے علمی انداز میں شعر کی تشریح کی، اور فرمایا کہ

خدائے تعالیٰ محتجب است محجوب نیست

یعنی وہ خود اپنی ذات کی طرف سے تو عیاں ہے، مگر ہماری مادی آنکھوں کے لیے وہ پوشیدہ ہے خواجہ حافظؔ نے حالت شوق میں فرمایا ہے کہ اے خدا تعالیٰ تیرا جمال عام ہے اور یہ ہماری آنکھوں کا قصور ہے کہ تجھے وہ دیکھ نہیں پاتیں، تو پھر ہماری آنکھوں کا یہ پردہ کیوں نہیں اٹھا دیتا کہ وہ اسی دنیا میں تجھے دیکھ لیں، وعدۂ فردا سے کیا فائدہ ؟ تمام مجمع نے شاہ صاحب کی اس تشریح کی تحسین کی اور اسے قبول کیا،

ایک مرتبہ شاہ صاحب کسی صاحب حال بزرگ سے ملنے گئے۔ انھوں نے فرمایا میرے دل میں بہت دنوں سے یہ خدشہ پیدا ہو رہا ہے اور کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا، کہ علما کہتے ہیں کہ دنیا میں رویت باری محال ہے اور میں بالکل عیاں اور ظاہر طور سے دیکھتا ہوں، اگلے صوفیہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے، یہ شعر اسی معنی میں کہا گیا ہے:

دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند

ور نہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را

شاہ صاحب نے کہا آپ فرماتے ہیں کہ ظاہر و عیاں دیکھ رہا ہوں، یہ بصیرت کا بصر سے اشتباہ ہے، پھر فرمایا اپنی آنکھ بند کیجیے، انھوں نے بند کر لی، شاہ صاحب نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کا وہ پہلا ادراک باقی ہے یا نہیں ؟ انھوں نے فرمایا ہاں باقی ہے، شاہ صاحب نے فرمایا یہی اشتباہ کی پہچان ہے، اس وقت آپ کو (آنکھ بند کرنے کی صورت میں) جو ادراک ہو رہا ہے وہ بصر کا نہیں بلکہ بصیرت کا ہے، اور آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بھی بصری کا ہے، اسی طرح آپ رویت باری کا مشاہدہ تو دیدۂ بصیرت سے کرتے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ یہ مشاہدہ بصر سے ہو رہا ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب کی دقت نظر اور تطبیق بین المسائل کی خصوصیت یہ بڑی حد تک شاہ

عبد الرحیم کی اس متوازن ذہنیت اور تربیت کا بھی ہاتھ تھا، خود شاہ ولی اللہ صاحب نے کئی جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے،

متن قرآن کی تعلیم | ہندوستان میں علم و دانائی اور معقولات کے مقابلہ میں دوسرے دینی علوم کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی ہے، اور اس سے بہت کم اعتنا کیا گیا، دسویں صدی ہجری میں محدث دہلوی کے فیض سے حدیث کا چرچا تو عام ہوا مگر قرآن ابھی تک بیضاوی اور کشاف ہی کے ذریعہ سمجھا جا رہا تھا، متن قرآن کے پڑھنے پڑھانے کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا، ہندوستان کے علما میں شاہ عبد الرحیم صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآن کو فلسفہ اور منطق کے سہارے بغیر پڑھا پڑھایا، اور ہندوستان میں اس سنت حسنہ کو زندہ کیا، ان کے بعد ان کے خانوادہ نے اس طریقہ کو اپنے ترجموں اور درس و تدریس کے ذریعہ عام کر دیا، شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں:

غالبا در حلقۂ یاران بیرون از تلاوت ہر روز دو سہ رکوع بہ تدبر و بیان معانی می خوانند، (انفاس ۳۵ؔ)

شاہ ولی اللہ صاحب جہاں اپنے اوپر انعام الٰہی کا ذکر کرتے ہیں وہاں اپنے والد کے اس طریقۂ درس کو اپنے لیے نعمت عظمیٰ اور فتح عظیم فرماتے ہیں، جزء لطیف میں ہے:

واز جملۂ نعمت عظمیٰ بریں ضعیف آن بود کہ چند بار در مدرسۂ قرآن عظیم با تدبر ..... بخدمت ایشان حاضر شدم و ایں معنی سبب فتح عظیم افتاد، (انفاس ۲۰۳ؔ)

حکمت عملی | عام طور پر علما نے ارسطو کی حکمت نظری ہی کی طرف توجہ کی اور اسی کو اپنا سرمایۂ فخر سمجھا، اور حکمت عملی کی طرف جو خالص اسلامی چیز ہے ان کی توجہ ہوئی نہیں یا بہت کم ہوئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے اکثر و بیشتر افراد زندگی کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات میں تفکر و تدبر سے یکسر محروم ہو گئے، اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ کشاکش حیات میں کوئی کام نہیں دے

سکتے، لیکن شاہ عبدالرحیم کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ انھوں نے حکمت نظری کے ساتھ ساتھ حکمت عملی کو بھی اپنایا، اور اس کو زندگی میں برتنے اور سیکھنے پر زور دیا، انفاس میں ہے:

حضرت ایشان...... عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند، (ص۳)

شاہ ولی اللہ صاحب کو حکمت کی تعلیم جس کو انھوں نے پھیلا کر ایک دفتر بنا دیا، سب سے پہلے اپنے گھر ہی سے ملی تھی، فرماتے ہیں:

"(حضرت ایشان) این فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند، (ص۴۹)

مضمون کے آخر میں شاہ صاحب کے کچھ حکیمانہ جملے نقل کیے جائیں گے،

ذوق سخن | شاہ صاحب کو ذوق سخن سے بھی حصہ ملا تھا، اور وہ بڑے سخن فہم اور کسی حد تک سخن گو بھی تھے، افہام و تفہیم کے وقت بکثرت اشعار پڑھتے تھے، اشعار میں ایسے نکات پیدا کرتے تھے کہ ان کے بزرگ بھی تحسین کیے بغیر نہیں رہتے تھے، ان کی نکتہ آفرینی کے دو ایک واقعے اوپر نقل کیے جاچکے ہیں، ایک واقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے،

شاہ صاحب پہلی مرتبہ اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں گئے تو وہ گھر کی تعمیر میں مشغول تھے اور زبان پر یہ شعر جاری تھا،

ہر کرا ذرہ وجود بود   پیش ہر ذرہ در سجود بود

شاہ صاحب نے وجود کے لفظ کو شہود سے بدل کر پڑھا، حضرت خلیفہ نے فرمایا کہ میں نے صحیح نسخوں میں لفظ "وجود" ہی دیکھا ہے، شاہ صاحب نے عرض کیا جی ہاں! میں نے بھی ایک صحیح نسخہ دیکھا ہے جس میں لفظ "شہود" ہے، حضرت خلیفہ اس وقت مشغول زیادہ تھے اس لیے اس روز بات یہیں ختم ہوگئی، دوسرے روز شاہ صاحب پھر ان کے پاس گئے تو انھوں نے پوچھا، اگر لفظ "شہود"

مانا جائے تو شعر کے معنی کیا ہوں گے، شاہ صاحب نے عرض کیا کہ

ہر کہ را کہ اول شہود حضرت حق   جس کو ہر ذرہ میں اللہ تعالیٰ کا شہود
در ذرات عالم پیدا شد لامحالہ پیش ہر ذرہ   ہو جائے گا وہ یقیناً ہر ذرہ کے سامنے
سجود خواہد کرد (انفاس ص۸۸)   سجدہ کرے گا،

اور کہا کہ اگر "وجود" کا لفظ رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عبد و معبود دونوں بالکل مجتمع اور متحد ہو گئے، تو پھر سجدہ کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سنکر مرشد نے فرمایا کہ لیکن صحیح نسخوں میں لفظ وجود ہے اس کی کیا تاویل ہوگی، شاہ صاحب نے عرض کیا کہ اگر وجود کا لفظ صحیح ہے تو "وجود" کے معنی وجدان کے ہوں گے، جو شہود کا ہم معنی ہے، یعنی جس کو خدا کا وجدان ہو جائے گا وہ ذرہ ذرہ میں اس کا جلوہ دیکھے گا، اور اس کے سامنے سربسجود ہوگا، حضرت خلیفہ اس نکتہ آفرینی سے بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد سے ان کو بہت عزیز رکھنے لگے،

شاہ صاحب نے انفاس العارفین اور مکتوبات و ملفوظات میں سیکڑوں ہندی و فارسی اشعار استعمال کیے ہیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کتنے اشعار شاہ صاحب کے ہیں، صرف دو فارسی رباعیوں اور ایک ہندی شعر کے متعلق یہ تصریح مل سکی ہے کہ وہ آپ ہی کے ہیں، ہندی شعر جس میں رحیم تخلص ہے، یہ ہے:

جب جیو نہ تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہو جیو ناتھ
رحیم پیا سوں یوں ملی جوں بوند سمندر ماتھ[1]

---

[1] اس شعر سے ان کے مسلک وحدۃ وجود پر روشنی پڑتی ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا وجود نہ تھا تو ہمارا کوئی معشوق بھی نہیں تھا، لیکن اب معشوق تو ہے مگر وجود باقی نہیں رہا، اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح قطرہ سمندر میں ملکر فنا ہو جاتا ہے اسی طرح میں بھی خدا کی ذات میں اس درجہ مستغرق ہوں کہ کوئی الگ چیز رہ ہی نہیں گیا ہوں یعنی میرے وجود پر اب اسی کا قبضہ ہے، میرا وجود خود میرے قبضہ میں نہیں ہے،

ایک روز نماز ظہر کے بعد شاہ صاحب نے فی البدیہ یہ رباعی کہی:

گر تو راہی حق بجواہی اے پسر خاطر کس را مرنجان الحذر
در طریقت کین عظیم جرم است این چنین فرمود آں خیر البشر

اور شاہ ولی اللہ صاحب سے فرمایا اس کو لکھ لو، میرے دل پر القا ہوا ہے، کہ میں تمھیں یہ وصیت کر جاؤں،

یہ فارسی رباعی بھی ان ہی کی ہے:

اے کہ نعمہائے تو از حد فزوں شکر نعمتہائے تو از حد بروں
عجز از شکر تو باشد شکر ما گر بود فضل تو مارا رہنموں

تصنیف | شاہ صاحب کی اولاد و احفاد، خلفاء و تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ان کی بے بہا اور نہ مٹنے والی یادگار ہے، اور جن کے ذریعہ ان کا علمی اور روحانی فیض قیامت تک جاری رہے گا لیکن ان مادی یادگاروں کے علاوہ کچھ ان کی قلمی یادگاریں بھی ہیں جو گو کمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں مگر کیفیت اور افادیت کے اعتبار سے بہت قیمتی اور قابلِ قدر ہیں،

شاہ صاحب میں بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو چکا تھا مگر ان کے روحانی ذوق و استغراق نے اسے زیادہ ابھرنے نہیں دیا، خود ان کے مرشد خواجہ خرد ان سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ

ہمیں وصیت می فرمودند کہ خود را از درس و تدریس و مطالعہ کتب و حکایات
غیر ضروریہ یکسو دار و خود را بالکلیہ بآں نسبت (روحانی) گمار (انفاس ص۲۰۰)

لیکن پھر بھی اس فطری ذوق کا کچھ نہ کچھ ظہور ہو ہی کے رہا،

خیالی پر حاشیہ لکھنے کا خیال | زمانہ طالب علمی میں میر زاہد کے حواشی کی ترتیب و تسوید میں شاہ صاحب کی شرکت کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کی طالب علمی ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی ہے:

ایک بزرگ نے ان سے اسم ذات کے تصور کے دوام کی یہ تدبیر بتائی کہ تم کاغذ یا تختہ پر جس قدر ہو سکے اس کو لکھتے جاؤ، کچھ روز کے بعد خود بخود ذہن میں اس کا تصور بیٹھ جائے گا، چنانچہ شاہ صاحب نے یہ عمل شروع کر دیا، اس خامہ فرسائی سے ان کے ذوق تصنیف کو بھی تحریک ہوئی اور ان کو ملا عبد الحکیم کے حاشیہ خیالی پر، جس کے وہ ابھی طالب علم تھے، ایک دوسرا حاشیہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا، مگر وہ خیالی کا حاشیہ کیا لکھتے، ان کے لوح دل پر اسم ذات کا نقش ایسا جم چکا تھا کہ وہی صفحۂ قرطاس پر ابھرنے لگا، اس غلبہ میں وہ پندرہ سولہ صفحات اسم ذات سے سیاہ کر گئے اور ان کو اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ وہ حاشیہ لکھ رہے تھے یا کاغذ پر نقطہائے دل نمایاں ہو رہے تھے، خود فرماتے ہیں:

خواستم کہ حاشیۂ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی بنویسم یک جزء کما بیش اسم ذات می نوشتم وشعور نداشتم (انفاس ص۶)

شاہ صاحب کے استغراق روحانی کی وجہ سے گویا یہ کام تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، مگر اس واقعہ سے ان کے تصنیفی ذوق کا پتہ چلتا ہے،

تصوف کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ | شیخ تاج سنبھلی[1] نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے طریقۂ ارشاد و تصوف پر سلف کی عبارت سے التقاط کر کے عربی میں ایک رسالہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا جو ان کے خاندان میں بہت دنوں تک متداول رہا،

مکتوبات | صوفیہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں تعلیمات کا بڑا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے، جو باتیں

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں: اول خلفا حضرت خواجہ (باقی باللہ) بودند و در آخر بمکہ معظمہ مدت اختیار کردہ ہماں جا مدفون شدند و ایں فقیر از متاخران مشائخ اہل ہند ہیچکس را ندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد باشند۔ (انفاس ص۱۹)

ہزاروں صفحات کے مطالعہ سے نہیں معلوم ہوتیں وہ ان کے دو ایک جملوں میں معلوم ہو جاتی ہیں، گو ظاہری ترتیب و تبویب کے لحاظ سے انھیں تصنیف نہیں کہا جا سکتا، مگر افادیت کے لحاظ سے اس کا درجہ کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں ہوتا،

شاہ عبدالرحیم صاحب نے بھی کچھ خطوط اپنے متوسلین و تلامذہ کو لکھے تھے، جس کو ان کے چھوٹے صاحبزادے شاہ اہل اللہ صاحب نے "انفاس رحیمیہ" کے نام سے جمع کر دیا ہے، گو اس کی ضخامت ۳۵ ۔۴ صفحات سے زیادہ نہیں ہے مگر اس مجالہ میں جو اخلاقی جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں وہ سیکڑوں ضخیم کتابوں سے قیمتی ہیں،

شاہ صاحب کے ایک دوسرے مجموعۂ "مکتوبات" کا ذکر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ العالی نے کیا ہے، جس کا قلمی نسخہ جامعہ عثمانیہ کے کتبخانہ میں ان کی نظر سے گذرا تھا[۱] معلوم نہیں اس کو کس نے جمع کیا ہے اور وہ "انفاس رحیمیہ" سے کتنا مختلف ہے،

فتاوی عالمگیری فتاوی کی تالیف میں ملا حامد کے معاون کی حیثیت سے شاہ صاحب بھی شریک تھے، گو بعض اسباب کی بنا پر وہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے، پھر بھی جتنے دنوں رہے بڑے مفید اور قیمتی اضافے کیے، ذیل میں ان کی شرکت کا پورا واقعہ نقل کیا جاتا ہے،

فتاوی کی تدوین کا کچھ کام ملا حامد کے سپرد تھا، ملا حامد مرزا زاہد کے درس میں شاہ صاحب کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس تعلق کی بنا پر از راہ ہمدردی انھوں نے شاہ صاحب سے اس میں شرکت کے لیے کہا اور کچھ مالی معاوضہ کی بھی امید دلائی، شاہ صاحب شاہی ملازمت پسند نہیں کرتے تھے اس لیے انھوں نے انکار کر دیا، ان کی بیوہ والدہ کو اس کی خبر ہوئی تو بہت برہم ہوئیں، اور باصرار اس خدمت کے قبول کر لینے پر مجبور کیا، ناچار شاہ صاحب نے اس میں شرکت کر لی، لیکن جب شاہی ملازمت

---

[۱] مقدمہ سیرت سید احمد شہید،

کی خبر ان کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم کو ہوئی تو آپ انھوں نے ناپسندیدگی ظاہر کی اور ترک ملازمت کا مشورہ دیا، شاہ صاحب نے والدہ کی ناخوشی کا عذر کیا، لیکن مرشد نے فرمایا:

اذا جاء حق اللہ ذھب حق العباد جب خدا کا حق آگیا تو بندہ کا حق باقی نہیں رہا۔

شاہ صاحب نے مرشد سے پھر عرض کیا کہ آپ دعا فرمائیں کہ ملازمت خود بخود چھوٹ جائے تاکہ والدہ کی ناراضی کا سوال نہ پیدا ہونے پائے، مرشد نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا اور دعا فرمائی، عالمگیر کے سامنے کارکنوں کے عزل ونصب کی فہرست ہمیشہ پیش ہوتی رہتی تھی، ایک بار جو فہرست پیش ہوئی تو اس نے شاہ صاحب کے نام پر بھی قلم پھیر دیا، اور ان کے یہاں یہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ چاہیں تو اس کے بجائے کچھ زمین دیدی جائے، لیکن دربار شاہی سے قطع تعلق ہی کے لیے دعا کرائی گئی تھی، اس لیے اس پیش کش کے قبول کرنے کا کیا سوال تھا، خود فرماتے ہیں کہ

قبول نہ کردم وشکرانہ بجا آوردم وحمد خداے تعالیٰ گفتم (انفاس ص۲۲)

شاہ صاحب کی معزولی کا اصلی سبب تو ان کے مرشد کی دعا ہی تھی لیکن اس دعا کی قبولیت کے لیے کسی ظاہر سبب کی بھی ضرورت تھی، شاہ صاحب نے وہ ظاہری سبب یہ بتایا ہے:

اوپر ذکر آچکا ہے کہ شاہ صاحب جس حصہ پر نظر ثانی کر رہے تھے اس میں کوئی عبارت پیچیدہ تھی، اس پر انھوں نے ایک حاشیہ بڑھا دیا تھا، جس کی وجہ سے ملا نظام کو بادشاہ کے سامنے خفت اٹھانی پڑی تھی، چونکہ یہ حصہ ملا حامد کے سپرد تھا اس لیے ملا نظام نے ان سے بازپرس کی اور ان پر برہم ہوئے، ملا حامد تو اس وقت کچھ نہیں بولے مگر ملا نظام کے جانے کے بعد شاہ صاحب سے اظہار ملال کیا، شاہ صاحب نے کتاب کے ماخذ کی طرف رجوع کیا اور مسئلہ کی پیچیدگی ان پر واضح کی، وہ بظاہر مطمئن ہو گئے مگر ان کے دل میں ان کی طرف سے غبار باقی رہا، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ازاں باز اکثر آں قوم بر من حسد می بردند وبظاہر سبب این ہم ملال حسد ایشاں بود (انفاس ص۲۲)

گر ان توقّم سے غالباً وہ لوگ مراد ہیں جنھیں شاہ صاحب سے علمی چشمک تھی، اور انھوں نے اپنی دانست میں شاہی ملازمت چھوڑ کر ان کو نقصان عظیم پہنچایا تھا،

مسلک | شاہ صاحب ہر چیز میں اعتدال اور توسط کو پسند کرتے تھے، اور مختلف مسائل میں فریق بنکر اختلاف کو بڑھانے کے بجائے ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس وقت تک علما میں جو مسائل شرعی ہوں خواہ ذوقی پیدا ہو چکے تھے، ان سب میں ان کا مسلک زیادہ تر خذ ما صفا ودع ما کدر تھا، شاہ صاحب صوفی تھے مگر تصوف میں بھی انکی راہ تقشف و تقید کے درمیان تھی، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

> درہر امر توسط دوست می داشتند نہ چنداں در تقشف و تعمق فرورفتہ بودند کہ بہ رہبانیت کشد و نہ چنداں ترک تقید بآداب مترسل بودند کہ بتہاون میل کند (انفاس ص۸۰)

اس طرح تصوف یا فقہ کے جتنے طریقے ہیں ان میں کسی طریقہ کو اس حد تک بڑھنے بڑھانے یا ترجیح دینے کو جس سے دوسرے کی تنقیص ہونے لگے بہت ناپسند کرتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

> بارہا از فحوائے کلام حضرت ایشان معلوم شد کہ تفضیل صاحب طریق دیگر لاسیما بوجہے کہ بمنقصت مفضول مفضی باشد مکروہ می داشتند، (انفاس ص۸۰)

وحدۃ وجود | صوفیہ میں وحدۃ وجود کا مسئلہ ہمیشہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے، لیکن شیخ ابن عربی سے پہلے یہ مسئلہ خالص ذوقی اور وجدانی تھا، اس کی کوئی علمی یا شرعی حیثیت نہیں تھی، حضرت شیخ محی الدین ابن عربی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کو علمی اور نیم شرعی حیثیت بھی دی، ان کے بعد سے عام صوفیہ نے ان ہی کی تقلید کی، اور یہ تقلید کی رسم ایسی عام ہوئی کہ ہر صوفی (ان میں مستثنیات بھی ہیں) خواہ اس کے ذوق و کیف سے آشنا ہو یا نہ ہو وہ اپنے کو لذت آشنا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا تھا، اور بغیر اس کے اپنے کو ہلکا محسوس کرتا تھا، شیخ کے اس عقیدہ پر سب سے پہلے ابن تیمیہؒ نے اور ان کے بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ نے

نے تنقید کی،

امام ابن تیمیہؒ نے قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں وحدت وجود کا ابطال کیا، مجدد الف ثانیؒ نے جو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ بادۂ معرفت کے بھی لذت شناس تھے، اس کی تردید بھی کی اور اصلاح بھی، اور ان کی "ہمہ اوست" کی تعبیر کو "ہمہ از اوست"، اور "وحدت وجود" کو "وحدت شہود" اور عینیت کو والیت و مدلولیت سے بدل دیا جس سے مسئلہ کی اصلی صورت سامنے آگئی، اور عوام کی گمراہی کے تمام منافذ بھی بند ہو گئے،

شاہ عبد الرحیم صاحب کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ عام طور پر صوفیہ کا مرکز نظر بنا ہوا تھا، خود شاہ صاحب کے خاندان میں کئی ایسے بزرگ گذر چکے تھے[۱] اور بعض موجود بھی تھے[۲] جو وحدۃ وجود کے قائل تھے، اس لیے ان پر بھی اس ماحول اور خاندان کا اثر تھا، وہ شیخ ابن عربی کے فلسفۂ وجود اور ان کی کتابوں کی طرف کافی حد تک مائل تھے، ابن عربی کی کتابوں سے ان کو اسقدر شغف تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

اگر خواہم فصوص را بر سر منبر تقریر کنم و جمیع مسائل آں را بآیات و حدیث مبرہن سازم و بوجہی بیان نمایم کہ ہیچکس را شبہہ نماند (انفاس ص۲۰۳)

لیکن ان کے مرشدین کے جذبۂ اتباع شریعت[۳] اور مجدد صاحب کے سلسلہ[۴] سے وابستگی نے انھیں

---

[۱] مثلاً عبد العزیز شکر بار اور شیخ رفیع الدین وغیرہ جو ان کے نانا اور پرنانا ہوتے تھے [۲] مثلاً ان کے بڑے بھائی شیخ ابو الرضا محمد جن کی صحبت میں ان کی ظاہری اور باطنی دونوں تعلیم ہوئی [۳] ان کے مرشد سید عبد اللہ اور خلیفہ ابو القاسم دونوں اتباع شریعت پر بیحد زور دیتے تھے، سید عبد اللہ حضرت آدم بنوری کے خاص تربیت یافتہ تھے، اور حضرت آدم بنوریؒ حضرت مجدد صاحب کے اجل خلفاء میں تھے، اس لیے مجدد صاحب کے روحانی فیض سے وہ خالی نہیں تھے [۴] مجدد صاحب کے سلسلہ تصوف کا فیض شاہ صاحب تک حافظ سید عبد اللہ کے علاوہ خواجہ خرد کے ذریعہ بھی پہنچا تھا، جو مجدد صاحب کے خاص صحبت یافتہ تھے،

اس مسئلہ میں بھی جادۂ اعتدال سے بہت کم ہٹنے دیا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اس کو ذوقی اور وجدانی چیز سمجھکر عام طور پر اس کی تشریح سے گریز کرتے تھے، کہ مبادا عام لوگ ذوق وشوق کی باتوں کو نہ سمجھ سکیں اور ورطۂ ضلالت میں پڑجائیں، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ

از تصریح بوحدت وجود احتراز می نمودند کہ غالب اہل زمان آں رافہم نمی توانند کرد و در ورطۂ الحاد وزندقہ می فتند۔ (انفاس ص ۴۳)

پھر بھی دل کا پیمانہ جس شراب سے لبریز تھا وہ کب تک اثر نہ دکھاتا، چنانچہ کبھی کبھی ان کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے تھے جن سے ان کے اندرونی میلان کا پتہ چلتا ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

کفر شریعت دو معبود پنداشتن وکفر حقیقت دو موجود دانستن (مکتوبات ص ۳۳)

ایک دوسرے مکتوب میں اس کو یوں لکھتے ہیں:

دو معبو گفتن کفر شریعت ودو موجود دیدن کفر طریقت (مکتوبات ص ۲۱)

تعلق حادث با لقدیم کی علمی انداز میں یوں توجیہ کرتے ہیں:

صور علمیہ کہ آنرا ملاحظہ می نمایم تحقق وتقرر در خارج ندارند بقوۃ علمیہ ما متحقق اند وآں ہمہ علم ماست کہ بچندیں رنگ برآمدہ شبہہ نیست کہ ایں صور را عین علم نتواں گفت زیرا کہ علم بود وایں صور نبودند ومنفصل از علم نیز نتواں گفت زیرا کہ ایں تلونات را قیوم ومنشا بود (انفاس ص ۴۵)

مسئلہ صفات کے متعلق فرماتے ہیں کہ

صفات عین ذات اند بمعنی آنکہ ذات فقط در صدور آثار از صفات زائد قائمہ بذات کفایت میکند (انفاس ص ۴۵)

قرآن کی اس آیت اینما کنتم ھو معکم (تم جہاں ہو اللہ تمھارے ساتھ ہے) کی توضیح

کرتے ہوئے فرمایا کہ

> این معیت محض بعلم نیست بلکہ در تحقق و تقرر نیز در بیجا خدشہ می آید زیرا کہ
> ایں معیت معیت جوہر بجوہر یا عرض بعرض یا جوہر بعرض نیست معنی است الطف از ہمہ
> معیات (انفاس ص۸۲)

اس مسئلہ معیت کی ایک دوسری لطیف توجیہ کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس قسم کے تمام مسائل کو ذوقی اور وجدانی سمجھتے تھے، جن میں ہر شخص اپنی روحانی استعداد اور قوت مشاہدہ کے مطابق مختلف توجیہیں کر سکتا ہے، مگر کسی کے ذوق و وجدان اور قوتِ مشاہدہ کے فیصلہ کو دوسرے کو ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، فرماتے ہیں:

> ہر کسے بحسب استعداد خود از مسئلہ معیت حظے گرفتہ است طائفہ دانستہ اند کہ حق
> سبحانہ بعلم وقدرت وسمع وبصر محیط است قال اللہ تعالیٰ مایکون من نجوی ثلثۃ الآیۃ
> وطائفہ معائنہ کردہ کہ ہر فعلی وانفعالی وحرکتی وصفتی کہ در عالم ظاہر است از حضرت
> حق است، قال تعالیٰ قل کل من عند اللہ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ
> وطائفہ مشاہدہ کردہ کہ ہرچہ ہست اوست وغیر او چیزے نیست، قال اللہ تعالیٰ
> کل شیئ ھالک الا وجہہ وقال ھو الاول والآخر والظاھر والباطن،
> وطائفہ حق را در حق دیدند وعبارت از کنہ ایں مقام قاصر است (انفاس ص۸۲)

عمل بالحدیث شاہ صاحب فقہ میں حنفی مسلک رکھتے تھے، مگر اس وقت کے عام فقہا کی طرح جامد اور انتہا پسند نہیں تھے، بلکہ احادیث و آثار کا تتبع بھی کرتے تھے، اور جس مسئلہ میں جو مسلک حدیث کی روشنی میں انھیں صحیح معلوم ہوتا تھا اسے اختیار کر لیتے تھے، خواہ وہ حنفی مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ عام فرض نمازوں میں امام کے پیچھے اور نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب

لکھتے ہیں:-

مخفی نماند کہ حضرت ایشان در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل می کردند الا

بعض چیزہا کہ بحسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح می یافتند از انجملہ آنست

کہ در اقتدا سورۂ فاتحہ میخواندند و در جنازہ نیز (انفاس ص۸۰)

ایک مرتبہ شیخ عبدالاحد نے قرأۃ خلف امام کے بارے میں شاہ صاحب سے بحث کی اور اس کی نفی میں یہ عقلی دلیل پیش کی کہ جب چند آدمی بادشاہ کے دربار میں کوئی غرض لے کر جاتے ہیں تو اسے پیش کرنے کی خدمت ایک شخص کے سپرد کر دیتے ہیں، ہر شخص اپنی اپنی عرضداشت الگ الگ پیش نہیں کرتا، شاہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اس پر نماز کا قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ

اصل در صلاۃ مناجات و تہذیب نفس است بدعا و خضوع چنانکہ حدیث

لا صلوٰۃ لمن لا یقرأ بام الکتاب دلالت می کند،

اس کے بعد فرمایا خدا تعالیٰ ایسا سمیع (سننے والا) ہے کہ اگر ساری دنیا کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی مختلف عرضداشتیں اپنی اپنی زبان میں بیک وقت شروع کر دیں تو بھی ایک ساتھ ہر شخص کی گذارش سن سکتا ہے اور اس سے کسی دوسرے کی گذارش میں کوئی خلل نہیں پڑے گا،

اس کے بعد ان سے فرمایا کہ اس زمانہ میں تو امام اپنی زبان سے لفظ الحمد کہتا ہے مگر اسکی حقیقت اور نماز کی روح سے بالکل غافل ہوتا ہے لیکن آپ امام کے تشویش ذہن سے احتراز نہیں کرتے، (مگر دربار الٰہی میں چند آدمیوں کے ساتھ مناجات کرنے کو باعث تشویش سمجھتے ہیں)

اسی طرح نماز سفر میں کبھی کبھی رخصت پر بھی عمل کر لیا کرتے تھے، اور قصر کے بجائے پوری نماز پڑھتے تھے، فرماتے ہیں:

دستورے از اسفار در وقتی از اوقات علوتے بخاطر رسید کہ تصر موذ رخصت است گاہی

با تمام ہم عمل باید کرد بداں طریق نماز خواندم (انفاس ص۱۳۵)

توسل | اس مسئلہ میں بھی عام متصوفین نے بہت سی بدعتیں پیدا کردی ہیں جس سے عام مسلمان زندگی کے مشکلات و مصائب میں بارگاہ خداوندی میں رجوع ہونے کے بجائے مختلف چوکھٹوں پر سر نیاز خم کرنے لگ گئے ہیں اور ان کو واذا سئالک عبادی عنی فانی قریب پر عملاً بالکل یقین نہیں رہ گیا ہے،

اس مسئلہ وسیلہ کی خامیوں پر سب سے پہلے غالباً امام ابن تیمیہؒ نے قلم اٹھایا اور اس کو شریعت کی روشنی میں منقح کیا، ان کے مسلک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وسیلہ پکڑنا صحیح نہیں تھا لیکن بعض دیگر ائمہ کی طرح شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وسیلہ کو جائز رکھا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے وسیلہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے، ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

وہر چہ مشکل افتد دو از روحانیت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم باید

خواست و از غیر حبیب خدا کسے دیگر رجوع نباید کرد (مکتوبات ص۱۴۹)

عرس وسماع | عمل بالحدیث کے جذبہ کے باوجود شاہ صاحب کبھی کبھی عرس اور سماع میں بھی شرکت کر لیا کرتے تھے[۱] لیکن ناجائز اغراض کے لیے جو لوگ ختم خواجگاں وغیرہ پڑھتے تھے سے وہ ناپسند کرتے تھے،[۲] (باقی)

---

۱ انفاس ص۱۲۸، ۲ انفاس ص۴۳،

حیات شبلی

ہندوستان میں علم حدیث

(الطریق تالیف علوم حدیث)

از

مولوی ابو یحیی امام خان صاحب نوشہروی

مشارق الانوار کی شرحین | مشارق الانوار بارہ ابواب مین مرتب ہے، اور صحاح ستہ کے بعد جس کتاب پر سب سے زیادہ شرحین لکھی گئین، ان مین شاید مشارق ہی ہو، جن مین سے اب تک اس کی ۱۲ شرحین راقم سطور کو معلوم ہو سکی ہین،

۱۔ تحفۃ الابرار: شیخ اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی الحنفی، (۷۸۶ھ / ۱۳۸۴ء)

۲۔ شوارق الاسرار العلیۃ (۴ مجلدات میں) صاحب القاموس مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی الشیرازی (۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء)

۳۔ کشف المشارق (در سہ مجلدات) از خیر الدین خضر بن عمر الطوفی (من علماء الدولۃ العثمانیۃ)

۴۔ المطالع المصطفویہ: شیخ امام سعید بن محمد بن مسعود الکازرونی (۷۵۸ھ / ۱۳۵۶ء) انھون نے ہر باب کے آخر مین اُس باب کی احادیث لکھ کر کتاب کے آخر مین ۲۲۴۶ میزان ثبت فرمادی ہے، موجودہ متداول نسخہ مشارق پر انہی کے شمار کردہ اعداد ثبت ہین،

۵۔ مبارق الازہار فی شرح مشارق الانوار عز الدین عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک م ۷۹۷ھ / ۱۳۹۴ء (طبع دولت عثمانیہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

شروع مین ۱۲ سطرون کا مقدمہ (لابن الملک) ہے، پھر مقدمہ مشارق الانوار کی شرح از ص ۳ تا ۲۰، اسی صفحہ ۲۰ سے شرح متن کا آغاز ہے، یہ ۲ جلدون مین ہے، جلد اول ۶۱۱ صفحات اور ثانی ۵۰۵ صفحون پر ختم ہوئی ہے،

مبارق الازہار مین بسلسلہ شرح وہ تمام خوبیان موجود ہین، جو قدما کی شرحون مین پائی جاتی ہین، یہان تک کہ ابن الملک اپنے زیر نظر نسخہ مشارق الانوار مین تصحیفاً جو کچھ پاتے ہین، بلا تامل ذکر کر دیتے ہین، فرماتے ہین،

"اعلموا انی التزمت ان ابین فی کل حدیث انہ مما انفرد بہ احد الشیخین او اتفقا علیہ لانی وجدت نسخ المشارق مختلفۃ فی العلامات ولم تکن معلومۃ ما ھی الاصح وانبہ علی ما وقع من المصنف فی بعض المواضع من علامات غیر مطابقۃ للواقع بان ینسب الحدیث الی الصحیحین ولم یکن الا فی احدھما او اخرجہ غیرھما او لم یوافق اسم الراوی لما فیھما واذکر من احوال راوی الحدیث و واقتصرت علی ما ذکرہ مع منبھاً فی ذلک للتنبیہ اتفقت النسخ الفاظھا"

مین نے التزام کیا ہے کہ شیخین مین اگر کوئی صاحب کسی حدیث مین منفرد ہین، تو اس کا ذکر کر دون، اور دونون (بخاری و مسلم) مین یہ حدیث منقول ہے تو اسے لکھ دون، کیونکہ مشارق الانوار کے متداول نسخے علامات ..... مین کہیں کہیں غیر مساوی ہین، جس سے بادی النظر مین اصل ماخذ کی اطلاع مشکل ہو جاتی ہے، یہی دشواری صحابی (مروی عنہ) کے معاملہ مین کہیں کہیں نظر آئی، اور اس کی تصحیح بھی کر دی گئی،

گویا مبارق الازہار مین شرح کے ساتھ مشارق الانوار کی صحت تخریج کی خدمت بھی کی گئی ہے
ن اگر حدیث (فی المتن) بخاری مین ہے تو اس کا ماخذ کتاب و باب لکھدیا، اور مسلم مین ہے تو اس
کتاب و باب کا ذکر کر دیا، دونون مین ہے تو ہر دو کا حوالہ کتاب و باب ضبط فرما دیا ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ ابن الملک نے مشارق کی ایک ایک حدیث کو صحیح سے ملا دیا ہے، اور جو حدیث
مقابلہ کے بعد نہین ملی صراحت کر دی کہ وہ حدیث بخاری مین یا مسلم مین یا ان دونون مین سے کسی مین
س ملی، ایسی حدیثین جو صحیحین مین سے کسی مین نہین ہین، ابن الملک کو بے شمار ملی ہین، نہیں کہا جا سکتا
مؤلف مشارق ہی کے پیش نظر صحیحین کے نسخون مین کوئی کمی تھی، یا انھون نے بخاری و مسلم کے سوا
ی اور کتاب سے لیا، یا امام حسن (صغانی) کے بعد کے محدثین نے مشارق مین ایسی احادیث کا
ضافہ کر دیا، جو صحیحین مین تو نہ تھین، یا نساخین نسخ کی بے پروائی سے ماخذ کا اندراج غلط ہوتا گیا،
ریا ابن الملک صاحب مبارق الازہار ہی کے پیش نظر نسخون مین تصحیف ہو چکی تھی جن پر اعتماد کر کر
فیں لم یجدہ (نہیں ملی) و لم یجدہ (نہیں ملی) لکھنا پڑا،

شروع مین راقم السطور نے ارادہ کیا، کہ چند احادیث کا مقابلہ کیا جائے، مبارق الازہار
، ایسی احادیث پر نشان بھی کر دیئے گئے، مگر اپنی کم ہمتی دیکھ کر آگے قدم نہ بڑھا سکا، کاش

ع مردے از غیب برون آید و کارے بکند

ابتدائے مضمون مین عرض کیا گیا ہے کہ مؤلف مشارق نے اقتباس حدیث میں کوئی ایک ٹکڑا لے کر
داد کر دیا، اب شارحین کے لئے تفحص کا میدان وسیع تھا، ہر ایک نے بقدر ہمت اس ٹکڑے کا بقیہ حصہ
اش کیا، اور اپنی سعی مشکور کو مشکور تر بنا دیا، یہی طریقہ مولانا خرم علی بلہوری اددھی (م ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء) نے
فۃ الاخیار مین قائم فرمایا ہے[1]

---

[1] ص ۷۰ ملاحظہ ہو، اسی حدیث کا بقیہ ٹکڑا جسے ابن الملک نے مستخرج فرمایا ہے، مولانا خرم علی نے وہی

ابن الملک (عبد اللطیف بن عبد العزیز م ۸۰۱ھ) نے مبارق الازہار[51] میں جو کچھ لکھا ہے، سید صدیق الحسن م ۱۳۰۷ھ) نے اُسے اور بھی واضح پیرایہ میں (اتحاف النبلاء) میں ضبط فرما دیا لکھتے ہیں:

" مشارق الانوار میں صغانی کے شمار کے مطابق ۲۲۴۶ حدیثیں ہیں، اور تمام بخاری و مسلم کی ہیں، (لا غیر) مصنف فرماتے ہیں کہ یہ کتاب مجھے اس قدر پسند ہے کہ میں خود اس کی روشنی میں راستہ دیکھتا ہوں، اور اس پر عمل کرتا ہوں، اس کو میں نے خلیفہ المستنصر ابن الظاہر بن المستضئ العباسی کے لئے لکھا"، اور اس میں اپنی تالیف مصباح الدجی، اور الشمس المنیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نجم و شہاب دونوں کی مفید باتیں اس میں داخل کیں[53]"

مولانا عبد الحئی لکھنوی م ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء نے بھی ابن الملک اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ الفوائد البہیہ میں کیا ہے[54]

دیگر شروح مشارق

مشارق کے دیگر شروح میں اولاً تین حاشیے مبارق الازہار کے تین مختلف اہل علم نے لکھے ہیں:-

(۶) حاشیہ مبارق الازہار:- اوّلہ الحمد للہ الذی خلق الارواح:-

(محشی کا نام معلوم نہ ہو سکا)

(۷) حاشیہ بر حاشیہ مذکور (مولانا ابراہیم بن احمد المعید ؟)

اوّلہ الحمد للہ الذی خلق ارواح ذوی العقول وسماہ صواب الافکار:-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۴) حصہ فائدہ میں اردو میں بیان کرکے اس پر نتیجہ مرتب کیا ہے، اور اس کے بعد دو سطور (ص ۴۶) پر دیکھئے، جن پر لکیر کھینچ دی گئی ہے [51] مبارق الازہار ص ۱، ۱۸، [52] الشیخ الامام سعید بن محمد ابن مسعود الکازرونی م ۷۵۸ھ شارح مشارق الانوار [53] اتحاف النبلاء ص ۱۰۲ [54] الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص (۴۴)

(۸) حاشیہ اُخری محمد بن احمد رفیقی الشہیر بوحی زادہ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء اوّلہ الحمد للہ الذی ہدانا لہذا

(۹) انوار البوارق فی ترتیب شرح المشارق ابراہیم بن مصطفیٰ، اس میں شیخ ابراہیم نے مبارق الازہار کی ترتیب (مع مشارق) مشکوٰۃ المصابیح کی طرح کردی[۱] اسی طرح خواجہ ازدانی جونپوری م ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء نے مصابیح الانوار کے نہج پر اسے مدوّن کیا، جیسا کہ شرح نمبر ۲۷ پر آئے گا، اور اسی طرح مولوی عبد الغفور صاحب غزنوی امرتسری (م ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) نے مشارق الانوار کو مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر مرتب کیا، جس کا ذکر شرح نمبر (۳۱) پر آتا ہے،

یہ کتاب ۹۸۶ھ/۱۵۷۹ء میں ختم ہوئی،[۲]

(۱۰، ۱۱) از مولیٰ شمس الدین احمد بن سلیمان المعروف با بن کمال پاشا م ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء)

(۱۲) حدائق الازہار شرح مشارق الانوار از وجیہ الدین عمر بن عبد المحسن الارزنجانی، اولہ الحمد للہ علی تواتر فضلہ و آلائہ،

شارح نے اس میں کتب ذیل سے استفادہ کیا، شرح السنۃ، نوادر الاصول، الفائق، النہایۃ، مجمع الغرائب، مطالع الانوار، شرح البیضاوی، التحفۃ لبدر الدین الاربلی،

(۱۳) شرح از شمس الدین ابن الصائغ محمد بن عبد الرحمان الزمردی الحنفی ۷۷۶ھ/۱۳۷۵ء،[۳]

(۱۴) شرح از مولیٰ محمد بن مصلح الدین القوجوی المعروف بشیخ زادہ المحشی ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء

(۱۵) شرح: جلال الدین رسولؒ بن احمد التبانی م ۷۹۳ھ/۱۳۹۰ء

(۱۶) شرح وحید الدین،

---

[۱] تمہ فہرست مبارق الانوار (لابن الملک) ج ۱ ص ۲۰ [۲] ایضاً مبارق الازہار جلد ۱ ص ۲۰ [۳] وکان بارًا متبحرًا جامعًا للعلوم ضابطًا للفنون سمع الحدیث بمصر و شام و برع و درس و افاد و تصانیف... و شرح مشارق الانوار فی الحدیث مات ۷۷۶ھ/۱۳۷۵ء (الفوائد البہیۃ)

(۱۷) دقائق الآثار (تلخیص مشارق) محمد بن محمد الاسدی م ۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء،

(۱۸) ضیاء المشارق الجدیر بالوقوع علی المفارق بہ ضیاء الدین علی بن محمود الکرمانی (متعدد جلدوں میں)

(۱۹) شرح، شمس الدین العطابی،

(۲۰) حاشیہ:- قاسم ابن قطلوبغا الحنفی م ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء،

(۲۱) مبارق الازہار: علی بن حسن ۹۳۱ھ/۱۵۲۹ء میں ترتیب پائی، اور اسی نام سے ایک شرح نمبر ۵ میں مذکور ہوئی، مگر علی حسن نے پہلے مشارق الانوار کو مبوب کیا، اس کے بعد شرح نمبر ۵ (ابن الملک م ۷۹۷ھ/۱۳۹۴ء) کو از سر نو مرتب کیا، نہیں کہا جا سکتا کہ کس اسلوب پر، البتہ علی بن حسن کی شرح کا حرف اوّل:- الحمد لِلّٰہِ الذی لَہٗ ما فی السّمٰوات ہے اور ابن الملک کی شرح کا پہلا جملہ اَلحمدُ للّٰہِ علیٰ ھدایۃ الھدایۃ دالاسلام ہے،

(۲۲-۲۳) علاء الدین یحییٰ بن عبد اللطیف الکاؤسی القزوینی، ان میں سے ایک کا حرفِ اوّل الحمد للہ الذی خلق السّمٰوٰت مزینۃ بمصابیح النجوم:- ہے، اور اس کی تالیف سے ۷۴۵ھ/۱۳۴۳ء میں بغداد مستنصریہ میں فارغ ہوئے، یہ شرح صغیر ہے، اور دوسری شرح کبیر ہے، مگر حرف اول غیر معلوم!

(۲۴) تحفۃ حسنا (ایک صد حدیث مشارق) عبد الباقی معروف بہ طورسون زادہ اولہ: اَلحمدُ للّٰہ الذی جَعَل الکتاب والسّنۃ[۱]:

ہندوستانی علماے حدیث کی شروح مشارق

اور اب تک سات ایسے شروح کا نشان ملا ہے۔ ان سب میں مقدم،

(۲۵) شرح مشارق الانوار، از مولانا شمس الدین یحییٰ اودھی ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء مصنف کے متعلق

[۱] اتحاف النبلاء ص ۱۴۸، ۱۴۹،

اخبار الاخیار میں ہے

"از اعاظم خلفاے شیخ نظام الدین اولیا ست گویند اما شرح مشارق است"

اور صاحب تذکرہ علماے ہند نے شرح مشارق الانوار ضبط فرمایا ہے (ص ۷۰)

ہوے نقل کردہ کہ ما تناوب بنی قطا ، از اودھ بدہلی از براے تحصیل علم او آوردہ [۵۱]

صاحب نزہۃ الخواطر (سید عبدالحئی بریلوی م ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء) آپ کا نام محمد اور ابو یحییٰ ثبت فرماتے ہیں ، شمس الدین نام ہو یا لقب دونوں تذکرہ نویس اس میں متفق ہیں [۵۲]

(۲۶) شرح مشارق الانوار از مولانا امام مظفر بلخی بہاری م ۸۰۳ھ ۱۴۰۰ء

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین منیری کے بعد ان کے جانشین مولانا امام مظفر بلخی قدس سرہ ہوئے ، جس وقت حضرت مولانا مرید ہوئے اسی وقت وہ ایک متبحر عالم تھے ، چنانچہ مونس القلوب ملفوظ مولانا احمد لنگر کی یہ عبارت ہے ،

"پیش ازاں کہ شیخ مظفر مرحوم بحضرت مخدوم جہاں بیایند ، در دہلی شور علم ایشاں شدہ بود ، سلطان فیروز در کشک لعل بدرس گردانیدہ بود"

بعدہ خوب مجاہدہ کیا ، ریاضت کی اور حضرت مخدوم کی صحبت میں رہے ، حضرت مولانا کے مکتوب میں بکثرت صحیحین کی حدیثیں آتی ہیں ، اور حضرت مخدوم برابر اُن کو امام لکھتے ہیں ، مکتوبات بست و ہشت کے مکتوب دوازدہم سے یہ ثابت ہے ، کہ مولانا امام مظفر بلخی نے مشارق الانوار کی شرح بھی لکھی تھی ، ان کی رحلت ۸۰۳ھ ۱۴۰۰ء میں ہوئی [۵۳]

---

[۵۱] اخبار الاخیار شیخ عبدالحق دہلوی ص ۹۰ [۵۲] نزہۃ الخواطر ص ۱۴۲

[۵۳] مستفاد از رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۲۳ ص ۲۹۵ تا ۲۹۹ بعنوان حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری اور علم حدیث ،

(۲۷) مدارج الاخبار شرح مشارق الانوار از خواجہ ارزانی محدث جونپوری (م ۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء)

شیخ ارزانی کے لڑکے احمد تھے، صاحب تذکرہ علمائے ہند نے لکھا ہے کہ ارزانی عہد فرخ سیر کے مشہور محدثین میں سے تھے، احادیث مشارق کی بہ ترتیب حروف تہجی بہ حسب ترتیب مصابیح الانوار تالیف کرکے اس کا نام مدارج الاخبار رکھا، عہد شاہی میں وہ منصب تک پہنچے، سال وفات ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء ہے،[51]

(۲۸) تحفۃ الاخیار اردو ترجمہ مشارق الانوار مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۷۱ھ) مطبع نظامی کانپور ۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء (و دیگر مطابع) مولانا خرم علی ولی اللّٰہی خاندان (دہلی) کے شاگرد تھے، ابتداء روش عام کے مطابق غالی مقلد کہ بقول صاحب تذکرہ علمائے ہند منع قراءۃ فاتحہ خلف الامام پر رسالہ لکھا، مگر جب قسمت نے پلٹا کھایا اور مولانا اسمٰعیل شہید کی مصاحبت نصیب ہوئی، تو اتباع سنت (من غیر تقلید) کا رنگ شوخ ہوتا گیا، اور اسی پر خاتمہ ہوا،

نواب ذوالفقار بہادر (باندہ) کی خواہش پر رد المختار کا اردو ترجمہ کیا، کتاب النکاح و کتاب البیع و کتاب الاقرار لکھ چکے تھے، کہ داعی اجل کو لبیک کہا، جس کو اُن کے بعد مولوی محمد احسن صاحب نانوتوی نے اُن کے ورثہ سے بمعاوضہ حق تالیف لے کر مکمل کیا، اور غایۃ الاوطار [illegible] کے نام سے طبع کرا دیا،

اس کے سوا مشارق الانوار کا اردو ترجمہ اور آداب الحرمین اور رسالہ نصیحۃ المسلمین آپ کی تصانیف سے ہیں،[52] اور ایک رسالہ جہادیہ جس کی اشاعت کی اجازت نہ مل سکی،[53]

مولانا خرم علی کی تالیفات میں مثنوی جہادیہ کا ذکر صرف کتب سیر میں برائے بیت رہ گیا ہے، سابقہ حکومت (برٹش) نے اسے بھی ممنوع الاشاعت قرار دیا تھا، مگر مرکز مجاہدین اسلام چمرقند

---

[51] معارف (مذکور) ج ۲۵ ص ۲۴، بسلسلۂ مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" بحوالہ گنج رشیدی [52] اصل کتاب فارسی میں ہے، جس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ اسلامیہ کالج پشاور میں موجود ہے، الباب المعارف العلمیہ ص ۱۹۲

[53] مستفاد از تراجم علمائے حدیث ہند جلد ۱ ص ۵۰۹ تا ص ۵۱۲،

(علاقۂ آزاد) سنے اپنے لیتھو پریس میں چھاپ دیا، یہ مثنوی ۲۴۴ اور رسائل جہادیہ سید احمد کی کا مضمون تحویل میں ہے، اتفاق سے اسی دوران میں اخبار (اسبوعیۃ) الحجاب چمرقند مرحوم کے مدیر تحریر مولوی فضل الٰہی صاحب وزیر آبادی سے مشرف ملاقات حاصل ہوا، فرماتے ہیں کہ ہمارے پریس چمرقند میں سب سے پہلے یہی مجموعہ طبع ہوا، مثنوی جہادیہ کے پہلے ۲ شعر:

بعد تحمید خدا نعتِ رسولِ اکرم — یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد — اہلِ اسلام اسے شرح میں کہتے ہیں جہاد

ترجمہ اور مشارق الانوار (مولانا خرم علی) ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ کتب حدیث کا سب سے پہلا اردو ترجمہ یہی تحفۃ الاخیار ہے، مولانا خرم علی بلہوری کا سال وفات ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء ہے، ان کے بعد نواب قطب الدین خان دہلوی (م ۱۲۸۹ھ/۱۸۶۲ء) نے مشکوۃ المصابیح کا اردو ترجمہ و شرح بنام مظاہر حق کیا،[1]

تحفۃ الاخیار کی یہ اولیت بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ اس کے مؤلف مولانا بلہوری کی وفات (۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء) کے بعد ۳ سال تک متواتر تین مرتبہ طبع ہوا، جیسا کہ نسخہ مطبوعہ بمبئی (تاریخ ۲۲، رمضان ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) کے آخری ص (۱۲۶۲) پر مرقوم ہے،

"پہلی مرتبہ نواب ذوالفقار علی خان بہادر لکھنؤ نے سب وقفاً چھپوایا، اور زیر نظر نسخہ نا خدا محمد علی بن نا خدا محمد حسین صاحب ادگے کی تائید اور اعانت سے تیسری مرتبہ معمورہ بمبئی کے مطبع محمدی میں نہایت صحت کے ساتھ ملبوس طبع کا پہنایا (مشارق، طبع محمدی بمبئی ۱۲۶۲ھ) بمبئی کے نسخہ پر مولانا (بلہوری) کی مرتبہ فہرست بھی منضم ہے، اس فہرست کی پہلی فصل "تحقیق مفہوم بدعت" ہے، جو کانپوری نسخہ (طبع ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کے آخر میں بھی شامل ہے،

---

[1] لیکن یہ ترجمہ نواب صاحب ممدوح کا نہ تھا، بلکہ شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی مہاجر مکی (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) کا جسے نواب صاحب نے بادنیٰ تغیر مہذب فرمایا، اور اس کا اعتراف بھی کیا،

جابر بن حیان

(دنیاے اسلام کا نامور کیمیا داں)

از مولوی سید وحید احمد صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

جابر نے اپنی بعض کتابیں برامکہ اور دوسرے امرار کے نام معنون کی تھیں، مورخین نے ان کی تصریح سے کیا ہے، ان میں کتاب اسطقس الاس الاول الثانی اور کتاب اغراض الصنعۃ وغیرہ قابل ذ... جابر کی وہ مشہور کتابیں جن کا تذکرہ ابن ندیم نے کیا ہے[۱] اور جو قلمی یا مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، حسب ذیل ہیں:-

۱- کتاب الواحد الاول، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہے، جس کا نمبر ۶۰۲۲ ہے،

یہ کتاب وہی ہے جس کا ابن ندیم نے اپنی فہرست میں کتاب الواحد الکبیر" کے نام سے ذکر کیا

۲- کتاب الواحد الثانی، اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ مذکورۂ بالا لائبریری میں موجود ہے، اس کتاب کا نام ابن ندیم نے "کتاب الواحد الصغیر" بتایا ہے،

۳- کتاب الرکن، ابن ندیم نے کتاب الارکان نام بتایا ہے،

۴- کتاب البیان، مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۱ء (باہتمام آقا محمد شیرازی)

۵- کتاب النور " " "

---

[۱] ابن ندیم ص ۵۰۱،

۶- کتاب الحجر، مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۱ء (باہتمام آقا محمد شیرازی)

۷- رسالۃ الایضاح " " "

۸- کتاب الاسطقس الاس الاول " "

۹- " " الثانی مطبوعہ بمبئی " "

۱۰- " " الثالث " " "

۱۱- کتاب التجرید " " "

۱۲- کتاب الرحمۃ " " "

۱۳- کتاب الملک " " "

۱۴- کتاب تفسیر الاسطقس " " "

مذکورۂ بالا گیارہ کتابیں ایک ہی ساتھ مجموعہ کی شکل میں آقا محمد شیرازی ملک الکتاب نے ۱۸۹۱ء میں چترپربھا پریس بمبئی میں چھپوا کر شائع کی تھیں، اسی مطبوعہ مجموعہ کو اصل بنا کر پروفیسر ہولمیارڈ نے ۱۹۲۸ء میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، پروفیسر ہولمیارڈ نے اس مجموعہ کے دو حصے کر دیئے ہیں، ایک حصہ میں عربی متن اور دوسرے حصہ میں اس کا انگریزی ترجمہ چھاپا ہے[1]، موخر الذکر کتاب یعنی "کتاب تفسیر الاسطقس" کا ابن ندیم نے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے،

---

[1] انگریزی میں پروفیسر ہولمیارڈ نے جابر بن حیان کے مذکورہ بالا گیارہ رسالوں کا حسب ذیل ناموں سے ترجمہ کیا ہے، ـــ

(۱) The Book of Explanation

(۲) The Book of Light

(۳) The Book of the Stone

۱۵- کتاب الزئبق، فرانس کے مشہور مستشرق برتھیلو نے جابر کی دو کتابین، کتاب الزئبق الغربي اور کتاب الزئبق الشرقي اڈٹ کرکے شائع کی ہیں، یہ دونوں کتابیں برتھیلو نے لیون کے کتب خانہ سے نقل کرائی تھین، قومی لائبریری پیرس مین بھی مذکورہ بالا کتابون کا ایک ایک نسخہ،

۱۶- کتاب الشعر اس کتاب کا ایک نسخہ برٹش میوزیم مین ہے، جس کا نمبر (۱۰۰۲۲) ہے،

۱۷- کتاب التبویب، اس کتاب کا ایک نسخہ پیرس کی قومی لائبریری مین موجود ہے، جس کا نمبر ۲۶۰۶ ہے، اس کتاب کا ایک دوسرا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن مین بھی ہے، جس کا نمبر ۸۲۲۹ ہے،

۱۸- کتاب الشمس والقمر- جس کا دوسرا نام کتاب الذہب الفضۃ ہے یہ جابر کی مشہور کتاب: کتاب الاحجار السبعہ کا اختصار ہے، اس کتاب کا تذکرہ جلدکی نے شرح نہایۃ الطلب مین کیا ہے اس کتاب کا ایک نسخہ پیرس کی قومی لائبریری مین ہے، جس کا نمبر ۲۶۰۶ ہے،

۱۹- کتاب التراکیب، پیرس کی قومی لائبریری مین اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے،

۲۰- کتاب الترکیب الثانی: اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پیرس کی قومی لائبریری مین موجود ہے،

---

(۴) (بقیہ حاشیہ) The Letter of Elucidation

(۵) The First Book of the Element of the foundation

(۶) The Second Book of the Element of the foundation

(۷) The Third Book of the Element of the Foundation

(۸) The Book of Abstraction

(۹) The (little) Book of the mercy

(۱۰) The Book of Dominion

(۱۱) The Commentry of the Book of the Element

۲۱۔ کتاب التذکیر، پروفیسر ہولمیارڈ نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں (The Book of rendering Mascalir -) کے نام سے کیا ہے،

اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، جس کا نمبر ۲۳/۴۲۲ ہے،

۲۲۔ اسرار الکیمیاء اس کتاب کا لاطینی زبان میں Secretaceetaorum کے نام سے ترجمہ ہوا ہے، اس کا ایک عربی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے، مگر اس کا نام الاسرار ہے، اس کا نمبر ۱۴۳۱ ہے، اس کتاب کا ایک ایک لاطینی (قلمی) نسخہ کیمبرج یونیورسٹی (Gounill ca- ca s coll egl -) میں موجود ہے، عربی متن کا تھوڑا سا حصہ پروفیسر برٹیلو نے اپنی کتاب (Lackimiau moyen.) میں چھاپا ہے،[۵۱] (پیرس ۱۸۹۳ء)

۲۳۔ کتاب الارض، یا ارض الاحجار، اس کو پروفیسر برٹیلو نے لیڈن کے نسخہ سے نقل کرا کے شائع کیا ہے، ایک نسخہ پیرس کی لائبریری میں بھی موجود ہے، جس کا نمبر ۲۶۰۶ ہے،

۲۴۔ کتاب الملکتیب یا نہایۃ الطلب اس کتاب کی جلدقی نے فارسی میں شرح کی ہے، یہ کتاب ۱۳۰۷ھ میں آقا محمد شیرازی کے اہتمام سے بمبئی میں چھپی ہے،[۵۲]

۲۵۔ کتاب الظہیر، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پیرس لائبریری میں موجود ہے، جلدقی نے نہایۃ الطلب میں اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے،

۲۶۔ کتاب مصحات افلاطون، اس کا ایک نسخہ قسطنطنیہ میں راغب پاشا کے کتب خانہ میں موجود ہے، جس کا نمبر ۹/۹۶۳ ہے،

۲۷۔ کتاب الموازین، اس کو برٹیلو نے لیڈن کے قلمی نسخہ سے نقل کرا کے شائع کیا ہے،

---

۵۱ معجم المطبوعات العربیہ ج ۱ ص ۶۶۵،

۵۲ ایضاً

(پروفیسر ہولمیارڈ کا خیال ہے کہ لاطینی زبان میں جو کتاب Liber de ponderibus (ponderibus ....) کے نام سے مشہور ہے، وہ اسی کتاب الموازین کا ترجمہ ہے[1]

۲- کتاب الریاض: اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بوڈلین کے کتب خانہ میں ہے جس کا نمبر ... ہے، اور ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، جس کا نمبر ۴۲۲/۵ ہے،

(۳) ذیل میں وہ کتابیں درج ہیں جن سے عربی دنیا ناواقف تھی، اور وہ یورپ والوں کی وساطت سے سامنے آئی ہیں،

۱- کتاب ابی قلمون: الفہرست میں اس کتاب کا نام .... کتاب ابی قلمون چھپا ہے، اس کتاب کا پروفیسر برٹیلو نے فرانسیسی زبان میں (Livre a Qalmoc peut-etre faut delivrer de cameleon) کے نام سے ترجمہ کیا ہے،

۲- کتاب المجردات: کتاب الفہرست میں اس کتاب کا نام آیا ہے، یہ کتاب لاطینی زبان میں (Liber denudatorum) کے نام سے مشہور ہے، اس کتاب کو غلطی سے زکریا رازی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے،

۳- کتاب التصریف: یہ کتاب لاطینی زبان میں Liber mutatorium کے نام سے موسوم ہے،

۴- کتاب الثلاثین: لاطینی میں اس کا ترجمہ Liber de xxx Verbis کے نام سے ہوا ہے،

۵- کتاب الخمسۃ عشر: لاطینی میں اس کا ترجمہ (Liber xv) کے نام سے ہوا ہے، اس کتاب کا ایک عربی نسخہ ٹرینٹی کالج آکسفورڈ کے کتب خانہ میں موجود ہے جس کا نمبر ۳۶۳ ہے،

---

[1] رسالہ المقتطف بابۃ مئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۵۵۱

خلاصۃ العروض

راسخ عظیم آبادی کا ایک نایاب قلمی رسالہ

از

مولوی سید احمد صاحب قادری استاذ مدرسہ شمس الہدی پٹنہ

کچھ عرصہ ہوا مین اپنے خاندانی کتب خانہ کی دیکھ بھال کر رہا تھا، کہ قلمی کتابون کے ایک مجموعہ پر نظر پڑی، اس مین فن تجوید کے گیارہ قلمی نسخے ہین، جو سب کے سب فارسی زبان مین ہین، اسی مجموعہ مین راسخ عظیم آبادی کا تصنیف کیا ہوا عروض کا ایک رسالہ خلاصۃ العروض کے نام سے دکھائی دیا، نظر اُس رسالہ پر رک گئی، کیونکہ اب تک راسخ کی کسی نثر کی تالیف کا علم نہ تھا، اور نہ اُن کے تذکرہ نگارون نے اُن کی کسی نثر کی تالیف کا ذکر کیا ہے، راقم نے بعض اہل علم سے دریافت کیا، لیکن انھون نے بھی اپنی لاعلمی ظاہر کی، متعدد بڑے کتب خانون کی فہرستون کی چھان بین کے بعد بھی اب تک کہین اس کا پتہ نہ چلا، اس رسالہ کے ملنے سے بڑی خوشی اس کی ہوئی، کہ اس عظیم المرتبت شاعر کی ایک کتاب محفوظ رہ گئی، جس کا علم بھی ہمین نہ تھا، اوسط درجہ کی تقطیع پر کل ۱۰ ورق کا یہ ایک مختصر رسالہ ہے، خط نستعلیق ہے، کتاب کے سرنامہ پر یہ عبارت سرخ روشنائی سے درج ہے

" رسالہ درفن عروض مسماۃ بخلاصۃ العروض من تصنیف ملک الشعراء شیخ غلام علی راسخ

کتاب کی ابتدا یون ہے،

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حمد بے حد وثنا بے لاتعد سزاوار ذات مستغنی الصفات

بدیع کہ اندیشۂ سریع النفوذ نازک خیالان سخن رس را در ادراک دقائق عروض لاتیشیا قافیہ تنگ، و سمند خیال صاحبان عقل فرہنگ را در فیافی شناخت کنہ ماہیتش پاے جولان لنگ" الخ

آگے چل کر مصنف سبب تالیف لکھتے ہوے رقمطراز ہیں :-

"ہر چند مؤلف این رسالہ غلام علی متخلص بر آسخ عفی عنہ بخاطر نداشت کہ وقت عزیز را درین شغل بے حاصل صرف نماید اما بایماے عزیزے کہ میلانے در کسب این فن شریف دارد و سطرے چند" الخ

پھر اپنی کتاب کی ترتیب کے متعلق لکھتے ہیں :-

"بیان ہفت نوع کہ بناے ترتیب این رسالہ بر آنست، نوعِ اوّل در بیان اقسام کلام موزون، نوع دوم خلاصۂ علم معانی در فصاحت و بلاغت کہ از محسنات کلام است نوعِ سیوم در علم بدیع، بیان بدایع لفظی نوعِ چہارم در بیان معنوی نوعِ پنجم در بیان معائب سخن نوعِ ششم در بیان خلاصہ علم عروض، نوعِ ہفتم در بیان حقیقتِ قافیہ و ردیف و رُباعی"

آخر میں لکھتے ہیں :-

"در خاطر ہست کہ بشرط بقاے حیات ناپائدار مستعار و مساعدت زمانۂ غدار نسخۂ مبسوطے ترتیب دہم کہ حقیقتِ اصول و فروع فن شعر بشرح و بسط دران مندرج باشد، انشاء اللہ سُبحانہٗ،

اس کے بعد کاتبِ رسالہ نے بایں الفاظ اپنی کتابت ثبت کی ہے،

"بتاریخ دہم جمادی الاوّل ۱۲۳۵ھ موافق بست ہفتم ماہ پھاگن ۱۲۲۶ فصلی

"بموجب حکم مصنف این رسالہ بخط خام شکستہ بال... بیچک لعل قوم کالیستھ ماتھر بروز جمعہ رقم یافت"

سب کے آخر میں سُرخ روشنائی سے یہ عبارت درج ہے،

"این نقل باصل مقابلہ نمودہ شد"

شیخ غلام علی راسخ کا سنہ وفات سنہ ۱۲۳۸ھ وبقول گارسن دی تاسی سنہ ۱۲۴۰ھ ہے اس لحاظ سے یہ رسالہ مصنف کی وفات سے تین یا پانچ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، اور خود مصنف نے لکھوایا ہے، فن عروض کے اعتبار سے یہ رسالہ قیمتی ہو یا نہ ہو لیکن راسخ کی تصنیف ہونے کی جہت سے بہت قیمتی ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کو چھپوا کر محفوظ کر دیا جائے،

تابعین

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور اُن کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین تھے، اور صحابہ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، حضرت ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعہ رائیؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریح وغیرہ، چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی ضخامت ۵۶۰ صفحے قیمت للعہ

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

اندلس کا اسلامی تمدن

(۲)

کتابیں اور کتب خانے ان تمام اعلیٰ ترقیوں کے پہلو بہ پہلو یہاں ایسی بلند پایہ کتابوں کی طلب تھی، جو اپنے فنوں میں یکتا ہوں، عربی رسم خط کے مختصر ہونے کی وجہ سے اس کی ترقی میں اس کو غیر معمولی مدد ملی، مختصر وقت اور کم کاغذ پر لکھنے کی وجہ سے لوگوں نے لاطینی و رومی خط کے بجائے اس خط میں لکھنا زیادہ پسند کیا، مسلمانوں کی فتح کے ابتدائی دور میں اسپینی عیسائیوں نے اپنے رسم خط کو محفوظ رکھا، لیکن عوام کی تعلیمی زبان اور اسلامی قانون کی واقفیت کے حاصل کرنے کی خاطر انھوں نے عربی رسم خط کی طرف توجہ کی، اور اسی زبان میں لکھنے اور پڑھنے لگے، اسی طرح تو مسلمانوں نے اپنی نئی زبان اور لٹریچر کے مطالعہ کی طرف توجہ کی، خصوصاً عبد الرحمٰن ثالث کے زمانہ میں اس تحریک کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا، اس لیے کہ ملک میں عام امن و امان قائم تھا، اور لوگ اپنے علمی مشاغل میں سکون سے مصروف رہ سکتے تھے، کتابوں کی نقلیں بھی عام طور پر کی جانے لگیں، اور لوگ اس سلسلہ میں غیر معمولی مصارف برداشت کرتے تھے، قرطبہ میں کتب فروشوں کی دوکانیں بڑی ترقی کے ساتھ کھل گئیں، یہ مقام کتابوں کا خاص مرکز بن گیا اور مغرب (یورپ) کے لیے بھی یہی مرکز قرار پایا،

شاہی کتب خانہ اگرچہ محمد اول کے عہد میں قائم ہوچکا تھا، اور وہ قرطبہ کے بہترین کتب خانوں میں سے تھا، عبدالرحمٰن ثالث نے اس میں اضافہ کیا، پھر اس کے دو لڑکوں محمد اور حکم ثانی نے اپنے باپ کے کتب خانہ کو غیر معمولی ترقی دی، ان میں سے ہر ایک نے علٰحدہ علٰحدہ ذخیرہ بھی فراہم کیا، حکم ثانی کے عہد حکومت کے خاتمہ پر تینوں کتب خانے ایک میں ملا دیے گئے، اب اس میں چار لاکھ کتابوں کی جلدیں تھیں، ناظم کتب خانہ مقرر کیا گیا، جس نے فہرست نگاری کے کام کو جاری کیا، اس کے ساتھ بہترین جلد ساز، خاکہ بنانے والے، اور مطلا اور مذہب کرنے والے کاریگر رکھے گئے، خلفاء کے زوال کے بعد اس کتب خانہ کی پراگندگی اور بربادی مغرب کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے،

قرطبہ میں ذاتی کتب خانے بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، جن میں عورتوں کے کتب خانے بھی تھے، ان میں سے آسیہ جس کو قرطبہ کی سوسائٹی میں عظیم مرتبت حاصل تھی، کتابوں کا قابل ذکر ذخیرہ رکھتی تھی، نیز نیچے درجہ کی عورتیں اپنا وقت قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتابوں کے نقل کرنے میں صرف کرتی تھیں، یہود، اسپینی عیسائی، اور نومسلم اسپینی بھی مرتب کتب خانے رکھتے تھے،

المنصور کے بعد قرطبہ کو زوال آیا، خانہ جنگیوں نے اس کو نقصان پہنچایا، شاہی کتب خانہ کا بڑا حصہ بربروں کی وحشت کی نذر ہوگیا، انھوں نے کتابیں برباد کیں، اور جلا ڈالیں، دولت مند خاندانوں میں سے بہت سے خاندان قرطبہ کی سکونت ترک کرکے مختلف صوبوں کے مختلف مقاموں میں چلے گئے، اساتذہ اور طلبہ نے دار الحکومت کو چھوڑ دیا، اور انھوں نے اپنے تعلیم وتعلم کے لیے نئے سرے سے مختلف مرکز مختلف مقاموں پر قائم کئے، اور طوائف الملوکی کے ساتھ کتب خانہ کی باقی ماندہ کتابیں بھی مختلف صوبوں میں تقسیم ہوگئیں،

فنون لطیفہ | سائنس اور لٹریچر کے پہلو بہ پہلو یہاں دوسرے فنون لطیفہ کو بھی بڑی ترقی ہوئی، خصوصاً فن تعمیر یہاں اپنی ترقی کے عروج پر پہنچا، اس کا نظارہ قرطبہ میں کیا جاسکتا ہے، یہ شہر اسپین کا ممتاز ترین شہر

بن گیا، اس کی عمارتوں اور محلوں کی شان و شوکت بغداد سے مقابلہ کرتی تھی، عربوں نے جو طرز تعمیر اختیار کیا تھا، وہ رومانی اسپینیوں کے طرز سے بالکل مختلف تھا، عربی طرز تعمیر کا آغاز اسلام سے پہلے ساسانیہ کے دور میں ہوا، انھوں نے اس طرز تعمیر کے محراب کو اخذ کیا، بیزنطی اثرات کو بھی انھوں نے مشرق ہی میں قبول کیا، پھر اسپین میں وزیگاتھ طرز کی کچھ چیزیں اخذ کیں، اسی طرح انھوں نے وزیگاتھ کو تعمیر کی مختلف چیزیں دیں، اس طرح ہسپانی عربی طرز تعمیر کی تخلیق ہوئی،

ہسپانوی عربی طرز کی نشو و نما خلفا کے ہاتھوں آٹھویں صدی سے دسویں صدی تک میں ہوئی، قرطبہ کی جامع مسجد اس طرز کا بہترین شاہکار ہے، اس کی تعمیر کا آغاز عبد الرحمٰن اول کے زمانہ میں ہوا، اور اس کی چند اہم تعمیری خصوصیات ہیں،........ قرطبہ کے زوال کے بعد غرناطہ کے طرز تعمیر نے فروغ حاصل کیا، اس دور کی عمارتوں کے خصوصیات اور ان کے نقش و نگار بھی قابل ذکر ہیں،........ اس طرز میں وزیگاتھک، شامی، بیزنطی اور عراقی طرز تعمیر کے اثرات پائے جاتے ہیں،

رنگ آمیزی، اور نقش و نگار بنانے اور مطلا و مذہب کرنے میں اسپینی مسلمانوں نے اپنا کمال دکھایا، اس میں وہ مذہبی مخالفتوں کا بھی خیال نہ کرتے تھے، وہ جانوروں اور اشخاص کی تصویریں بناتے تھے، ان میں سے چند چمکیلے برتن الویرا میں ہیں، جن میں انسانی انگلیاں بنائی گئی ہیں، پیتل کا کام مسجد کے لیمپ میں پایا جاتا ہے، اور اس کی سلور پلیٹ حکم ثانی کے زمانہ کی ہے، اسی طرح قالین، سلک، پردوں، صوفوں اور گدوں وغیرہ کی اہم صنعتیں تھیں، شہری حماموں کا رواج مسلمانوں ہی سے ہوا، ان کے لیے مستقل عمارتیں تیار کی جاتی تھیں،

تمدنوں کی آمیزش و اتصال | مسلمانوں کی خانگی زندگی میں عیسائیوں کی زندگی سے فرق نمایاں تھا، مسلمان چار بیویاں کر سکتے تھے، اور خلفاء اور امراء کی بیویاں (نہیں بلکہ باندیاں) ہوتی تھیں،

جو حرم میں رکھی جاتی تھیں، قانون نے پہلی بیوی کو یہ اجازت بھی دے رکھی تھی کہ اس کا شوہر دوسری شادی نہیں کرے گا،[۱] گھر کے اندر عورت، مرد کے ماتحت تھی، لیکن وہ اپنی ملکیت کا بڑا حصہ[۲] محفوظ رکھ سکتی تھی، اور قانونی عدالت میں اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف چارہ جوئی کر سکتی تھی، اور قانون جو ان کی صورت میں وہ شوہر سے علحدہ ہو جانے کا حق بھی استعمال کر سکتی تھی، وہ اپنے معاشرتی تعلقات میں آزادانہ سفر کر سکتی تھی، وہ کبھی سڑکوں پر اپنے سر کو چھپائے بغیر چل پھر سکتی تھی،[۳] مدارس وغیرہ میں وہ مردوں کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی،

خلافت کی سنہری تہذیب و تمدن نے قدرتی طور پر شمال کے ان عیسائیوں کو جو عیسائی ملکوں میں تھے، متاثر کیا، وہ مسلمانوں کے عام نقطہ ہائے نظر کو قبول کرنے لگے، خصوصاً وہ عیسائی غلام جو آزاد ہو کر مسلمانوں کے پاس سے آتے تھے، اپنے اسلامی ناموں تک کو باقی رکھنا پسند کرتے تھے، نیز عیسائیوں اور مسلمانوں میں شادیاں بھی ہوتیں، اکثر عیسائی عورتیں مسلمانوں سے بیاہی گئیں، اس سے اسلامی تمدن کو زیادہ فروغ حاصل ہوا، اس کے ساتھ عربوں نے بھی کچھ مقامی اثرات قبول کئے، جب دو قسم کے لوگ کسی ایک معاہدہ سے منسلک ہوتے ہیں تو اعلیٰ تمدن کے مالک دوسرے فریق کو متاثر کرتے ہیں، یہی صورت حال اسپین میں عربوں کی تھی، اور یہی عربی تمدن کے اس فروغ کا سبب تھا، جو نویں صدی سے تیرہویں صدی تک میں یورپ میں چھایا رہا، اس زمانہ میں اسلامی فلسفہ اور سائنس اپنے معراج کمال پر تھے، عملی زندگی میں عربوں کے اثرات زیادہ گہرے تھے، جو نہ صرف سیاسی تھے بلکہ قوانین کی تدوین اور فوج کی تربیت میں بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ عیسائی اسپین پر دوبارہ اقتدار حاصل کر لینے کے باوجود، عربی تمدن کی برتری کو تسلیم اور اس کی عزت کرتے رہے،

---

[۱] اندلس میں اس قسم کی کوئی قانونی پابندی نہیں تھی، مقالہ نگار کو کسی بات سے غلط فہمی ہوئی ہے [۲] اسلامی قانون کے مطابق بڑا حصہ نہیں بلکہ جزو کل پوری ملکیت عورت کی وسی کے لیے تھی [۳] یہ صحیح نہیں ہے،

ادبی اثرات اتنے زیادہ مضبوط نہیں تھے تاہم عربی طرز بیان یونان، قسطیلہ، نوارا وغیرہ میں یکساں جاری تھے، رومانی زبانوں نے جو تدوین کی منزل میں تھیں، عربی کے بے شمار الفاظ قبول کیے، اور لاطینی الفاظ عربی لب لہجہ میں بولے جانے لگے، ایسے بہت سے عرب تھے جو رومانی سمجھتے تھے، خصوصاً سرحدی اضلاع کے باشندے، وہ "لاطینی عرب" کہے جاتے تھے، جیسے کہ یہاں کے بہت سے عیسائی، عربی زبان کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، اور وہ "الغرائب" کہے جاتے تھے،

محکوم اسپینی عیسائی "معارب" یعنی محکوم اسپینی عیسائیوں نے قدرتی طور پر عربی کے اثرات زیادہ قبول کیے تھے، وہ پورے اسلامی دور میں عام طور پر زیر اثر رہے، اسی زمانہ میں ایک پادری اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:-

> "میرے بہت سے عیسائی ساتھی عربوں کی شاعری اور افسانوں سے حظ اٹھاتے ہیں، وہ مسلمان فقیہوں اور فلسفیوں کی کتابیں پڑھتے ہیں، اس لیے نہیں کہ تردید کریں بلکہ اس لیے کہ صحیح اور فصیح عربی لکھنی آجائے، پادریوں کو چھوڑ کر آج کون سا عیسائی ہے جو کتب مقدسہ کی تفسیریں لاطینی زبان میں مطالعہ کرتا ہو .... ہزاروں عیسائیوں میں سے شاید ایک عیسائی ایسا نکلے جو اپنے کسی دوست کو چار سطر کا خط سلیس لاطینی میں لکھ سکے لیکن عربی کا یہ زور ہے کہ اس زبان کو روانی میں لکھنے والے ایسے عیسائی بکثرت موجود ہیں جو عربی میں شعر کہتے ہیں جو صحت و عروض کے لحاظ سے عربوں کے کلام سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے"

اس کے ساتھ مسلمانوں نے بھی وزیگاتھ کلچر کو نومسلموں اور محکوم اسپینی عیسائیوں سے حاصل کیا، خصوصاً زبان، نظم و نسق اور فنون کی تنظیم میں ان اثرات کی جھلک موجود ہے، محکوم اسپینی عیسائیوں نے اپنے قدیم مذہبی و کلیسائی مدرسہ کو قائم رکھا جن میں قدیم روایات برقرار رکھے گئے تھے، ان عیسائی عورتوں نے جو عربوں اور بربروں کی خدمتیں انجام دی تھیں، عربی تمدن کے اثرات کو قائم رکھا، یہ اثرات

ایسے ماتحت ہوتے تھے کہ مسلمانوں یا عیسائیوں کی طرف سے ان کی مخالفت کی جاتی، اس لیے ان اثرات کے بڑھنے اور قائم رہنے کے مواقع حاصل رہے۔

لیکن اسلامی اثرات کے ساتھ عیسائی تمدن بھی اپنی وزیگاتھ بنیادوں پر اپنی راہ پر نشو و نما پاتا رہا، لیکن وزیگاتھک سلطنتوں کا سیاسی اتحاد جداگانہ نقطہ ہائے نظر کی وجہ سے ٹوٹ چکا تھا، اور اس دور کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں قومی زندگی کی کوئی روح موجود نہیں تھی، درحقیقت "اسپین" اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا تھا، ہم استریاس، لیون، گلیشیا، نوار، قستیلہ اور کیٹلونیا کے متعلق جدا جدا گفتگو کر سکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی حیثیت انفرادی تھی، اس زمانہ میں متحد ملک کا تصور باقی نہیں رہ گیا تھا، ان میں سے ہر ایک حکومت کے تحت وہاں انسانوں کے درجے ان میں باہمی تفوق اور ان کی مدنیت کا ایک نظام تھا،......

عربی تمدن کے اثرات کا دوام | عربی تمدن عہد وسطیٰ میں اپنے علوم سائنس اور خیالات کی ندرت کے اعتبار سے بہت پھولا پھلا، لیکن (سیاسی اقتدار کے زوال کے بعد) اس کے حریف تمدن نے روز بروز ترقی کی اور اسپینی قوم اور اسپینی عقیدہ کی تخلیق ہوتی گئی، بایں ہمہ خیالات کے میدان میں، اور اپنے دستوری تجربوں کے ذریعہ اس نے اپنے اہم نشانات چھوڑ دیے، اس طرح عربی اثرات کبھی بھی ختم نہیں ہوئے کہ جب چھوٹی عیسائی حکومتیں دشمنوں کے مقابلہ میں متحد ہوتی گئیں، اور نئی اسپینی سلطنت عالم وجود میں آئی تو اسپین کے اسی عربی تمدن کی بنیادوں پر نئے تمدن کی تعمیر عمل میں آئی۔

استفسار و جواب

حج کے قدیم مراسم اور حج نبوی قبل ہجرت

جناب سید نجم الحسن صاحب رضوی
محلہ میاں سرائے خیرآباد، ضلع سیتاپور

قبل ہجرت حج کرنے کا کیا طریقہ تھا؟ مشرکین حج ادا کیا کرتے تھے؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ
قبل نبوت اور قبل ہجرت کتنے حج کیے؟

معارف:۔ حج عرب کا عام شعار تھا، اس کے رسوم و ارکان عہد ابراہیمی سے جاری توراۃ میں عہد ابراہیمی کے طریقوں کی تفصیل آئی ہے، امتداد زمانہ سے ان رسوم میں کچھ چیزیں بد تھیں، اور کچھ مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے سنت ابراہیمی کی پیروی میں ان رسوم کو جو اس عہد سے قائم تھے، جاری رکھا، اور مشرکین کے ہاتھوں جو تبدیلیاں ہوئی تھیں، اور جو رسمیں بڑھ گئی تھیں، ان کی اصلاح کی، مشرکین کے طریقوں میں جو تبدیلیاں کی گئیں ان کی تفصیل جلد ۵ میں "حج کی اصلاحات" کے عنوان سے درج کی گئی ہے، براہ کرم اسکی طرف رجوع فرمائیں۔

مسلمانوں کے لیے حج کی فرضیت کا حکم کب آیا اس میں کئی روایتیں ہیں، بعضوں نے قبل ہج کہا ہے، لیکن عام اہل علم نے اس کو رد کیا، پھر ہجرت کے بعد یہ کس سنہ کا واقعہ ہے، اس میں بھی بیانات ہیں، یعنی ۵ سنہ سے ۹ سنہ تک کے ہر سنہ کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت موجود ہے اسی سال اس کی فرضیت کا حکم آیا، (تاریخ خمیس ج ۱ ص ۳۰۵) بہر حال مکہ معظمہ ۸ سنہ میں فتح اور ۹ سنہ میں کعبہ کو مشرکانہ رسوم سے پاک کر کے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حج ادا کیا، امیر حج حض

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحیح سنت کے مطابق حج کے مناسک کی تعلیم دی، اور یوم النحر میں خطبہ دے کر حج کے مسائل بیان فرمائے۔

اس لیے ۹ سنہ سے پہلے مسلمانوں نے جو حج ادا کیے، ان میں مشرکین عرب بھی رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل نبوت کتنے حج کیے اس کی تصریح نظر سے نہیں گذری، لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ قبل نبوت ہی سے مراسم شرک سے طبعاً اجتناب فرماتے تھے، اس زمانہ میں حج میں مشرکانہ مراسم بکثرت داخل تھے، البتہ ترمذی کی ایک روایت میں یہ تصریح آئی ہے کہ آپ نے عمرہ کے علاوہ تین حج ادا فرمائے، دو قبل ہجرت اور ایک بعد ہجرت، چنانچہ مذکور ہے:۔

عن جابر بن عبد اللہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حج ثلث حجج، حجتین قبل ان یھاجر وحجۃ بعد ما ھاجر الخ

(ترمذی ص ۱۴۲، باب ما جاء کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حج ادا فرمائے، دو حج ہجرت فرمانے سے پہلے، اور ایک حج ہجرت فرمانے کے بعد ادا فرمایا۔

میزان الاعتدال میں ایک حوالہ

جناب محمد اسلم صاحب سلیم
کوٹھی تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا (مغربی پنجاب)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے "مقالات" کے حصہ اول کے صفحہ ۱۶ میں حاکم مصنف "مستدرک" کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ علامہ ذہبیؒ نے اپنی کتاب "میزان الاعتدال" میں ان کے متعلق لکھا ہے "تشیع فی مستدرکہ احادیث ساقطۃ ویکثر من ذلک ھو شیعی مشھور" یہ حوالہ بہت زیادہ تلاش کیا گیا اور میزان الاعتدال کو غیر معمولی کاوش سے دیکھا گیا مگر نہ ملا، آخر مجبور ہو کر جناب کی خدمت میں لکھا جاتا ہے کہ آپ براہ کرم جلد اور صفحہ کی تعیین فرمائیں، تاکہ مولانا نعمانی کے معاندین کی زبان بندی ہو جائے اور

ہم کو نہیں نظر آتی پڑیں، ہم مولانا کے غیر معمولی عقیدت مندوں میں سے ہیں اور نااہل

لوگوں کا طعن مولانا نعمانی پر ہمارے دل کو بہت زیادہ دکھ دیتا ہے، میزان الاعتدال

کی تینوں جلدیں ہمارے پاس ہیں،

معارف:- آپ کا مکتوب ملا تھا، غیر معمولی تاخیر سے جواب دے رہا ہوں، تعجب ہے،

کہ میزان الاعتدال میں مولانا شبلی مرحوم کی حوالہ دی ہوئی عبارت آپ لوگوں کو نہیں ملی، وہ حاکم

کے ترجمہ میں موجود ہے، آپنے شاید "حاکم" کے نام سے تلاش کیا ہے،" محمد بن عبد اللہ" کے ضمن میں دیکھئے،

"حاکم" تو غنیمت ہے، حافظ ذہبی کی پوری عبارت درج ذیل ہے :-

"صاحب التصانیف امام صدوق لکنہ یصحح فی مستدرکہ احادیث

ساقطۃ ویکثر من ذٰلک فما ادری ھل خفیت علیہ فما ھو ممن یجھل ذٰلک

وان علم فھذہ خیانۃ عظیمۃ ثم ھو شیعی مشھور بذٰلک من غیر تعرض

للشیخین وقد قال ابن طاھر سألت ابا اسمٰعیل عبد اللہ الانصاری عن

الحاکم ابی عبد اللہ فقال امام فی الحدیث رافضی خبیث قلت اللہ یحب الانصاف

ما الرجل برافضی بل شیعی فقط" (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵ شمار ترجمہ ۹۲)

لیکن علامہ ذہبی نے جو کچھ لکھا ہے نفس اس موضوع پر مجھے کچھ عرض کرنا نہیں ہے، عبارت

کو نقل کرنے کا مقصود صرف اسی قدر ہے کہ آپ کو وہ حوالہ مل جائے، اور معترضین کو آپ خاموش

کر سکیں، والسلام "م"

سیرت عائشہ رض

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی اور انکے مناقب و فضائل و اخلاق اور علمی کارنامے اور انکے اجتہادات

اور صنف نسوانی پر انکے احسانات، اسلام کے متعلق انکی نکتہ سنجیاں اور معترضین کے جوابات، قیمت ۸ے ضخامت ۳۴۹ صفحے،

ادبیات

تابشِ سہیل

از جناب اقبال احمد خانصاحب سہیلؔ اعظم گڈھ

تیور جو اسیروں کے بگڑے صیاد کی ہمت چھوٹ گئی
اے جوشِ جنوں تیرے صدقے زنجیر غلامی ٹوٹ گئی

باندھے ہوئے اپنے سر سے کفن اٹھے جو فدا کارانِ وطن
صیاد کا زہرہ آب ہوا نبضِ اہلِ وفا کی چھوٹ گئی

جمہور کے آگے چل نہ سکی راجاؤں اور نوابوں کی
تھی جس پہ بدیشی بیل چڑھی وہ شاخِ وفا کی ٹوٹ گئی

اب پرچمِ حق منصور ہوا باطل کا اندھیرا دور ہوا
کشکول گدائی چور ہوا تقدیرِ تملق پھوٹ گئی

جس ننگ غلامی کے ہاتھوں غیرت کی نظر جھک جاتی تھی
دامن سے وہ دھبہ دور ہوا چہرے سے وہ کالک چھوٹ گئی

اب برق و تگرگ سے ڈرنا کیا سر لیں گے ہم آئے جو بھی بلا
پرواز کا کچھ موقع تو ملا تیلی تو قفس کی ٹوٹ گئی

قفقاز سے لے تا ساحلِ چیں خوابیدہ فضائیں جاگ اٹھیں
نکلا جو گہن سے یہ مہر مبیں ہر گوشہ میں اسکی چھوٹ گئی

گلزارِ وطن آباد ہوا ہر سرو چمن آزاد ہوا
رخصت وہ ستم ایجاد ہوا وہ قہر گیا وہ لوٹ گئی

پھر جوش پہ ہے دریائے سخن پھر دور میں ہے صہبائے سخن
قفلِ درِ زنداں کیا ٹوٹا رندوں کی بھی توبہ ٹوٹ گئی

مل جل کے کرو تعمیرِ وطن ایسا نہ ہو طعنہ دے دشمن
ساجھے کی یکائی تھی ہنڈیا چورا ہے پہ آخر پھوٹ گئی

طوفانِ مسرت اٹھا ہے نغموں کا تلاطم برپا ہے
اقبالِ سخنور کے لب سے اب مہرِ خموشی ٹوٹ گئی

مسلمانوں سے خطاب

از جناب سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج چاٹگام

مسلمانو! تمھیں ہو غایتِ تخلیق انسانی — تمھیں سے وادیِ ایمن کی ہے یہ جلوہ سامانی

مسلمانو! تمھیں ہو فخرِ موجوداتِ عالم میں — خلائق میں تمھیں ہو نائبِ محبوبِ سبحانی

جو تم میں نورِ حق ہے، اُس سے دنیا جگمگا اٹھی — تمھارا سینہ سینائی تمھارا دل ہے فارانی

تمھیں نے درسِ عرفاں دیکے عالم کو کیا روشن — تمھاری وجہ سے ہیں منکشف اسرارِ پنہانی

خدائے پاک نے خیر الامم تم کو بنایا ہے — فضیلت کی تمھاری ہیں دلیل آیاتِ قرآنی

خلافت کے تمھیں قابل امانت کے تمھیں حامل — فرشتوں سے بھی بڑھ کر ہے تمھاری ذات نورانی

حقیقت کے تمھیں قائل صداقت کے تمھیں حامل — تمھارا قلب ہے سرچشمۂ الطافِ ربانی

زمیں سے آسماں تک سب تمھارے زیرِ فرماں ہیں — کسے حاصل ہے یہ فرمانروائی اور جہانبانی؟

تمدن میں ہو تم بے مثل اور تہذیب میں یکتا — سیاست میں ہو تم فائق، عدالت میں ہو لاثانی

حکومت میں ہو تم کامل، تدبر میں ہو تم ماہر — تمھیں سے خلق نے سیکھا ہے آئینِ جہانبانی

تمھارا عہدِ ماضی شہرۂ آفاق ہے اب تک — تمھیں پر ختم ہے دنیا کی کسرائی و خاقانی

غضب ہے تم ازل کا عہد و پیماں بھول بیٹھے ہو — تمھیں ہے فکرِ دنیا، اور ہوائے لذتِ فانی

جب آتی ہے مصیبت تو خدا کو یاد کرتے ہو — پر اپنے فعل پر تم کو نہیں ہوتی پشیمانی

سدھرنے کی تمھارے کوئی صورت ہے زمانے میں؟ — نہ پاکیزہ عمل ہے اور نہ کوئی وصفِ روحانی

تم اپنے شامتِ اعمال سے رسوائے عالم ہو — نہ تم میں ہے جوانمردی، نہ وہ اخلاقِ انسانی

خدا ترسی نہ موجب اور نہ ہو حسنِ عمل تم میں — تو لا حاصل ہے دنیا کی شہنشاہی و سلطانی

دلوں میں جب تمھارے قوت ایماں نہیں باقی ‏ ‏ کرے کیا نور سینائی، کرے کیا برق فارانی

کہو کس منہ سے کرتے ہو مسلمانی کا تم دعویٰ؟ ‏ ‏ اگر تم میں نہ ہو جوش بلالی عشق سلمانی

اگر تم میں نہیں تنظیم اور تہذیب اسلامی ‏ ‏ تو ہے بے فائدہ آئین رومی عقل یونانی

اٹھادو امتیاز ذات و نسل اب اے مسلمانو! ‏ ‏ بنو تم مومن صادق، نہ قحطانی نہ عدنانی

حکومت دین و دنیا کی تمھارے بس میں ابھی ہے ‏ ‏ تمھاری قوم گر ہو لیلیٰ مذہب کی دیوانی

تمھارے پائے استقلال میں لغزش نہ آئیگی ‏ ‏ اگر زیر نگیں تم کرسکو جذبات نفسانی

اگر عزت سے رہنا چاہتے ہو تم تو یہ سن لو ‏ ‏ ضروری ہے تمھارے واسطے ایثار و قربانی

کہاں تک میں سناؤں درد دل کی داستاں تمکو ‏ ‏ دعا پر ختم کرتا ہوں اب اپنی نظم طولانی

مظفر کی دعا ہے ہوں مسلماں مومن کامل

عمل ہو ان کا اسلامی، سخن ہو انکا حقانی

تصوّرات

از جناب اکرم دہولیوی

اول بھی بے ثبات ہے آخر بھی بے ثبات ‏ ‏ مجھ مشت خاک کے لیے کیا موت کیا حیات

کتنی ستم ظریف تھی حسن ازل کی ذات ‏ ‏ بخشا اسیر عشق کو زندان کائنات

موج نسیم رنگ چمن روح کائنات ‏ ‏ وہ جلوۂ لطیف بھی ہے رشک صد حیات

ڈوبا سرور و کیف میں ہر لمحۂ حیات ‏ ‏ شاید بنے وہ رونق بزم تصورات

لیتی تھی درس موت سے جب ہر نفس حیات ‏ ‏ یارب کہاں گیا وہ مراد و مشکلات

ایذا پسندیوں سے بالآخر کھلی یہ بات ‏ ‏ بے سود تھیں کسی سے کرم کی توجہات

جوشِ جنوں میں چھیڑ دیا [illegible] سازِ غم | [illegible] ہو کہ گونج اٹھے ساری کائنات
اے عندلیب [illegible] کہاں [illegible] | [illegible] ہے رنگِ چمن کو نہیں ثبات
خلدِ بریں تو روزِ ازل سے قدم میں تھی | کب ہیں شہیدِ عشق کے منت کشِ نجات
دیوانگیٔ شوق کا عالم نہ پوچھیے | تاروں سے ہمکلام رہے ہم تمام رات
جب لطف تھا کہ ہوش میں آتے نہ ہم کبھی | اک خواب ہی سہی وہ ترا عہدِ التفات
کیا سوچ کر کسی سے کریں شرحِ آرزو | ممکن نہیں کہ منہ سے نکل جائے دل کی بات
چھوٹا نہ دستِ شوق سے دامانِ آرزو | بے التفاتیاں ہیں تری عینِ التفات
در پردہ وہ نگاہ اگر ملتفت نہیں | کرتا ہے کون رازِ وفا میں تصرفات
یہ مرحلہ بھی موت نے آسان کر دیا | ترکِ تعلقات نہ تھی میرے بس کی بات

قربان لطفِ ساقیٔ کوثر کے جائیے
اکرمؔ غمِ نجات سے ہم کو ملی نجات

الٰہی توبہ

از جناب ناصر مالیگانوی

"عصرِ حاضر" کا یہ انسان ، الٰہی توبہ | نہ بصیرت ہے نہ عرفان، الٰہی توبہ!
قتل و غارت کا یہ طوفان ، الٰہی توبہ | بستیاں ہو گئیں ویران ، الٰہی توبہ!
جذبۂ "مہر و وفا" سے ہوئے سینے خالی | ہائے "اخلاص" کا یہ فقدان ، الٰہی توبہ!
خانہ جنگی ہی میں مصروف نظر آتے ہیں | وہ ہوں ہندو کہ مسلمان ، الٰہی توبہ!
جس طرف دیکھیے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے | اُف مصائب کا یہ طوفان ، الٰہی توبہ!

چین ملتا ہی اب تو کسی صورت سے — آج ہر دل ہے پریشان الٰہی توبہ!

تیغ محشر کی تھم اب یہ تو توقع ہی نہیں — رُک سکے جنگ کا طوفان الٰہی توبہ!

حیف ہے قیدِ غلامی سے رہا ہوتے ہی — آدمی بن گیا حیوان الٰہی توبہ!

اس جفاکاری و افتاد پہ بھی اہلِ وطن — نہیں ہوتے ہیں پشیمان الٰہی توبہ!

ہند بھی تھا کبھی گہوارۂ امن و راحت — اب تو ہے جنگ کا میدان الٰہی توبہ!

انقلاباتِ زمانہ بھی عجب ہیں ناصر

اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ شان الٰہی توبہ!

معذرت

افسوس ہے کہ بعض ناگہانی اتفاقات و حادثات کے سبب سے جن کا سلسلہ ابھی کچھ نہ کچھ قائم ہے مجھے وطن سے واپسی میں تاخیر ہو گئی اور ۱۸ دسمبر کی شب کو واپس آسکا اس اثنا میں وقت کی کمی کی وجہ سے رسالوں کو ناتمام شائع کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اور وہ معذرت چھاپی گئی، جو فہرست مضامین کے ساتھ منسلک ہے، اس لئے اس ماہ میں ان کتابوں پر تبصرہ شائع نہ ہو سکا جن کا وعدہ کیا جا چکا تھا انشاء اللہ رسالہ کے نئے مرتب سے عرض کر دیا جائے گا کہ وہ آئندہ ماہ میں موعودہ کتابوں پر تبصرہ شائع کر دیں،

والسلام

سید ریاست علی ندوی

ہماری کتابین

تاریخ اخلاق اسلام، جلد اول، اس مین اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتون سے نقد و تبصرہ ہے،

مصنفہ: مولانا عبد السلام ندوی، ضخامت ۶۰۰ صفحے،

قیمت: عہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہین، ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابون مین مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانون کے تعلیمی نظام اور ان کے مدرسون اور [illegible] تو نہین مل سکتا، [illegible] کے [illegible]

ضخامت ۱۳۰ صفحے، قیمت ۱۲ ر

مختصر تاریخ ہند، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین، اور جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہین، وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائین،

اس کتاب کو گورنمنٹ بہار نے اپنے سرکاری مدرسون مین بھی جاری کر دیا ہے، اور حکومت یو پی نے اس کے ۵۰۰ نسخے سرکاری لائبریریون کے لئے خریدے ہین، ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ

ہماری بادشاہی، ہمارے چھوٹون بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین،

ضخامت: ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ

ہندوستان کی کہانی، ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے، تاکہ مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، اور ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے اور اب کیا ہین، [illegible] صفحے، قیمت: عہ

مرتبہ مولوی [illegible] ندوی،

مقدمہ رقعات عالمگیر، اس مین اسلامی فن انشاء اور انشاء و مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے [illegible] کی تفصیل ہے، اور پھر عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و سوانح پر خود عالمگیر کے خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی گئی ہے،

۳۹۰ صفحے، قیمت: للعہ

رقعات عالمگیر، اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کئے گئے ہین، ان سے ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، مرتبہ: سید نجیب اشرف ندوی ایم اے،

ضخامت: ۴۸۰ صفحے،

قیمت: سے ر

[illegible]

اور معترضین کے جوابات، قیمت: ہے، ضخامت ۲۲۰ صفحے، طبع سوم باضافہ حواشی [illegible]

سیر عمر بن عبد العزیز

تابعین

علم و عمل، اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد اُن ہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس میں مشہور اکابر تابعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

ضخامت :- ۵۰۶ صفحے، قیمت :- للعہ

(پرنٹر و پبلشر صدیق احمد)